مکاتیب غالب

دیباچہ

باسمہ

تقریب

سنہ ۱۸۵۷ء کی رستخیز بیجا سے ہندوستان کی جو ریاستیں محفوظ رہیں، اُن میں روہیلکھنڈ کی واحد اسلامی ریاست مصطفٰے آباد عرف رامپور، مشرقی علم و ادب کی سرپرستی کے اعتبار سے ممتاز ترین درجے کی مالک ہے۔

یہ ریاست، بارھویں صدی ہجری میں، جانباز روہیلوں کی مردانہ کاریوں کی بدولت قائم ہوئی اور چند سال کے اندر اپنے خوش بخت فرمانروا، نواب سید علی محمد خاں بہادر کے اقبال کی تائید سے روہیلکھنڈ کے طول و عرض پر چھاگئی۔ لیکن ابھی اس کی بنیاد کما حقّہٗ استوار نہ ہونے پائی تھی کہ ۱۱۶۲ھ (۱۷۴۹ء) میں نواب سید علی محمد خاں بہادر کا انتقال ہوگیا۔ حافظ رحمت خاں بہادر نے، دیگر روہیلہ سرداروں کے مشورے سے، اُن کے فرزند سوم نواب سید سعد اللہ خاں بہادر کو، جو ابھی صغیر السن تھے، تخت نشین کر دیا۔ سلطنت اودھ، روہیلوں کے روز افزوں اقتدار و تسلط کو خطرے کی نگاہ سے دیکھتی تھی۔ اس نے اس نازک وقت سے فائدہ اُٹھایا، اور اپنی مسلسل جارحانہ مخالفت سے روہیلکھنڈ کی طویل و عریض سلطنت کو ریاست رامپور کی مختصر چار دیواری میں محصور ہونے پر مجبور کر دیا۔

اس پُرآشوب عہد میں، حکومتِ انگلشیہ کے زیرِ حمایت، نواب سید فیض اللہ خاں بہادر عرش منزل مسند آبائی پر متمکن ہوئے۔ آپ میں وہ تمام صفاتِ حسنہ، جو ایک معدلت گستر حکمراں کا طرۂ امتیاز شمار کی جاتی ہیں، بوجہ اتم موجود تھیں۔ اس لیے آپ نے اپنی دانشِ شاہانہ سے کام لے کر، روہیلوں کی منتشر قوت کو یکجا کیا؛ تعلیم و تربیتِ رعایا کے لیے مدرسۂ عالیہ قائم کرکے

مضامین

دیباچہ

متن

ملا حسن فرنگی محلی اور بعد ازاں بحر العلوم مولانا عبد العلی لکھنوی کو اُس کا پرنسپل مقرر فرمایا؛ اور محکمۂ قضا (جوڈیشل ڈپارٹمنٹ) کے لیے فتاویٰ فیض اللہ خانی مرتب کرایا، لیکن ابھی عروجِ ستارۂ اقبال کی اُمیدِ مُردہ پوری طرح زندہ ہونے پائی تھی کہ ذیحجہ سنہ ۱۲۰۸ھ (۱۷۹۴ء) میں نواب عرش منزل نے قضا کی۔

روہیلوں نے، آپ کے فرزندِ اکبر، نواب سید محمد علی خاں بہادر، کو اپنا حکمراں تسلیم کیا مگر یہ نیا دور، ایک افسوسناک حادثے کے باعث، بہت جلد ختم ہو گیا، اور محرم سنہ ۱۲۰۹ھ (۱۷۹۴ء) میں بجائے آپ کے، نواب عرش منزل کے فرزند دوم، نواب سید غلام محمد خاں بہادر مسند نشین ہوئے۔ حکومتِ اودھ نے، جو روہیلوں کی مجتمع قوت کو پھر خائفانہ نظروں سے دیکھنے لگی تھی، اس معاملے میں بیجا مداخلت کی، اور نواب سید محمد علی خاں بہادر کا خوں بہا طلب کرنے کے بہانے سے رامپور پر فوج کشی کر دی۔ سوءِ اتفاق سے روہیلوں کو شکست ہو گئی۔ نواب سید احمد علی خاں بہادر ابن نواب سید محمد علی خاں بہادر، جو ابھی خُرد سال تھے، نواب سید نصر اللہ خاں بہادر کی سرپرستی میں والی بنائے گئے، اور نواب سید غلام محمد خاں بہادر اور اُن کی اولاد رامپور سے باہر رہنے پر مجبور ہوئی۔ لیکن "عدو شرے برانگیزد کہ خیر ما دراں باشد" ان حضرات کی ظاہری محرومیِ تخت و تاج، ان کی آیندہ عظمت و شہرت کا سبب بن گئی۔

سنہ ۱۲۵۶ھ (۱۸۴۰ء) میں نواب سید احمد علی خاں بہادر فوت ہوئے، اور اُن کی اکلوتی صاحبزادی، شمسہ تاجدار بیگم صاحبہ کی حکومت تسلیم کرنے سے روہیلہ سرداروں نے انکار کر دیا۔ حکومتِ انگلشیہ کے تدبر نے نواب سید غلام محمد خاں بہادر کے خلف الرشید، نواب سید محمد سعید خاں بہادر جنت آرام گاہ کو اس وراثتِ آبائی کا حق دار قرار دیا۔

نواب جنت آرام گاہ نے سنِ شعور کو پہنچ کر حکومتِ انگلشیہ کو شرفِ خدمت بخشا تھا، اور اپنی کارروائی اور قابلیتِ انتظامی کی بدولت ڈپٹی کلکٹری کے عہدے کی عزت فرما چکے تھے۔ آپ نے زمامِ حکومت ہاتھ میں لے کر، سب سے پہلے ریاست کی تنظیم جدید کی طرف توجہ مبذول فرمائی، اور فوج، پولیس اور محکمۂ مال کے لیے نئے قوانین و ضوابط مقرر

فرما کر، روہیلوں کے غیر منظم جرگے کو آئینی ریاست کے قالب میں ڈال دیا۔

انتظامی امور سے فارغ ہو کر، نواب جنت آرام گاہ نے سرپرستیِ علم و ادب کی طرف قدم اُٹھایا۔ مولانا فضلِ حق خیر آبادی، ملک الشعرا مہدی علی خاں ذکی مراد آبادی، حکیم احمد خاں فاخر رامپوری اور دیگر علما و ادبا مختلف کتابوں کے ترجمہ و تالیف پر مامور ہوئے، لیکن یہ پودا پروان چڑھنے نہ پایا تھا کہ سنہ ۱۲۷۱ھ (۱۸۵۵ء) میں نواب جنت آرام گاہ نے فاتحئہ ناتمام۔ آپ کے بعد نواب سید محمد یوسف علی خاں بہادر فردوس مکاں نے تاجِ ریاست زیبِ سر فرمایا۔ آپ نواب جنت آرام گاہ کی تخت نشینی سے قبل دہلی میں قیام پذیر ہوئے تھے، اور مولانا فضلِ حق خیر آبادی مفتی صدر الدین خاں آزردہ، اور میرزا اسد اللہ خاں غالب سے علومِ عربی و فارسی کی تحصیل فرما چکے تھے۔ آپ کی تخت نشینی کے دو سال بعد ہندوستان نے حکومتِ انگلشیہ کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا۔ نواب فردوس مکاں نے اس موقع پر حکومت کی حمایت و ہمدردی میں بیش بہا خدمات انجام دیں، اور غدر زدہ ہو جانے پر آفت رسیدہ علما، شعرا، ادبا اور دیگر اہلِ ہنر کے لیے اپنے سایۂ عاطفت و پرورش کو وسیع فرمایا۔

نواب فردوس مکاں کے دامنِ جود و سخا میں پناہ لینے والے حضرات کی طویل فہرست میں مفتی محمد سعد اللہ مراد آبادی، میرزا اسد اللہ خاں غالب دہلوی، منشی مظفر علی خاں اسیر لکھنوی، منشی امیر احمد امیر مینائی، صاحب عالم میرزا رحیم الدین بہادر حیا دہلوی، شیخ علی بخش بیمار، میر عوض علی عدیل، بلیح آبادی خوش نویس نستعلیق، اور منشی انبا پرشاد لکھنوی داستان گو، وہ ممتاز ہستیاں ہیں، جن سے اربابِ علم و ادب بخوبی واقف ہیں۔

لیکن ان تمام صاحبانِ فضل و کمال میں، نجم الدولہ دبیر الملک میرزا اسد اللہ خاں بہادر غالب دہلوی کو یہ خصوصیت حاصل تھی کہ آغازِ سنہ ۱۸۵۷ء میں مولانا فضلِ حق خیر آبادی کی وساطت سے، نواب فردوس مکاں نے اُنھیں فنِ سخن میں اپنا مشیرِ خاص مقرر فرمایا تھا۔ ابتداءً نواب فردوس مکاں وقتی عطیات سے میرزا صاحب کی امداد فرماتے رہتے تھے۔ غدر کے بعد اُن کی پنشن بند ہو جانے پر، نواب صاحب نے جولائی سنہ ۱۸۵۹ء سے سو روپے ماہوار تنخواہ جاری فرما دی تھی، جو اُن کے انتقال کے بعد نواب خلد آشیاں کے خزانے سے ملتی رہی، اور میرزا صاحب

کی وفات پر اُن کے متبنّے حسین علی خاں شاداں کے وظیفے کی شکل میں تبدیل ہوگئی۔
اس رشتے کی بدولت سنہ ۱۸۵۷ء سے سنہ ۱۸۶۹ء تک دربارِ رامپور اور میرزا غالب کے درمیان سلسلۂ مراسلت جاری رہا۔ اس مراسلت کا معتد بہ حصّہ محکمۂ عالیۂ دارالانشا (پولیٹیکل ریکارڈس آفس) میں محفوظ تھا۔ سنہ ۱۹۳۵ء میں احقر نے اعلیٰ حضرت بندگانِ حضور پُر نور ہز ہائنس عالی جاہ، فرزندِ دلپذیرِ دولتِ انگلشیہ، مخلص الدولہ، ناصر الملک، امیر الامرا، نواب سر سید محمد رضا علی خاں بہادر، مستعد جنگ، کے سی۔ایس۔آئی، ایل ایل ڈی، ڈی لٹ، فرمانروای رامپور، دَامَ اِقبالُھُم و مُلکُھُم کی توجہ ہمایوں اس نادر و نایاب ذخیرے کی اشاعت کی طرف مبذول کرانے کی جرأت کی۔

بندگانِ اعلیٰ حضرت کی ذاتِ گرامی، اپنے آبای کرام کی طرح، سرپرستیٔ علوم و آداب میں عموماً، اور پرورشِ زبانِ اُردو میں خصوصاً، اقران و اماثل میں ممتاز ہے۔ بنا بریں حکمِ عالی نافذ ہوا کہ اس مجموعے کو باحسن وجوہ مرتب کر کے افادۂ اربابِ ذوق کے لیے شائع کر دیا جائے۔ میں نے مولوی امتیاز علی خاں عرشی، ناظمِ کتاب خانۂ رامپور کو (جن میں علمی قابلیت، ذوقِ سلیم اور علم و ادب کی علمی خدمت کے جذبات جمع ہیں، اور جن سے مجھے آیندہ کے لئے بہت بلند اور خوش آیند توقعات ہیں) اس ادبی خدمت کے انجام دینے پر مامور کیا، اور وقتاً فوقتاً مناسب ہدایات اور مشورے دیتا رہا۔ ان کی مسلسل دو سال کی سعی و جانفشانی کے بعد آج یہ مجموعہ اس قابل ہوا ہے کہ اعلیٰ حضرت شہریارِ رامپور، دام اقبالھم و ملکھم کے حضور میں اس گذارش کے ساتھ پیش کیا جا سکے کہ

لائق نبود قطرہ بعمان بردن | خار و خس صحرا بگلستان بردن
اما چہ کنم کہ رسم موری باشد | پای ملخی پیش سلیمان بردن

التجا ہے کہ یہ حقیر کوشش شرفِ قبولیت سے مفتخر کی جائے، کہ یہی اس کی قبولیتِ عامّہ کا پیش خیمہ ہوگا۔
خدا سرکار کی عمر دراز کرے، اور جاہ و جلال و اقبال زیادہ فرمائے تاکہ اس مبارک عہد میں اہم سے اہم اور زیادہ سے زیادہ علمی خدمات انجام پائیں۔ آمین:

رنگ محل پیلس، رامپور
۱۷ مارچ ۱۹۳۷ء

بشیر حسین زیدی
چیف منسٹر، رامپور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تمہید

بندگانِ ہمایونِ اعلیٰ حضرت فرمانروای رامپور، دام اقبالہم وملکہم کے حکم سے مکاتیبِ غالب کا پہلا نسخہ ۱۹۳۷ء میں شائع کیا گیا تھا۔

مرتب کا ارادہ تھا کہ ملک کے مستند نقادوں کے مشورے اور اپنی نئی معلومات کے پیشِ نظر دوسری اشاعت کو صوری و معنوی دونوں حیثیتوں سے بہتر شکل میں پیش کرے گا لیکن ابھی اس کی نوبت نہ آئی تھی کہ دنیا کی سب سے بڑی جنگ شروع ہوگئی اور چند دن کے اندر عمدہ کاغذ نایاب ہوگیا۔ اس صورتِ حال کا تقاضا تھا کہ حالات کے سازگار ہونے تک کتاب کی طباعت ملتوی کی جائے۔ حُسنِ اتفاق سے ہندوستان کی متعدد یونیورسٹیوں نے اسے اپنے اردو کے نصاب میں داخل کر لیا تھا۔ طلبا کی ضرورت مجبور کر رہی تھی کہ جلد از جلد کتاب بازار میں لائی جائے۔ آخرِ کار ذوقِ حسن طباعت پر طلبا کی ضرورت کا احساس غالب آیا، اور ۱۹۴۳ء میں دوسری بار اور ۱۹۴۵ء میں تیسری بار مکاتیب کا درسی ایڈیشن چھاپا گیا۔

گزشتہ سات برس کی مدت میں مرتب مکاتیب نے اس امر کی برابر کوشش کی تھی کہ کتاب کے داخلی محاسن کی آراستگی و پیراستگی کا عمل جاری رکھے۔ الحمدللہ کہ اس سعی میں کامیابی نصیب ہوئی اور مکاتیب کا ظاہری حسن جتنا گھٹتا گیا، باطنی اوصاف اس سے کہیں زیادہ بڑھتے چلے گئے۔ اب کہ یہ چوتھا نسخہ شائع کیا جا رہا ہے، مرتب کو اطمینان ہے کہ اس کا متن میرزا صاحب کے پسندیدہ اصول املا کے بالکل مطابق اور دیباچے اور حواشی کے مباحث پچھلی تمام طباعتوں سے

زیادہ صحیح اور مفید ہیں۔

چونکہ اس بار پچھلے دیباچے غیر ضروری جان کر حذف کر دیے گئے ہیں، اس لیے یہ ظاہر کر دینا ضروری ہے کہ کتاب میں اردوئے معلی اور عودِ ہندی کے جن نسخوں کا مطبع و سنہ کے ذکر بغیر حوالہ دیا گیا ہے، وہ بالترتیب اکمل المطابع دہلی اور مطبع مجتبائی میرٹھ سے ۱۸۶۹ء) میں چھپ کر شائع ہوئے تھے۔ ان دونوں کے دوسرے ایڈیشنوں نیز اور کتابوں کا حوالہ دیتے وقت مطبع و سنہ طباعت کا اظہار کسی ایک جگہ کر دیا گیا ہے، جس سے حوالوں کی تصدیق میں کوئی خاص زحمت و دقت نہیں ہوگی۔

پچھلی طباعتوں میں معاونین کا شکریہ نام بنام ادا کیا جا چکا ہے، لیکن جذبۂ منت پذیری کے مزید تقاضے سے مجبور ہو کر مرتب کتاب اس بار پھر اُن سب حضرات کی خدمت میں دلی شکریہ پیش کرتا ہے، جنھوں نے اپنا قیمتی وقت صرف فرما کر مفید مشورے دیے تھے۔ خدا اُنھیں جزائے خیر عطا کرے اور رامپور کے اس "دورِ رضوی" کو ہمارے لئے مزید برکت و خیر کا باعث بنائے! آمین!

کتاب خانۂ رامپور
۱۵ جنوری ۱۹۶۲ع

حقیر
امتیاز علی خاں، عرشی
ناظم کتاب خانۂ رامپور

سرگذشت غالب

آتشِ غدر سرد ہو جانے کے بعد میرزا غالب نے نواب فردوس مکاں کی خدمت میں ایک عریضہ لکھا تھا، جس کا یہاں سے جواب نہیں گیا۔ میرزا صاحب نے خیال کیا کہ شاید میری رودادِ غدر سے واقف نہ ہونے کے باعث سرکار کو شبہ ہے کہ میں بھی باغیوں کا شریکِ کار رہا ہوں، اور اس بناء پر ازراہِ احتیاط مراسلت سے احتراز فرمایا ہے۔ اس شبہے کے ازالے کے لیے ۱۴ جنوری سنہ ۱۸۵۸ء کو انھوں نے دوسرا عریضہ ارسال کیا، اور اس میں اپنے انگریزی روابط، حقیقتِ تعلقِ قلعہ اور ایامِ غدر میں اپنی گوشہ گیری کے تذکرے سے پہلے سرکار کو لکھا:

"ہر آئینہ در دل چنان گزشت کہ درین بار بدا فسانِ سخن سرای توان گفت کہ سرگزشتِ من از ولیِ نعمت نہان و حجابی درمیان نماند۔"[1]

میرزا صاحب کی اس توجیہ کے پیشِ نظر میں نے بھی مناسب خیال کیا کہ کم از کم وہ حالات جنھیں خود میرزا صاحب اس عریضے یا دیگر عرائض و مکاتیبِ رامپور کے ذریعے سے نواب فردوس مکاں، نواب خلد آشیاں، یا وابستگانِ دربار کے علم میں لانا ضروری سمجھتے تھے، چند ضروری اضافوں کے ساتھ آغازِ مکاتیب میں شامل کر دوں۔

نام تخلص اور خطاب

میرزا صاحب کا نام اسد اللہ خاں، عرف میرزا نوشہ، تخلص غالب اور "نجم الدولہ، دبیر الملک، نظام جنگ" خطاب تھا۔[2]

۱۔ مکاتیب: ۸۔ ۲۔ مکاتیب: ۴، ۱۰، ۱۳، ۱۴، ۵۲

پیدائش اور یتیمی

میرزا صاحب آگرے میں ۸ رجب سنہ ۱۲۱۲ھ (۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء) کو پیدا ہوئے[۱]۔ ان کے والد عبد اللہ بیگ خاں ۱۸۰۲ء میں راج گڑھ کی جنگ میں گولی کا زخم کھا کر انتقال کر گئے، تو چچا نے اپنا بیٹا بنا لیا اور بڑے ناز و نعم سے ان کی پرورش شروع کر دی۔ میرزا صاحب فرماتے ہیں:

"در پنج سالگی پدرم عبد اللہ بیگ خاں بہادر را ... چراغِ ہستی فرو مرد۔ گرامی آذرِ من .... مرا بپسرِ خواند و بناز پرورد"[۲]

نسبی خاندان۔ چچا

میرزا صاحب کے چچا نصر اللہ بیگ خاں بہادر چار سو سواروں کے رسالے کے افسر تھے۔ اُنھوں نے جنرل لارڈ لیک بہادر کے ماتحت گرانقدر فوجی خدمات انجام دی تھیں۔ جب سنہ ۱۸۰۵ء میں سونک سونسا (متصل آگرہ) کا پرگنہ انگریزی قبضہ و تصرف میں آیا،[۳] تو لارڈ صاحب کی سفارش پر حکومت نے یہ پرگنہ بقیدِ حینِ حیات اُن کی جاگیر میں دیدیا۔ ابھی اس عطیے سے اچھی طرح فائدہ اُٹھانے نہ پائے تھے کہ سنہ ۱۸۰۶ء میں نصر اللہ بیگ خاں کا یکایک انتقال ہو گیا۔ گورنمنٹ نے جاگیر واپس لے کر اُن کے ورثا کی پنشن مقرر کر دی۔ میرزا صاحب کو زرِ پنشن ابتداءً ریاستِ فیروز پور جھرکہ کے خزانے سے اور بعد ازاں غدر تک خزانۂ کلکٹری دہلی سے ملتا رہا۔ خود فرماتے ہیں:

۱- مکاتیب: ۸۰، اردوی: ۳۹۹، عود: ۶۹ (۲)، دستنبو: ۲۶ میرزا صاحب نے ۱۲۲ اکتوبر ۱۸۶۶ء کو لکھا ہو کہ میرا ہم قوم تو سراسر قلمرو ہند میں نہیں۔ سمرقند میں دو چار یا دشت خفچاق میں سو دو سو ہوں گے۔ مگر ان اقربا بھی پانچ برس کی عمر سے ان کے دام میں اسیر ہوں ۶۵ برس ستم اُٹھائے ہیں۔ (خطوط: ۱: ۱۴۰) اس میں بھی پانچ برس کی عمر میں چچا اور چچی کی پرورش میں آنے کی طرف اشارہ ہے۔ چونکہ ان کی چچی نواب احمد بخش خاں کی حقیقی بہن تھیں، اس لیے میرزا صاحب کی بیوی کی حقیقی پھپھی اور اقربا ہی بھی میں شامل ہوئیں (۳) تاریخ سلطنتِ انگلشیہ: ۸۰۵ طبع مرادآباد سنہ ۱۸۷۶ء خود میرزا صاحب نے یہ بتایا ہے کہ نصر اللہ بیگ خاں نے اپنے زورِ بازو سے سونک سونسا کے پرگنے بھرت پور کے زیب ہلکر کے سواروں سے چھینے تھے۔ جرنیل صاحب نے وہ دونوں پرگنے خانِ موصوف کو بطریقِ استمرار عطا فرمائے۔ مگر جاگیر مقرر ہونے کے دس مہینے بعد مرگِ ناگہانی یعنی سے گر کر مر گئے۔ جاگیر سرکار میں باز یافت ہوئی اور اس کے عوض نقدی مقرر ہو گئی۔ غالب: ۱۹ طبع سوم

"حالی رای جہان آرا لی باد کہ دیرینہ نمک خوارِ سرکارِ انگریزم۔ و از سرآغازِ سالِ یکہزار و ہشت صد و شش کہ در آنگاہ شمارِ سنینِ عمرِ من از دہ نگزشتہ بود، بعوضِ جاگیرِ عمِ حقیقی نسبی خود، نصر اللہ بیگ خاں بہادر کہ با جمعیتِ رسالۂ چہار صد سوار بمعیتِ جرنیل لارڈ لیک بہادر در فتحِ ہندوستان کوششہای شایان کردہ، و پرگنہ سونک سونسا بتقید حینِ حیات جاگیر یافتہ، و ہم دران عہد برگِ ناگاہ از جہان رفتہ بود، بفرمانِ جرنیل لارڈ لیک بہادر و منظوریِ گورنمنٹ مشتِ زری شاملِ جاگیرِ عم سبطی من نواب احمد بخش خان بہادر، در وجہِ معاشِ من منجملۂ زرِ استمراری سرکاری کہ بذمۂ احمد بخش خان بہرِ دوام واجب الادا بود، قرار یافت" ۱

چچا کے انتقال کے بعد میرزا صاحب کے سرپرست اُن کے نانا خواجہ غلام حسین خاں کمیدان رہے، جو آگرے کے ایک عالی خاندان رئیس تھے۔

حقیقی بھائی

میرزا صاحب تین بھائی بہن تھے۔ ان میں بہن، چھوٹی خانم اُن سے بڑی اور بھائی میرزا یوسف بیگ خاں، چھوٹے تھے۔ بھائی کے بارے میں فرماتے ہیں:

"بہرحال دو امر ہنوز مبہم ہیں: ایک اس انگریزی تحریر کا حال، اور دوسرے میرے بھائی کے جنون کی حقیقت"۔ ۲

میرزا یوسف بیگ خاں نے ۱۹ صفر سنہ ۱۲۷۴ھ (۱۹ اکتوبر سنہ ۱۸۵۷ء) کو بحالتِ دیوانگی دلّی میں انتقال کیا۔

بیبی خاندان۔ بی بی

میرزا صاحب کی بی بی امراؤ بیگم، نواب الٰہی بخش خاں معروف کی بیٹی اور نواب احمد بخش خاں، والیِ فیروز پور جھرکہ (جاگیردارِ لوہارو) کی، بھتیجی تھیں۔ یہ ۸ رجب سنہ ۱۲۲۵ھ (۱۸۱۰ء) کو میرزا صاحب کے عقد میں آئیں، اور اُن کے

۱۔ مکاتیب: ۸ (۲)، یادگارِ غالب: ۱۰، غالب ۲۲ بحوالۂ اردوئے معلیٰ (۳) مکاتیب: ۱۰

۲۔ کلیاتِ نثرِ فارسی: ۲۶۹

بعد تک زندہ رہیں۔ نواب فردوس مکاں کی مزاج پرسی کے ایک خط میں میرزا صاحب نے ان کا ذکر کیا ہے، فرماتے ہیں:

"جب سے حضرت کی ناسازیِ مزاجِ مبارک کا حال خارج سے مسموع ہوا ہے، عالم الغیب گواہ ہے کہ مجھ پر اور میری بی بی پر.. کیا گزر رہی ہے"۱

میرزا صاحب کے انتقال کے بعد، امراؤ بیگم نے اپنی مالی مصیبت کا سارا کچا چٹھا لکھ کر کمشنرِ دہلی سے درخواست کی تھی کہ میرزا صاحب کی پنشن حسین علی خاں پسرِ متبنیٰ کے اور میرے نام منتقل کر دیجائے۔ ڈپٹی کمشنر کی ہمدردانہ رپورٹ کے باوجود کمشنرِ دہلی نے جواب دیا کہ متبنیٰ بیٹے کے نام پنشن کسی طرح جاری نہیں ہوسکتی۔ البتہ بیوہ کچہری میں حاضر ہو، تو اُس کے نام دس رُپے ماہوار وظیفہ مقرر کردیا جائیگا اس باغیرت بی بی نے کچہری کی حاضری کو گوارا نہ کیا، اور دس رُپے ماہوار کے وظیفے سے انکار کردیا۔

حسین علی خاں نے ۱۲ جون سنہ ۱۸۶۹ء کو نواب خلد آشیاں کی خدمت میں ایک عریضہ ارسال کیا تھا۔ اُس میں میرزا صاحب کے قرض کی ادائگی کی درخواست اور اپنے حاضر نہ ہوسکنے کے عذر کے بعد، بیگمِ غالب کی درخواست پنشن کے بارے میں لکھتے ہیں:

"پنشنِ سرکارِ انگریزی کی یہ صورت ہوئی کہ ہنگامِ ثبوت وتحقیقِ مفلسی وبقیدری وقرضداری ڈپٹی کمشنر صاحب نے رپورٹ اچھی کی۔ اُس پر کمشنر بہادر نے حکم دیا کہ پسرِ متبنیٰ کی پنشن نہیں ہوسکتی۔ ہاں، زوجہ کے واسطے مبلغ دس روپے تجویز ہوں گے۔ جناب دادی صاحبہ نے دس روپے نامنظور رکیے۔ یہ امید بھی جاتی رہی"۲

اس عرضی کے آخر میں، بیگم صاحبہ کی طرف سے لکھا گیا تھا:۳

"اور جانب امراؤ بیگم (سے) بعدِ کورنش تو بندہ مضمونِ رضتی ہذا گزارش ہے۔

۱- مکاتیب: ۲۷ (۲)، مسل ۱۶۹، صیغۂ احباب، عہدِ نواب خلد آشیاں محافظ خانہ دار الانشا۔
۳- امراؤ بیگم کی یہ تحریریں ان کی دستخطی نہیں، حسین علی خاں کے قلم کی معلوم ہوتی ہیں۔

کمترینہ اول بعمرِ ہفتاد سالہ حرکت و نقلِ مکان سے معذور، اور سوائے اُس کے صدمۂ انتقالِ شوہر اور ہجومِ قرض خواہان سے اور معیشتِ آیندہ سے مجبور ہوں بہ سبب عدت کے خانے سے باہر نہیں نکل سکتی۔ بدیں وجہ مانعِ حضوری ہے اور سوائے درِ دولت کے کوئی ملجا و ماوا نظر نہیں آتا۔ حضور کو دستگیری مجھ بیکسہ عاجزہ کی واجب ہے۔ اور یہ ارادہ ہے کہ بعد انقضائے مدتِ عدت خدمت میں حاضر ہوں، اور وہیں انفاسِ بقیہ کو گزاروں۔ اب نانِ شبینہ کو محتاج ہوں۔ چارہ اس کا بجز بندگانِ عالی کے ممکن نہیں۔ رحم فرمائیے اور خبرگیری کیجیے، کہ بدعاگوئی دولتِ ابد مدت مشغول رہوں۔

مہر: امراؤ بیگم بنتِ الٰہی بخش خاں - ۱۲۴۱ "

۲۲ ربیع الثانی سنہ ۱۲۸۶ھ (۲ اگست سنہ ۱۸۶۹ء) کو بیگم صاحبہ نے پھر نواب خلد آشیاں کو لکھا:

"جنابِ عالی، جس روز سے مرزا اسداللہ خاں غالب نے وفات پائی ہے تو یہ عاجزہ بیوہ اس قدر مصائب میں گرفتار ہے کہ تحریر سے باہر ہے۔ اول تو یہ مصیبت ہے کہ مرزا صاحب مرحوم آٹھ سو روپیے کے قرضدار مرے۔ دوسری مصیبت یہ کہ پنشنِ انگریزی مسدود ہوئی۔ تیسری یہ کہ تنخواہ سو روپیے ماہوار، جو آپ ازراہ قدردانی کے مرزا مرحوم کو ارسال فرماتے تھے، وہ بھی یکلخت موقوف ہوئی۔ اب تک قرض لیکر اوقات بسری کی۔ اب قرض بھی نہیں ملتا نوبت فاقہ کشی کی پہنچی۔ اس حالتِ حیرانی اور پریشانی میں پھر یہی خیال آیا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارا وسیلہ پرورش اور اوقات گزاری کا اس دنیا میں آپ کی ذاتِ بابرکات کو بنایا ہے، اور سوائے آپ کی ذاتِ بابرکات کے دوسرا کوئی نظر نہ آیا۔ لاچار برخوردار حسین علی خاں کو آپ کے قدموں پر لا ڈالا۔ آپ نے بسبب شرفا پروری اور اقتضائے مروت اور فتوت کے اُس قدر اوپر حال برخوردار کے عنایت فرمائی ہے کہ بیان سے

باہر ہے۔ اب دعاگو کی یہ تمنا ہے کہ ایسی پرورش مجھ ضعیفہ کی ہو جائے کہ مرزا مرحوم حقِ عباد سے بری ہو جائیں، کہ یہ سخت عذاب ہے۔ اگر حضور صورتِ ادائی قرض فرما دیں، تو کمالِ ثوابِ عظیم ہو گا۔ اور اگر دفعۃً صورتِ ادائی قرض مناسب رائی بیضا ضیا کے نہ ہو، تو یہ تنخواہ ششماہی کی بحساب فی ماہ صد روپیہ بالفعل مجھ بیوہ کو عنایت ہو جائے۔ باقی ۶ ۱۵ اور بحال بدِ مذکورۂ بالا مرحمت ہو جائیں، تاکہ میں بیوہ قرض مرزا صاحب کا ادا کر دوں اور ظاہر الیقین ہے کہ زندگی میری بھی اسی میعاد میں پوری ہو جائے گی۔ اور یہ احسان کرنا مجھ پر فی سبیل اللہ ہے، کیونکہ میں بیوہ ضعیفہ اور بیکس ہوں۔ اتنی عنایت سے آپ کی زندگی میری بسر ہو جائے گی۔ اور پنشن میری دس روپیہ انگریز کرتا ہے، بشرطیکہ کچہری میں حاضر ہوں۔ اور جانا میرا کچہری میں ہرگز نہ ہو گا، گو فاقوں سے مر جاؤں۔ کیا میں اپنے باپ اور چچا اور شوہر کا نام روشن کروں؟ اور جو عزت اور ریاست میرے چچا کی اور حرمت میرے والد کی اور شوہر کی آگے خاص و عام کے بلکہ حضور پر سب روشن ہے۔ حاجت بیان کی نہیں ہے۔"[1]

اس عریضے پر بھی سرکار نے کوئی حکم نہ دیا، تو ۲۴ جمادی الاولیٰ سنہ ۱۲۸۶ھ (۲ دسمبر ۱۸۶۹ء) کو بیگم صاحبہ نے مکرر درخواستِ پرورش پیش کی۔ اس کا مضمون تقریباً سابق درخواست کے مطابق ہے، اس لیے اعادہ مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ البتہ اس عرضی کے لفافے پر میر منشی صاحب کا یہ نوٹ ہے:

"پیش نمودہ شد۔ حکم نفاذ یافت کہ درین خصوص بہ نواب مرزا خان فہمائش و ہدایت بعمل آمد۔ ۹ ستمبر سنہ ۱۸۶۹ء"[2]

۱- مثل ۲۵۴، صیغۂ مذکورہ۔ ذکر غالب (ص ۵۰)، سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد بھی انگریزی پنشن کے بارے میں کوشش جاری رہی، تاآنکہ فروری ۱۸۷۰ء سے قبل اجرائی پنشن کا حکم آگیا، مگر ابھی اس کے لینے کی نوبت نہیں آئی تھی کہ بیگم صاحبہ کا انتقال ہو گیا۔ (۲) مثل ۴۳۶، صیغۂ مذکورہ۔

غالباً یہ ہدایت مزید تحقیق و تصدیق کے متعلق ہوگی، اس لیے کہ اس نوٹ کے ایک مہینہ اور اکیس دن کے بعد ۳۰ اکتوبر سنہ ۱۸۶۹ء کو سرکار نے ادائی قرض کا حکم دیدیا اور اس حکم پر ۸ نومبر سنہ ۱۸۶۹ء کو ۶ سو روپے کی ہنڈوی رام کشن داس کی دکان سے حکیم غلام نجف خاں کی معرفت میرزا صاحب کی بیوی کو بھیجدی گئی۔[1]

اس کے بعد بیگم غالب کی ایک اور درخواست شعبان سنہ ۱۲۸۶ھ (نومبر ۶۹ء) میں آئی تھی۔ مثل میں صرف لفافہ شامل ہے اس بنا پر مضمونِ عرضی کے متعلق صرف قیاساً کہا جا سکتا ہے کہ ادائی قرض کے شکریے پر مشتمل ہوگی۔

امراؤ بیگم نے نواب خلد آشیاں کو جو پیشین گوئی لکھی تھی، وہ تقریباً سچی نکلی، یعنی میرزا صاحب کی برسی کے دن ۲ ذیقعدہ سنہ ۱۲۸۶ھ (۴ فروری ۱۸۷۰ء) کو اُن کا انتقال ہوگیا۔[2]

بی بی کے چچا اور بھائی

نواب احمد بخش خاں بہادر، والیٔ فیروز پور جھرکہ و جاگیر دارِ لوہارو، میرزا صاحب کی بی بی کے حقیقی چچا تھے۔ حکومتِ انگریزی میں اُن کی بڑی عزت اور منزلت تھی۔ آخر سنہ ۱۸۲۲ء میں اپنے بڑے بیٹے، نواب شمس الدین احمد خاں کو فیروز پور کی حکومت اور نواب امین الدین احمد خاں بہادر اور نواب ضیاء الدین احمد خاں بہادر نیّر کو لوہارو کی جاگیر دے کر خود اپنی حویلی واقع قطب صاحب میں گوشہ گیر ہو گئے تھے۔[3] نواب شمس الدین احمد خاں، جو میواتن کے بطن سے تھے، اپنے مختلف البطن بھائیوں سے خوشگوار تعلقات نہ رکھ سکے۔ خاندان کے دوسرے افراد بھی غالباً اپنی نسبی برتری کا مظاہرہ کرتے ہوں گے، جن میں میرزا صاحب کو نمایاں ہونا چاہیے۔ شاید یہی باعث تھا کہ ان سے بھی تعلقات اچھے نہ تھے۔ جب اُنھیں ولیم فریزر، ریزیڈنٹ دہلی، کے قتل کے الزام میں پھانسی دی گئی، تو میرزا صاحب نے اسے کیفر کردار قرار دیا۔ چنانچہ اپنی سرگزشت میں

۱- آوارہ جٓہ آمد و صرف ریاست سنہ ۱۸۶۹ء (۲) ذکرِ غالب: ۵۰، (۳) غالب: ۲۵، نمونہ: ذکرِ رخشاں۔

اس طرف اشارہ بھی کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

بفرمانِ جرنیل لارڈ لیک بہادر و منظوری گورنمنٹ مشتب زری شانزدہ گیر عم سبش من، نواب احمد بخش خاں بہادر، در وجہِ معاشِ من قرار یافت. چون جانشینِ احمد بخش خان کیفرِ کردار یافت و جاگیرِ سرکار باز یافت شد، رسیدِ من آن وجہِ مقرری از خزانۂ کلکٹریِ دہلی صورت پذیرفت۔[1]

نواب احمد بخش خاں نے ربیع الاول سنہ ۱۲۴۳ھ (۱۸۲۷ء) میں اس دارِ فانی سے کوچ کیا، اور نواب شمس الدین احمد خاں بہادر کو ۸ اکتوبر سنہ ۱۸۳۵ء کو صبح کے وقت کشمیری دروازے کے باہر پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔[2]

بی بی کے پوتے۔ باقر علی خاں

امراؤ بیگم کے سات بچے ہوئے، لیکن کسی نے پندرہ مہینے سے زیادہ عمر نہ پائی۔ نواب زین العابدین خاں عارف، امراؤ بیگم کے حقیقی بھانجے، اور میرزا صاحب کے شاگردِ رشید، سنہ ۱۸۵۲ء میں دو خردسال بچے چھوڑ کر انتقال کر گئے۔ میرزا صاحب نے ان دونوں کو متبنّیٰ کر لیا۔ خود فرماتے ہیں:

"کما بیش پنج سالست کہ دو کودکِ بی مادر و بی پدر رہم اند و دو آن زن کہ خونِ منش گردن، بفرزندی برداشتہ ام"[3]

ان میں بڑے باقر علی خاں تھے، جو والد کے انتقال کے بعد کچھ عرصے تک اپنی دادی بنیادی بیگم کے پاس رہ کر ان کے بعد میرزا صاحب کے یہاں چلے آئے تھے۔

میرزا صاحب اکتوبر سنہ ۱۸۶۱ء میں درد قولنج میں مبتلا ہونے سے بید کمزور ہو گئے تھے، جس کا ۱۱ نومبر ۱۸۶۱ء کے عریضے میں ذکر بھی کیا ہے۔ اپنی بیماری کے پیشِ نظر انھوں نے نواب فردوس مکاں سے درخواست کی کہ میرے بیٹے کے لیے تنخواہ مقرر کر دی جائے۔ سرکار نے ۲۳ اپریل سنہ ۱۸۶۲ء کو اس کے جواب میں تحریر فرمایا:

۱۔ مکاتیب: ۸ (۲) ذکرِ غالب: ۲۷ و ۲۸ نیز ملاحظہ ہو حاشیہ ۹ مشمولہ مکاتیب (۳) دستنبو: ۲۷

"ہر چند مخلص را پرورش و مراعاتِ صاحبزادۂ آن کرم فرما بدل ملحوظ و
مرکوز، الا دستور این سرکار بعنوانِ مرقومۂ سامی نبوده است "۱

اس سے صاحبزادے کا نام نہیں معلوم ہوتا، مگر قیاس یہ ہے کہ باقر علی خاں مراد ہیں، جن کی عمر اس وقت چودہ سال کی تھی۔

میرزا صاحب نے باقر علی خاں کی پرورش کی، پڑھایا لکھایا، اور جب جوان ہوگئے تو ڈھائی ہزار روپے لگا کر نواب ضیاء الدین خاں بہادر کی صاحبزادی سے شادی کر دی۔ نواب خلد آشیاں کو شادی کے مصارف کے متعلق لکھا ہے:

"باقر علی خاں کی شادی نواب ضیاء الدین خاں کے ہاں ہوئی۔ انھوں نے
کھانے جوڑے کے دو ہزار روپے دیے، اور میری زوجہ نے پانسو روپے
کا زیور لگا کر پچیس سو روپے صرف کیے "۲

باقر علی خاں شاعر تھے، اور کامل تخلص کرتے تھے۔ مرزا قربان علی بیگ سالک شاگردِ غالب، سے مشورۂ سخن تھا۔ ۲۹ ویں برس میں یکم جمادی الاولیٰ سنہ ۱۲۹۳ھ (۲۵ مئی ۱۸۷۶ء) کو انھوں نے انتقال کیا۔[۳]

حسین علی خاں

عارف کے چھوٹے بیٹے، حسین علی خاں تھے میرزا صاحب نے فردوس مکاں کی مزاج پرسی کے پہلے خط میں ان کو اپنا فرزند لکھا ہے۔ فرماتے ہیں:

"جب سے حضرت کی ناسازیٔ مزاجِ مبارک کا حال سامع سے مسموع ہوا
ہے، عالم الغیب گواہ ہے کہ مجھ پر۔۔۔۔۔ اور میرے فرزند حسین علی خاں
پر کیا گزر رہی ہے "۴

خود حسین علی خاں نے بھی نواب خلد آشیاں کی خدمت میں ۱۲ جون ۱۸۶۹ء کو جو عریضہ تحریر کیا تھا، اس میں اپنے نام کے بعد "پسرِ متبنّیٰ مرزا اسد اللہ خاں

۱۔ مثل نمبر ۴، صحیفۂ احبابِ عہدِ فردوس مکاں، میرزا صاحب کا خط مثل میں محفوظ نہیں ہے (۲) مکاتیب: ۴۲
۳۔ تاریخ لطیف قلمی ۱۹۱۱ و دیوانِ سالک: ۲۹۳، و ذکرِ غالب: ۲۷۔ و تقانِ دہلی (۴) مکاتیب: ۲۷

غالب، لکھا ہے۔ اسی عریضے میں یہ بھی درج ہے کہ کمشنر نے پسرِ متبنّٰی کے نام میرزا صاحب کی پنشن جاری کرنے سے انکار کر دیا۔ گویا مذکورۂ بالا حاکم کی عدالت میں بھی حسین علی خاں، کو میرزا صاحب کا متبنّٰی ظاہر کیا گیا تھا۔

میرزا صاحب نے آغازِ سنہ ۶۶ء میں نواب خلد آشیاں سے ان کی تنخواہ کی استدعا کی تھی۔ مگر یہاں سے خلافِ مدعا جواب دیا گیا۔[1] پھر ۱۹ اگست ۱۸۶۶ء کو اُن کی منگنی کے بارے میں لکھا:

"آپ کے غلامِ زرخرید، یعنی حسین علی خاں کی منگنی ہو گئی، اور اپنے کنبے میں ہوئی، یعنی نواب احمد بخش خاں مرحوم کے حقیقی بھائی کی پوتی سے، اور رجب کا مہینا قرار پایا۔ اب میرے بڑھاپے اور میری مفلسی کی شرم آپ کے ہاتھ ہے۔"[2]

سرکار نے جواباً تحریر فرمایا کہ آپ کی تحریر مجمل ہے، "خلاصۂ مکنونِ خاطر" تحریر فرمائیے۔ اس کے جواب میں میرزا صاحب نے ۵ ستمبر کو لکھا:

"مجملاً یہ کہ میں درِ دولت کا گدای خاک نشین اور وہ آپ کا غلام۔ تفصیل یہ کہ میرے پاس نقد، جنس، اسباب، املاک، اور میرے گھر میں زیور، زرینہ وسیمینہ کا نام و نشان نہیں۔ بہت اُدھار قرض کوئی دیتا نہیں۔ آپ روپیہ عنایت فرمائیں، تا یہ کام سرانجام پائے۔ اور بوڑھے فقیر کی برادری میں شرم رہ جائے۔ دوسری بات یہ کہ سو روپے آپ کی سرکار سے بطریقِ خیرات اور باسٹھ روپے آٹھ آنے مہینا انگریزی سرکار سے بعوض جاگیر پاتا ہوں۔ عالم الغیب جانتا ہے کہ اس میں میرا بڑی مشکل سے گزارا ہوتا ہے۔ بہو کو کہاں سے کھلاؤں گا؟ حسین علی خاں کی کچھ تنخواہ مقرر ہو جائے۔ لیکن توقیعِ تنخواہ اُس کے نام جاری نہ ہو، بلکہ اُس کی زوجہ، حسن جہاں بیگم بنتِ اکبر علی خاں، کے نام وہ تنخواہ مقرر ہو، اور اُس کی مہری رسید سے ملا کرے۔

۱- مکاتیب: ۵۰ (۲) ایضاً: ۶۲

زرِ مہر بہ شادی کی مقدار اور تنخواہ کی مقدار جو خداوند کی بہت اور اس کنگال اپاہج کی قسمت ہے۔۱

سرکار نے ارقام فرمایا کہ مابدولت کو بربنای موانست و اتحادِ قدیمہ آپ کی خوشنودی مدِ خاطر ہدِ نظر ہے۔ آپ مصارف کی مقدار لکھیے، تاکہ حکم مناسب دیا جائے۔ اس کے جواب میں میرزا صاحب نے ۲۳ ستمبر کو تحریر کیا:

"باقر علی خاں کی شادی نواب ضیاء الدین خاں کے ہاں ہوئی۔ مُنھ دکھانے جوڑے کے دو ہزار روپیے دیے اور میری زوجہ نے پانسو روپے کا زیور لگا کر پچیس سو روپے صرف کیے۔ حسین علی خاں کا سُسرا، یعنی اکبر علی خاں، اپنے خاندان کا ہے۔ لیکن امیر نہیں، نوکری پیشہ ہے۔ اب یہ میں کیونکر عرض کروں کہ مجھے کیا دو؟ سائل ہوں، یہ رسم نہیں کہ سائل مقدارِ سوال عرض کرے۔ حالِ مصارفِ شادی خاندان لکھ دیا۔ دو ڈھائی ہزار میں شادی اچھی ہو جائے گی لیکن یہ بھی ساتھ عرض کرتا ہوں کہ میرا حق خدمت اتنا نہیں کہ اس قدر مانگ سکوں۔ جو کچھ دو گے اُس میں شادی کر دوں گا۔"۲

سوءِ اتفاق سے اکتوبر میں سرکار کا مزاج ناساز رہا۔ اور میرزا صاحب یاددہانی نہ کر سکے۔ البتہ زمین ہموار کرنے کے خیال سے ایک مدحیہ قطعہ نومبر کو ارسال کر دیا تھا۔ اس پر بھی کار برآری نہ ہوئی اور رجب کی ۱۱ تاریخ آ پہنچی تو ہنڈوی کی رسید میں قرض کا دُکھڑا رو کر لکھا:

"پیر و مرشد! رجب کا مہینا چلا۔ حسین علی خاں کی سسرال سے شادی کا تقاضا ہے۔ اِدھر سے بجز سکوت جواب نہیں۔"۳

اِس عریضے کا سرکار کی جانب سے کوئی جواب نہ گیا، اور رجب میں شادی ملتوی ہو گئی۔ میرزا صاحب نے ۲ رمضان سنہ ۱۲۸۴ھ (۲۹ دسمبر سنہ ۱۸۶۷ء) کو تحریر کیا:

۱۔ مکاتیب: ۳ے، (۲) ایضاً: ۴ے، (۳) ایضاً: ۷ے

"ماہِ صیام میں سلاطین و امرا خیرات کرتے ہیں۔ اگر حسین علی خاں یتیم کی شادی اسی مہینے میں ہو جائے اور اس بوڑھے اپاہج فقیر کو روپیہ ملجائے تو اس مہینے میں تیاری ہو رہے، اور شوال میں رسم نکاح عمل میں آئے۔ اور چونکہ اس ماہِ مبارک میں درِ فیض باز اور سالِ انگریزی کا بھی آغاز ہے، وہ پچیس روپیہ مہینا، جو زبانِ مبارک سے نکلا ہے، جنوری سنہ ۱۸۶۸ء سے بنامِ حسین علی خاں مذکور جاری ہو جائے، تو مجھے گویا دونوں جہان مل گئے۔"[1]

لیکن جواب کے انتظار میں ذیقعدہ آپہنچا، تو میرزا صاحب نے ۹ مارچ سنہ ۱۸۶۸ء کو لکھا:

"مرزا حسین علی خاں کی شادی رجب کے مہینے میں قرار پائی تھی۔ عطیہ حضور کے نہ پہنچنے کے سبب ملتوی رہی۔ آج جو ذیقعدہ کی ۱۵ ہے، ۱۵ دن یہ اور مہینا ذی الحجہ کا۔ اگر اسی ذیقعدہ کے مہینے میں کچھ حضرت عطا فرمائیں گے تو آخرِ ذی الحجہ تک نکاح ہو جائے گا۔ خدا کرے، خداوند کے ضمیر میں یہ بھی گزرے کہ غالب جب بیاہ لائے گا، تو اس کو روٹی کہاں سے کھلائے گا! غرض اس سے یہ کہ حسین علی خاں کی تنخواہ جاری ہو جائے۔"[2]

سرکار نے یہ درخواست منظور فرمالی، اور آمدِ زمستاں تک شادی سے فراغت کی امید ہو گئی۔ نواب مرزا خاں داغ دہلوی، اور حکیم مظفر حسین خاں بہادر لکھنوی نے علی الترتیب میرزا صاحب کو قبولِ التماس کی اطلاع دی۔ اس کی توثیق، نیز مکرر یاددہانی کی خاطر میرزا صاحب نے ۱۳ اگست سنہ ۱۸۶۸ء کو لکھا:

"تین التماسیں سابق پیش ہوئی تھیں۔ سواب پہلے برخوردار نواب مرزا خاں کی تحریر سے اور پھر جناب مظفر حسین خاں بہادر کے خط سے اُن خواہشوں کے منظور و مقبول ہونے کی نوید پائی۔ انشاء اللہ الکریم حسبِ ارشادِ حضور اسی برس ۶۸ میں، آمدِ زمستاں یعنی نومبر و دسمبر میں میرا قرض بھی ادا

---

۱ مکاتیب: ۸، (۲) ایضاً: ۹۔

ہو جائے۔۔۔۔ علی خاں کی شادی بھی ہو جائے گی، اور اُس کے واسطے اُس کی زندگی تک تنخواہ جداگانہ مقرر ہو جائے گی۔"[1]

اِس عرصے میں حسین علی خاں کی سسرال سے شادی کا سخت تقاضا شروع ہوگیا۔ میرزا صاحب نے مجبور ہو کر، ستمبر کو پھر عرض کیا:

"پیر و مرشد، حسین علی خاں کے سسرال والوں کا بڑا تقاضا ہے۔ زندگی مشکل ہو گئی ہے۔ بطریقِ "شیئاً للہ" سوال مختصر یہ ہے کہ جو حضرت کے مزاج میں آوے، وہ عطا کیجیے، اور حسین علی خاں کے نام جداگانہ تنخواہ مقرر کر دیجیے؛ لیکن یہ دونوں امر جلد صورت پکڑ جائیں۔"[2]

سرکار نے ابھی اس کا جواب تحریر نہیں فرمایا تھا کہ میرزا صاحب پر قرضخواہوں کا تقاضا ہونے لگا، اور شادی کی خوشی کے حصول سے قبل قرض کے غم کا رفع کرنا ضروری ہوگیا۔ ادائی قرض کی سبیل صرف سرکارِ رامپور کا عطیہ تھا۔ بنا برین ۱۶ نومبر کو میرزا صاحب نے بحالتِ اضطرار لکھا:

"حال میرا تباہ ہوتے ہوتے اب یہ نوبت پہنچی کہ اب کے تنخواہ میں سے ۵۴ روپیہ بچے۔ ۶۳ روپیے کا چٹھا ماہوار کا، سود سہ ماہہ دینا بھلا آٹھ سو روپیے ہوں، تو میری آبرو بچتی ہے۔ ناچار حسین علی خاں کی شادی اور اُس کے نام کی تنخواہ سے قطعِ نظر کی۔ اب اس باب میں عرض کروں کیا مجال، کبھی نہ کہوں گا۔ آٹھ سو روپیے مجھ کو اور دیجیے۔ شادی کیسی؟ میری آبرو بچ جائے تو غنیمت ہے۔"[3]

میرزا صاحب مرتے دم تک اپنے اس عہد پر قائم رہے۔ آخری عریضے میں بھی، جو ۱۰ جنوری سنہ ۱۸۶۹ء کو تحریر کیا تھا، حسین علی خاں کی شادی کا ذکر نہیں کیا، اور یہ ارمان ساتھ لے کر دنیا سے رخصت ہوگئے۔

حسین علی خاں نے اُن کے انتقال کے ایک مہینے بعد، ۱۷ مارچ سنہ ۱۸۶۹ء

۱- مکاتیب: ۸۱ (۲) ایضاً: ۸۲ (۳) ایضاً: ۸۳ (۴) ایضاً: ۸۴

کو اپنے تقررِ تنخواہ کی درخواست بھیجی۔ بعد ازاں ۱۲ جون کے عریضے میں پھر اپنی خواہشِ وظیفہ کا اعادہ کیا، اور یہ بھی عرض کیا کہ فدوی بیمار رہے، اس لیے حاضرِ خدمت نہیں ہو سکتا۔ صحت کے بعد قدمبوسی کی سعادت حاصل کرے گا۔

امراؤ بیگم کے ۲۲ ربیع الثانی سنہ ۱۲۸۶ھ (۲ اگست سنہ ۱۸۶۹ء) کے محولۂ بالا عریضے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُس وقت تک حسین علی خاں ملازم ہو چکے تھے لیکن ابھی اُن کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ حسین علی خاں نے رامپور سے دلّی واپس جاکر ۲۱ فروری سنہ ۱۸۷۰ء کو ایک خط منشی سیلچند صاحب کو لکھا تھا۔ اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ حسین علی خاں اگست سنہ ۱۸۶۹ء کے بعد رامپور آکر فروری ۱۸۷۰ء میں میرزا صاحب کی برسی کی فاتحہ کے لیے رخصت سے کر دلّی گئے، تو سُسرال والوں نے شادی کا تقاضا کیا۔ چونکہ سرکارِ رامپور سے پچیس رُپے ماہوار اُن کی تنخواہ مقرر ہوئی تھی، اور ملازمت پر صرف ۶ مہینے گزرنے کے باعث کچھ پس انداز ہو نہ سکا تھا، اس لیے جداگانہ عریضے میں سرکار سے مصارفِ شادی عطا فرمانے کی درخواست کی تھی، اور منشی صاحب سے خواہش کی تھی کہ اس کام میں کوشش کریں: "یقین تو ہے کہ حضور، دام اقبالہٗ، بیس رحم فرما کر کچھ عنایت فرمائیں گے۔ آگے مقدر۔"

اس کے بعد شادی سے متعلق کوئی تحریر نہیں ملتی، اس لیے نہیں کہا جا سکتا کہ سنہ ۱۸۷۰ء میں حسین علی خاں کی شادی ہوئی، تو ریاست کی طرف سے اُن کی کچھ مدد کی گئی یا نہیں۔

حسین علی خاں بھی شاعر تھے، اور فارسی میں خیالؔی اور اُردو میں شاداںؔ تخلص کرتے تھے۔[1] اُنھوں نے تیسویں سال میں یکم شوال ۱۲۹۷ھ (۱۸۸۰ء) کو انتقال کیا۔ "شادانِ فرخ نہاد" مادۂ تاریخ ہے۔[2] اُن کا مختصر سا دیوان، چند سال ہوئے، کتابخانے کے ردّی گھر میں دستیاب ہوا ہے۔ کچھ منتخب کلام خمخانۂ جاوید

۱۔ فغانِ دہلی میں حسین علی خاں کا تخلص راقم لکھا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُنھوں نے شاداں تخلص بعد کو اختیار کیا تھا۔ (۲) انتخابِ یادگار: ۲۷ و ۱۰۶؛ تاریخ لطیف: ۱۵۲؛ ذکرِ غالب: ۸۴۔ یہاں ۱۲۹۵ھ سالِ وفات درج ہے۔

میں اور ایک شعر فغانِ دہلی میں بھی درج ہے۔

تعلیم عربی و فارسی

میرزا صاحب نے خلیفہ معظم سے، جو آگرے کے جگت اُستاد تھے، عربی کی ابتدائی اور فارسی کی مروجہ تعلیم حاصل کی تھی۔[1] لیکن زبانِ فارسی سے طبعی لگاؤ، ذوقِ سلیم اور قدیم و جدید فارسی کے عمیق مطالعے نے اُنھیں نغز گو شاعر اور دیدہ ور ادیب بنا دیا۔

اپنی فارسی دانی کے متعلق ایک عریضے میں فرماتے ہیں:

"بدوِ فطرت سے میری طبیعت کو زبانِ فارسی سے ایک لگاؤ تھا۔ چاہتا تھا کہ فرہنگوں سے بڑھ کر کوئی ماخذ مجھ کو ملے۔ بارے مراد بر آئی۔ اور اکابرِ پارس میں سے ایک بزرگ یہاں وارد ہوا، اور اکبرآباد میں فقیر کے مکان پر دو برس رہا، اور میں نے اُس سے حقائق و دقائق زبانِ پارسی کے معلوم کیے۔ اب مجھے اس امر خاص میں نفسِ مطمئنہ حاصل ہے۔ مگر دعویٰ اجتہاد نہیں ہے، بحث کا طریقہ یاد نہیں۔"[2]

میرزا صاحب نے اس بزرگ کا نام عبدالصمد اور سالِ ورود ۱۲۲۶ھ (۱۸۱۲ء) بتایا ہے۔[3] لیکن برہانِ قاطع کے ادبی ہنگامے سے پہلے کسی جگہ اس علامۂ دہر اُستاد کا ذکر نہیں کیا، حالانکہ بحالتِ جوانی کلکتے میں جو معرکہ پیش آیا تھا،[4] اس کا تقاضا تھا کہ مخالفین کے سامنے ایسے یکتا اُستاد سے استفادے کا اظہار کرتے۔ اس سے شبہہ ہوتا ہے کہ کہیں ملا عبدالصمد خود اُن کے اپنے ذہن کی پیداوار تو نہیں۔ خواجہ حالی نے[5] لکھا ہے کہ میرزا صاحب فرماتے تھے "مجھ کو مبداءِ فیاض کے سوا کسی سے تلمذ نہیں ہے۔ اور عبدالصمد محض ایک فرضی نام ہے۔ چونکہ لوگ مجھ کو بے اُستادا کہتے تھے، اُن کا منہ بند کرنے کو میں نے ایک فرضی اُستاد گھڑ لیا ہے۔" اس بیان سے یہ شبہہ حدِ یقین کو پہنچ جاتا ہے۔

تصوف و فلسفہ

دلّی میں میرزا صاحب کا حلقۂ احباب مولانا فضلِ حق خیرآبادی جیسے فلسفی

(۱) یادگارِ غالب: ۱۳ (۲) غالب نامہ: ۷، غالب: ۲۰ (۳) مکاتیب: ۶۰ (۴) قاطع برہان: ۷ (۵) یادگارِ غالب: ۱۴

حکیم مومن خاں مرحوم جیسے نجومی، منشی صدرالدین خاں آزردہ جیسے فقیہ، شاہ نصیرالدین عرف کالے صاحب جیسے صوفی بزرگواروں پر مشتمل تھا، اِس لیے مجلسی مذاکروں اور ذاتی مطالعے سے اُنھیں تصوف کے اُصولی مسائل کا ضروری علم حاصل ہوگیا تھا۔ اِدھر احباب اور شاگردوں میں چند طبیب شامل تھے، اور خود اُن کی عمر کا خاصا حصّہ بھی گوناگوں امراض میں گزرا۔ ان اسباب نے طب سے خاطرخواہ واقف کردیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے کلام میں جابجا ان علوم کی اصطلاحوں کا عالمانہ طور پر ذکر آیا ہے۔ زیرِ نظر مکاتیب میں بھی ایک کے اندر اصطلاحاتِ علمِ نجوم اور دوسرے میں طبّی تجربے کا ذکر ہے[۱]۔ اسی طرح نواب خلدآشیاں کے جشنِ جلوس کے موقع پر جو نثر لکھ کر پیش کی تھی، اُس میں بھی منجمانہ پردازِ بیان نمایاں ہے[۲]

وطن اور سکونتِ دہلی

میرزا صاحب کا وطن اکبرآباد (آگرہ) ہے۔ اپنے ایرانی اُستاد کے ذکر میں نواب خلدآشیاں کو لکھا ہے:

"اکابرِ پارس میں سے ایک بزرگ یہاں وارد ہوا، اور اکبرآباد میں فقیر کے مکان پر دو برس رہا"

لیکن شادی کے بعد ترکِ وطن کرکے دلّی میں آبسے تھے۔ یکم ستمبر سنہ ۱۸۶۶ء کو لکھتے ہیں:

"میں باون ترپن برس سے یہاں رہتا ہوں"[۳]

اس حساب سے اُن کا دلّی میں قیام سنہ ۱۸۱۲ء یا سنہ ۱۸۱۴ء سے ہونا چاہیے۔ دلّی میں میرزا صاحب کا آبائی مکان نہ تھا، اس لیے بیشتر کرایے کے مکانوں میں رہے۔ ان میں سے دو کا ذکر ۱۴ جنوری سنہ ۵۸ء کے عریضے میں کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

"دیران خاص بعنوان نامہ ہای پیشین نشانِ کلبۂ این دردلیش دلریش

(۱) مکاتیب: ۲۱، ۴۵ (۲) کلیاتِ نثرِ فارسی: ۹۱ (۳) مکاتیب: ۵۷

عقبِ مسجدِ جامع نبشتہ اندمن از ہفت ہشت سال در محلۂ بلی ماران

می مانم۔"[1]

مسکن کے حالات

جس زمانے میں میرزا صاحب دلّی تشریف لائے وہ اس جہاں آباد کی پیرانہ سالی کا عہد تھا، تاہم آثارِ شگفتگی و آبادانی ہر طرف ہویدا تھے۔ غدر سنہ ۱۸۵۷ء نے شہر کی بچی کھچی دولت لوٹ کر نیا سکہ چلا دیا۔ عمارات گرا کر سڑکیں بچھائی گئیں، شہر اجاڑ کر قبرستان آباد کیے گئے اور اہلِ ہنر کو شہر بدر کر کے شہر میں فوج کا پڑاؤ ڈالا گیا، تو دلّی دلّی نہ رہی، کیمپ ہو گئی۔ ایک بار نواب فردوس مکاں کو چوب چینی کی ضرورت پیش آئی۔ شہر دہلی اطبّا اور عطاروں کا مخزن تھا۔ سرکار نے میرزا صاحب سے فرمائش کی۔ اس کے جواب میں ۲۶ دسمبر سنہ ۱۸۶۴ء کو تحریر کرتے ہیں:

"دلّی اب شہر نہیں، چھاؤنی ہے، کیمپ ہے۔ نہ قلعہ، نہ شہر کے اہل، نہ اطرافِ شہر کے رؤسا۔"[2]

۱۸ ستمبر سنہ ۱۸۶۶ء کو کانٹوں کے فقدان کی وجہ بتاتے ہوئے لکھتے ہیں:

"شہر سراسر ویران ہے، کاتب کہاں؟"[3]

خشک سالی

سنہ ۱۸۶۵ء میں دلّی بارانِ رحمت کے فیض سے محروم رہی۔ جولائی بھری برسات کا مہینا ہے، لیکن شہرِ دہلی کے اندر اس زمانے میں بھی لُو چلتی رہی۔ میرزا صاحب نے ۲۳ جولائی کے عریضے میں دلّی کی محرومی کا رونا ان لفظوں میں رویا:

"یہاں خلق کو مینہ درکار ہے، اور ہوا سے شرارہ بار ہے۔ دھوپ کی تیزی سے آدمی کے تیور اور پہاڑ کے پتھر جلے جاتے ہیں۔ پانی جگر گداز

۱۔ مکاتیب: ۱۰ (۲) ایضاً: ۳۰ (۳) ایضاً: ۵۸

ہوا جاتا ہے، امراض مختلفہ کا ہجوم یہاں بتاں۔ جز اعضای انسان کے کہ وہ پسینے میں تر ہیں، حرارت و رطوبت کا کہیں پتا نہیں۔ یا گوہلیق ہو یا سطلق ہوا نہیں۔ "[1]

۱۱ اگست کو پھر لکھا:

"یہاں مینہ اسی قدر برسا ہے کہ جس کے پانی سے زمیندار حاصل فصل ربیع سے ہاتھ دھو لیں۔"[2]

برسات

لیکن آیندہ سال بارش نے سنہ ۶۵ء کی قلتِ باران کی تلافی کر دی، اور شہر میں اس قدر پانی برسا کہ گزشتہ باون تریپن برس سے ایسا نہ برسا تھا یکم ستمبر سنہ ۶۶ء کو میرزا صاحب نے لکھا ہے:

"برسات ایسی ہوئی ہے کہ میں باون ترپن برس سے یہاں رہتا ہوں، عرش آرامگاہ اکبر شاہ کے عہد میں ایک بار ایسی برسات دیکھی تھی، یا امسال نظر آئی ہے۔"[3]

عقائد

ایک عریضے سے میرزا صاحب کے عقائدِ اسلامی پر اجمالی روشنی پڑتی ہے۔ فرماتے ہیں:

"اگرچہ فاسق و فاجر ہوں، مگر وحدانیتِ خدا اور نبوتِ خاتم الانبیا کا بدل معتقد اور بزبان معترف ہوں۔"[4]

میرزا صاحب کا خاندان سنی عقیدے کا تھا۔ لیکن وہ خود توحید و رسالت کے بعد امامت کے بھی قائل تھے، اور اس طرف اُن کا رجحان بچپن ہی سے تھا۔ حضرت عباس علمدار کی منقبت میں اُن کا ایک

۱۔ مکاتیب: ۳۹ (۲) ایضاً: ۴۰ (۳) ایضاً: ۵۷ (۴) ایضاً: ۶۱

فارسی قصیدہ ہے۔ اس میں لکھتے ہیں:[۱]

انکو دکیم دریں ولای تو رہ دانست   دانی خود ازیں چیست کہ گفتم تبو کم را

منقبت امیرالمومنین علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں فرماتے ہیں:[۲]

کہ تا کینہ از مہر بشناختم   بکس غیر حیدر نہ پرداختم

جوانی بدین در بسر بردہ ام   شبی در خیالش سحر کردہ ام

بظاہر جب تک گھر میں تبدیل مذہب کے دواعی موجود نہ ہوں، کوئی بچہ از خود ایسا نہیں کر سکتا۔ اس لیے بعید نہیں کہ میرزا صاحب کی ننھیال جہاں ان کی پرورش ہوئی تھی، شیعی عقیدہ رکھتی ہو۔

اخلاق و عادات

میرزا صاحب کے اخلاق و عادات اُس عہد کے دنیا دار اور زمانہ فہم شرفا کے اخلاق و عادات کا نمونہ تھے۔ لغوگوئی سے پرہیز، ہنرہ جھوٹ سے نفرت، احباب کی تکلیف سے رنج، خوشی سے راحت، چھوٹوں پر مہربانی اور بزرگوں کی خیر خواہی کا ثبوت اُن کی زیرِ نظر تحریروں میں بھی ملتا ہے۔[۳]

قدما کا اعتراف

میرزا صاحب شعرای قدیم کے فنی مرتبے اور اُن کے کلام سے استشہاد کو تسلیم کرتے تھے۔ نواب خلد آشیاں کو صراحتاً لکھا ہے:

"فقیر اشعارِ قدما کا معتقد، اُن کے کلام کا عاشق ہے"۔[۴]

نیز خلیفہ احمد علی صاحب رامپوری کو دورِ متاخرین کے گلِ نوشگفتہ، مولانا عرفی شیرازی، کے متعلق لکھتے ہیں:

"قواعدِ زبانِ فارسی کا ماخذ تو ان حضرات کا کلام ہے.... عرفی کی زبان سے

۱۔ کلیاتِ فارسی: ۲۰۸   (۲) ابرِ گہر بار: ۶۱، اکمل المطابع دہلی سنہ ۱۲۸۰ھ
۳۔ مکاتیب: ۱۲، ۱۶، ۲۱، ۲۳، ۳۸، ۴۶، ۶۱   (۴) ایضاً: ۶۱

جو نکل جائے وہ سند ہے۔ ہمارے واسطے وہ ایک قاعدۂ محکم ہے۔ وہ مطاع ہے اور ہم اس کے مقلّد اور مطیع ہیں۔" ۱

<u>ہندی شعرا اور فرہنگ نویسوں کا انکار</u>

لیکن ہندی شعرائی فارسی گو اور ہندی فرہنگ نویسوں کے قائل نہ تھے، اور اس معاملے میں بڑی حد تک انصاف سے آگے نکل گئے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ یہ حضرات اہلِ زبان کا کلام پڑھ کر محاورات و الفاظ کے معنے اپنے قیاس سے قائم کرتے ہیں، جو بھروسے کے قابل نہیں۔ نواب خلد آشیاں کو لکھا ہے:

"میاں انجو جامع فرہنگِ جہانگیری، شیخ رشید راقم فرہنگِ رشیدی علمائی عجم میں سے نہیں۔ ہند ان کا مولد، ماخذ اِن کا اشعار قدما، ہادی اِن کا، اِن کا قیاس، ٹیکچند اور سیالکوٹی مل ان کے پیرو سبحان اللہ، ہندی بھی اور ہندو بھی۔" ۲

اِس عریضے کے جواب الجواب میں لکھتے ہیں:

"شعرائی ہند کے کلام میں جو غلطیاں نظر آتی ہیں، یا ہندی فرہنگ لکھنے والوں کے بیان میں جو نادرستی اور باہم جو اُن کی عقول میں اختلاف ہیں، اُس میں کلام نہیں کرتا، اپنی تحقیق کو مانے ہوئے ہوں۔" ۳

<u>بے تکلفی</u>

مخلص احباب اور محسنوں سے تکلف برتنے کو نامزا جانتے تھے۔ نواب فردوس مکاں سے اُن کا تعلق سراسر اخلاق پر مبنی تھا۔ جب رُپے کی ضرورت آپڑتی، بلا تکلف مانگ لیا کرتے تھے۔ اپنے اس رویّے کو ایک خط میں ظاہر بھی کر دیا ہے۔ فرماتے ہیں:

"جو آپ بن مانگے دیں، اُس کے لینے میں مجھے انکار نہیں، اور جب مجھے حاجت

۱- مکاتیب: ۱۴، ۱ (۲) ایضاً: ۶۱ (۳) ایضاً: ۶۱

آپڑے، تو آپ سے مانگنے میں عار نہیں۔"

قرض کی عادت

متموّل اور ذی عزت خاندان کا فرد ہونے کے سبب سے میرزا صاحب کے مصارف زیادہ تھے، اِس لیے انگریزی پنشن اور رامپور کا وظیفہ ملنے کے زمانے میں بھی اُنھیں قرض سے نجات نہ ملی، اور اس بارِ گراں سے سبکدوشی حاصل کرنے کے لیے ہمیشہ سرکارِ رامپور سے امداد طلب کرتے رہے۔ اس سلسلے کی سب سے پہلی تحریر ہے، جو پنشن کی بندش کے زمانے میں نواب فردوس مکاں کی خدمت میں ارسال کی ہے، لکھتے ہیں:

"بارِ گرانِ غم سے پست ہوگیا ہوں۔ آگے تنگدست تھا، اب تہی دست ہوگیا ہوں۔ جلد میری خبر لیجیے، اور کچھ بھجوا دیجیے۔"[۲]

اس کے بعد ۸ دسمبر سنہ ۱۸۵۹ء کو پھر لکھا ہے:

"سو روپے کی ہنڈی ... پہنچی، اور روپیہ وصول میں آیا اور صرف ہوگیا، اور میں بدستور بھوکا اور ننگا رہا۔ تم سے نکھوں تو کس سے کہوں؟ اس مشاہرۂ مقرری سے علاوہ دو سو روپے مجھ کو اور بھیجدیجے گا، تو جلا لیجے گا، لیکن اس شرط سے کہ اس عطیۂ مقرری میں محسوب نہ ہو، اور بہت جلد مرحمت ہو۔"[۳]

۲۲ اگست سنہ ۱۸۶۵ء کو نواب خلد آشیاں کی خدمت میں تحریر کیا ہے:

"ان دنوں میں متفرقات کے قرضدار سرگرم تقاضا بلکہ آمادۂ شور و غوغا تھے۔ دو سو روپے کی ہنڈوی مراحی آبِ حیات ہوگئی، دامِ مرگ سے نجات ہوگئی۔"[۴]

ایک بار رامپور سے تنخواہ کی روانگی میں دیر ہوئی، تو میرزا صاحب نے ۱۰ اگست سنہ ۱۸۶۶ء کو سرکار کی خدمت میں لکھا:

۱۔ مکاتیب ۱۱ (۲) ایضاً ۱۱ (۳) ایضاً: ۱۰۷ (۴) ایضاً ۴۵

" میرا حال یہ کہ اگر نیری تنخواہ گھر میں اور کچھ قرض کی قسط میں جاتی ہے۔ حضور کے عطیے پر میرا اور شاگرد پیشہ کا اور حسین علی خاں کا گزارا ہے۔ غالب نقیب جانتا ہے، جس طرح گزرتی ہے۔ چار سو کا قرض باقی ہے اب کوئی قرض بھی نہیں دیتا۔ "[۱]

۱۳ اگست کو پھر لکھتے ہیں:

" کل آخر روز میر منشی حضور کا خط آیا۔ جون کی تنخواہ کی رسید نہ پہنچنے کی اطلاع پائی۔ تہیدستی و قرض کے رنج میں خستہ و آزردہ بیٹھا تھا۔ اسی وقت عرضی لکھی۔ اگرچہ ڈاک کا وقت نہ تھا، مگر بھیج دی۔ "[۲]

۱۶ اکتوبر سنہ مذکورہ کے عریضے میں راحت کا انحصار قرض کی ادائیگی میں بتاتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

" حضور ملک و مال جس کو جس قدر چاہیں عطا کر سکتے ہیں۔ میں آپ سے فرغ راحت مانگتا ہوں، اور راحت منحصر اس میں ہے کہ قرض باقی ماندہ ادا ہو جائے اور آیندہ قرض لینے کی حاجت نہ پڑے۔ "[۳]

سرکار نے میرزا صاحب کا قرض ادا فرما دیا، تو ۸ جنوری سنہ ۱۸۶۷ء کو اس کے شکریے میں لکھتے ہیں:

" حضرت کے تصدق سے قرض ادا ہوگیا۔ تنخواہ نے قحط سے اور میں نے رنج سے رہائی پائی۔ "[۴]

اگست سنہ ۱۸۶۸ء میں میرزا صاحب کے قرض کی ادائیگی کا سرکار نے پھر وعدہ فرمایا۔ اس وعدے سے میرزا صاحب کو جو مسرت ہوئی، اس کا اندازہ ان الفاظ سے بخوبی ہوتا ہے:

" تین التماسیں سابق پیش ہوئی تھیں ... اُن خواہشوں کے منظور و مقبول ہونے کی نوید پائی۔ انشاء اللہ الکریم حسب ارشاد حضور اسی برس ...

۱۔ مکاتیب: ۵۵ (۲) ایضاً: ۵۶ (۳) ایضاً: ۶۰ (۴) ایضاً: ۶۲

آمیزستان' یعنی نومبر و دسمبر میں میرا قرض ... ادا ہو جائے گا"۱

۱۶ نومبر سنہ مذکورہ کو پھر لکھا :

"حال میرا تباہ ہوتے ہوتے اب یہ نوبت پہنچی کہ اب کے تنخواہ میں سے ۶۴ روپے بچے ..... مجلاً آٹھ سو روپے ہوں تو میری آبرو بچتی ہے۔ شادی کیسی ؟ میری آبرو بچ جائے، تو غنیمت ہے ... مختصر یہ کہ اب میری جان اور آبرو آپ کے ہاتھ ہے۔ گر حضور جو عطا فرمانا ہے جلد ارشاد ہو"۲

۱۷ دسمبر کو میرزا صاحب نے یاد دہانی کی، اور آخری خط میں اپنے اضطراب کو ان الفاظ سے ظاہر کیا :

"حضور قرضخواہوں نے بہت عاجز کر رکھا ہے۔ بس میرا یہی کام ہے کہ یاد دلا دوں۔ آگے حضرت مالک ہیں"۳

لیکن ابھی یہاں سے رقم پہنچنے نہ پائی تھی کہ ان کا انتقال ہو گیا۔

ضعف پیری

میرزا صاحب نے سب سے پہلے یکم اکتوبر سنہ ۱۸۵۹ء کے عریضے میں ضعفِ پیری کا ذکر کیا ہے۔ فرماتے ہیں :

"خدمت گزار ہوں اور دعا و ثنا میرا کام ہے۔ بڑھاپے نے کھو دیا۔ جز نفسے چند، مجھ میں کچھ باقی نہیں"۴

قولنج

امراض کا شکوہ ۱۱ نومبر سنہ ۱۸۶۱ء سے شروع ہوتا ہے۔ اس زمانے میں میرزا صاحب ابتداءً درد قولنج اور بعد ازاں بخار میں مبتلا ہو کر ایک ماہ تک امراض کی مصیبت جھیلتے رہے تھے۔ فرماتے ہیں :

"دو ماہ ایک مہینا بھر سے بیمار ہے۔ ابتداء ہی قولنج درد ہی لیب استعال

۱۔ مکاتیب : ۱۸ (۲) ایضاً : ۵۳ (۳) مکاتیب : ۸۴ (۴) ایضاً : ۱۵

اور یہ عارضہ کہ اس مرض میں اُس سے گریز نہیں، تپ نے آ گھیرا، کئی باریاں چُھٹ گئیں۔ اب دو باریاں ٹل گئی ہیں۔ لیکن طاقت بالکل سلب ہو گئی ہے، اور ضعفِ دماغ نے قریب بہلاکت پہنچا دیا ہے۔ با ناچار آب سیب کا استعمال ہے۔"[1]

امراضِ مختلفہ کا ہجوم

نواب خلد آشیاں کی دعوتِ قدومِ رامپور کے جواب میں ۱۸ جون ۱۸۶۰ء کو لکھتے ہیں:

"وہ آگ برس رہی ہے کہ طیور کے پر جل رہے ہیں۔ بعد آگ کے پانی برسے گا سفر خصوصاً پوڑھے رنجور آدمی کو دونوں صورت میں متعذر۔"[2]

۲۴ جولائی کو پھر تحریر کیا ہے:

"پانی جگر گداز، ہوا جانستان، امراضِ مختلفہ کا ہجوم جاں ستاں۔"[3]

نیم مردہ

سنہ ۱۸۶۵ء میں، نواب سکندر زمانی بیگم صاحبہ کا انتقال ہوا۔ ایسے موقع پر میرزا صاحب کو "بزبانِ فارسی و عبارتِ بلیغ" تعزیت نامہ لکھنا چاہیے تھا، لیکن ضعفِ پیری مانع آیا، اور انھوں نے ۸ استمبر کو ازراہِ معذرت لکھا:

"اب میں نیم مردہ، دل پژمردہ، خاطر افسردہ، جس باب میں لفظ و معنی فراہم کیا چاہوں، وہ سراسر طبع کے خلاف۔"[4]

کوفتہ و رنجور

رامپور کے دوسرے سفر سے واپس ہوتے ہوئے میرزا صاحب مرادآباد پہنچکر بیمار ہو گئے تھے۔ نواب خلد آشیاں نے مزاج پُرسی کی، تو اُس کے جواب میں ۲۱ جنوری سنہ ۶۶ء کو رودادِ سفر بیان کر کے لکھتے ہیں۔

"ایک ہفتہ کوفتہ و رنجور رہا۔ اب ویسا پیر و ناتواں ہوں جیسا کہ اس سفر سے پہلے تھا۔"[5]

۱۔ مکاتیب: ۲۲ (۲) ایضاً: ۳۸ (۳) ایضاً: ۳۹ (۴) ایضاً: ۴۷ (۵) ایضاً: ۴۹

درویش کا مال

مبعد ازاں ۱۵ فروری سنہ مذکورہ کو امراض کی تفصیل فرماتے ہیں:
"سامعہ مدت سے کھو بیٹھا۔ اب آنکھوں کو بھی رو بیٹھا۔۔ فقدانِ طاقت، سقوطِ اشتہا، ضعفِ بصر، ضعفِ بحت ہے" ۱

نیجان ہوں

اس سفر کی صعوبت اور عرضِ راہ کی بیماری نے میرزا صاحب کی رہی سہی صحت برباد کردی، اور یہ اپنے آپ کو نیجان سمجھنے لگے۔ چنانچہ ۹ مارچ کو لکھتے ہیں:

"اپنا حال اس سے زیادہ کیا لکھوں کہ آگے ناتوان تھا، اور اب نیجان ہوں۔ برخوردار نواب مرزا خاں اپنے مشاہدے کے مطابق جو میری حقیقت عرض کرے، وہ مسموع و مقبول ہو" ۲

حواس درست نہیں

امراض اور مالی پریشانیوں نے میرزا صاحب کے حواس پر بھی کافی اثرانداز کی تھی۔ ۱۱ اگست سنہ ۶۶ء کو تحریر کیا ہے:

"غم نے منجمل بڑھاپے کے پست و مضمحل کر دیا ہے۔ حضرت کے قدموں کی قسم، نہ حواس درست، نہ رای صحیح! برسوں سے کرداہت میں مبتلا رہتے رہتے اب طاقت تحمل کی نہ رہی۔ خدا جانے کیا ہوتا ہے، کیا سمجھتا ہوں، کیا کرنا چاہیے، کیا کرتا ہوں" ۳

۱۸ ستمبر کو اختلالِ حواس کے ساتھ بصارت کے فتور اور ہاتھ کے رعشے کا بھی ذکر کیا ہے ۴

امراضِ قدیم بڑھ گئے

اِس کے بعد ۱۳ مارچ سنہ ۶۷ء کو لکھتے ہیں:

۱۔ مکاتیب: ۵۰ (۲) ایضاً: ۵۱ (۳) ایضاً: ۵۶ (۴) ایضاً: ۵۸

"اِس درویش کا حال اب قابلِ گزارش نہیں۔ امراضِ قدیم بڑھ گئے۔ دوران سر اور رعشہ اور ضعفِ بصر تین بیماریاں نئی پیدا ہوئی ہیں۔ قلم نہیں بنا سکتا، لڑکوں سے بنوا لیتا ہوں۔ برسوں کی بات نہیں رہی۔ ہفتوں کی یا مہینوں کی زندگی رہ گئی ہے۔" ۱

فرضِ محال

اِس کے ایک مہینے بعد ۱۴ اپریل سنہ ۶۷ء کو نمایش باغ بے نظیر کی شرکت کی آرزو کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

"نمایش گاہ سراسر سویدا رامپور کا ذکر اخبار میں دیکھتا ہوں، اور خونِ جگر کھاتا ہوں کہ ہائے، میں وہاں نہیں! بالاخانے پر رہتا ہوں۔ اُتر نہیں سکتا۔ مانا کہ آدمیوں نے گود میں لے کر اُتارا، اور پالکی میں بٹھا دیا، کہارے کر چلے، راہ میں نہ مرا اور رامپور پہنچ گیا کہاروں نے جاکر بے نظیر میں میری پالکی رکھ دی۔ پالکی قفس اور میں طائرِ اسیر دیکھی بے پر وبال۔ نہ چل سکوں، نہ پھر سکوں۔ جو کچھ اوپر لکھ آیا ہوں، یہ سب بطریقِ فرضِ محال ہے؛ ورنہ ان امور کے وقوع کی کہاں مجال ہے۔" ۲

اب دم نہیں

ماہ و سال کے سفر کے ساتھ ساتھ، میرزا صاحب کے اعضا بھی فرسودہ و ناتواں ہوتے چلے گئے، تا آنکہ ۱۱ جون ۱۸۶۷ء کو اُنھوں نے منشی سیلچند کو صاف صاف لکھ دیا:

"بھائی! بے تکلف لکھتا ہوں کہ مجھ میں اب دم نہیں۔ نہ طاقت باقی ہے، نہ حواس درست ہیں۔ ...... بس اب تو یہ نوبت پہنچی ہے کہ آج بچا کل مرا کل بچا پرسوں مرا۔" ۳

۱۔ مکاتیب: ۶۸ (۲) ایضاً: ۶۹ (۳) ایضاً: ۱۱۱

وفات اور مدفن

آخر وہ دن بھی آگیا، جس کی میرزا صاحب کو برسوں سے آرزو تھی، یعنی ۱۵ فروری سنہ ۱۸۶۹ء مطابق ۲ ذیقعدہ سنہ ۱۲۸۵ھ کو پیر کے دن ظہر کے وقت اُن کا انتقال ہوگیا۔ ۲۱ دسمبر سنہ ۱۸۵۹ء کو دتّی اور دتّی والوں سے ناراض ہو کر حسین مرزا کو لکھا تھا:

"رامپور زندگی میں میرا مسکن اور بعدِ مرگ میرا مدفن ہو لیا۔"[1]

مگر قضا و قدر نے اُنھیں دتّی ہی میں رکھا اور وہیں شاہ نظام الدین اولیاؒ کے مزار کے قریب اپنے سبھی خاندان کے احاطے میں مدفون ہوئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔[2]

---

[1] اسلام دوی: ۳۲۹ (۲) تاریخ و وقتِ انتقال کے لیے دیکھو حاشیہ مکتوب ۱۱۶۔ یہاں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ مولانا مہر کو اس پر اصرار ہے کہ ۱۵ فروری سنہ ۱۸۶۹ء کو ذیقعد سنہ ۱۲۸۵ھ کی تیسری تاریخ تھی، دوسری نہ تھی۔ اُن کی نظر میں اس کی دلیل یہ ہے کہ ہجری و عیسوی تاریخوں کا تطابق بتانے والی کتابوں سے یہی ظاہر ہوتا ہے۔ میں یہ عرض کرتا ہوں کہ ان کتابوں کا حساب اس مفروضے پر قائم ہے کہ ہجری مہینوں میں سے ایک ۲۹ کا اور ایک ۳۰ کا ہوتا ہے۔ لیکن مشاہدہ اس کے خلاف ہے یعنی کبھی دو چاند پے بہ پے ۲۹ یا ۳۰ کے دکھائی دیتے ہیں۔ اس لیے جب واقعے کے متعلق اُسی دن عیسوی اور ہجری تاریخ ضبط کرلی جائے اور وہی تاریخ کسی دوسرے دور دراز مقام پر بھی تسلیم کی جا چکی ہو، تو پھر حسابی تطابق کو اس شہادتی تطابق پر ترجیح نہ دی جائے گی۔ ۱۵ فروری کو ذیقعدہ کی دوسری تاریخ کا ہونا خواجہ حالیؔ نے یادگار میں ضبط کیا ہے ان سے پہلے حسین علی خاں بھی اپنے عریضۂ موسومہ خلد آشیانی میں یہی دو تاریخیں لکھ چکے ہیں۔ یہاں سے جو جواب گیا ہے، اُس کی تاریخیں دیکھنے سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ اُس سال ۱۴ فروری کو ذیقعدہ کی پہلی ہوئی تھی۔ اس سال کی جنتری میں بھی جس کا ایک نسخہ کتابخانۂ رامپور میں محفوظ ہے، ۱۵ فروری کو ۲ ذیقعدہ کے مطابق درج کیا ہے ان تمام شہادتوں کے مقابلے میں حساب کی کتاب کو یہ جانتے ہوئے کہ وہ مفروضے پر مبنی ہے، کس طرح تسلیم کیا جا سکتا ہے؟ ہاں کوئی معاصر بیان ہمارے سامنے نہ ہوتا، تب حسابی تطابق کو ضرور مان لیتے جیسا کہ تمام اہلِ علم کا معمول یہ ہے۔

تصانیف

میرزا صاحب نے زیرِ نظر عریضوں میں اپنی متعدد تصنیفات کا ذکر کیا ہے ان میں سے اکثر مشہور ہیں، اور بار بالطبع بھی ہو چکی ہیں۔ بعض کے حالات سے البتہ اربابِ علم آگاہ نہیں، اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان سب کا اجمالی تذکرہ کر دیا جائے۔

مہرِ نیمروز

۱۴ جنوری سنہ ۵۰ء کے عریضے میں میرزا صاحب نے اس کتاب کا تذکرہ کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

"از ہفت ہشت سال بتحریرِ تاریخِ سلاطینِ تیموریہ .... می پرداختم"۱

۹ جون سنہ ۶۶ء کو پھر لکھا:

"بادشاہِ دہلی نے مجھ کو نوکر رکھا، اور خطاب دیا، اور خدمتِ تاریخ نگاری سلاطینِ تیموریہ مجھ کو تفویض کی"۲

تفصیل یہ ہے کہ سنہ ۱۸۵۰ء میں شاہِ ظفر نے میرزا صاحب کو تاریخ نویسی کی خدمت پر پچاس روپے کے مشاہرے کے ساتھ مقرر فرمایا، اور حکم دیا کہ حکیم احسن اللہ خاں بہادر تاریخوں سے حالات اقتباس کریں، اور میرزا صاحب اپنے اندازِ خاص میں ان واقعات کو لکھیں۔ کتاب کا نام پرتوستان رکھا گیا،

۱۔ مکاتیب: ۹ (۲) ایضاً: ۵۲

اور یہ تجویز قرار پائی کہ کتاب دو حصّوں میں تقسیم کی جائے: پہلا حصّہ ابتدائے آفرینش سے امیر تیمور گورگاں تک بالاختصار اور تیمور سے ہمایوں تک قدرے تفصیل کے ساتھ مرتب کیا جائے، اور دوسرے میں جلال الدین اکبر سے سراج الدین بہادر شاہ تک کے واقعات ہوں۔ میرزا صاحب نے حصّۂ اول کا نام "مہرِ نیم روز" اور ثانی کا "ماہِ نیم ماہ" رکھا۔ حصّۂ اول کے متعلق ۱۱ جون سنہ ۱۸۵۲ء کو منشی جواہر سنگھ جوہر کو لکھا ہے:

"مسودۂ روداد اورنگ نشینانِ چغتائیہ بدستِ ہیرا سنگھ روان داشتہ ایم، و ہنوز از رسیدنش نشان نیافتہ ایم۔ اگر رسیدہ است بنویسند، ورنہ از ہیرا سنگھ باز پرس کنند"[1]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مہرِ نیم روز کی ترتیب کا کام سال ڈیڑھ سال کے اندر ہی ختم ہو چکا تھا، لیکن کتاب کی طباعت کی نوبت سنہ ۱۲۷۱ھ (۱۸۵۴ء) میں آئی۔ چاہیے تھا کہ میرزا صاحب حصّۂ ثانی کی ترتیب شروع کر دیتے، لیکن ایسا نہ ہوا، حتی کہ سنہ ۵۷ء نے بساطِ حکومت اُلٹ دی، اور ماہِ نیم ماہ شرمندۂ طلوع نہ ہوسکا۔ بظاہر اس کی ایک وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ اسی سال شیخ ابراہیم ذوق کا انتقال ہوا تھا اور میرزا صاحب بہ تنخواہِ سابق، اُستادِ شہ قرار پائے تھے، اس لیے اُنھوں نے خلافِ دانشمندی سمجھا ہو گا کہ ایک تنخواہ کے عوض دو خدمتیں انجام دیں۔[2]

غدر کے بعد میرزا صاحب اس کتاب کو اپنے انگریزی تعلقات کے لیے سفر خیال کرنے لگے تھے۔ ۱۰ نومبر ۱۸۵۸ء کو شیو نراین کو لکھا ہے:

"مہر نیم ماہ نہیں، اس کا نام مہر نیم روز ہے اور وہ سلاطینِ تیموریہ کی تواریخ ہے، اب وہ بات گئی گزری، بلکہ وہ کتاب اب چھپانے کے لائق ہے، نہ چھپوانے کے قابل"[3]

۱- کلیاتِ نثرِ فارسی: ۲۵۰ (۲) اس ایڈیشن کا ایک نسخہ کتاب خانے میں محفوظ ہے۔ آوارجۂ خزانہ سنہ ۵۶-۱۸۵۵ء سے پتا چلتا ہے کہ ۲ مارچ سنہ ۱۸۵۶ء کو اس کا حساب مجرا ہوا تھا۔ اس لیے فروری سنہ مذکورہ میں خریداری عمل میں آنا چاہیے۔ (۳) خطوط: ۱، ۲۸۷

دستنبو

میرزا صاحب نے "آغازِ یازدہم مئی سنہ ۱۸۵۷ء سے ۳۱ جولائی سنہ ۱۸۵۸ء تک روداد شہر اور اپنی سرگزشت یعنی پندرہ مہینے کا حال نثر میں لکھا... اور التزام اس کا کیا... کہ دساتیر کی عبارت یعنی پارسی قدیم لکھی جائے، اور کوئی لفظ عربی نہ آئے۔" اور منشی شیونراین کے مطبع مفیدِ خلائق واقع اکبرآباد (آگرہ) میں بڑے اہتمام و صحت کے ساتھ طبع کرایا۔ اس کتاب کا ایک نسخہ نواب فردوس مکاں کو بھی ارسال کیا تھا۔ ۷ نومبر سنہ ۱۸۵۸ء کو اُس کی رسید کے متعلق لکھتے ہیں:

"یہ چار جزو کا رسالہ جواب بھیجا ہے، اس کا دیکھنا ضرور درکار ہے۔ فارسی قدیم اور پھر حسنِ معنی اور صنعتِ الفاظ؟ با این ہمہ ہر امر کی احتیاط اور ہر بات کا لحاظ... میں پہلے سے مداحوں میں اپنا نام لکھوا چکا ہوں، اور دزرای ملک دارا دربان کے دو ساز نیکٹ پا چکا ہوں۔ اگر اس اجمال کو بہ تفصیل معلوم کیا چاہیے، تو اسی کتاب موسوم بہ "دستنبو" میں دیکھا چاہیے۔"[۲]

لیکن خط کے الفاظ سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ نواب صاحب کی خدمت میں پیش کیا ہوا نسخہ مطبوعہ تھا یا قلمی۔ اگر مطبوعہ تھا، تو اس سے یہ نتیجہ نکلے گا کہ ۷ نومبر سنہ ۱۸۵۸ء سے قبل کتاب طبع ہو چکی تھی۔

نامۂ غالب

میرزا صاحب نے سنہ ۱۸۶۰ء میں فارسی کی مشہور فرہنگ برہانِ قاطع کے اغلاط پر مشتمل ایک رسالہ قاطعِ برہان لکھ کر، نواب فردوس مکاں کی امداد سے شائع کیا تھا۔ اس کے جواب میں ہندوستان کے متعدد اہلِ علم نے رسائل لکھے ان میں سے ایک بزرگ مرزا رحیم بیگ نے رسالہ ساطعِ برہان تصنیف کیا اور اُس میں میرزا صاحب کو بہت جلی کٹی سنائیں۔ میرزا صاحب نے اس کا جواب الجواب لکھا، اور اُس کے پانچ نسخے نواب مرزا خاں داغ دہلوی کے توسط سے نواب

۱۔ اُردوی: ۴۹ (۲) مکاتیب: ۱۰ و ۱۱

خلد آشیاں کی خدمت میں پیش کرکے، ۱۴ ماہِ اگست سنہ ۱۸۶۵ء کو لکھا:

> ایک عبارت کا ایک جزو بطریقِ خط ایک انصاف دشمن کو لکھ کر چھپوا دیا ہے پارسل اُس کا نواب مرزا کو ارسال کیا ہے۔ پانچ رسالے وہ میری طرف سے نذر گزرانیں گے۔ حضرت قبولِ نذر کو میرا عز و شرف جانیں گے۔[۱]

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ رسالۂ مذکورہ شروعِ اگست سنہ ۱۸۶۵ء میں شائع ہوا تھا سوءِ اتفاق سے ان پانچ نسخوں میں کا ایک بھی کتاب خانے میں نہیں نہ کسی اور جگہ مکمل نسخے کا پتا چلا۔ البتہ اس رسالہ کا اخیر ورق ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی کے پاس محفوظ ہے، اُس سے پتا چلتا ہے کہ رسالہ ۱۶ صفحوں میں ختم ہوا ہے صفحۂ ۱۶ کے نیچے سطر کے باہر چھاپے خانے والوں کی طرف سے یہ عبارت خاتمے کی چھپی ہے: "الحمد للہ کہ نجم الدولہ اسد اللہ خاں بہادر غالب کا خط موسومہ مرزا رحیم بیگ صاحب کا مطبع محمدی محمد مرزا خاں میں: بیچ کنپ دہلی اندرون کوچہ چیلہ گذر رفیض حد چھاؤنی کے، اہتمام عبدالرزاق بیگ سے چھپا ۱۸۶۵ء۔"

دیوانِ اُردو

میرزا صاحب نے ۵ ذی الحجہ سنہ ۱۲۷۳ھ (۲۷ جولائی سنہ ۱۸۵۷ء) کے عریضے میں دیوانِ اُردو کا اس طرح ذکر کیا ہے:

> "مجھ کو یہ غم ہے کہ... دیوانِ اُردو کی رسید میں نے نہ پائی..... دیوان کی رسید... ایسے ہی باریک کاغذ پر لکھ کر اس ساہوکار کو دیجیے گا، اور اُس کو تاکید کیجیے گا کہ اس کو بھیج دے۔"[۲]

منشی شیو نراین اکبر آبادی کو اس کے بارے میں لکھتے ہیں:

> "اب تم سنو۔ دیوانِ ریختہ اتم و اکمل کہاں تھا؟ مگر ہاں میں نے غدر سے پہلے لکھوا کر نواب یوسف علی خاں بہادر کو رامپور بھیج دیا تھا۔"[۳]

اس بیان سے مترشح ہے کہ میرزا صاحب نے مئی سنہ ۱۸۵۷ء سے قبل دیوانِ اُردو

۱۔ مکاتیب: ۱۴۱ (۲) ایضاً: ۸۵، ۸۶ (۳) اردوی: ۳۸۱

رامپور بھیجا۔ لیکن دراصل نسخۂ مذکورہ پانچویں عریضے کے جواب کی تاریخ (۹ مئی) اور تاریخِ آشوبِ غدر (۱۱ مئی) کے درمیان بھیجا گیا تھا۔ چونکہ وہ تاریخ غدر سے قبل تھی، اس لیے میرزا صاحب نے مجملاً "غدر سے پہلے" کہا ہے۔

میرزا صاحب کو اس کی رسید نومبر سنہ ۱۸۵۸ء تک موصول نہ ہو سکی جب ماہِ مذکور میں اُنھوں نے دستنبو کی ایک جلد تحفۃً ارسال کی اور نواب صاحب نے جواب میں لکھا کہ عدیم الفرصتی کے سبب دیوان اور دستنبو ملاحظے سے نہ گزرے تو میرزا صاحب نے ۷ نومبر کو لکھا:

"اس قرینے سے کہ بسبب کم فرصتی کے اُن کا ملاحظہ نہ کرنا مرقوم ہوا، دیکھنے سے دیوان اور اس کتاب کا پہنچنا معلوم ہوا۔"[۱]

بظاہر اس کے کاتب کا ذکر کہیں نہیں ملتا۔ مگر خط کا انداز کلیاتِ فارسی کے خط کے مطابق ہے۔ اس سے میں قیاس کرتا ہوں کہ یہ نواب فخرالدین خاں خِرد کے قلم کا ہے، جو کلیاتِ فارسی کے کاتب ہیں۔

<u>کلیاتِ فارسی</u>

کلیاتِ فارسی کا نسخہ میرزا صاحب نے مارچ سنہ ۱۸۶۱ء میں نذر کیا تھا۔ ۷ اپریل سنہ ۱۸۶۱ء کو اس کے بارے میں تحریر کرتے ہیں:

"کلیاتِ فارسی کے پہنچنے سے اور اس نذر کے مقبول ہونے سے مجھ کو بہت خوشی حاصل ہوئی۔"[۲]

۱۹ محرم سنہ ۱۲۸۲ھ (۱۴ مئی سنہ ۱۸۶۵ء) کو نواب خلد آشیان کو لکھتے ہیں:

"دو قصیدۂ مدحیہ میرے دیوانِ فارسی میں مرقوم اور وہ دیوان حضرت کے کتاب خانے میں موجود ہے۔"[۳]

بعد ازاں ۱۸ جون سنہ ۱۸۶۵ء کو پھر لکھتے ہیں:

"اب عرض یہ ہے کہ حسب الحکم حضور کے یہ قصیدہ میرے دیوانِ فارسی میں، جو کتاب خانے میں موجود ہے، درج کیا جائے۔"[۴]

خود میرزا صاحب کی ایک تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نسخے کے کاتب نواب

۱۔ مکاتیب: ۱۱ (۲) ایضاً: ۲۰ (۳) ایضاً: ۳۷ (۴) ایضاً: ۳۸

فخرالدین محمد خاں خرد تخلص دہلوی ہیں ۱؎

انتخابِ دیوانِ اُردو

نواب خلد آشیاں نے اساتذۂ فارسی و اُردو کے منتخب اشعار کی ایک بیاض مرتب فرمانے کے سلسلے میں ۲۵ اگست سنہ ۱۸۶۶ء کو میرزا صاحب سے اپنے چیدہ اشعار بھیجنے کی فرمائش کی۔ میرزا صاحب نے ۱۰ستمبر کو جواباً تحریر کیا:

"اُردو کا دیوان ایک شخص کو دیا ہے ..... بعدِ اتمام تحریر نذر کیا جائے گا۔"۲

۱۸ستمبر کو پھر لکھا:

"خاطرِ اقدس میں نہ گزرے کہ غالب تعمیلِ احکام میں کاہل ہے ... کاتب کی تلاش کی۔ شہر سراسر ویران ہے، کاتب کہاں! بارے ایک دوست نے کاتب کا نشان دیا۔ اُردو کا دیوان، اشعار پر صاد کرکے، اُس کو حوالے کیا۔ کل دہ اجزای منقولہ آئے۔ آج بطریق پارسل مع اس عرضی کے ارسال کیے۔ خط کاتب کا مجھ کو پسند نہیں آیا۔ حضرت کو کیونکر پسند آئے گا! اغلاط اتنے تھے کہ مجھ کو تحریر کے بار بار محنت پڑی۔"۳

۲۴ستمبر کو سہ بارہ اُردو دیوان کا اس طرح ذکر کیا:

۱۔ ملاحظہ ہو اُردوی معلی: ۲۸۹۔ نواب فخرالدین محمد خاں خرد تخلص، نواب شرف الدین محمد خاں دہلوی کے فرزند اور بڑے آزاد مزاج اور صوفی منش انسان تھے۔ نواب مصطفٰے خاں شیفتہ، نیز اور میرزا صاحب وغیرہ کی کتابت کیا کرتے تھے۔ چنانچہ دستنبو اور اُردو اور فارسی کلیات کے نسخے، جو کتابخانۂ رامپور میں محفوظ ہیں اور دیوانِ غالب اُردو کا نسخۂ مملوکۂ خواجہ محمد شفیع صاحب دہلوی انھیں کے لکھے ہوئے ہیں۔ میرزا صاحب نے ان کے متعلق تفتہ کو لکھا ہے کہ "کاتب اُن اجزا کا جن کی رو سے کاپی لکھی جاتی ہے، فارسی کا عالم ہے علم اُس کا نجابت الدین رامپوری اور حکیم محمد حسین سے زیادہ ہے" (خطوط: ۱، ۵۲) خرد کی کتابت حیرت انگیز حد تک اغلاط سے مبرا ہوتی ہے۔ خود میرزا صاحب بھی اس کے قائل تھے۔ چنانچہ جولائی ۱۸۵۹ء میں مجروح کو لکھا ہے: "قاطع برہان کے مسودے سب میں نے پھاڑ ڈالے، اس واسطے کہ ہر نظر میں اُس کی صورت بدلتی گئی۔ وہ تحریر بالکل مغشوش ہو گئی، ہاں اُس کی نقلیں صاف کہ جن میں کسی طرح کی غلطی نہیں، نواب صاحب نے کرلی ہیں ایک میرے واسطے، ایک بھائی ضیاء الدین خاں کے واسطے"۔ (خطوط: ۱، ۲۵۳)

۲۔ مکاتیب: ۵۸ (۳) ایضاً: ۵۸

"اُردو دیوان کا انتخاب بھیج چکا ہوں۔ یقین ہے کہ حضرت کی نظرِ انور سے گزر گیا ہو۔" ۱

انتخابِ دیوانِ فارسی

اسی سلسلے میں میرزا صاحب نے فارسی دیوان کا انتخاب بھی روانہ کیا تھا۔ ۸ستمبر کے خط میں اس کے متعلق فرماتے ہیں:

"فارسی دیوان کا شیرازہ کھول کر چند شخصوں کے حوالے کیا ہے۔" ۲

۱۸ستمبر کے عریضے میں، دیوانِ اُردو کے ارسال کی اطلاع کے بعد، لکھتے ہیں:

"فارسی کلیات کا شیرازہ کھول کر اجزا اُس کے احباب پر تقسیم کر دیے ہیں۔ جابجا اشعار پر صاد کر دیے ہیں، وہ بھی میرے انتخاب کے مطابق نقل ہو رہے ہیں۔ بعدِ اتمام وہ بھی پیشکش کر دوں گا۔" ۳

۲۴ستمبر کو یہ انتخاب روانہ کر کے سرکار کو لکھا:

"آج فارسی دیوان کا انتخاب بطریقِ پارسل اس عرضی کے ساتھ بھیجتا ہوں.... اس درویش نے صرف غزلوں اور رباعیوں کا انتخاب بھیجا ہے۔ قصائد و قطعات و مثنویات کا انتخاب ابھی نہیں بھیجا۔ اگر حکم ہو، تو وہ بھی بھیجوں۔" ۴

مثلوں میں ایسی کوئی تحریر موجود نہیں جس سے پتا چل سکے کہ سرکار رامپور نے ان اصناف کا انتخاب بھی طلب فرمایا تھا۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ میرزا صاحب کو مزید زحمت نہ دی گئی۔ کتاب خانۂ رامپور نے یہ دونوں مجموعے "انتخابِ غالب" کے نام سے یک جا چھاپ کر شائع کر دیے ہیں۔

اِن کے علاوہ حسبِ ذیل کتابیں بھی میرزا صاحب کی لکھی ہوئی ہیں:

(۱) کلیاتِ نثرِ فارسی (جو پنج آہنگ، مہرِ نیم روز اور دستنبو کا مجموعہ ہے)

(۲) پنج آہنگ (مجموعۂ مکاتیبِ فارسی۔)

۱۔ مکاتیب: ۵۹ (۲) ایضاً: ۵۸ (۳) ایضاً: ۵۸ (۴) ایضاً: ۵۹

(۳) قاطع برہان، فارسی لغت کی مشہور کتاب برہانِ قاطع کے اغلاط پر مشتمل ایک رسالہ۔

(۴) درفشِ کاویانی، (قاطعِ برہان کا مرمہ نسخہ)،

(۵) سبدِ چین (جس میں وہ فارسی اشعار ہیں، جو کلیاتِ نظم کی طباعت کے بعد کہے گئے تھے)

(۶) باغِ دودر۔ یہ سبدِ چین کا دوسرا نسخہ ہے۔ میرزا صاحب نے اسے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا حصہ وہی ہے جو سبدِ چین کے نام سے چھپا تھا صرف چند نظموں کا اضافہ ہوا ہے۔ دوسرا حصہ اُن نثروں پر مشتمل ہے، جو کلیاتِ نثرِ فارسی میں چھپنے سے رہ گئی تھیں۔ دیباچے میں ۱۲۸۳ھ سالِ تالیف لکھا ہے۔ اس کا قلمی نسخہ جناب وزیر حسن صاحب ایم۔ اے (دہلی) کے پاس محفوظ ہے۔

(۷) عودِ ہندی }
(۸) اردوی معلیٰ } (مکاتیبِ اردو کے مجموعے)

(۹) نکات و رقعات، (قواعدِ فارسی سے متعلق ضروری ہدایات اور چند فارسی خطوط کا مجموعہ)

(۱۰) قادر نامہ[۱]، (خالق باری کی طرز کا رسالہ)

(۱۱) تیغِ تیز،

(۱۲) لطائفِ غیبی، (جو میاں داد خاں سیاح کے نام سے میرزا صاحب نے شائع کی تھی)

۱۔ بعض حضرات کو قادر نامے کے تصنیفِ غالب ہونے میں شبہہ ہے۔ لیکن کتاب خانۂ رامپور میں اس کا ایک ایسا مطبوعہ نسخہ موجود ہے، جو سنہ ۱۲۸۰ھ میں خود دہلی کے محمدی پریس میں چھپا تھا اس میں نہایت صفائی کے ساتھ اسد اللہ خاں غالب دہلوی کو اس کا مؤلف بتایا ہے۔ اس شہادت کے سوا خود اشعار، بالخصوص دو موتے کی غزلوں، سے غالب کی شوخی اور ندرتِ بیان اتنی ہویدا ہے کہ جو اصحاب غالب کی افتادِ طبع سے کما حقہ واقف ہیں، ایک لمحے کے لیے بھی اسے غالب کے علاوہ کسی دوسرے کا نتیجۂ طبع تسلیم نہیں کر سکتے۔

(۱۳) ترجمۂ دعای صباح۔ (ایک چھوٹی سی فارسی مثنوی ہے^1 جو امیرالمومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب ایک عربی دعا کا منظوم ترجمہ ہے غالب کے حقیقی بھانجے میرزا عباس بیگ صاحب کی فرمایش پر سنہ ۱۲۸۴ھ سے پہلے مطبع نولکشور لکھنؤ میں چھپی تھی۔ بعد ازاں رسالۂ نگار لکھنؤ کے ماہِ مئی سنہ ۱۹۲۱ء کے پرچے میں حقیر عرشی کی ایک مختصر تمہید کے ساتھ شائع ہوئی۔

(۱۴) میرزا صاحب نے شاہ ظفر کی طرف سے ایک فارسی مثنوی بھی لکھی تھی جس میں اس افواہ کی تردید کی گئی تھی کہ بادشاہ نے مذہب اہل تشیع اختیار کرلیا ہے۔ سلطان العلما مولانا سید محمد صاحب لکھنوی کو خود میرزا صاحب لکھتے ہیں :

"در نگارش مثنوی مضمون از خسرو است و لفظ از من، چنانکہ در راستی زینہ از معنی و عدد از تار است"

اس مثنوی کے ۴۴ شعر ہیں۔ کلام کا آغاز اس طرح کیا گیا ہے :

حق پرستان و معدلت کیشان ہاں ہاں، ای قبیلۂ اندیشان
رازداناں دین و دانش و داد تر زبانانِ وصف جد و جہاد
نو بر نخلۂ حوادث نیست شاہی ماید ہر حادث نیست
منتہی تا بہ یافتہ اُ غلانش یافت ہر کس کہ حجت عنوانش

(۱۵) اسمای فارسی۔ قادر نامے کے مجلس پریس والے نسخے کے آخر میں فراہی کی نصاب البیان کے انداز پر ۱۱ فارسی قطعے مذکورۂ بالا نام سے چھاپے گئے ہیں۔ پوری کتاب کے سرورق پر یہ عبارت درج ہے: الحمدللہ والمنۃ کہ نسخۂ کثیر المنفعت قلیل الحجم مسمی بہ قادر نامہ و اسمای فارسی از تصنیف خاقانی زمان دبیرالملک مرزا اسداللہ خاں غالب باہتمام کنھیا لال دارو غہ در مجلس پریس دہلی طبع شد۔"

1- کلیات نثر فارسی: ۲۲۹ (م)۔ یہ پوری مثنوی متفرقات غالب مرتبۂ پروفیسر سید مسعود حسن صاحب رضوی میں شائع ہو چکی ہے۔

اس عبارت سے مترشح ہے کہ اسمای فارسی بھی غالب ہی کی تصنیف ہے۔ کتاب کے آخری بے نقط قطعے کے انداز سے مذکورہ خیال کی بڑی حد تک تائید ہوتی ہے۔ واللہ اعلم عند اللہ۔

تلامذۂ رامپور

میرزا صاحب کے رامپوری شاگردوں میں سے حسبِ ذیل حضرات کا ذکر زیرِ نظر مکاتیب میں آیا ہے:

ناظم

یہ نواب فردوس مکاں کا تخلص ہے۔ آپ فروری سنہ ۱۸۵۷ء میں میرزا صاحب کے شاگرد ہوئے۔ ابتدائی چند غزلوں میں یوسف تخلص کیا۔ بعد ازاں میرزا صاحب کے مشورے پر ناظم لکھنے لگے۔

میرزا صاحب کے قیامِ دہلی کے باعث، زیادہ تر خط کتابت کے ذریعے اصلاح عمل میں آتی تھی۔ سرکار اپنے مسودے خوشنویس سے صاف کرا کے میرزا صاحب کے پاس بھیجتے۔ اصلاح ہو کر غزلیں واپس آتیں، تو ملاحظے کے بعد خوشنویس سے بشکلِ دیوان لکھا کر رکھ لیتے۔ حُسنِ اتفاق سے اصلاحی مسودوں میں سے چند کتاب خانے کے ردّی گھر میں دستیاب ہو گئے ہیں۔ اُن میں سے چند اشعار یہاں نقل کیے جاتے ہیں، جن پر میرزا صاحب نے صاد کیا ہے۔

اِن شعروں پر تین صاد کیے ہیں:

حیلۂ پیروئ شرع کہاں سے سیکھا؟ قبرِ عاشق کا نشاں خوب مٹایا تو نے
کی بھلائی بھی، تو کس نخوت و پندار کیساتھ بختِ خوابیدہ کو ٹھوکر سے جگایا تو نے

خاطر تو جمع ہے کہ نہیں بعدِ حشر موت ناظم گذر ہی جائے گا روزِ شمار بھی

مارا ہے اس طرح کہ عجب کیا ہی، گر ہو محشر میں زندہ ہونے کا میرے یقیں تجھے

ان شعروں پر دو صاد کیے ہیں :

چاہیے تجھ سے رہیں بندہ و آزاد طول ق چاہیے تجھ سے کریں کا فرو دیندار لحاظ
نہ تجھے حشر کا ، اے فتنۂ ایام خیال نہ تجھے خلق کا ، اے شوخ ستمگار لحاظ

ان بیتوں پر ایک ایک صاد ہے :

دیکھنا شوخی کہ میرا پوچھتے پھرتے ہیں گھر سُن لیا ہے یہ کہ اُسکو کچھ نہیں گھر سے غرض

بات کی پیچ ہی جو ناصح سے کیا کرتا ہوں بحث ورنہ دل دینے سے ہو مجھ خوشی دشتیاں آجکل

آستیں بھی نچوڑ ڈالیں گے اشک کے پوچھنے سے فرصت ہو

ملط سہی اثر آہ و نالہ پر ناظم رہے نہ دل میں ہوس آزمائی کر دیکھو

طریقِ عشق میں ہرگز رہا نہ میں بیکار جو گر پڑا ، تو قدم میں نے پاسباں کیلیے

عبث ہے خوفِ شکایت کسی کے ملنا و رہے ہیں یاد ستمہائے بیشمار کسے

میرزا صاحب کے تمام شاگردوں میں یہ فخر صرف نواب ناظم کو حاصل ہے کہ اُنھوں نے اپنے اُستاد کے انداز خاص کو سب سے زیادہ اپنایا ہے اس رائے کی تقویت کے لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے کچھ اور منتخب اشعار پیش کیے جائیں - فرماتے ہیں :

طولِ شبِ ہجر جانتا ہوں مرنا مجھے لاکھ بار ہوگا

عیسیٰ کا بھی علاج کئی بار ہو چکا اچھا غمِ فراق کا بیمار ہو چکا
اب کیوں کمی کرے تجھے کس کا لحاظ ہے روئے کا نام دیدۂ خونبار ہو چکا

بلبلاہے امتحانِ وفا میں مزا ہنوز — ناظم، اگرچہ تجربہ سو بار ہو چکا

میں بھی ہوں، حضرتِ ناصح، دانا — کچھ سمجھ کر مجھے سمجھائیے گا
تم نہیں قول و قسم کے سچے — جھوٹ کہتا ہوں، قسم کھائیے گا

مے میں یہ بات کہاں جو ترے دیدار میں ہے — جس کو دیکھا کہ گرا، پھر نہ سنبھلتے دیکھا
دل کے پینے میں یہ قدرت اُسے اٹھنے دی — جس کو مٹی کے کھلونے پہ مچلتے دیکھا

وہ کون ہے جو نہیں چاہتا کہ کام بنے — پر اختیار میں بھی ہو درست کر لینا
کہاں کی نیند، ادا حبیب یہ اُس کی یاد آجائے — اُٹھا کے تکیے سے بازو پہ سر کو دھر لینا

چاہو تم ادھر ہو آزردہ، یہ مانا ہم نے — شرطِ انصاف نہیں شکوے کو بیجا کہنا

تپش و زاری و تنہائی و سرگردانی — گھر میں سب کچھ ہمیں موجود ہے، صحرا کیسا

آبرو کیا، پیرہن جیب بے گریباں رہ گیا! — بارے آنسو پُنچھ گئے میرے کہ داماں رہ گیا
دیکھنے کو میرے آیا، لوحش اللہ، مرحبا! — مر تے مرتے مجھ پہ اُس ظالم کا احساں رہ گیا
آدمی پر راز حسن بے نشاں کیونکر کھلے! — جس قدر ظاہر ہوا اُتنا ہی پنہاں رہ گیا

ہمنشیں، خستگیِ دل کا ہوا غم تجھ کو — یہ نہ دیکھا کہ مرے دل میں ہے پیکاں کس کا؟

دکھتی کہوں اور کہ نہ سکو مجھ سے شکایت — اُس چشمِ فسوں ساز کو بیمار کہوں گا

شرمندہ ہوے پر کہیں ضد اور نہ بڑھ جاے — عہد اُس کا اُسے یاد دلانا نہیں اچھا
غم کھانے میں کچھ نفع بھی ہوتا ہے کہ ناصح — کہتا ہے کہ غم بیہدہ کھانا نہیں اچھا

وہ عذرہای مُوَجَّہ سُنے کہ کیا کہیے — ہوے ہم اُن سے گلہ کر کے شرمسار بہت
زمیں پہ گر کے بھی ہوتی نہیں شراب تلف — کہ زیرِ خاک ہیں رندانِ بادہ خوار بہت

نہ ثواب اُس میں ہے، نہ اِس میں اثر — صبر بیہودہ، اضطراب عبث

شداد، شکر کر کہ گئی در پہ تیری جان — جب تھا مقامِ شکوہ کہ مرتا ارم سے دور
دم بھر میں جا پہنچتے ہیں، یاں کے مقیم واں — یہ مرحلہ نہیں ہے سوادِ عدم سے دور

گالیاں دینے میں تم کو نہیں زنہار لحاظ — پوچھیے بات، تو ہو مانعِ گفتار لحاظ
سچ ہے، تھا عہدِ وفا کے دل اُسکو دینا — آگیا وقت پہ کرتے ہوے تکرار لحاظ
جیب و دامن کو کیا سر بسر آلودۂ خوں — کچھ نہ آیا تجھے، اے دیدۂ خونبار لحاظ

مٹی نہ وصل میں بھی کلفتِ زمانِ فراق — تمام رات کہی ہم نے داستانِ فراق
خوشا حبیب و ادا ہای دلستانِ حبیب! — بدا فراق و المہای جانستانِ فراق!
جگر گداز ہے کیا گرمیِ نگاہِ عتاب! — جگر شگاف ہے کیا تیزیِ سنانِ فراق!

ہمنشیں، صورتِ آرایشِ عالم کب تک؟ — جاودانی سہی نقش، مگر ہم کب تک!
کون ہوگا کہ نہ ہو معتقدِ فصلِ بہار — موسم اچھا ہے، پہ یہ کہیے کہ موسم کب تک!
کیا نہ سوکھیں گے سرِشک اور نہ دم ٹوٹے گا — گریہ پے در پے و فریاد دمادم کب تک؟

جبر سے ہیں نے کیا ہے اُس کو مہماں آجکل — بن رہا ہے گھر مِرا کنعاں کا زنداں آجکل
آگیا برسات کا موسم، وہ اب کیوں آئیں گے — اُن کے ہاتھ آیا ہے عذرِ باد و باراں آجکل

شہرت نہیں مجنوں کی برابر، یہ مسلم — پر کوئی نہ جانے ہیں، ایسے بھی نہیں ہم
ہستی سے ہیں بہرہ ملا ہے فقط اتنا — ہیں مثلِ سحر ایک دمِ بازپسیں ہم

یہ ظلم جو تم کرتے ہو، بیجا نہیں گویا — کہتے ہو جسے "شکوۂ بیجا نہ کرو تم"
سنتے دام نہ دانہ، فقط اک شرط وفا کی — کیوں آکے پھنسے کوئی، اگر ایسا نہ کرو تم
ہم تم کو بُرا کہتے ہیں یا خو کو تمہاری — لو خو کی بھی اچھی کہی، جھگڑا نہ کرو تم

فسانۂ ستمِ ہجر ہے، سوال نہیں — نہ دو جواب، سُنے جاؤ، کچھ ملال نہیں
سُنا بھی تم نے تو کس سے سُنا، خدا کی پناہ! — کہا ہے غیر نے جو کچھ، وہ میرا حال نہیں

مزا دیتا ہے تنہائی میں رونا — کہ اک دریا رواں ہے اور میں ہوں
وصالِ دائمی کا ہے تصوّر — بہارِ بے خزاں ہے اور میں ہوں

دل سخت ہے کافر کا، پر آنکھوں میں حیا ہے — سُنتے ہی جفا کا گلہ شرما گئیں آنکھیں
دل دیکھے رہا گریۂ خونیں کا مجھے شغل — باقی تھا جگر، سو اُسے یوں کھا گئیں آنکھیں

مِل جاتے ہیں، تو کہتے ہیں: "اچھی طرح تو ہو؟" — گویا ہمارے جی میں کچھ ارمان ہی نہیں

حبیب ترا نام سنا، تو نظر آیا گویا — کس سے کہیے کہ تجھے کان سے ہم دیکھتے ہیں
ذرّہ و مہر و گل و خار میں ہر سو موجود — دیکھتے ہیں تجھے، گر دھیان سے ہم دیکھتے ہیں

کہتے ہو جائیں گے، پھر کیوں نہیں جاتے، جاؤ — میرے جینے کی مجھے راہ بتاتے جاؤ
غصہ کیسا؟ نہ مجھے زجر، نہ درباں کو نہیب — در تک آتے ہو، تو آواز سناتے جاؤ
میں نے چونکا بھی، تو کیا تم نے تماشا دیکھا — گھر کو، اچھا ہے، تمھیں آگ لگاتے جاؤ

عاشق ہوے سے کم نہوئی اُس کی سرکشی — معشوق سے ہے عربدہ نازو ادا کے ساتھ
مُنھ تک رہے ہیں بوسے کے سائل بنے ہوئے — اک نوع کا غرور بھی ہے التجا کے ساتھ

فرہادِ ہوس پیشہ نے بھی دی تو سہی جان — پر شیوۂ اربابِ وفا اور ہی کچھ ہے
ہم زہد و عبادت کے بھی منکر نہیں، ناظم — پر قاعدۂ فقر و فنا اور ہی کچھ ہے

ہمیں ہے حضرتِ عیسیٰ کا امتحاں منظور — کہے نہ کوئی کہ پھرتے ہیں ہم دوا کے لیے

کھلے کیا دل، در و دیوار کے آثار باقی ہیں — ہوا ہر چند گھر ویراں، پہ صحرا پھر بھی صحرا ہے
مسیحائی کا دم بھرتے ہو، سچ ایسے ہی ہو لیکن — کبھی اپنے مریضِ غم کو بھی پوچھا کہ کیسا ہے

کیسی شفا، کہاں کی شفا، یہ بھی چند روز — قسمت میں تھا کہ نازِ مسیحا اٹھائیے
ڈرتے ہیں محتسب سے، بھلا آئے تو سہی — اچھی کہی کہ ساغر و مینا اٹھائیے

مہر و وفا کو کوئی نہ اچھا کہے بھلا — آزردگی ہوئی بھی تو کس بات پر ہوئی
تم سے نہ ہو سوا غذر، یہ اور بات ہے — پر کیا کہو گے، ظلم کی پرسش اگر ہوئی

وہ اپنے وعدے کے سچے ہیں آئیں گے لیکن — مجالِ صبر کہاں، تابِ انتظار کسے!
نہ دل سے نالہ رُکے اور نہ آنکھ سے آنسو — کوئی کہو کہ کہے کوئی راز دار کسے

تو وہ ہے کہ گر ہم درِ گلزار سے گزرے "کیوں باغ گیا تھا" یہی تکرار نکالی
ہم وہ ہیں کہ' بدوضع' تری روز نئی بات سنتے رہے پُرمنھ سے نہ زنہار نکالی

نواب فردوس مکاں کا دیوان دو بار چھپ چکا ہے۔ مگر پہلی بار سنہ ۱۲۷۰ھ میں چھپا، تو صرف میرزا صاحب کے اصلاحی کلام پر مشتمل تھا۔ دوبارہ اُن کے صاحبزادے سید حیدر علی خاں بہادر نے سنہ ۱۲۸۶ھ میں شائع کیا، تو وہ غزلیں بھی شامل کردیں، جن میں آسیر لکھنوی سے مشورۂ سخن کیا گیا تھا۔[1]

بیتاب

نواب فردوس مکاں کے حقیقی بچانا دبھائی، اور نواب خلدآشیاں کے حقیقی ماموں تھے۔ مومن خاں مرحوم سے تلمذ تھا۔ سنہ ۱۸۶۶ء میں میرزا صاحب کے شاگرد ہوے اور مومن خاں کا دیکھا ہوا مکمل دیوان اُن کے پاس اصلاح کے لیے بھیجدیا۔ اس کی اصلاحیں بیتاب کے نام کے خطوں کے ساتھ لکھی جاچکی ہیں۔ یہاں صادی اشعار نقل کیے جاتے ہیں۔[2]

اس شعر پر میرزا صاحب نے تین صاد بنا ے ہیں:

لکھدیا لکھتے تو، لیکن پھر جو کچھ رحم آگیا رددیا اللہ نے میرا مقدر دیکھ کر

اور حاشیے پر لکھا ہے: "آپ سے پہلے میری سرنوشت پر بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ غالب"

ان شعروں پر دو دو صاد ہیں۔

کیا ہوئی مینِ جبیں؟ ہنسنے، ہو کیسے نعش پر! زندگی میں یوں کبھی صورت نہ دکھلائی ہمیں

غیر بھی کہہ نہیں سکتا ہو کہ بیتاب ہوں میں نام سے میرے ہوئی ہو اُنھیں نفرت کیسی

۱۔ دیوانِ اول کے چند نسخے کتابخانۂ رامپور میں موجود ہیں اور اہلِ ذوق کے ہاتھ فروخت کیے جاتے ہیں۔

۲۔ بیتاب کا دیوان گلدستۂ باغِ جناں کے نام سے چھپ چکا ہے۔

ان اشعار پر ایک ایک صاد ہے :

کیا پشیماں ہوے وہ مار کے ٹھوکر، افسوس! سنگِ رہ سمجھے تھے جس کو وہ مرا سر نکلا

ضد تو دیکھو کہ نہ کی غیر کی جانبداری بولنا یوں بھی اُنھیں ہم سے گوارا نہ ہوا

کوئی یوں نیم بسمل کو تڑپتا چھوڑ جاتا ہے! یہ بیرحمی تو دیکھو، کس جگہ وہ رحم کھاتا ہے

نواب خلد آشیاں

خلد آشیاں نے میرزا صاحب سے مشورۂ سخن کا آغاز فارسی نثر سے کیا تھا۔ میرزا صاحب نے تفتہ کے خط میں لکھا ہے :

"نظم کی طرف توجہ نہیں، نثر لکھتے ہیں اور خوب لکھتے ہیں۔ جلالای طباطبائی کی طرز برتتے ہیں۔"[1]

خود نواب صاحب کو تحریر کیا ہے :

"واقعی افتتاحِ کلام بطرزِ میرزا طاہر وحید اور پھر نگارش مطالب بشیوۂ میرزا جلالای طباطبائی ہے۔ لیکن دونوں صورتوں میں دیباچۂ اعجازِ خسروی کا رنگ جلوہ گر ہے۔ پس ناقدِ بصیر کے نزدیک یہ نگارش، طاہرِ وحید اور جلالا کی عبارت سے بہتر ہے۔"[2]

بہت ممکن تھا کہ فارسی نظم میں بھی اُنھیں سے مشورہ کرتے۔ مگر سوءِ اتفاق سے یہ رشتہ استوار نہ رہ سکا۔ اور اُنھوں نے اپنا فارسی کلام مورخ الدولہ سپہر کاشانی کے پاس ایران بھیجدیا۔ اُردو میں امیر مینائی کے شاگرد ہو گئے۔

آپ نے اپنے اردو اور فارسی دواوین بڑے اہتمام سے شائع فرمائے تھے[3] مگر عام طور پر اہلِ ادب اُن کے انداز سے ناآشنا ہیں۔ اس لیے بمقتضای مقام

۱- اردوی: ۱۴۲ (۲) مکاتیب: ۵۷ (۳) نواب خلد آشیاں کے دواوین کے باقی ماندہ نسخے اہلِ ذوق کے ہاتھ فروخت کیے جاتے ہیں۔

یہاں چند منتخب شعر لکھے جاتے ہیں:

ملا ہزار دسے میں مجھ سے اک زمانہ ملا — مگر خدا کی قسم! مسا یے وفا نہ ملا
ملا ہے یار، تو نواب اتنے خوش کیوں ہو؟ — خدا ملا، کوئی دولت ملی، خزانہ ملا!

ستاتا ہے ہردم نئے رنگ سے — زمانہ بھی تیری ادا ہوگیا

میں تو مرتا ہوں اپنی ہمت پر — جان دے کر بھی انفعال ہوا!

حشر تک تجھ کو مبارک یہ ہے رونا، نوابؔ — رکھدیا آنکھ پہ اُس شوخ نے دامن اپنا

ہجر میں ناتواں ہوں نے مجھے — ناز کیوں کر ترے اُٹھاؤ ں گا

کون مقتل میں سنے گا میری فریادیں، کہ تم — ہاتھ اُٹھاؤ گے، تو شورِ مرحبا ہوجائے گا

یہ کیا کیا کہ کیا دعویٰ وفا نواب — کہ اُس کو اور جفا کے لیے بہانہ ہوا!

ذوقِ دیدار مدد کر، کہ بڑے شوق سے — حوصلہ دیکھتے ہیں اپنے تماشائی کا

نوابؔ تونے وصل کا پیغام کیوں دیا؟ — کمبخت، کیا فراق میں تجھ کو مزا نہ تھا؟

نوابؔ، یوں تو اُس نے آنکھیں لڑائیں سب سے — پر دیکھنا وہی ہے، جس کو ادا سے دیکھا

اثر آیا دعا میں اُس دم، ہائے — دل میں جب کوئی مدعا نہ رہا!

کس خرابی سے دل کو تھاما ہے! ناز سے اب نہ مسکرائیں آپ

ہم تو رو رو کے جتاتے رہے الفت اپنی زیرِ لب ہنس کے وہ کہتے رہے ہر بار عبث

کی فرشتوں کی راہ ابر نے بند جو گنہ کیجیے ثواب ہے آج

دیوانہ گر کہیں گے، تو مجھ کو کہیں گے لوگ تم کیوں ہو مضطرب، مجھے بیتاب دیکھ کر؟

مرنا بہت ہے مشکل، کہتے ہو منہ بنا کر صدقے تمھارے منہ کے، دیکھو تو مسکرا کر

جاتے ہیں انتظار میں جی سے کون بیٹھا رہے قیامت تک!

شکوے نہ سننے کی ہے تغافل سے خو وہاں اٹکا ہے دم یہاں گلۂ ناتمام تک

دیا ہے بوسہ اُسے پھیر لو تو ہم جانیں یہ دل نہیں ہے کہ لیجاؤ مسکرا کر تم

ہوش میں آؤ، نہ بھولو مری نادانی پر تم کو ہشیار بنایا ہے، وہ ناداں ہوں میں"

ابھی تو بھولے ہوئے ہو، مگر یہ یاد رہے ہنوں گے ہم، تو کہو گے: "وہ یاد آتے ہیں

ایسی تو بیخودی نہیں ہوتی شراب میں کیا تم نے میرے بخت کو دیکھا ہی خواب میں

سو ظلم اب تو ہم پہ ہیں، پر کچھ بھی یاد ہے کہنا وہ بے بسی میں کہ "اللہ کیا کروں"؟

جس حشر پہ توقعِ فریاد ہے مجھے — ڈرتا ہوں، وہ بھی کوئی تمھاری ادا نہ ہو

اثر فلک سے اُتر آ ذرا خدا کے لیے! — کہ اُس نے ہاتھ اُٹھائے ہیں اجابت کے لیے

مانگیں ہیں رقیب نے دعائیں — مٹی نہ خراب ہو اثر کی

وصل میں اک نہ اک بلا آئی — جب رُکاوٹ گئی، حیا آئی

آپ کا ماتم میں آنا عذر خواہی کے لیے — حشر میں کافی ہے میری بے گناہی کے لیے

حشر میں ہو سے بن کے چھوٹ گئے — یہ نئی طرح کی شرارت تھی

اشک بہنے اور آنکھیں دو، خدایا رحم کر — اتنی ہی آنکھیں بھی دے آنسو بہانے کے لیے

یہ کس کا زخم ہے، یارب! کہ ہیں مرتے وقت — تڑپ کے بیکڑوں ٹوٹے دل و جگر کے بینے

لذت نہ پائی کچھ دلِ اُمیدوار نے — دھوکا بڑا دیا ستمِ روزگار نے

کون کہتا ہے کہ نالوں میں نہیں تاثیر کچھ — جور کرتے ہیں وہ ہم پر، اک اثر یہ بھی تو ہے

منشی

منشی سیلچند دارالانشا کے افسر کا تخلص ہے۔ اُنھوں نے نواب فردوس مکاں کے غسلِ صحت کی تاریخ کا ایک شعر لکھ کر میرزا صاحب کے پاس بغرضِ اصلاح و تکمیل بھیجا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میرزا صاحب کے شاگرد تھے۔ مزید کلام

دستیاب نہ ہو سکا۔

شوخی[1]

نادر شاہ خاں کا تخلص ہے ۔ اِن کے والد کا نام محمد ضامن خاں رسالدار اور وطن رامپور تھا۔ شوخی کی پیدائش دلّی کی ہے ۔ اوائلِ شباب میں وہیں ملازمت بھی کی ۔

سنہ ۱۸۶۰ء میں میرزا صاحب رامپور تشریف لائے، تو اُنھوں نے اپنا کلام پیش کیا۔ میرزا صاحب نے انکار کرتے ہوئے فرمایا: "تم جانتے ہو، میں نواب صاحب کا بُلایا ہوا حاضر ہوا ہوں ۔ اُنھوں نے اصلاحِ شعر کی خدمت میرے سپرد کی ہے ۔ بغیر اُن کے حکم و اجازت کے یہاں اور کسی کے کلام پر اصلاح نہیں دے سکتا[2]۔"

شوخی اس بات سے بہت مایوس ہوئے، مگر اتفاق یہ کہ میرزا صاحب کے پاس شراب ختم ہو گئی ۔ نجی ملازموں میں سے کوئی اس کا اہل نہ تھا کہ مرادآباد سے جا کر شراب لا دے ۔ شوخی آئے، میرزا صاحب نے اُن سے سارا حال کہا، وہ اس خدمت کے بجا لانے کو تیار ہو گئے ۔ میرزا صاحب نے شراب کا نام بتایا اور مزید شناخت کی خاطر خالی بوتل دکھا کر ویسی ہی ایک بوتل لانے کا حکم دیا ۔ شوخی نے گھر آ کر باپ سے منتیں کر کے روپیہ لیا، اور ایک کی جگہ ۵ بوتلیں خرید کر لا دیں۔ میرزا صاحب بہت خوش ہوئے، اور قیمت لینے پر اصرار کیا مگر شوخی نے ایک نہ مانی ۔

۱۔ زیرِ نظر مکاتیب میں شوخی کا مذکور نہ ہونے کے باعث یہاں ذکر کرنا بے جوڑ سا نظر آتا ہے۔ لیکن مولانا مہر نے اپنی کتاب میں میرزا صاحب کے قیامِ رامپور کے کچھ واقعات ان کی زبانی نقل کئے ہیں، جن کے منجملہ خود شوخی کی شاگردی کا دلچسپ واقعہ بھی ہے ۔ چونکہ میں نے بحثِ تعلقاتِ رامپور میں شوخی کے بیان سے فائدہ اُٹھایا ہے اس لئے جزاءِ احسان کے طور پر یہاں اُن کا ذکر کر رہا ہوں ۔

۲۔ ممکن ہو کہ میرزا صاحب شوخی کو ٹالنا ہی چاہتے ہوں۔ لیکن اُنھوں نے نواب زین العابدین خاں عرف کلن میاں کے کلام پر اصلاح دینے سے انکار کی جو وجہ بیان کی تھی، وہ بھی سرکار سے استجازت تھی ۔ اس سے یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ وہ سلسلے جذبۂ رقابت و رشک کے خوف سے میرزا صاحب فی الواقع سرکار کے اعزا اور رعایا دونوں سے اُستادانہ تعلق پیدا کرنے کو مصلحت کے خلاف جانتے تھے، اور اسی لئے بے اجازت اصلاح دینے سے بچتے تھے ۔

دوسرے دن شوخی حاضر ہوئے، تو میرزا صاحب نے فرمایا: "وہ تمھاری غزل کہاں ہے، جو اُس دن لائے تھے"؟ شوخی نے فوراً جیب سے نکال کر غزل پیش کر دی۔ میرزا صاحب نے اُسے دیکھ کر جا بجا اصلاح دی۔ اصلاح دیتے جاتے تھے، اور ساتھ ساتھ ہدایات و افادات کا سلسلہ بھی جاری تھا۔

اس کے بعد شوخی دہلی جا کر کئی ماہ تک میرزا صاحب کی خدمت میں رہے (۱)

وسطِ عمر میں شوخی بنارس چلے گئے تھے، اور کلکٹری کے نائب ناظر اور پیشکار کی خدمات انجام دینے کے ساتھ میرزا صاحب سے مشورۂ سخن بھی کرتے رہے۔ (۱)

مولانا ابوالکلام آزاد نے اُن کے پاس ایک قطعہ دیکھا تھا، جس پر میرزا صاحب کے قلم کی اصلاحیں تھیں۔

نمونۂ کلام یہ ہے:

ہوں کسی حالت میں، پر غصہ ہو اس دلگیر پر — خود بخود بل آگیا پیشانیِ تصویر پر

ہر ہر سخن پہ جان نہ دینے کا ہے گلہ — اک بات آگئی ہے بُتِ خود نما کے ہاتھ

بنا کروں کوئی میخانہ، جی میں ہے، شوخی — کہ بعد مرگ زمانے میں یادگار رہے

کچھ روز جوانی کے مزے لینے دے زاہد — دو چار برس میں تو قیامت نہیں ہوگی

(۱) غالب: ۱۴۴، طبع ثانی (۲) خمخانہ: ۵، ۷۷۔

لوازماتِ امارت

شاگرد پیشہ

۱۰ اگست سنہ ۶۰ء کے عریضے میں میرزا صاحب نے اپنے ملازموں کا بھی اجمالی ذکر کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

"حضور کے عطیے پر میرا اور شاگرد پیشے کا اور حسین علی خاں کا گزارہ ہے۔ عالم الغیب جانتا ہے جس طرح گزرتی ہے۔"(۱)

۱۵ نومبر سنہ ۶۰ء کو پھر لکھتے ہیں:

"متعلقین شاگرد پیشہ اور لڑکے قرض متفرقہ میں جا کر لو روپے بچیں گے۔"(۲)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مالی پریشانی کے باوجود میرزا صاحب امیرانہ ٹھاٹھ رکھتے تھے۔ ان میں سے بعض کا تذکرہ میرزا صاحب کے دوسرے سفرِ رامپور کے ضمن میں آئے گا۔

شاگرد پیشے کی تنخواہ

میرزا صاحب نے نومبر سنہ ۱۸۶۰ء میں نواب خلد آشیاں کو اپنے ماہوار مصارف کی جو روداد لکھی ہے، اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں ہر مہینے ۳۰ رُپے نوکروں کی تنخواہ کے ادا کرنا پڑتے تھے(۳) لیکن ۱۲ نومبر سنہ ۶۵ء کو رامپور سے حکیم غلام نجف خاں کو مختار کار کی شکایت میں لکھا ہے:

"خفا ہوں کہ...... چشا ۳۲ روپے ۸ آنے کا نہ بانٹا۔"(۴)

ظاہر ہے کہ دو سال کے اندر ملازموں کی مقدار میں اتنا اضافہ ممکن نہیں کہ ۳۲ کی جگہ ۶۲ رُپے کا ماہوار خرچ ہو جائے۔ اس لیے یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ یا تو میرزا صاحب نے سرکار کی ہمدردی حاصل کرنے کی غرض سے واقعی صرف سے زیادہ لکھا، اور یا حکیم صاحب کے خط میں کاتب نے ۳۰ کی دہائی کو غلطی سے دو پڑھ لیا۔ چونکہ ۲ اور ۳ میں اکثر دھوکا

(۱) مکاتیب: ۵۵ (۲) ایضاً: ۷۷، ۹۳ (۳) خطوط: ۱، ۲۳۱

ہو جاتا ہے، اس لیے میں یہی خیال کرتا ہوں کہ کاتب نے سہواً یا غلط پڑھ کر ۶۳ کی جگہ ۶۲ لکھ دیے ہیں۔

مختار کار

میرزا صاحب نے ۱۳ اگست سنہ ۱۸۶۶ء کے عریضے میں مختار کار کا بھی ذکر کیا ہے، فرماتے ہیں:

"آج آخر روز توقیع وقیع مع جولائی کی تنخواہ کی ہنڈوی کے پہنچا۔ ہنڈوی مختار کار کو دی اور یہ عرضی لکھنے بیٹھا۔"(۱)

بعد ازاں ۱۰ ستمبر سنہ ۱۸۶۰ء کو منشی سیل چند کے نام کے مکتوب میں لکھتے ہیں:

"اگلے مہینے یعنی اگست ۱۸۶۰ء کی تنخواہ کی ہنڈوی جو تم نے بھیجی تھی اس کا روپیہ ابھی تک نہیں پٹا۔ بس تو جس دن ہنڈوی آتی ہے، اسی دن یا دوسرے دن اپنے مختار کار کے ہاتھ کہ وہ بھی مہاجن ہے، بیچ ڈالتا ہوں۔ مگر اس مختار کار کو جس کے ہاں ہنڈوی آتی ہے، اس نے روپیہ اب تک نہیں دیا۔"(۲)

اس بیان سے مترشح ہے کہ مختار کار سے کوئی تنخواہ دار ملازم مراد نہیں ہے بلکہ میرزا صاحب کا جس مہاجن سے لین دین تھا اُسی سے میرزا صاحب مختاری کا کام بھی لیتے تھے۔ حکیم غلام نجف خاں کے محولۂ بالا خط سے مختار کار کا نام بھی معلوم ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں:

"کدار ناتھ لڑکا ہے۔ وہ مجھ سے کیا خفا ہوگا؟ روپیہ جو خزانے میں جمع ہوگا آخر وہی لائے گا۔ خفا میں ہوں کہ روپیہ دام دام لیا میرا نمک نہ دیا، اور چھ ۲۳ روپیہ آٹھ آنے کا نہ بانٹا۔"(۳)

---

(۱) مکاتیب: ۵۹ (۲) ایضاً: ۱۱۳ (۳) خطوط: ۱/ ۲۳۱

انگریزی تعلقات

دیرینہ نمکخوار

حکومتِ انگلشیہ سے میرزا صاحب کے تعلق کا آغاز، اُن کے چچا نصراللہ بیگ خاں بہادر کے توسط سے ہوتا ہے۔ نصراللہ بیگ خاں بہادر انگریزی فوج میں رسالدار، اور پرگنۂ "سونک سونسا"(۱) کے جاگیر دار تھے۔ میرزا صاحب اپنے والد کے انتقال کے بعد چچا کی سرپرستی میں پرورش پا رہے تھے کہ سنہ ۱۸۰۶ء میں نصراللہ بیگ خاں بہادر کا انتقال ہوگیا۔ لارڈ لیک بہادر نے دیرینہ خدمات کا لحاظ کرکے، جاگیر کے عوض اُن کے متعلقین کی ۵ ہزار نقد پنشن مقرر کردی، اور اس طرح میرزا صاحب انگریزوں کے وظیفہ خوار بن گئے۔

یہ پنشن نصراللہ بیگ خاں بہادر کے نسبتی بھائی نواب احمد بخش خاں بہادر، والیٔ فیروزپور جھرکہ، کے خزانے سے ملتی تھی۔ لیکن اُن کے جانشین، نواب شمس الدین احمد خاں بہادر، کو ولیم فریزر، ریزیڈنٹ دہلی، کے قتل کرانے کے الزام میں پھانسی دیدی گئی، اور فیروزپور کی جاگیر ضبط ہوگئی، تو میرزا صاحب اور دیگر ورثای نصراللہ بیگ خاں کی پنشن خزانۂ کلکٹری، دہلی سے تقسیم ہونے لگی اور اپریل سنہ ۱۸۵۷ء تک میرزا صاحب کو ملتی رہی۔

اپنی اس "دیرینہ نمکخواری" کے متعلق نواب فردوس مکاں کو تحریر کرتے ہیں:

"حائی رای جہان آرای باد کہ دیرینہ نمکخوار سرکار انگریزیم، و از میرآغاز سالِ یکہزار و ہشت صد و شش کہ و ساتگاہ شمار سنین عمر من از دہ نگزشتہ بود، بعوضِ جاگیر عم حقیقی نسبی خود، نصراللہ بیگ خان بہادر، کہ با جمعیت

---

(۱) تاریخ سلطنت انگلشیہ (ص ۸۵ طبع مراد آباد سنہ ۱۸۶۷ء) میں لکھا ہے کہ "سنہ ۱۸۰۵ء میں سونک سونسا سہار متصل آگرہ قبضۂ سرکار میں آیا"۔

رسالۂ چہار صد سوار بمعیت جرنیل لارڈ لیک بہادر در فتح ہندوستان کوششہای نمایان کردہ، وپرگنۂ سونک سونسا بقید حین حیات جاگیر یافتہ، وہم دران عہد برگِ ناگاہ از جہان رفتہ بود، بفرمانِ جرنیل لارڈ لیک بہادر و منظوریٔ گورنمنٹ، مشتِ زری شاملِ جاگیرِ عم سبیٔ من، نواب احمد بخش خان بہادر، در وجہ معاشِ من منجملۂ زر استمراریٔ سرکاری کہ بذمۂ نواب احمد بخش خان بہرِ دوام واجب الادا بود، قرار یافت۔ چون جانشینِ احمد بخش خان کیفرِ کردار یافت و جاگیر بسرکار بازیافت شد، رسیدنِ آن وجہ مقرری از خزانہ کلکٹریٔ دہلی صورت پزیرفت، چنانکہ تا انجامِ اپریلِ سنہ ۱۸۵۷ء از کلکٹریٔ دہلی یافتہ ام۔" (۱)

دربار اور خلعت

پنشن خوار کی حیثیت سے میرزا صاحب اہم شخصیت کے مالک نہ تھے۔ اُنھیں ساڑھے سات سو رُپے سالانہ یا ساڑھے باسٹھ رُپے ماہوار کا معمولی وظیفہ ملتا تھا۔ نواب خلد آشیاں کو ۵ ستمبر سنہ ۱۸۶۶ء کے عریضے میں لکھا ہے:

"میں مہینا انگریزی سرکار سے بعوض جاگیر پاتا ہوں۔" (۲)

دراصل اُن کا حقیقی اعزاز یہ تھا کہ گورنر جنرل کے دربار میں داہنی صف میں دسواں نمبر اور سات پارچے کا خلعت مع جیغہ، سرپیچ و مالای مروارید پاتے تھے۔ نواب فردوس مکاں کو یہ تفصیل لکھتے ہوئے فرماتے ہیں:

"میں انگریزی سرکار میں علاقہ ریاست دودمانی کا رکھتا ہوں۔ معاش اگرچہ قلیل ہے، مگر عزت زیادہ پاتا ہوں۔ گورنمنٹ کے دربار میں دسواں نمبر اور سات پارچے اور جیغہ، سرپیچ، مالای مروارید خلعت مقرر ہے۔" (۳)

غدر اور قصورِ خدمت

سرکارِ انگریزی سے میرزا صاحب کے تعلقات ۱ سنہ ۵۷ء تک خوشگوار

(۱) مکاتیب: ۸ (۲) ایضاً: ۷۳ (۳) ایضاً: ۱۵۔

تھے۔ جب دہلی اور دیگر اطرافِ ملک میں انگریزوں کے خلاف فوج اور رعایا نے بغاوت کا جھنڈا بلند کیا، اور بہادر شاہ ظفر مطلق العنان حکمران قرار دے گئے، تو میرزا صاحب کے لیے گوشہ گیری کے سوا کوئی چارہ کار نہ رہا؛ کیونکہ اگر اپنی محسن سرکار کا ساتھ دیتے، تو باغی گھر بار لوٹ لیجاتے، اور اہلِ قلعہ کی کھلم کھلا حمایت کرتے، تو بصورت ناکامی انگریزوں کی طرف سے بدسلوکی کا خوف تھا۔ نصیب کی تائید سے میرزا صاحب کی تدبیر کارگر ہوئی اور وہ دہلی کے اندر باغیوں کے ساتھ "بباطن بیگانہ و بظاہر آشنا" ایام گزاری کرتے رہے۔ جب انگریزی فوج نے شہر فتح کیا، اور اُن اشخاص کی دار و گیر شروع ہوئی، جنھوں نے باغیوں کی جنبہ داری کی تھی، تو بہت سے شہری خوف کے مارے اِدھر اُدھر بھاگ گئے۔ میرزا صاحب اس وقت بھی اپنی جگہ سے نہ ہلے۔ شہر میں تحقیقات شروع ہوئی، مخبروں نے اطلاعیں بہم پہنچا کر باغیوں کی تلاش میں گورنمنٹ کی مدد کی۔ میرزا صاحب بھی قلعہ کے وظیفہ خوار تھے۔ چاہیے تھا کہ حکام انھیں بھی بُلاتے اور پُرسش و جوکرتے، مگر ایسا نہ ہوا خود میرزا صاحب نے کسی حاکم سے اس لیے ملنا مناسب نہ جانا کہ موجودہ اصحاب میں اُن کا کوئی شناسا نہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ عرصے کے لیے اُن کے تعلقاتِ انگریزی منقطع ہو گئے۔ دورانِ بغاوت میں، نواب فردوس مکاں نے انگریزوں کی بڑی امداد کی تھی۔ میرزا صاحب اس حقیقت سے واقف تھے۔ جب غدر کی آگ بجھ گئی، تو انھوں نے ۱۴ جنوری سنہ ۱۸۵۸ء کو اپنی روداد نواب صاحب کو لکھ کر آخر میں عرض کیا:

"راستی اینکہ دریں فتنہ و آشوب خدمتی بجا نیاوردہ ام لیکن مقام شکایت کہ بہ تقدیم رسیدن خدمت ازراہ بیدستگاہی ست و ذریعہ اخلاص بخلوص ہمان بی گناہی ست"(۱)

---

۱ - مکاتیب: ۹

بعدازاں ، نومبر ۱۸۵۸ء کو تحریر کیا ہے:

"خدا کا شکر ہے کہ با وجود تعلق قلعہ کسی طرح کے جرم کا بہ نسبت میرے احتمال بھی نہیں۔"(۱)

اسی سلسلے میں ، نومبر سنہ ۱۸۵۹ء کو لکھتے ہیں:

"اب تک میں اپنے کو یہ بھی نہیں سمجھا کہ بگناہ ہوں یا گنا ہگار، مقبول ہوں یا مردود، مانا کہ کوئی خیرخواہی نہیں کی جو شائے انعام کا مستحق ہوں، لیکن کوئی بیوفائی بھی سرزد نہیں ہوئی جو دستور قدیم کو برہم مارے۔"(۲)

مسدودیِ دربار وخلعت و پنشن

میرزا صاحب نے ایام غدر میں جو روش اختیار کیا تھا، اس کی بنا پر حکومت انگلشیہ کی نظر میں مجرم ثابت نہ ہوے کہ سزا دیجاتی لیکن کسی خاص خدمت کے انجام نہ دینے کے سبب سے اس کے بھی مستحق خیال نہ کیے گئے کہ پنشن، دربار اور خلعت بحال رکھا جائے۔ چنانچہ یہ تینوں اعزاز بند ہوگئے۔ نواب فردوس مکاں کو، نومبر سنہ ۱۸۵۹ء کے عریضہ میں دربار وخلعت کے ذکر کے بعد لکھا ہے:

"لارڈ ہارڈنگ صاحب کے عہد تک پایا۔ لارڈ ڈلہوسی یہاں آئے نہیں۔ اب یہ نواب معلی القاب آتے ہیں۔ زمانے کا رنگ اور۔ کوئی حاکم کوئی سکتر میرا آشنا نہیں۔ بڑے میرے مربی قدر دان جناب اڈمنسٹن صاحب وہ بھی چیف سکتر نہ رہے، لفٹنٹ گورنر ہوگئے۔ وہ سکتر رہتے، تو مجھے کچھ غم نہ تھا۔"(۳)

پنشن کی مسدودی کے بارے میں ۲۴ جنوری سنہ ۱۸۵۰ء کے محولۂ بالا عریضے میں لکھتے ہیں:

"چنانکہ تا انجام اپریل سنہ ۱۸۵۰ء از کلکٹری دہلی یافتم۔ مازمئی

۱- مکاتیب: ۱۱ (۲) ایضاً: ۱۵ (۳) ایضاً: ۱۵

خود آشکار است کہ حال چیست "۱

اس کے بعد، نومبر سنہ ۱۸۵۸ء کو تحریر کرتے ہیں:

"جنابِ عالی، طرفہ معاملہ ہے۔ خدا کا شکر ہے، اور اپنی قسمت کا گلہ ہو ..... قسمت کا گلہ یہ کہ عطائی جنن تدیم کا حکام کو خیال بھی نہیں۔ یہ نومبر سنہ ۱۸۵۸ آٹھواں مہینا ہے۔ گویا بن کھائے جینا ہے" ۲

پنشن کی بحالی کی کوشش

مئی سنہ ۱۸۰۶ء سے اپریل سنہ ۵۷ء تک میرزا صاحب کو خاندانی وظیفہ ملتا رہا۔ مئی میں غدر ہو گیا اور چند ماہ تک اہلِ دہلی اور گورنمنٹ کے تعلقات منقطع رہے۔ فتحِ دہلی کے بعد، جنوری سنہ ۵۸ء تک میرزا صاحب نے اس لیے تجدیدِ راہ و رسم کی سعی نہ کی کہ آشنا حاکموں میں سے اب کوئی نہ رہا تھا، اور نئے حکام سے ملاقات کی تقریب کوئی خدمت ہوتی چاہیے تھی، جو ازراہِ احتیاط انھوں نے انجام نہیں دی تھی۔ چنانچہ ۱۴ جنوری سنہ ۵۸ء کے عریضے میں نواب فردوس مکاں کو لکھا ہے:

"واز سر آغازِ سال ۱۸۰۶ ... بعوضِ جاگیرِ عم حقیقیٔ نسبیٔ خود ... مشتہ زری ... در وجہِ معاشِ من .... قرار یافت .... چنانکہ تا انجام اپریل سنہ ۱۸۵۷ء از کلکتریٔ دہلی یافتہ ام۔ وازینجا خود آشکار است کہ حال چیست .... می بایست کہ خود سلسلہ جنبان گشتمی و با حکام پیوستمی درین بارہ سخن آنست، کہ درین زمانہ حاکمان با ہیچ کس سابقۂ معرفتی ندارم۔ و معہذا موقع و محلِ آن نمی نگرم کہ نامہ نویسم، و خواہشِ ملاقات بمیان آورم۔ راستی اینکہ درین فتنۂ و آشوب خدمتی بجا نیاوردہ ام" ۳

لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ۱۴ جنوری اور ۲۵ مارچ سنہ ۵۸ء کے درمیان ہی بحالی پنشن کی سلسلہ جنبانی شروع کر دی تھی۔ اس لیے کہ نواب فردوس مکاں کی یادداشت

۱- مکاتیب: ۸ (۲) ایضاً: ۱۱ (۳) ایضاً: ۸ و ۹

دعوتِ رامپور کے جواب میں، صاحبزادہ سید زین العابدین خاں بہادر کو ۲۵ مارچ سنہ ۵۸ء کو لکھتے ہیں:

"میں نے اپنے پنشن کے باب میں چیف کمشنر بہادر کو درخواست دی تھی۔ وہاں سے صاحب کمشنرِ شہر کے وہ درخواست حوالے ہوئی۔ صاحبِ کمشنرِ دہلی نے صاحب کلکٹر شہر سے کیفیت طلب کی ہے۔ پس اگر وہ کیفیت پنشن کی ہے، تو یہاں کی کلکٹری کا دفتر اگر نہیں رہا، نہ رہے، ریوینو بورڈ کے دفتر اور لفٹنٹ گورنریِ آگرہ اور نواب گورنر جنرلِ کلکتہ کے دفتر، اس پنشن کی کیفیت سے خالی نہیں ہیں۔ اور اگر میری کیفیت مطلوب ہے، تو میرا بجرم اور بری اور الگ ہونا صاف ہے، اور وہی دفترِ قلعہ داخبارِ مخبرین، ظاہر ہے۔ بہرحال صاحب کمشنر شہر، کیفیت صاحب کلکٹر سے طلب کر کر چیف کمشنر کے ساتھ پنجاب کو گئے ہیں۔ دیکھیے کب آویں، اور بعدِ ملاحظۂ کیفیت کیا حکم دیں۔"[1]

مدّاحوں میں نام

اس عرصے میں میرزا صاحب نے بقولِ خود "مدّاحانِ حکومتِ انگلشیہ میں اپنا نام درج کرا کے وزرای ملکہ دارا دربان کے دو سارٹیفکٹ حاصل کر لیے تھے۔"[2] اس کے باوجود نومبر سنہ ۵۸ء تک پنشن جاری نہ ہوئی، اور جب شہر میں یہ افواہ مشہور ہوئی کہ جنوری سنہ ۱۸۵۹ء میں پنشنداروں کو روپیہ ملے گا، تو

۱- مکاتیب: ۸۶ (۲) نومبر سنہ ۱۸۵۰ء سے پہلے ہی غالب نے ملکۂ وکٹوریا کی مدح میں ایک قصیدہ
نظم صنعت زحرفہ خون چکان دہد
کہ کر لارڈ ایلن برا، سابق گورنر جنرل، کو لندن بھیجا کہ وہ اُسے بارگاہِ شاہی میں پیش کریں۔ جواب آیا کہ قصیدہ پہنچا، میں نے حکامِ متعلقہ کو بھیج دیا کہ گزرانا جائے۔ پھر سر ہیر گنگش کی تحریر آئی کہ جو قصیدہ لارڈ ایلن برا نے بھیجا تھا، اُس پر حکم ہوا کہ قصیدہ گزار حاکم ہند کے توسط سے اپنے مطالب گزارش کرے۔ غالب نے عرضداشت لکھ کر لارڈ کیننگ کو بھیجی، تو اُنھوں نے اس کی رسید اور اُس کے انگلستان بھیجے جانے کی اطلاع لکھی۔ چار مہینے پیچھے مسٹر رسل کلرک نے عرضداشت کا جواب بھیجا۔ یہ سب کچھ ہو چکا تھا کہ پہلی نومبر کو اعلان ہوا کہ آج سے ہندوستان میں ملکۂ وکٹوریہ کا عمل ہو گیا۔ اس صورت میں مداحوں میں نام لکھوانا عبارت ہے، قصیدہ لکھ کر ممدوح تک پہنچا چکنے سے، اور سارٹیفکٹ ان خطوں کو کہا ہے، جو قصیدے اور عرضداشت کی رسید اور غالب کی عقیدت مندی اور وفاداری کے گویا اقرار تھے، دو گورنروں نے انھیں بھیجے تھے۔ (رسالہ ہندوستانی: ۲۵۸ بابت جولائی سنہ ۱۹۳۸ء)

۷ نومبر سنہ ۵۸ء کو میرزا صاحب نے ازراہِ شکایت نواب فردوس مکاں کو لکھا:

"قسمت کا گلہ یہ کہ عطائی جشن قدیم کا حکام کو خیال بھی نہیں۔ یہ نومبر سنہ ۱۸۵۸ اکیسواں مہینا ہے۔ گویا ہیں کھائے بیٹھا ہے۔ کہتے ہیں کہ جنوری شروع سال میں پنشناروں کو روپیہ ملے گا۔ دیکھیے کیا نیا گل کھلے گا۔ پہلی نومبر کو یہاں اشتہار عام ہوگیا ہے کہ اب قلمروِ ہندوستان میں عملِ ملکۂ معظمہ عالی مقام ہوگیا ہے۔ میں پہلے سے مدّاحوں میں اپنا نام لکھوا چکا ہوں، اور وزرائی ملکۂ دارا دربان کے دوسارتی فکٹ پا چکا ہوں۔"[1]

اس کے جواب میں نواب صاحب نے رامپور آنے کی دعوت دی۔ میرزا صاحب نے ۳ دسمبر کو جواباً تحریر کیا:

"میرے حاضر ہونے کو جو ارشاد ہوتا ہے، میں وہاں نہ آؤں گا، تو اور کہاں جاؤں گا۔ پنشن کے وصول کا زمانہ قریب آیا ہے۔ اس کو ملتوی چھوڑ کر کیونکر چلا آؤں؟ سُنا جاتا ہے، اور یقین بھی آتا ہے کہ جنوری آغازِ سال ۵۹ عیسوی میں یہ قصہ انجام پائے۔ جس کو روپیہ ملنا ہے اُس کو روپیہ جس کو جواب ملنا ہے اُس کو جواب مل جائے۔"[2]

<u>عرضی کی روداد</u>

جنوری سنہ ۵۹ء پر دو مہینے اور گزر گئے، مگر ہنوز مقدمۂ پنشن فیصل نہ ہوا۔ سرکار رسانی ۱۳ اپریل کو پھر دعوتِ آمدِ رامپور دی، تو میرزا صاحب نے لکھا:

"مجموعِ پنشناروں کی مثل مرتب ہے، اور ہنوز صدر کو روانہ نہیں ہوئی۔ نواب گورنر جنرل لارڈ کیننگ بہادر نے کلکتے سے میرے پنشن کے کاغذ طلب کیے، اور وہ کاغذ فہرست میں سے الگ ہو کر لفٹنٹ گورنر بہادر پنجاب کی خدمت میں ارسال ہوئے۔ وہاں سے کلکتے کو بھیجے جائیں گے۔ پھر وہاں سے

۱۔ مکاتیب: ۱۱ (۲) ایضاً: ۱۲۔

حکمِ منظوری پنجاب ہوتا ہوا یہاں آئے گا، اور یہاں مجھ کو روپیہ مل جائے گا۔"[1]

راہِ چارہ: مسدود

جب مہینے پر مہینا گزرنے لگا، اور پنشن کا تصفیہ نہ ہوا، تو میرزا صاحب نے ، نومبر سنہ ۵۹ء کو مجبوراً لکھا:

"ابتک میں اپنے آپ کو یہ بھی نہیں سمجھا کہ بیگناہ ہوں یا گناہگار۔ مقبول ہوں یا مردود۔ مانا کہ کوئی خیر خواہی نہیں کی، جو نئے انعام کا مستحق ہوں، لیکن کوئی بیوفائی بھی سرزد نہیں ہوئی، جو دستورِ قدیم کو برہم مارے۔ بہر حال راہِ چارہ مسدود اور دُکھ موجود۔ عرفی خوب کہتا ہے:

مرا زمانہ طناز دست بستہ و تیغ   زند بفرقم و گوید کہ "ہان" سری میخارد"[2]

نواب فردوس مکاں کی سفارش

نواب فردوس مکاں اپنے اُستاد کی پریشانی سے کما حقہ واقف تھے۔ آپ نے ازراہِ نوازش بعض انگریز حکام سے اس لیے میرزا صاحب کی اکثر تعریف کی کہ اُن کے سابقہ مدارج عزت بحال ہو جائیں، اور جب میرزا صاحب کا یاس نامہ مورخہ ، نومبر سنہ ۵۹ء مطالعہ فرمایا، تو تسکینِ خاطر کے لیے لکھا:

"مشفقا، ہنگام ملاقات کے اکثر بعضے صاحبان بہادرِ ذیشان سے تذکار محامد اوصافِ ذاتی اور صفاتی آپ کا عمل میں آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل اور قدر دانیٔ سرکارِ دولتمدار سے یقینِ واثق ہے کہ جو مدارجِ شریف آپ کے قدیم سے ہیں، بنگاہِ گورنمنٹ بہادر سے بھی اُسی مطابق ظہور میں آوے گا، کس واسطے کہ اہالیٔ سرکارِ ابد قرار قدر دان و قدر شناس ہیں"[3]

اقبال کی تائید

سرکار کی سفارش بار آور ہوئی، اور پنشنداروں کا نقشا، بعدِ صدورِ حکم

ا۔ مکاتیب: ۱۳ (۲) ایضاً: ۱۵ (۳) ایضاً: ۱۹، ح ۲۔

صدر سے واپس آگیا۔ میرزا صاحب نے ۱۲ اپریل سنہ ۶۰ء کو ان الفاظ میں سرکار کو اطلاع دی:

"عالم دو ہیں: ایک عالمِ شہادت، ایک عالمِ غیب۔ جس طرح عالمِ شہادت میں آپ میری دستگیری کر رہے، عالمِ غیب میں آپ کا اقبال مجھ کو مدد پہنچا رہا ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ وہ نقشا پنشنداروں کا، جو یہاں سے صدر کو گیا تھا، وہ اب صدر سے بعدِ صدورِ حکم آگیا۔ حکم بہ نسبت ہر واحد کے مختلف ہے۔ تقلیل بہت ہے، سو روپیے مہینے والے کو چھتر بھی ہیں اور پچیس بھی ہیں اور دس بھی ہیں۔ اب فرمائیے میرے واسطے کیا احتمال گزرتا ہے۔ یاس کلی ہے۔ لیکن واقع یہ ہوا ہے کہ سب سے پہلے میرا نام اور پورے پنشن کی واگزاشت کا حکم۔ طرفہ یہ کہ میرے نام کے ساتھ ایک انگریزی تحریر ہے، کہ جس کے دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ گورنمنٹ کا حکم منظوری اس تحریر پر متفرع ہے۔ حکام کے عملے میں اور وکلا اور اہلِ شہر میں یہ مشہور ہے کہ وہ تحریر ولایت سے آئی ہے۔ بہر حال دو امر ہنوز مبہم ہیں: ایک اس انگریزی تحریر کا حال اور دوسرے میرے بھائی کے پنشن کی حقیقت۔ سو یہ دونوں امر چند روز میں معلوم ہو جائیں گے اور جو معلوم ہوگا وہ عرض کیا جائے گا۔" [1]

خدا سازیات

میرزا صاحب نے ۴ مئی سنہ ۶۰ء کو زرِ پنشن وصول کر لیا۔ اہلِ دہلی نے اس اجرا کو نواب فردوس مکاں کی سعی و کوشش کا نتیجہ قرار دیا۔ میرزا صاحب ان مراتب سے بخوبی آگاہ تھے، اور جنوری سنہ ۶۰ء میں رامپور آتے وقت بعض احباب کو یہ لکھ بھی چکے تھے کہ اس سفر کا مقصد یہ ہے کہ نواب صاحب کے ذریعے سے گورنمنٹ سے میری صفائی ہو جائے۔ لیکن اس نے

۱۔ مکاتیب: ۱۷

باوجود، جب یوسف مرزا صاحب نے لکھا کہ خواجہ جان کی زبانی معلوم ہوا ہے کہ والیٔ رامپور کی کوشش سے آپ کی پنشن جاری ہو گئی، تو اس کے جواب میں میرزا صاحب نے اجرای پنشن کو مسبب الاسباب کی طرف منسوب کرتے ہوئے لکھا:

"خواجہ جان جھوٹ بولتا ہے۔ والیٔ رامپور کو اس پنشن کے اجرا میں کچھ دخل نہیں۔ یہ کام خداساز ہے، بعلی بن ابی طالب علیہ السلام"[1]

بحالیٔ دربار اور خلعت کی کوشش

اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ میرزا صاحب گورنر جنرل کے دربار میں خلعتِ ہفت پارچہ اور سہ رقوم جواہر لارڈ ہارڈنگ صاحب کے وقت تک حاصل کرتے رہے تھے۔ لارڈ ڈلہوزی نے دلی آکر دربار نہیں کیا، اس لیے سنہ ۱۸۴۸ء سے غدر سنہ ۵۷ء تک میرزا صاحب کو شرکتِ دربار اور حصولِ خلعت کا کوئی موقع میسر نہ آیا۔ غدر کے بعد، بعذرِ اشتباہ، پنشن بند ہوئی، تو دربار و خلعت کی امید بھی جاتی رہی۔ لیکن اجرای پنشن کے بعد میرزا صاحب نے بحالیٔ دربار کی درخواست کی، جس پر عرصے تک تحقیقات ہوتی رہی۔

گورنر کا دربار و خلعت

آخر ماہِ فروری سنہ ۱۸۶۳ء کو سر رابرٹ منٹگمری، لفٹنٹ گورنر پنجاب نے دلی میں دربار کیا۔ میرزا صاحب کو دربار میں نہ بلایا گیا، لیکن ۳ مارچ کو دن کے بارہ بجے گورنر نے یاد کر کے اپنی طرف سے خلعت دیا اور فرمایا کہ گورنر جنرل بہادر کا دربار انبالے میں ہونے والا ہے۔ آپ وہاں دربار میں شریک ہو کر خلعتِ معمولی حاصل کیجیے۔ میرزا صاحب نے غالباً ۴ مارچ کو

۱- اردوی: ۱۳۳ (۲)، اردوی: ۱ (۲۸)، ۳۰۳ یہاں دو باتیں ظاہر کرنے کی ہیں: پہلی یہ کہ پہلے خط میں اردوی معلی کے اندر شنبہ ۷ فروری طبع ہوا ہے، جو از روی حساب غلط ہے۔ دوسری یہ کہ میرزا صاحب کو مولوی اظہار حسین خاں کی زبانی یہ معلوم ہوا کہ گورنر جنرل دربارۂ بحالیٔ خلعت کی بحالی کا حکم لکھانے کے ۱۲ یا ۱۵ دن بعد اس طرف کو روانہ ہوئے تھے۔ اس صورت میں حکمِ بحالی فروری میں جاری ہونا چاہیے، نہ کہ مارچ میں، جیسا کہ مہر صاحب نے لکھا ہے۔

سرکار سے زادِ راہ کے لیے عطیے کی درخواست کی۔ ۱۱ کو سرکار نے ۲۰۰ روپے بھیجے ۱۶ مارچ کو میرزا صاحب رسید کے ساتھ نواب فردوس مکاں کو لکھتے ہیں:

"اب سنیے اپنے دعاگو کی داستان۔ منگل ۳ مارچ کو جناب لفٹنٹ گورنر بہادر نے خلعت عطا کیا، اور فرمایا کہ "ہم تمھیں مژدہ دیتے ہیں کہ نواب گورنر جنرل بہادر نے اپنے دفتر میں تمھارے دربار اور خلعت کے بدستور بحال رہنے کا حکم لکھوا دیا۔" میں نے عرض کیا کہ "میں انبالے جاؤں؟" فرمایا "البتہ انبالے جانا ہوگا۔"

بعد جناب نواب صاحب کے جانے کے شہر میں شہرت ہوئی کہ دلّی کے لوگ انبالے جانے سے ممنوع ہیں۔ گھبرایا اور صاحب کمشنر کے پاس گیا۔ آپ خط اپنا دے آیا، زبانی پرسش کا جواب زبانی پایا۔ پھر خط کے جواب میں خطِ محررۂ ۴ مارچ آیا۔ چنانچہ لفافہ بلحاظِ گرانئ وزن رہنے دیتا ہوں، اور خط بجنسہٖ حضرت کو بھیجتا ہوں۔ کل سے ایک اور خبر اڑی ہے کہ نصیب اعدا لاٹ صاحب کی طبیعت ناساز ہوگئی ہے۔ انبالے میں دربار نہ کریں گے، اور شملے کو چلے جائیں گے۔ اب میں دو وجہ سے بین السفر والسکون متردد ہوں: پہلی وجہ خاص اور دوسری وجہ عام دوسو میں سے سو لے کر ساز و سامان درست کیا ہے۔ اور سو مہاجن کے ہاں ڈاک اور خرچ راہ کے واسطے رہنے دیے ہیں۔ تار برقی میں جناب نواب صاحب سے حکم منگواؤں گا۔ جو حکم آئے گا، آپ سے عرض کر کے اُس کی تعمیل کروں گا۔"[۱]

<u>گورنر جنرل کے دربار میں نہ جاسکے</u>

نواب فردوس مکاں نے میرزا صاحب کے عریضۂ مورخہ ۱۶ مارچ کے جواب میں کمشنر صاحب کے خط کا جس قدر مضمون دُہرایا ہے[۲] اُس سے معلوم ہوتا ہے

۱۔ مکاتیب: ۲۴ (۲) ایضاً: ۲۵، ح ۱۔

کو صاحب نے انبالے میں گورنر جنرل سے ملاقات نہ ہونے کا امکان ظاہر کیا تھا۔ اتفاقاً اُسی زمانے میں میرزا صاحب کے پھُنسیاں بھی نکل آئیں۔ مجبوراً خود انبالے جانے کے بجائے اپنا نذر کا قصیدہ، بسبیلِ ڈاک بھیج کر شکریے کے جوابی فرمان پر قناعت کر لی، اور ۴ اگست سنہ ۱۸۶۳ء کو نواب فردوس مکاں کو تحریر کیا:

"جب انبالے میرا جانا نہ ہوا، تو میں نے قصیدۂ مدح، جو دربار کی نذر کے واسطے لکھا تھا، بطریقِ ڈاک جناب چیف سکرتر بہادر کو اس مراد سے بھیجا کہ آپ اس کو جناب نواب معلی القاب کی نظر سے گزرانیں۔ اور یہ دستورِ قدیم تھا کہ جب میں قصیدۂ مدحیہ بھیجتا، تو صاحب سکرتر بہادر کا خط بے واسطۂ حکامِ ماتحت مجھ کو آ جاتا۔ اب جو میں نے موافقِ معمول قصیدہ بھیجا، یقین ہے کہ مارچ یا اپریل کے مہینے میں وہ لفافہ یہاں سے ان کو گیا۔ صدائے برنخاست۔ ناامید ہو کر بیٹھ رہا۔ بلکہ یہ خیال گزرا کہ جب رسمِ تحریرِ خطوط نہ رہی، تو دربار و خلعت کہاں؟ ناگاہ، کل شام کو صاحب سکرتر بہادر کا خط ڈاک میں آیا۔ وہی افشانی کاغذ، وہی القاب۔ جی چاہتا تھا کہ اصلِ خط مع سرنامہ بھیج دوں، تاکہ حضور ملاحظہ فرمائیں۔ مگر برسات کا اندیشہ مانع آیا۔ نقل سرنامے اور خط کی بھیجتا ہوں۔"[1]

گورنر کا دوسرا دربار اور خلعت

سر ڈانلڈ میکلوڈ، گورنر پنجاب، نے ۱۰ دسمبر سنہ ۱۸۶۶ء کو دلّی میں دربار کیا۔ میرزا صاحب دربار میں شریک اور "خلعت ہفت پارچہ و سہ رقوم جواہر" سے مشرف ہوئے۔ رامپور اُس زمانے میں نواب خلد آشیاں کے زیرِ حکومت تھا۔ دربار کے دوسرے دن میرزا صاحب نے سرکار کو لکھا:

"حضرت کی توجہ باطنی، جو ہمیشہ میری مصلحِ حال اور ازالۂ عزّ و وقار کی کفیل

۱۔ مکاتیب: ۲۹۔

ہے، بعد ادائی شکر الٰہی، اُس کا سپاس بجا لاتا ہوں۔۔ پیش از غدر گورنمنٹ کے دربار میں ۷ پارچے اور جیغہ، سرپیچ، مالائی مروارید، تین رقمیں جواہر کی مجھ کو ملتی تھیں۔ بعد غدر اگرچہ پنسن اور دربار بحال رہا، لیکن خلعت موقوف ہو گیا۔ نواب لفٹنٹ گورنر بہادر پنجاب کا کل ۱۲ پر چار بجے دربار تھا، حکم سب دربار داروں کو پہنچ گیا تھا۔ میں نواب مہدی علی خاں صاحب کو رخصت کر کے گھر آیا۔ دو گھنٹے کے بعد دربار میں گیا۔ خیال یہ کہ ملاقات ہو گی، ایک رباعی کاغذ مذہب پر لکھی ہوئی نذر کروں گا، کلماتِ عنایت سن کر چلا آؤں گا۔ نہ مجھ کو کچھ احتمال، نہ صاحب کمشنر بہادر شہر کو علم۔ بارے بروقت ملاقات، تعظیم معمولی اور مصافحہ کر کے لارڈ صاحب نے کھڑے کھڑے جیغہ، سرپیچ میری ٹوپی پر باندھا، اور فرمایا کہ یہ ہم نے آپ کے واسطے رکھا تھا، مالائی مروارید میر منشی نے گلے میں ڈال دی۔۔۔۔ میں اس عطیے کو آپ کی بخشش معنوی سمجھتا ہوں۔"(۱)

یہ مرزا صاحب کا آخری دربار اور خلعت تھا؛ اس زمانے میں ضعف کے

(۱) مکاتیبِ غالب (ص ۱۲۶) مرزا صاحب نے ایک اردو قصیدہ میکلوڈ بہادر گورنر پنجاب کی مدح میں لکھا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ موصوف الذکر نے کسی سال ۱۲ جنوری کو لب دریا خیمے کھڑے کرا کے دربار کیا تھا۔ مرزا صاحب کا نام دربار کی فہرست میں غلط لکھا گیا تھا، اور بوقت شرکت نمبر نذر اور خلعت کا پچھلا انتظام برقرار نہ رکھا گیا تھا۔ یہ طرز عمل ۷۰ برس کی عمر میں مرزا صاحب کے لیے بہت جگر خراش ثابت ہوا۔ اس پر طرہ یہ ہوا کہ کسی اخبار نویس نے اخبار لدھیانہ میں روداد دربار کے اندر ان کا نامناسب الفاظ میں ذکر کیا۔ مرزا صاحب کو اہلِ دربار کی چشمک زنی ہی کا کافی صدمہ تھا۔ اس سے اور زیادہ دکھ پہنچا۔ لیکن ادب کی وجہ سے کچھ نہ کہہ سکتے تھے، مگر اس قصیدے کے ذریعے پچھلے مدارج کی برقراری کی استدعا کی۔ میکلوڈ صاحب منٹگمری کے ۱۰ جنوری ۱۸۶۵ء کو مستعفی ہونے کے بعد گورنری کا عہدہ سنبھالا تھا ۱۲ جنوری ۱۸۶۵ء کو دربار کرنا، اور فہرستِ شرکا کا جاری ہو کر سب کو پہنچ جانا محال ہے۔ ۱۲ جنوری ۱۸۶۶ء کو بھی دربار کرنا ناممکن ہے، اس لیے کہ اس سے ۲۸ دن پہلے ۱۵ دسمبر ۱۸۶۵ء کو ان کا دربار دلی میں ہو چکا تھا جس میں مرزا صاحب بھی شریک ہو کر خلعت پہن چکے تھے۔ ۱۲ جنوری ۱۸۶۹ء کو مرزا صاحب کی شرکت کو عقل نہیں مانتی، اس لیے کہ ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء کو ان کا انتقال ہو گیا ہے۔ جب وہ دسمبر ۱۸۶۸ء میں بغیر آشوب کے سہارے کے دربار میں چل پھر نہ سکتے تھے، تو صرف ایک ماہ بعد کب اس قابل ہوں گے۔ اب جنوری ۱۸۶۷ء اور جنوری ۱۸۶۸ء رہ جاتے ہیں۔ ان کے متعلق کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ مگر ۱۸۶۷ء کے متعلق اس سوال کا جواب کیا ہوگا کہ جب میکلوڈ انھیں دسمبر ۱۸۶۵ء میں خلعت دے چکے تھے، تو اب خلعت کیوں نہیں دیا۔

باعث بغیر سہارے کے چلنے پھرنے سے معذور تھے۔ ماسٹر پیارے لال آشوب شریکِ دربار تھے۔ انھوں نے سہارا دیا۔ بروقتِ ملاقات میکلوڈ صاحب نے پوچھا کہ یہ تمہارا بیٹا ہے۔ میرزا صاحب نے کہا کہ "نہیں" "مگر بیٹے سے زیادہ عزیز ہے"
سالک نے خلعتِ ہفت پارچہ" سے ۱۸۶۶ سنہ عیسوی، اور آل محمد مارہروی نے "خلعتِ زیبا و ہمایوں آمد" سے ۱۲۸۳ سالِ ہجری نکالا ہے؛

(۱) خم خانہ: ۱۱۰، (۲) دیوانِ سالک: ۱۷۲، (۳) دیوان تواریخ: ۱۴، مگر مؤخر الذکر میں عنوانِ قطعۂ تاریخ میں اس خلعت کو گورنر جنرل ...... کا عطیہ قرار دیا ہے، جو حقیقت میں مصنف کا سہو ہے۔

تعلقاتِ قلعۂ معلّٰی

تاریخ نویسی

دلّی کے لال قلعے سے میرزا صاحب کے تعلقات اکبر شاہِ ثانی کے وقت سے تھے۔ اُن کا ایک فارسی قصیدہ اور دو ایک قطعے اُن کی مدح میں موجود ہیں لیکن یہ تعلقات تعزیتوں میں آمد و رفت اور قصیدہ خوانی تک محدود تھے۔ شاہ ظفر کے عہد میں مولانا نصیر الدین عرف کالے صاحب، مرشدِ شاہ، اور احترام الدولہ حکیم احسن اللہ خاں بہادر کے توسط سے رشتۂ ملازمت بھی پیدا ہو گیا

جمعرات کے دن ۲۳ شعبان سنہ ۱۲۶۶ھ (۴ جولائی سنہ ۱۸۵۰ء) کو بادشاہ کے حضور میں باریابی حاصل ہوئی۔ خلعتِ ششش پارچہ ملازمان درگاہ نے پہلے سے پہنا دیا تھا۔ بادشاہ نے دستِ خاص سے جیغہ اور سرپیچ سر پہ باندھا اور مالائے مروارید گلے میں ڈالی اور نجم الدولہ، دبیر الملک، نظام جنگ خطاب عطا کیا۔ خدمت یہ قرار پائی کہ حکیم احسن اللہ خاں بہادر تاریخوں سے جن جن کتب مستند واقعات میرزا صاحب کو دیتے رہیں اور یہ اپنی طرزِ خاص میں اُن واقعات کو لکھیں۔ اس خدمت کے صلے میں ۵۰ روپے ماہوار تنخواہ مقرر کی گئی۔ میرزا صاحب اس کتاب کا صرف ایک حصہ مرتب کر سکے، جو مہرِ نیمروز کے نام سے چھپ چکا ہے

اصلاحِ اشعار

میرزا صاحب کے تعلقِ خدمت کو کچھ اوپر چار برس ہوئے تھے کہ ۲۴ صفر سنہ ۱۲۷۱ھ (۱۶ نومبر ۱۸۵۴ء) کو شیخ ابراہیم ذوقؔ، استادِ شاہ ظفر کا انتقال ہو گیا۔ بادشاہ نے اصلاحِ اشعار کی خدمت بھی میرزا صاحب کے سپرد کر دی

---

(۱) مکاتیب: ۵۰، مہر نیمروز: ۱۰، کلیاتِ نثر فارسی: ۲۹۰، غالب: ۲۰۴، غالب نامہ: ۵۷؛ ذکرِ غالب

(۲) میرزا صاحب نے سہواً انگریزی تاریخ ۲ جون لکھدی ہے جو اندرونی حساب ۴ جولائی ہونا چاہیے۔

میرزا صاحب نے ان دونوں خدمتوں کے متعلق نواب فردوس مکاں کو لکھا ہے

مع ہیو نبد تعلق با بہادر شاہ جو آں بود کہ از ہفت ہشت سال بتحریر تاریخ سلاطین
تیموریہ و از دو سہ سال باصلاح اشعار شہریار می پرداختم ۱۰

۹ جون سنہ ۶۶ء کو نواب خلد آشیاں کی خدمت میں تحریر کیا ہے :

"جب بادشاہ دہلی نے مجھ کو نوکر رکھا، اور خطاب دیا، اور خدمت تاریخ نگاری سلاطین تیموریہ مجھ کو تفویض کی تو میں نے ایک غزل طرز تازہ پر لکھی۔ مقطع اس کا یہ ہے :

غالب وظیفہ خوار ہو، دو شاہ کو دعا
وہ دن گئے، جو کہتے تھے "نوکر نہیں ہوں میں"

مجروح کے ایک خط میں شاہ ظفر سے اپنے تعلقات کی نوعیت کا تذکرہ اس طرح کیا ہے :

"بادشاہ اپنے فرزندوں کے برابر پیار کرتے تھے یعنی، ناظر، حکیم، کسی سے توقیر کم نہیں، مگر فائدہ وہی قلیل ۲"

سنہ ۱۸۵۷ء کے پر آشوب حادثے نے اس تعلق کو ختم کر دیا۔ اور میرزا صاحب انگریزوں کے خوف سے اپنے نام کی شاہی خطاب والی مہر کی جگہ وہ مہری جس میں "غالب ۱۲۷۰ کندہ تھا، خطوں پر لگانے لگے۔ ۳ ستمبر ۱۸۵۸ء کو تفتہ کے خط میں اس کی وجہ یہ لکھی ہے کہ "اجزائے خطابی کا لکھنا نامناسب بلکہ مضر ہے ۳"

(۱) مکاتیب : "بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ میرزا صاحب ۸،۷ برس تک تاریخ نویسی اور دو تین برس تک اصلاح کی خدمت انجام دیتے رہے لیکن واقعہ یہ نہیں ہے، بلکہ کل تعلق خدمت ۷ برس رہا، جن میں سے آخری دو ڈھائی سال اصلاح اشعار میں گزرے

(۲) مکاتیب ۲ [illegible] اردوئے معلیٰ (۱۲۰) لاہور ایڈیشن (۳) مکاتیب میں جگہ جگہ یہ مہر استعمال کی گئی ہے اس خطوں میں پہلا ۱۵ ستمبر ۵۸ء کو لکھا گیا ہے (۵) اردوئے معلیٰ ۲۹، فاروقی دہلی [illegible]

تعلقاتِ رام پور

ریاستوں سے تعلق کی نوعیت

میرزا صاحب کو اپنی عالی نسبی پر ہمیشہ فخر رہا۔ وہ اس زمانے میں بھی جبکہ سر پر مصائب کے بادل منڈلا رہے تھے، اور چاروں طرف نفسی نفسی کا عالم تھا اپنی نسبی انفرادیت کے گیت گاتے رہے، اور زادۂ تخم افراسیاب کو نہ بھولے لیکن سنہ ۱۲۶۳ھ / ۱۸۴۷ء میں فیض الحسن خاں، کوتوال دہلی کے ہاتھوں قمار بازی کے الزام میں گرفتار ہوئے، اور چھ مہینے کی بامشقت قید اور دو سو روپے جرمانے کی سزا پائی! اس واقعے کی جزئیات بیحد افسوسناک

(۱) میرزا صاحب کی قید کا بیان: یادگار غالب: ۲۹، غالب: ۱۰۳، غالب نامہ: ۷۵، ذکر غالب: ۵۸ میں ملاحظہ ہو یہاں ظاہر کر دینا واضح کر دینا ضروری ہے کہ یہ حادثہ سنہ ۱۸۴۷ء میں پیش آیا تھا جو از روئے حساب ۱۲۶۳ھ کے مطابق ہے، لہٰذا خواجہ حالی مرحوم کا سنہ ۱۸۴۲ء تحریر کرنا کسی طرح درست نہیں اس کا ثبوت یہ ہے کہ رشتہ نعتیہ کے ایک شاگرد، منشی غلام لال عاصی دہلوی متخلص بہ نول مرتب دیوان سنہ ۱۸۵۵ء بقول خمخانۂ جاوید ایام غدر سنہ ۱۸۵۷ء نے اس واقعے سے متعلق ایک قطعۂ تاریخ لکھا ہے اور قطعے کے سرنامے میں واقعے کی جزئیات پر روشنی ڈالی ہے اس کے مادہ ہائے تاریخ سے بھی ۱۲۶۳ھ مطابق ۱۸۴۷ء نکلتے ہیں۔ عاصی کی عبارت یہ ہے۔

مرزا نوشہ شاعر بے بدل دہلی، رند مشرب، متخلص بہ اسد و غالب سے فیض الحسن خاں کوتوال دہلی کو ناحق کی عداوت پیدا ہو گئی تھی۔ اس نے بعلت قمار بازی ان کو قید کرا دیا۔ جس کی مندرجۂ ذیل تاریخ نکالی گئی:

سزا بجد سے قفس میں تو سب اظہار ظلم کا ہے — اور اٹھارہ سو سینتالیس میں قید غریباں ہے
قلب غالب نہ کیوں کر موسش اور گریہ سے دل پر ہو — دہلی کی کٹائی کان جو بولے ہندالہ ہے
رہائی ورد ہے میرزا نوشہ کی کیسے لکھی ہو — مزین مخزن انوار وان ابن فیض الحسن خاں ہے
سرہانے پکار کر شمنہ لقد ہونے عاصی — اسد کو جو پچھاڑ سے گھیر کر ڈالا بندالہ ہے

بوقت گرفتاری کوتوال صاحب رتھ میں بیٹھ کر موقعہ پر گئے، اور ظاہر کیا کہ سواریاں زنانی آئی ہیں اس دھوکے سے اندر داخل ہو گئے اور اندر مکان کے ضربات ہوئی باہم اس قدر ہوئیں کہ باہر تک آواز آتی تھی۔ مگر زینے کے اندر جمعیت بہت تھی اور کچھ امدادی بر وقت پہنچ گئے و گرفتار کر کے قید کرا دیا بہت سے رئیس اور شرفا اس حرکت سے ناراض ہوئے اور عدالت میں بلاعت کے ساعی ہوئے مگر قید ہو ہی گئی

(باقی صفحہ ۷۰ پر)

تھیں، کوتوال نے گرفتاری کے وقت اور مجسٹریٹ نے سزا کی تجویز میں ان کی وجاہت و شرافت کا قطعاً لحاظ نہ کیا۔ پولیس اور عدالت کے اس نامناسب سلوک سے ان کی حسِ غیرت سخت مجروح ہوئی۔ خود اپنی نظر میں شرافت خاندان پر دھبّا آگیا، اور وہ اپنے آپ کو روسای ہندوستان سے ملنے جلنے کے قابل شمار کرنے میں پس و پیش کرنے لگے۔

بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۹

ایک روز مسٹر راس صاحب سول سرجن دہلی، قیدیانِ جیل خانہ کو ملاحظہ کرتے کرتے حضرت کے پاس پہنچ گئے، در حال دریافت کیا آپ نے فی البدیہہ یہ فرمایا ؎

جس دن سے کہ ہم غم زدہ زنجیر بپا ہیں — کپڑوں میں جوئیں بخیے کے ٹانکوں سے سوا ہیں

اسی وقت ڈاکٹر صاحب نے گورنمنٹ کو چٹھی لکھ کر رہا کرا دیا"۔ (کلامِ عالی: ۲۲۳)

مولانا مہر کا بھی یہ ارشاد صحیح نہیں کہ سنہ ۱۲۶۳ھ کی عید الفطر ۱۳ اگست سنہ ۱۸۴۷ء کو تھی اور عید الضحیٰ ۲۰ نومبر سنہ ۱۸۴۷ء کو ہوئی کیونکہ ۱۲۶۳ھ کی عید ۱۳ اگست سنہ ۱۸۴۸ء کو ہوئی تھی، اور سنہ ۱۸۴۷ء میں جو عید الفطر آئی، وہ اولاً تو سنہ ۱۲۶۳ھ کی تھی، اور ثانیاً ۱۲ ستمبر کے مطابق تھی۔ مہر صاحب کے بیان میں ایک اور تسامح بھی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ میرزا صاحب کو ۲۵ جون سنہ ۱۸۴۷ء یا اس سے چند روز قبل گرفتار کیا گیا۔ اس خیال کی بنیاد، خود انھیں کے بیان کے مطابق، احسن الاخبار بمبئی کی ۲۵ جون کی اشاعت میں اس خبر کا شائع ہونا ہے۔ پہلے تو یہی باور کرنا مشکل ہے کہ آج سے تقریباً سو برس پہلے دیسی اخباروں کو اتنے دور دراز مقامات سے ہر روزہ خبریں ملتی تھیں لیکن اس سے قطع نظر کر کے بھی ۲۵ جون کو یا اس سے چند روز قبل گرفتاری کا واقع ہونا محلِ تامل ہے۔ اس لیے کہ محمد اکرام صاحب نے احسن الاخبار کا جو اقتباس دیا ہے وہ فقرہ "دہلی ۱۵ جمادی الثانی" سے شروع ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آئندہ بیان ہونے والی خبر دہلی سے ۱۵ جمادی الآخرہ کو بھیجی گئی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس خبر سے متعلق واقعہ اسی تاریخ کا یا اس سے قبل کا ہوگا۔ بعد کا کسی طرح نہیں ہو سکتا۔ جمادی الآخرہ سنہ ۱۲۶۳ھ کی پندرھویں تاریخ ۳۱ مئی سنہ ۱۸۴۷ء کے مطابق ہے۔ لہٰذا میرزا صاحب کی گرفتاری ۳۱ مئی سے پہلے ہونا چاہیے۔ اخبار فوائد الناظرین ج ۲ نمبر ۹ مورخہ ۳۱ مئی سنہ ۱۸۴۷ء صفحہ ۹۰ میں دہلی کی خبروں کے تحت یہ عبارت درج ہے: "۲۵ ماہ مئی کو بیچ مکان جناب مرزا نوشہ اسد اللہ خاں صاحب کے قمار بازی ہو رہی تھی۔ چنانچہ کوتوال صاحب یہ خبر پا کر وہاں گئے، اور جناب میرزا صاحب کو مع اور قمار بازوں کے گرفتار کر کے کوتوالی میں لے گئے۔ اب دیکھا چاہیے کہ صاحب مجسٹریٹ ان کے حق میں کیا حکم دیتے ہیں"۔ یہ واضح ثبوت ہے اس امر کا کہ مرزا صاحب کی گرفتاری ۲۵ مئی سنہ ۱۸۴۷ء مطابق ۹ جمادی الثانیہ سنہ ۱۲۶۳ھ کو عمل میں آئی تھی۔

حامی کے بیان سے ہمیں یہ امور بالتصریح معلوم ہو جاتے ہیں (۱) کوتوال کا نام (بقیہ صفحہ ۷۱)

سنہ ۱۸۵۲ء میں ریاست جیپور سے اتفاقاً رابطہ پیدا ہوا۔ میرزا تفتہ نے اس کی تفصیلات دریافت کرتے ہوئے لکھا کہ میرا بھی خیال رہے۔ اس کے جواب میں جمعہ دہم دسمبر سنۂ مذکورہ کو میرزا صاحب نے لکھا:

جیپور کا امر محض اتفاقی ہے، بے قصد و بے فکر درپیش آیا ہے۔ جو سنا کا نہ ادھر متوجہ ہوا ہوں۔ بوڑھا ہو گیا ہوں۔ بہرا ہو گیا ہوں۔ سرکار انگریزی میں بہت بڑا پایہ رکھتا تھا۔ رئیس زادوں میں گنا جاتا تھا۔ پورا خلعت پاتا تھا۔ اب بدنام ہو گیا ہوں۔ بہت بڑا دھبہ لگ گیا ہے۔ کسی ریاست میں دخل نہیں کر سکتا تھا، مگر ہاں، استاد یا پیر یا مداح بن کر راہ و رسم پیدا کروں، کچھ آپ فائدہ اٹھاؤں، کچھ اپنے کسی عزیز کو وہاں داخل کر دوں۔ دیکھو کیا صورت پیدا ہوتی ہے۔[۱]

چونکہ استاد یا پیر بن کر ملنے میں ان کا درجہ کم از کم والی ریاست کے مساوی ہونا یقینی تھا، اور بصورت مداحی، ممدوح سے مساوی برتاؤ کی آرزو نہیں پیدا ہوتی، اس لئے ان صورتوں میں میرزا صاحب کو اپنے اخلاقی

(۱) جیپورڈ: (۱) گرفتاری کی تدبیر (۲) میرزا صاحب اور اُن کے رفقا کے ساتھ پولیس کا غیر شریفانہ سلوک (۳) رہائی کی سفارش کرنے والے کا نام (۴) اور جس سے سفارش کی گئی تھی اس کا تعین (۵) میرزا صاحب کے ایک شعر کی وجہ نظم۔ اور چونکہ یہ معاصرانہ بیان ہے اس بنا پر ہم اس سے خود میرزا صاحب کے بعض بیانوں کی تائید اور بعض کی تصحیح کر سکتے ہیں۔

ڈاکٹر راس صاحب کے دہلی کے تعین، مدت قیام اور عام برتاؤ کے سلسلے میں فوائد الناظرین، ج، نمبر ۱۲ مورخہ جولائی سنہ ۱۸۵۱ء، ص ۹۵ کا یہ اقتباس دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔

"واضح ہو کہ ۱۰ تاریخ ماہ حال کو اکثر افسران انگریزی ملازم گورنمنٹ متعینہ ضلع دہلی نے ڈاکٹر راس صاحب سول سرجن دہلی کو ایک کتابی جس میں کچھ الفاظ یا عبارت بھی تھی دربارہ توصیف ڈاکٹر صاحب موصوف کندہ ہے مع ایک چٹھی شکریہ وغیرہ کی پیش کی۔ کہتے ہیں کہ یہ صاحب بارہ برس کے عرصے سے دہلی میں مامور تھے اور ان کی توجہ اور مہربانی سے سب لوگ کیا انگریز کیا ہندوستانی، راضی اور احسان مند اور شکر گزار ہیں۔ چونکہ ان ڈاکٹر صاحب کے عہدہ اور رلمبر کی ترقی ہوئی ہے اس لئے عنقریب یہاں سے تشریف لیجانے کو ہیں۔ اور سنا جاتا ہے کہ بجائے صاحب موصوف کے غالباً ڈاکٹر یا فورصاحب مقرر ہوں گے۔"

(۱) اردوئے معلی: ۱۱۳

دھبتے کے احساس کا خطرہ نہ تھا، اور اب وہ بھی ریاست سے اسی قسم کے تعلقات کے خواہاں تھے۔

رامپور سے ابتدائی تعلق

نواب سید غلام محمد خاں بہادر، نور اللہ مرقدہ، کے صاحبزادے اپنے والد ماجد کی تخت سے دست برداری کے بعد، حکومت انگلشیہ کی زیر حمایت رامپور سے باہر اقامت گزیں ہونے پر مجبور ہوئے تھے، اور سابقہ تعلقات کی بنا پر پہلے لکھنؤ اور بعد ازاں دار السلطنت دہلی کو اپنا مستقر بنایا تھا۔ میرزا صاحب جس زمانے میں دلی تشریف لائے، یہ خاندان وہاں فروکش تھا۔ چونکہ یہ حضرات صاحب علم و فضل تھے، اس لئے ان سے میرزا کے روابطِ خلوص و اتحاد پیدا ہوگئے۔

ایک عریضے میں میرزا صاحب نے ان روابط کا تذکرہ کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

"ہم دریں کیج بکہ مسکن من است، شنیدہ ام کہ والا شان زین العابدین خاں بہادر بشہر آمدہ اند۔ نیاز مندی من بامرحومی نواب عبد اللہ خاں بہادر و مہرورزی من با اصغر علی خانِ مرحوم و صحبت و خلتِ من با نواب عبد الرحمٰن خاں بہادر مغفور کجا دیدہ اند، و آں مدارج کی در نظر دارند کہ ایشاں را در ضمیر ہنگام شست کہ گدائی گوشہ نشیں ما باید دید۔"[1]

نواب فردوس مکاں کی شاگردی

نواب سید محمد یوسف علی خاں بہادر، فردوس مکاں، نے سن شعور میں قدم رکھ کر اپنی خاندانی روایات کے ماتحت طلب علم کی راہ پر گامزنی کی، دلی کے اساتذہ میں، مفتی صدر الدین خاں آزردہ اور مولوی فضل حق

---

(۱) مکاتیب: ۱۔

خیرآبادی عربی میں، اور میرزا صاحب فارسی ممتاز حیثیت رکھتے تھے ان سب سے خاندان رامپور کی دوستی تھی اس لئے نواب فردوس مکاں کی تعلیم انھیں حضرات کے سپرد کی گئی، اور حسنِ اتفاق سے میرزا صاحب ایک ایسے طالب علم کے استاد قرار پائے، جس کو قضا و قدر ریاست رامپور کا تاج و تخت سونپنے والی تھی![1]

نواب جنت آرامگاہ کی مداحی

سنہ ۱۸۴۰ء میں، نواب سید محمد سعید خاں بہادر، جنت آرامگاہ، وارث

(۱) نواب فردوس مکاں کا میرزا غالب سے فارسی پڑھنا بزرگانِ شہر کی روایات پر مبنی ہے خواجہ حالی مرحوم نے بھی یادگارِ غالب (ص ۲۳) حاشیہ میں ذکر کیا ہے کہ نواب یوسف علی خاں بہادر نے میرزا صاحب سے دلی میں فارسی پڑھی تھی اس زبانی روایت کی تائید ہوتی ہے کہ میرزا صاحب باوجود معلمی پیشہ نہ ہونے کے احبا اور مخصوص احباب کے بچوں کو پڑھایا کرتے تھے خاندان رامپور کے افراد سے ان کے تعلقات مخلصانہ تھے۔ ان حالات میں بعید نہیں کہ انھوں نے نواب فردوس مکاں کو فارسی پڑھائی ہو۔

میرزا صاحب نے نواب فردوس مکاں سے اپنے قدیم تعلقات کا جن لفظوں میں ذکر کیا ہے ان سے اس خیال کی تائید ہوتی ہے۔ چنانچہ تجبر کو لکھا ہے۔ "نواب یوسف علی خاں بہادر والیِ رامپور .... میرے آشنائے قدیم ہیں" (اردوی: ۲۸۲) میرزا صاحب تفتہ کے خط میں صراحت کرتے ہیں کہ "نواب یوسف علی خاں بہادر تیس بتیس برس سے میرے دوست .... ہیں" (اردوی: ۵۴) اردوی معلی کے نسخۂ مطبوعہ کی رو سے یہ خط سنہ ۱۸۶۲ء میں لکھا گیا تھا مگر اس میں میرزا صاحب نے رامپور کے پہلے سفر کی روداد لکھی ہے، اس لئے اس کو سنہ ۱۸۶۰ء کا نوشتہ ہونا چاہیئے۔ اور سنہ ۶۲ء میں دوستی پر ۳۰ سال گزرنے کے یہ معنی ہیں کہ سنہ ۱۸۳۲ء میں یہ رشتہ پیدا ہوا۔ نواب فردوس مکاں سنہ ۱۸۱۶ء میں متولد ہوئے، اور ۱۸۴۰ء میں اپنے والد ماجد کی تخت نشینی پر رامپور تشریف لائے تھے۔ بنابریں سنہ ۱۸۳۲ء میں ان کو میرزا صاحب کا دوست نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ شاگرد ہونا بعید از قیاس نہیں۔ اس لئے کہ اس وقت ان کی عمر ۱۶ سال کی ہو گی، جو طلب علم کا موزوں تر زمانہ ہے۔

یہاں اس کی وضاحت ضروری ہے کہ میں نے تیس بتیس میں ...... سے تیس کو اس لئے اختیار کیا ہے کہ "بتیس" کے پیش نظر آغاز تعلقات کا سنہ ۱۸۳۰ء قرار پاتا ہے، جو اس لئے صحیح نہیں کہ اگست ۱۸۲۶ء سے نومبر ۱۸۲۹ء تک میرزا صاحب سفرِ کلکتہ کے سلسلے میں دلی سے باہر رہے ہیں۔

تخت رامپور قرار پاے۔ نواب سید عبداللہ خاں بہادر، برادرِ خُرد جنت آرامگاہ نے، جو میرزا صاحب کے بہت گہرے دوست اور اس وقت میرٹھ کے صدر الصدور تھے، سابقہ تعلقات کی بنا پر میرزا صاحب سے نواب جنت آرامگاہ کی مدح میں قصیدہ لکھنے کی فرمائش کی۔ میرزا صاحب نے معذرت کرتے ہوئے لکھا:

> خدام بلند مقام کہ سرانجام قصیدہ بقصد نام آوری از غالب بینوا چشم داشتہ اند، مگر آں فرسودۂ روان افسردہ دل را کہ ہنوز نمردہ است، از زندہ پنداشتہ اند!... سگالش، گشایش این کار، چوں صنعتِ لقائقی دگلدستہ بندی، تنہا بکوشش دست و بازو صورت نبستی، تا چشم از خستگی، دل پوشیدہ می دفرمان پزیرانہ و پردازش کار کوشیدمی چکنم، چوں میر این رشتہ در دست دل است؟ تا دل بجای نباشد، زبان سخن سرای نباشد۔ دیدہ وران صاحبدل دانند کہ چہ قدر باد یدہ و دل بہم آمیختہ شود، تا نقشی بدین شگرفی کہ بالغ نظراں پسندند، انگیختہ شود۔ این دلِ شکستہ، بہم نہ پیوستہ کہ در سینۂ من و ہمانا دشمن دیرینۂ منست، زنہار بکار سخن گستری نیاید، و معنی آفرینی را نشاید۔ ... اگر دانند کہ فلانی، باین ہمہ پریشانی، سخن گفتن میتواند، و من نیز دانم کہ میتوانم۔ در مدح بندگان سپہر آستان، امیر المسلمین قبلۂ دنیا و دین، سرور سلطان نشاں، نواب سید محمد سعید خاں بہادر بالقابہ چرا سخن نتوانم؟ تا اگر درین گیتی لعل و گہر سودئہ بردہ باشم، خود در آن گیتی دین و ایمان زیاں نکردہ باشم۔ امید کہ دربارۂ گزارش بدان ستایش نظماً و نثراً نامہ نگار را از اموات شمارند، و بدعای سلامتِ ایمان، کہ حسنِ خجستگیٔ انجام ہماں تواند بود، یاد آرند۔[1]

لیکن میرزا صاحب نے سنہ ۱۸۴۰ء میں جس کام کے سرانجام نہ پانے کا عذر کیا تھا، چند سال کے بعد قدرت ان سے وہی کام لینے والی تھی۔

۱۔ کلیات نثر فارسی: ۲۱۹

نواب فردوس مکاں کی تخت نشینی اور رشتۂ استادی کی تجدید

چنانچہ اس مراسلت کے پندرہ سال بعد اپریل سنہ ۱۸۵۵ء میں نواب جنت آرامگاہ نے وفات پائی، اور نواب فردوس مکاں تخت نشین ہوے۔ میرزا صاحب نے شاہ دہلی کے رابطے کو مدنظر رکھ کر قطعۂ تاریخ جلوس ارسال کیا! دربار رامپور سے اس کا کوئی جواب نہ گیا؛ اور تقریباً دو سال تک تجدید تعلقات کی یہ کوشش بارآور نہ ہوئی۔[۱]

حسن اتفاق سے مولانا فضل حق خیرآبادی رامپور میں فروکش تھے۔ انھوں نے وقتاً فوقتاً سرکار کے روبرو میرزا صاحب کے اشعار پڑھے، جس سے سرکار اُن سے مراسلت اور مشورۂ سخن کے مشتاق ہوگئے۔

مولانا نے میرزا صاحب کو لکھا کہ سرکار کی خدمت کے لئے کمربستہ ہوجایئے اور اصلاح اشعار کا کام انجام دیجئے۔ مولانا کا نامۂ گرامی میرزا صاحب کو ۷، ۲ جنوری سنہ ۱۸۵۷ء کو موصول ہوا۔ ۹ جنوری کو انھوں نے بتعمیل ارشاد نواب فردوس مکاں کی خدمت میں پہلا عریضہ ارسال کیا۔ اس کے جواب میں سرکار نے ۵ فروری کو اپنے کچھ اشعار بغرض اصلاح بھیجے اور ان کے ساتھ تحریر فرمایا:

"نمیقۂ بہجت بلاغت آگین مشعر رسید خط مولوی صاحب مخدوم مولوی محمد فضل حق صاحب با دیگر مراتب محبت و اشفاق بعبارت رنگین و دقیق دربین انتظام مرکش مضامین وصول نشاط شمول گردیدہ، باطلاع خیریت‌ہا سرمایۂ سرور ناممصور افزودہ۔ از مزید شفقت و ائتلاف قلبی متصور شد۔"[۳]

۱۔ مکاتیب، ص ۲۔ میرزا صاحب کے شاگرد نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ نے نیر نیمروز کا غالباً مطبوعہ نسخہ شوال ۱۲۷۱ھ (جون سنہ ۱۸۵۵ء) میں نواب فردوس مکاں کی خدمت میں تحفۃً ارسال کیا تھا۔ نواب صاحب ۱۳ رجب سنہ ۱۲۷۱ھ (۲۱ اپریل سنہ ۱۸۵۵ء) کو تخت نشین ہوے تھے۔ شیفتہ کا تخت نشینی کے چند ماہ بعد میرزا صاحب کی تصنیف کا تحفہ میں بھیجنا اس امر کی غمازی کرتا ہے کہ انھوں نے خود میرزا صاحب کے اشارے سے ایسے کیا تھا۔ شیفتہ کے خط کے لئے ملاحظہ ہو رجسٹر صیغہ احباب جس میں مثل ۹۸ بستہ ۲۳ کا خلاصہ درج ہے۔

۳۔ مکاتیب، ص ۳، ح ۳۔

اس فرمان نے میرزا صاحب میں نیا ولولہ پیدا کیا، اور انھوں نے ۱۱ فروری کو سرکار کی مدح میں قصیدہ لنظم کر کے بذریعۂ ڈاک ارسال کیا۔ اس کی ایک نقل میرزا صاحب نے مولانا کی خدمت میں بھی بھیجی تھی، جو انھیں آگرہ میں موصول ہوئی وہاں سے ۱۰ ماہِ اپریل کو مولانا نے سرکار کو تحریر فرمایا:

"بعد عرض میرساند کہ خبرِ سگال بافضالِ ایزد بیہمال بصحت و اعتدال بالور رسید[۱] ملاطفہ مرزا صاحب مشفق نجم الدولہ مرزا اسد اللہ خاں صاحب متخلص بغالب مع قصیدہ یمیہ کہ در مدیح حضور فیض معمور منظوم کردہ اند، از ڈاک خانہ یافت۔ مرزا صاحب موصوف در ثنا و ستائشِ موزونیِ طبع اقدس و توصیفِ غزلہائی کہ نزدِ شاں شرفِ ارسال یافتہ بودند، و شکر و سپاسِ عطائی مبلغ پانصد روپیہ کہ بدو دفعہ بمرزا صاحب موصوف عنایت شدند، اسہابِ در تحریر فرمودہ، حالانکہ طبعِ اقدس در علومِ عقلیہ و فنونِ حکمیہ آنچناں دقیقہ رس کہ عدیلِ آں در مملکتِ ہندوستان کہ حالِ علمائی آں تفصیلاً معلوم است، کمتر بلکہ معدوم است، نظمِ شعر و فہم آں را بدایعِ معانی تازہ و مضامین مبتکرہ و سردِ الفاظِ فصیحہ و تراکیبِ بلیغہ بحسبِ اوزانِ عروض نسبت بعلوِ طبع اقدس و بلندی افکارِ صائبہ ازادنی مراتب است، مرزا صاحب ازیں حال لاعلم اند۔ طبعِ عالی و فکرِ صائب در دقائقِ حکمیہ و معضلاتِ فلسفیہ بجائی میرسد کہ رسیدنِ افہامِ علّامِ اعلام تا آں مقام معلوم الانتفاست۔ دریں سخن ہیچ مبالغہ و اغراق نیست۔ حضور لامع النورِ منفسِ نفیس، امتحانات فرمودہ اند، و تکریرِ امتحان ہم سہل است۔ و بنظرِ ہمتِ والا در جود و سخا بذلِ آلافِ الوف ما قلِ قلیل توان پنداشت۔ مرزا صاحب حقِ سپاسگزاری ادا کردہ اند، نظمِ قصیدۂ مدحیہ در غایتِ بلاغت و انسجام است۔ غالباً شرفِ اندوزِ ملاحظۂ والا شدہ باشد۔"

۱۔ مثل نمبر ۹۰ صیغۂ احیاء عہد نواب فردوس مکاں، محکمہ دارالانشاء۔

مولانا کی اس تحریر نے میرزا صاحب کے سابقہ تعلقات از سرِ نو استوار کر دیے اور ایک مخلص دوست کی کوشش سے میرزا صاحب کی یہ تجویز کہ "آیندہ ریاستوں میں پیر یا استاد بن کر رسوخ حاصل کرنا چاہیے"، ریاستِ رامپور میں کامیاب ہو گئی۔

نواب فردوس مکاں کا سالِ شاگردی

نواب فردوس مکاں کے سالِ تلمذ کا تذکرہ میرزا صاحب نے متعدد خطوط میں کیا ہے۔ لیکن تقریباً ہر خط میں اُن کا بیان دوسرے خط سے مختلف ہے۔ مارچ سنہ ۶۰ء میں ہنجر کو لکھا ہے:

"سنہ ۱۸۵۷ء میں نواب یوسف علی خاں بہادر والیِ رامپور، کہ میرے آشنائے قدیم ہیں، اس سال یعنی سنہ ۱۸۵۷ء میں میرے شاگرد ہوئے۔ ناظم اُن کو تخلص دیا گیا۔ بیس پچیس غزلیں اردو کی بھیجے۔ میں اصلاح دے کر بھیج دیتا، گاہ گاہ کچھ روپیہ اُدھر سے آ جاتا رہتا۔ قلعے کی تنخواہ جاری، پنشن کھلا ہوا، اُن کے عطایا فتوح گنے جاتے تھے۔ جب وہ دونوں تنخواہیں جاتی رہیں، تو زندگی کا مدار اُن کے عطیے پر رہا۔ بعد فتحِ دہلی وہ ہمیشہ میرے مقدم کے خواہاں رہتے تھے، میں عذر کرتا تھا۔ جب جنوری سنہ ۱۸۶۰ء میں گورنمنٹ سے وہ جواب پایا کہ جو اوپر لکھ آیا ہوں، تو میں آخر جنوری میں رامپور گیا۔"[۱]

اسی مہینے میں تفتہ کو لکھتے ہیں:

"نواب یوسف علی خاں بہادر تیس بتیس برس کے میرے دوست اور پانچ چھ برس سے میرے شاگرد ہیں۔ آگے گاہ گاہ کچھ بھیج دیا کرتے تھے۔ اب جولائی سنہ ۱۸۵۹ء سے سو روپے مہینا ماہ بماہ بھیجتے ہیں۔"[۲]

اس تخمینے کی رو سے، نواب فردوس مکاں کا سالِ شاگردی سنہ ۵۳ یا ۱۸۵۴ء

۱۔ اردوی، ۸۳ ۲ و ہوہ: ۲ ۱۳ ۲ ۱ عوہ میں پنشن کھلی ہوئی، بعینہٖ مونث ہے (۲) اردوی ۱ ۱ ۵

قرار پاتا ہے، لیکن ۳۰ جولائی سنہ ۱۸۶۵ء کو سیاح کو تحریر کیا ہے:

"ایک قرن ۱۲ برس سے فردوس مکاں نواب یوسف علی خاں، والیٔ رامپور اپنے اشعار میرے پاس بھیجتے تھے، اور سو روپے مہینا ماہ بماہ بسبیل ہنڈوی بھجواتے تھے۔"

اس حساب سے نواب فردوس مکاں کو سنہ ۵۳ء میں میرزا صاحب سے مشورۂ سخن شروع کرنا چاہیے۔ لیکن ابھی عرض کیا جا چکا ہے کہ میرزا صاحب نے ۲۸ جنوری سنہ ۵۷ء کو اپنا پہلا عریضہ ارسال کیا تھا، اور اس میں یہ لکھا تھا کہ سنہ ۵۵ء میں قطعۂ تاریخ جلوس کا ارسال ربط شاہ و گدا کی بنا پر تھا، اب یہ عریضہ مولانا فضل حق خیرآبادی کے ارشاد کی تعمیل میں لکھ رہا ہوں۔ اس کے جواب میں ۵ فروری سنہ ۵۷ء کو نواب فردوس مکاں نے گرامی نامہ تحریر فرمایا، جس کا ضروری حصہ اوپر نقل کیا جا چکا ہے۔ اس میں یہ الفاظ ارادۂ تلمذ پر دال ہیں:

"... شفقتا، ہر چند کہ کاتب را اتفاقِ موزونیتِ یک مصرعہ ہم نشدہ بود، لیکن محض بجہت سماعت کلام سامی زبانی مولوی صاحب صدرالوصف دلم خواست کہ طریقۂ رسل و رسائل جاری شود۔ چوں سبیلی بہ ازیں بنظرم نہ رسید، لہٰذا چند ابیات واہیات موزوں نمودہ، بقصدِ اصلاح پیش آں یگانۂ آفاق مرسل گشت۔ چشم داشت کہ بعد اصلاح غزلہائی مذکور مع کدام طرح جدید ملطف فرمودہ شود۔"

اس کے جواب میں میرزا صاحب نے ۱۲ فروری کو عریضہ تحریر کیا، اور اس میں غزلیات اور ہنڈوی کے پہنچنے کی اطلاع کے بعد عرض کیا کہ "اشعار خود بہنگام خویش خواہد رسید"۔ نیز ۱۵ فروری کو اصلاح شدہ غزلوں کے ساتھ جو عریضہ بھیجا اس میں تخلص کے متعلق لکھا:

۱۔ اردوئے معلیٰ، ص ۱۲۲، مکاتیب: ص ۳۔

"میں نہیں چاہتا کہ آپ کا اسم سامی اور نام نامی تخلص رہے۔ ناظم، عالی، انور، شوکت، خیساں، ان میں سے جو پسند آئے وہ رہنے دیجیے، مگر یہ نہیں کہ خواہی نخواہی آپ ایسا ہی کریں۔ اگر وہی تخلص منظور ہو، تو بہت مبارک۔"[۱]

سرکار نے یکم مارچ کو جواباً تحریر فرمایا:

"منجملۂ الفاظ تخلص لفظِ ناظم مطبوع طبع نیاز گشت۔"[۲]

ان تصریحات سے واضح ہوتا ہے کہ نواب فردوس مکاں ۵ فروری سنہ ۱۸۵۷ء کو میرزا صاحب کے شاگرد ہوئے، ۱۵ فروری کو میرزا صاحب نے انھیں تخلص کے لیے چند الفاظ لکھے، اور یکم مارچ سنہ ۱۸۵۷ء کو سرکار نے ناظم تخلص پسند آنے کی میرزا صاحب کو اطلاع تحریر فرمائی۔[۳]

۱۔ مکاتیب: ۳۰۔ ۲۔ ایضاً: ص ۱۰۔ ۳۔ امیر مینائی مرحوم نے نواب فردوس مکاں کے ذکر میں تحریر فرمایا ہے: "طبیعت ازلی سے موزوں پائی تھی۔ سخن گوئی کا ذوق اور شعر فرمانے کا شوق تھا۔ پہلے مومن خاں صاحب دہلوی سے مشورہ رہا، پھر مرزا اسد اللہ خاں غالب سے تلمذ ہوا۔ آخر بوضع استادان لکھنؤ موزوں فرمانے لگے۔ منشی مظفر علی صاحب اسیر لکھنوی میں سحبان عصر و یکتائی دہر ہیں کلام دکھانے کا اتفاق ہوا" (انتخاب یادگار)۔ جہاں تک حکیم مومن خاں مرحوم کی شاگردی کا تعلق ہے، بظاہر سرکار کے اس ارشاد کے بعد کہ: "کاتب را اتفاق موزونیت یک امر مرسوم نہ شد بود،" اس کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ مومن خاں کے کلیات فارسی در نسخۂ قلمی کتاب خانہ رامپور ورق ۱۰۰ الف، میں ۵ بیت کا ایک قطعہ ملتا ہے، جس میں نواب فردوس مکاں کے ورود دہلی کی تاریخ نظم کی ہے۔ مگر تلمذ کی طرف ہی نہیں نفس شعر گوئی کی طرف بھی کوئی اشارہ نہیں ملتا۔ اس کا عنوان ہے: "تاریخ آمدن یوسف علی خاں بہادر بہ دہلی و زمانہ و صحبت" اشعار یہ ہیں: عمر خضر و نیز رشک زلیخا یہ جان سالی یوسف علی خاں بہادر ۔۔ رسانہ گردہا وتح عزیز کلبہ روما لی یوسف علی خاں بہادر بروگو یہ نقد حصول آرزو ہا و نہ زکال یوسف علی خاں بہادر پہ ظفر دلکاب ۔ کرم گرم دو راہش ، خوش حال یوسف علی خاں بہادر تو اس یافت سال ورودش بدہلی ۔ زا قبالی یوسف علی خاں بہادر
بظاہر یہ ماننا دشوار ہے کہ امیر نے نواب صاحب کے والد ماجد کے متعلق کوئی خلاف واقعہ بات اپنی طرف سے نواب صاحب کی لاعلمی میں درج کرنے کی جرأت کی ہوگی۔ مگر نواب خلد آشیاں کے انتقال کے بعد امیر اللغات کی پہلی جلد شائع ہوئی تو اس کے دیباچے میں امیر مرحوم نے لکھا کہ نواب ناظم مجھ سے بھی مشورۂ سخن فرماتے تھے۔ ان کے اس بیان کو حسن اللہ خاں ثاقب نے خطوط امیر مینائی ۱۹۲۴ء میں، مکین حیدرآبادی نے یادگار امیر میں، احباب جلیل نے سوانح امیر میں، اور آغا اکبر شاہ نے حیات امیر میں دہرایا ہے

قد میرزا صاحب کی خیر خواہی

میرزا صاحب کے جدید رشتۂ استادی[1] کے قیام پر چند ماہ گزرے تھے کہ غدر سنہ ۵۷ء کے آثار پیدا ہونے لگے۔ میرزا صاحب نے اپنے محسن شاگرد کی خدمت میں کچھ خطوط لکھے، جو اُن کی حسبِ ہدایت چاک کر دیے گئے۔[2] اس ہدایت کی وجہ بجز اس کے اور کچھ سمجھ میں نہیں آتی کہ اُن تحریروں کا مضمون سیاسیات سے متعلق تھا۔ اس لئے کہ جب آتشِ غدر بھڑک اٹھی، اور نواب فردوس مکاں کے لئے ناگزیر ہو گیا کہ اپنا رویہ متعین کریں، تو انھوں نے انتہائی ہوشمندانہ طریق کار اختیار کیا۔ دستنبو میں میرزا صاحب لکھتے ہیں:

"چشم بد دور! فرزندہ ہور، نواب یوسف علی خاں بہادر فرمانروای رامپور کہ از دیرباز درآن سرزمین بمرزبانی و شاہ نشانی نیاگان خویش را جانشین است و با جہانبانان انگلند در مہرورزی و یکدلی استواری پیمان نغز بدآن آئین ست کہ دست روزگار در ہزار سال بہزار گونہ کشاکش آن را نبارد گسست، چہ ناچار بفرستادن پیام خشک، زبان ہم سایگان از گفتگو بست۔"

یہ رویہ، جسے میرزا صاحب نے پیام خشک سے تعبیر کیا ہے، اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتا تھا، جب تک حالات کا صحیح علم اور ان کے پیدا ہونے

[1] اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر امیر کا استاد ناظم ہونا واقعہ تھا تو انھوں نے اس کا ذکر انتخاب یادگار میں کیوں نہ کیا، علاوہ بصورت دیگر دیباچہ امیر اللغات میں کیوں بیان فرمایا۔ چونکہ اس کا کوئی مسکت جواب نہیں ملتا، اس لئے ہم نواب ناظم کے اپنے بیان اور امیر مرحوم کے بیان کو ترجیح نہیں دے سکتے۔ ہاں امیر لکھنوی کی شاگردی کا ثبوت سرکار کے فرمان بنام امیر مورخہ ۳ اکتوبر سنہ ۱۸۶۳ء سے بھی ملتا ہے (مثل ۵۰، صیغۂ احباب)۔ اس کی ظاہری وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ آخر سنہ ۱۸۶۳ء میں میرزا صاحب نے ضعف پیری و غلبۂ امراض کے باعث سرکار سے استدعا کی تھی کہ آئندہ انہیں خدمتِ اصلاح سے معاف رکھا جائے (۱۳ مئی ۱۸۶۳ء)۔ غالباً سرکار نے اس استدعا کو منظور فرما کر امیر مینائی کے مشورے لینے شروع کیے۔ آپ کے پاس بھی اپنا کلام بھیجنا شروع کر دیا تھا مگر میرزا صاحب سے بھی رشتۂ شاگردی منقطع نہیں فرمایا۔ چنانچہ مرض الموت میں بھی ایک سلام لکھ کر اُن کے پاس بغرض اصلاح ارسال کیا تھا جو بعد انتقال واپس آیا۔ مکاتیب: ۲۰۳، کلیاتِ نثرِ فارسی: ۳۰۵۔

کے واقعی اسباب قبل از وقت نہ معلوم ہو چکے ہوں

ترکِ مراسلت

غدر کے ساتھ حکومت ہند کے سلسلۂ نامہ رسانی میں اختلال واقع ہو گیا، نیز دہلی سے خط کتابت کرنے میں کاتب و مکتوب الیہ کے لیے لال قلعے یا حکومت ہند کی نظر میں مشتبہ قرار پانے کا خطرہ تھا، اس لیے قاصد کے ذریعے سے خیریت گوئی و عافیت جوئی بھی سہل اور بےخطر نہ رہی۔ ادھر نواب فردوس مکاں روہیلکھنڈ کی بغاوت فرو کرنے میں منہمک تھے۔ ان حالات کا یہ نتیجہ نکلا کہ میرزا صاحب اور سرکار میں اگست سنہ ۵۷ء سے جنوری سنہ ۵۸ء تک مراسلت نہ ہو سکی۔ ساتویں عریضے میں میرزا صاحب اس کے متعلق لکھتے ہیں:

"درزمان چیرہ دستی کورنمکان سپاہ و روسیاہ، سررشتہ پیام از ہم گسست ناچار بفرستادن نامہ بر، رساندن نامہ و پیام صورت بست۔ درین روزگار کہ فرمان دادوران داد گر رواج دسلسلۂ آمدشد نامہ رسائی یافت، نامہ و پیام روان داشتہ شد، ونارسیدن پاسخ از چنان بہ اندیشہ شد کہ مگر آن نیایش نامہ نرسیدہ باشد، یا فرط احتیاط مانع تحریر جواب گردیدہ باشد۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بہ نگاشتن این نامہ زحمت اوقات ملازمان ازان رو روا داشتہ ام، کہ اگر نفرستادن نامہ محض از روی احتیاط است چو پیدا گردد کہ در عنایت تقریظ و در رعایت افراط است۔"

میرزا صاحب کی مالی پریشانی اور تقرر وظیفہ

میرزا صاحب کو خزانۂ کلکٹری سے ساڑھے باسٹھ روپے ماہوار پنشن ملا کرتی تھی، جسے غدر کے بعد تعلقِ قلعہ کے سبب سے گورنمنٹ نے مسدود کر دیا۔ اس کے بعد میرزا صاحب نے بیگناہی ظاہر کی، لیکن مدت تک شنوائی نہ ہوئی۔ غدر سے قبل نواب فردوس مکاں نے وقتاً فوقتاً کچھ عطیات بھیجے تھے۔ میرزا

صاحب نے تجیر کو ان عطیات کے بارے میں لکھا ہے[1]

"نواب یوسف علی خاں بہادر والئ رامپور . . . . بیس پچیس غزلیں اردو کی بھیجیں، میں اصلاح دے کر بھیج دیتا، گاہ گاہ کچھ روپیہ اُدھر سے آتا رہتا۔"

لیکن ایامِ غدر میں وہ بھی امداد نہ کر سکے۔ غدر کے بعد سنہ ۱۸۵۸ء میں مرزا صاحب نے ایک قصیدے کے توسط سے سالانہ امداد کی درخواست کی، فردوس مکاں نے متعدد بار ڈھائی سو روپے نقد عطا کیے۔ مرزا صاحب کو اوقات بسر کرنے کے لیے ماہوار امداد کی ضرورت تھی۔ انھوں نے نواب صاحب کے حضور میں مزید پرورش کی درخواست ارسال کی سوئے اتفاق سے مثل میں یہ درخواست موجود نہیں، البتہ عریضہ مورخہ ۱۸ اپریل سنہ ۵۹ء میں ایک حسن طلب پر مشتمل نیاز نامے کا ذکر ہے۔ فرماتے ہیں:

"نیاز نامے میں کچھ حسن طلب بھی تھا۔ افسوس کہ وہ خط ضروری نہ پہنچا۔"[2]

چونکہ اول الذکر عریضہ سرکار کو موصول نہ ہوا، اور دوسرے میں اس حسن طلب کی تصریح نہ تھی، اس لیے مجبوراً ۱۰ جولائی سنہ ۵۹ء کو مرزا صاحب نے ایک اور عریضہ ارسال کیا۔ مثل میں یہ عریضہ بھی موجود نہیں ہے، لیکن سرکار کے جوابی فرمان مورخہ ۱۰ ذیحجہ سنہ ۱۲۷۵ھ مطابق ۱۲ جولائی سنہ ۱۸۵۹ء سے اس کے مضمون پر روشنی پڑتی ہے۔ سرکار نے ارشاد فرمایا ہے:

". . . . . سامی صحیفہ ملفت آگین مورخہ دسویں اس مہینے جولائی سنہ حال کا بیچ عین انتظار کے خانہ آرائی چہرہ وصول نشاط شمول کا ہوا، اور اوپر مراتب مرقومہ کے مطلع کیا، اور ان غزلوں کی اصلاح سے مخلص کو کمال مسرت ہوئی، اور بنظر آپ کی زیر باری کے اس مہینے جولائی سے سو روپیہ مہینہ مقرر کیا گیا، اور دفتر میں نام آپ کا مندرج کیا گیا۔"

۱۔ اردوئے معلیٰ: ۳۰۸، عود ہندی: ۱۳۶ (ان عطیوں کی تفصیل آیندہ صفحوں میں ملاحظہ ہو)۔ ۲۔ مکاتیب: ۱۴

ہر مہینے تنخواہ مقرر پہنچے گی۔ یقین ہے کہ آپ بھی اس کو معمول کماں محبت پر فرمائیں گے۔"

اس فرمان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں میرزا صاحب کسی وجہ سے خط نہ لکھ سکے تھے، سرکار اُن کے خط کے منتظر تھے۔ ۱جولائی کے عریضے میں انھوں نے اپنی زیرباری کا ذکر کیا، تو سرکار نے ازراہ پرورش سو روپے ماہوار تنخواہ مقرر فرمادی۔ سرکار کار و بجائے لفظ "وظیفہ"، ۲۷ جولائی کو صادر ہوا، اور میرزا صاحب کو پہلی تنخواہ کی ہنڈوی ۲ ذیحجہ سنہ ۷۵ھ مطابق ۱۳ جولائی سنہ ۵۹ء کو روانہ کی گئی۔

اپریل سنہ ۶۰ء میں میرزا صاحب نے مجروح کو جو خط لکھا ہے اس میں بھی جولائی سنہ ۵۹ء سے تنخواہ جاری ہونے کا ذکر ہے۔ فرماتے ہیں:

قرار داد یہ ہے کہ نواب صاحب جولائی سنہ ۵۹ء سے کہ جس کو یہ ساتواں مہینا ہے، سو روپے مجھے ماہ بماہ بھیجتے ہیں۔"[۲]

ہنڈوی بھیجنے کا طریقہ

چونکہ میرزا صاحب رامپور میں فرو کش نہ تھے، اس لیے نہیں۔ بھینے کی

۱۔ عکس نمبر ۳ صحیفۂ احباب (۲۹) ادر دی: ۱۹۰۸ء، ۹۰۔ میرزا صاحب کی تنخواہ کے تقرر کے سلسلے میں مولانا قمر فرماتے ہیں قدر کے بعد جب قلعے کی تنخواہ جاتی رہی، اور خاندانی پنشن بند ہو گئی تو غالب نے ایک فارسی قصیدہ نواب یوسف علی خاں کو بھیجا جس میں گھرے دوستانہ روابط کا ذکر کرتے ہوئے نواب صاحب کے تغافل کا شکوہ کیا گیا تھا...... اس قصیدے پر نواب یوسف علی خاں مرحوم نے سو روپیہ ماہوار کا وظیفہ غالب کے لیے مقرر فرما دیا، جو ماہ بماہ نواب صاحب خود غالب کو بھیجتے رہے (ص ۱۰۴)، لیکن مکاتیبِ بالا و دستاویزوں کے پیش نظر مجھے مولانا کی اس رائے سے اتفاق نہیں کہ اس قصیدے پر میرزا صاحب کی تنخواہ مقرر کی۔ ہاں یہ مجھے تسلیم ہے کہ اس کے بعد نواب صاحب کو تہنیتِ بریلی کی مبارکباد دیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ میں منشی یا انشا یا مختہ یا عامل کے عہدے کا طلبگار نہیں، بلکہ صرف یہ چاہتا ہوں کہ میرا حصہ مجھے ماہ بماہ پہنچتا رہے (۱۰۲)، اسی آخر قصیدے میں میرزا صاحب نے ماہانہ کی جگہ، سالانہ امداد کی درخواست کی ہے۔ فرماتے ہیں:

ہر سال ازاں شہر بمن مایہ روا دار

کز بہر ہمیں گشتہ در قطعۂ تو شامل

دسویں بارھویں تاریخ تک سو روپے کی ہنڈوی سرکار کے گرامی نامے کے ساتھ ملفوف بھیجی جاتی تھی۔ بعض عرائض میں میرزا صاحب نے لکھا ہے کہ پہلی دوسری تاریخ تک روپیہ بھیجدیا جایا کرے۔ سرکار نے اس کو منظور بھی فرمالیا ہے، اور دفتر کو حکم بھی ہوگیا ہے۔ لیکن بالعموم ان تاریخوں کے بعد ہی روانہ کیا گیا۔ میرزا صاحب کے مکتوب محررہ ۲۰ جولائی سنہ ۶۵ء بنام سیاح سے معلوم ہوتا ہے کہ سرکار میرزا صاحب سے روپے کی رسید نہیں لیتے تھے میرزا صاحب لکھتے ہیں:

"ایک قرن" ۱۲ برس سے فردوس مکاں، نواب یوسف علی خاں والی رامپور ...... سو روپے مہینا ماہ بماہ بسبیل ہنڈوی بھجواتے تھے۔ اُس مغفور کی دانائی دیکھیے کہ مجھ سے کبھی اُس روپے کی رسید نہیں لی۔ اپنے خط میں ہنڈوی بھیجا کرتے۔ میں خط کا جواب لکھ بھیجتا!

اس مکتوب میں رسید سے میرزا صاحب کی مراد باضابطہ ٹکٹ چسپاں رسید ہوگی، ورنہ سرکار کے ہر فرمان میں روپے کی وصولیابی سے مطلع کرنے کی خواہش اور میرزا صاحب کے تمام ماہانہ عرائض میں روپے کی رسید کی اطلاع درج ہے

اصلاح میں تاخیر

میرزا صاحب کی طرف سے نواب فردوس مکاں کے کلام پر اصلاح دینے میں تاخیر بھی ہو جاتی تھی، چنانچہ متعدد فرامین میں تعجیل کا تقاضا اور بعض میں تاخیر کا شکوہ نظر آتا ہے۔ اس کا سبب میرزا صاحب کی علالت طبع تھی۔ ۲ نومبر کے ایک مکتوب میں میرزا صاحب نے سیاح کو لکھا ہے:

اندنوں ضعفِ دماغ، دوران سر میں ایسا مبتلا ہوں کہ والی رامپور کا بھی بہت سا کلام یوں ہی دھرا ہوا ہے، دیکھنے کی بھی نوبت نہیں آئی، تمہاری

ا۔ اردوی: ۱۲۰

بھیجی ہوئی غزلیں سب محفوظ دھری ہوئی ہیں۔ خاطر جمع رکھو
جب نواب صاحب کی غزلیں دیکھوں گا۔ تو یہ بھی دیکھی جائیں گی"۱

ایک بار تفتہ کے کلام پر اصلاح دینے میں دیر ہوئی۔ انھوں نے تقاضائی خط لکھا۔ اس پر ۱۴ اکتوبر سنہ ۶۲ کو میرزا صاحب نے تحریر فرمایا ہے :

بھائی تم سچ کہتے ہو کہ بہت مسودے اصلاح کے واسطے فراہم ہوے ہیں
مگر یہ نہ سمجھنا کہ تمہارے ہی قصائد پڑے ہیں۔ نواب صاحب کی غزلیں
بھی اسی طرح دھری ہوئی ہیں۔ برسات کا حال تمہیں بھی معلوم ہے۔۔
اب نجات ہوئی ہے۔ نواب صاحب کی غزلیں اور تمہارے قصائد دیکھے جائیں گے۔۔۔
۔۔۔۔۔ میں ناتوان بہت ہو گیا ہوں گویا صاحب فراش ہوں۔ کوئی شخص نیا
متعلق کی ملاقات کو آ جائے، تو اٹھ بیٹھتا ہوں ورنہ پڑا رہتا ہوں۔ لیٹے لیٹے خط لکھتا ہوں
لیٹے لیٹے مسودات دیکھتا ہوں۔ اللہ! اللہ! اللہ!"۲

اس جواب پر ایک مہینا گزر گیا، لیکن تفتہ کو اصلاح شدہ قصائد نہ ملے انھوں نے پھر شکایت آمیز خط لکھا۔ اس کے جواب میں ۲۷ نومبر سنہ ۶۲ء کو میرزا صاحب نے معذرت کرتے ہوے نواب صاحب کی غزلوں پر اصلاح نہ دینے کا پھر ذکر کیا۔ فرماتے ہیں :

"مرزا تفتہ۔ جو کچھ تم نے لکھا ہے۔ یہ بیدردی ہے اور بدگمانی۔ معاذ اللہ!
تم سے اور آزردگی۔ مجھ کو اس پر ناز ہے کہ میں ہندوستان میں ایک
دوست صادق الولا رکھتا ہوں۔ جس کا ہرگوپال نام اور تفتہ تخلص ہے
۔۔۔۔ بھائی، مجھ میں اب کچھ باقی نہیں ہے۔ برسات کی مصیبت گزر گئی
لیکن بڑھاپے کی شدت بڑھ گئی۔ تمام دن پڑا رہتا ہوں۔ بیٹھ نہیں سکتا
اکثر لیٹے لیٹے لکھتا ہوں۔۔۔۔ لالہ بالمکند بیصبر کا ایک پارسل ہے کہ اس کو

۱۔ اردوی ، (۲) ایضاً ص

بہت دن ہوے، آجتک سرنامہ بھی نہیں کھولا۔ نواب صاحب کی دس پندرہ غزلیں پڑی ہوئی ہیں۔

ضعف نے غالب، نکما کر دیا   ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے!!

گر وظیفہ جاری

لیکن اس تاخیر کے باوجود نواب فردوس مکاں وظیفہ برابر دیتے رہے حتیٰ کہ سنہ ۶۳ء میں میرزا صاحب کے اصلاح سے انکار پر بھی سرکار نے وظیفہ بند نہ کیا۔ سرکار کی اس مہربانی کا میرزا صاحب نے ایک خط میں ذکر بھی کیا ہے۔ واقعہ یہ درپیش آیا کہ ایک بار تفتہ کے کلام پر اصلاح دینے میں دیر ہوئی (انھوں) نے تقاضا کیا۔ میرزا صاحب نے عذرِ ضعف کیا، جسے تفتہ نے باور نہ کیا۔ اس پر میرزا صاحب نے تحریر فرمایا:

میرا عجب حال ہے۔ حیران ہوں کہ تمھیں میرا کلام کیوں باور نہیں آتا۔۔۔ سامعہ مر گیا تھا، اب باصرہ بھی ضعیف ہو گیا۔۔۔۔۔ رئیسِ رامپور سو روپے مہینا دیتے ہیں۔ سال گزشتہ ان کو لکھ بھیجا کہ اصلاح نظم جو اس کا کام ہے اور میں اپنے میں حواس نہیں پاتا۔ متوقع ہوں کہ اس خدمت سے معاف رہوں۔ جو مجھے آپ کی سرکار سے ملتا ہے، عوضِ خدمات سابقہ میں شمار کیجیے، تو میں نمک لبر ہو سہی، ورنہ خیرات خوار سہی، اور اگر یہ عطیہ بشرطِ خدمت ہے، تو جو آپ کی مرضی ہے۔ وہی میری قسمت ہے۔

برس دن سے ان کا کلام نہیں آتا۔ فتوحِ مقرری نومبر تک آئی۔ اب دیکھیے، آگے کیا ہوتا ہے۔ آجتک نواب صاحب از راہِ جوانمردی دیے جاتے ہیں۔"[۳]

(۱) اردو ۱۹۱۵ء... (۲) یہ انگریزی کے لفظ سِک Sick یعنی مریض کی بگڑی ہوئی صورت ہے آج کل رامپور کے عام لوگوں کی زبان پر "سیک" ہے اور جب کوئی سپاہی اچھا ہو کر شفاخانے سے اپنی کمپنی میں جا شامل ہوتا ہے، تو کہتے ہیں کہ "جین" ہو گیا (۲) یہ لفظ انگریزی کے لفظ جوائن "کی تصحیف ہے۔ (۳) اردوی: ۲۳، ۲۴۔

یہ خط میرزا صاحب نے ۱۴ رجب کو لکھا تھا۔ اس کے آخر میں سنہ درج نہیں ہے قیاس چاہتا ہے کہ سنہ ۱۲۸۱ھ مطابق ۱۳ دسمبر سنہ ۱۸۶۴ء تاریخ کتابت ہو۔ وجہ یہ ہے کہ اس میں میرزا صاحب نے نومبر کی تنخواہ موصول ہونے کی اطلاع دی ہے، لہٰذا خط لکھے وقت دسمبر کا مہینا ہونا چاہیے، اور جیسا کہ خود میرزا صاحب کے اٹھائیسویں عریضے سے معلوم ہوتا ہے، رجب سنہ ۱۲۸۱ھ دسمبر سنہ ۱۸۶۴ء کے ساتھ شروع ہوا تھا۔

اس خط میں میرزا صاحب نے اس عریضے کا مضمون دہرایا ہے، جو نواب فردوس مکاں کی خدمت میں ارسال کیا تھا۔ گو وہ عریضہ مثلوں میں موجود نہیں ہے، لیکن دوسری مثلوں میں دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ میرزا صاحب کا یہ ارشاد کہ "دو برس دن سے اُن کا کلام نہیں آتا"، حقیقی عذر ہے۔ کیونکہ دسمبر سنہ ۶۲ء سے دسمبر سنہ ۶۴ء تک نواب فردوس مکاں نے تقریباً ہر ماہ خط بھیجا ہے، مگر کسی میں اشعار کے ارسال کی اطلاع یا مرسلہ کلام کی واپسی کا تقاضا درج نہیں ہے۔ اُن کا آخری کلام وہ دستوخت تھا، جو میرزا صاحب نے آخر اکتوبر سنہ ۶۲ء میں واپس بھیجا اور ۲۹ اکتوبر سنہ مذکور مطابق ۱۵ جمادی الثانیہ سنہ ۱۲۸۱ھ کو موصول ہوا۔ اس کے بعد اکتوبر سنہ ۶۴ء کے آخر یا نومبر کے آغاز میں سرکار مرض سرطان میں مبتلا ہو گئے اور غالباً سنہ ۶۵ء کے شروع میں محرم سنہ ۱۲۸۲ھ کی مجالس کے لیے صرف ایک سلام لکھ کر بھیج سکے۔ جو اُن کے انتقال کے بعد میرزا صاحب نے نواب خلد آشیاں کی خدمت میں واپس ارسال کیا تھا۔[۱]

رامپور کا پہلا سفر، اور سرکار کے پانچ دعوت نامے

مملکت ہند میں امن و اماں قائم ہوتے ہی، سرکار نے میرزا صاحب کو رامپور تشریف لانے کی دعوت دی۔ نواب صاحب کا پہلا دعوت نامہ مثل میں

۱۔ مکاتیب، ۳۶

موجود نہیں ہے۔ صاحبزادہ سید زین العابدین خاں بہادر کے نام کے مکتوب مورخہ ۲۵ مارچ سنہ ۵۸ء میں میرزا صاحب نے اپنے رامپور نہ آنے کے وجوہ تحریر کیے ہیں، اس لیے یقیناً پہلی دعوت ابتدائی سنہ ۵۸ء میں گئی ہوگی۔ خود میرزا صاحب کے الفاظ "بعدِ فتح دہلی وہ ہمیشہ میرے مقدم کے خواہاں رہتے تھے، میں عذر کرتا تھا"، سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے۔ ۲۵ نومبر سنہ مذکورہ کو سرکار نے پھر تحریر فرمایا:

"مشفقا، جو کہ مخلص کو اشتیاق حصولِ معانقہ اور مکالمہ آپ کا بدرجۂ کمال ہے، اور اب تشریف آوری آپ کی اس جگہ مناسب ہے اس واسطے حوالۂ خامۂ محبت نگار کے ہوتا ہے کہ آپ دیدار فائض الانوار اپنے مخلص کو مسرور فرمائیے" ۳

اس کے بعد ۲ فروری سنہ ۱۸۵۹ء کو سرکار نے سہ بارہ تحریر فرمایا:

"اور بھی حالِ وصول پنشن سے اور یہ کہ آپ کا ارادہ تشریف آوری کا اس طرف کو کب ہے مطلع فرمانا موجبِ مزید سرورِ خاطرِ محبت آثر کا متصور ہے" ۳

بعد ازاں ۱۳ ماہ اپریل سنہ ۵۹ء کو چوتھی بار تحریر فرمایا:

"حالِ تشریف آوری آپ کا اس طرف کو ابھی تک سامعہ نواز نہیں ہوا، اور دلِ صفا منزل مشتاق اور منتظرِ دریافت سرورِ ملاقات کا ہے۔ اس واسطے حوالۂ خامۂ اتحاد نگار کے ہوتا ہے کہ آپ براہِ عنایت کے نوید تشریف فرمائی اس سمت سے کہ کب تک ممکن الوقوع ہے، مطلع اور مطمئن فرمائیے" ۴

۲۰ مئی کو پانچویں بار لکھا:

"مشفقا، عرصہ ممتد ہوا کہ اب تک نوید تشریف فرمائی آپ کی اس طرف

۱۔ اردوئے: ۸۳ و (۲)، مکاتیب: ۱، مح ۹۰ و (۳)، مثل نمبر ۵۳، صحیفۂ احباب عہد نواب یوسف علی خاں (۴)، مکاتیب ۱۲ اح ۳۔

کوسامعہ نواز نہیں ہوئی۔ اور آپ کہ انتظار مقدمۂ پنشن کا تحریر فرماتے ہیں، کیا خبرگیری مقدمۂ پنشن کی تشریف رکھنے آپ کے سے یہاں پر مختار ؑ نہیں ہو سکتی؟ آپ براہ لطف اور مہربانی کے حالِ قصد تشریف آوری سے جلد مطلع اور مسرور فرمایئے گا کہ رفعِ انتظار ہو۔"

میرزا صاحب کا عذر

میرزا صاحب، مطلع سیاست صاف ہوجانے کے بعد، اپنی انگریزی پنشن کے اجرا کی سعی میں مصروف تھے، اور اپنے آپ کو جرم بیوفائی و غداری سے قطعاً بری پاتے تھے، اس لیے حکام کی ہر دفتری حرکت ان کی امید کو پیامِ کامیابی نظر آتی تھی۔ بسا اوقات احباب کو کامیابی کی منزل قریب آجانے کی اطلاعیں تک دیدیتے تھے! ایسی حالت میں کس طرح ممکن تھا کہ دلی سے باہر چلے جاتے۔ چنانچہ یہی امروز فردا دلی چھوڑ کر رامپور آنے سے مانع رہے، اور انھوں نے ہر دعوت نامے کے جواب میں عذر کیا کہ پنشن کے وصول کا زمانہ قریب آگیا ہے، اس کو ادھورا چھوڑ کر نہیں آسکتا اس سلسلے میں صاحبزادہ سید زین العابدین خاں بہادر کو تحریر کرتے ہیں؛

"جناب نواب صاحب میرے محسن اور میرے قدرداں اور میری امیدگاہ ہیں۔ میں اگر رامپور نہ آؤں گا، تو اور کہاں جاؤں گا۔ یہ جو آپ کہتے ہیں کہ تجھ کو آنے میں تردد کیا ہے، تردد کچھ نہیں، تو قف سبب وجہ توقف کی یہ کہ میں نے اپنے پنشن کے باب میں چیف کمشنر بہادر کو عرضی دی تھی۔ وہاں سے صاحب کمشنر شہر کے وہ درخواست حوالے ہوئی صاحب کمشنر دہلی نے صاحب کلکٹر شہر سے کیفیت طلب کی ہے۔۔۔۔ بہرحال صاحب کمشنر شہر کیفیت صاحب کلکٹر سے طلب کر کر چیف کمشنر کے ساتھ پنجاب کو گئے ہیں۔ دیکھیے کب آویں، اور بعد ملاحظۂ کیفیت

۱۔ مثل نمبر ۵ و صیغۂ احباب ۱۰ م اردوئے معلی اور عود ہندی میں اس مضمون کے متعدد خطوط موجود ہیں۔

کیا حکم دیں۔ مگر تا صدورِ حکم میں یہاں سے کہیں جا نہیں سکتا۔ ہاں بعد ملنے حکم کے، خواہی دلخواہ ہو خواہی مخالف مدعا، دونوں صورت میں رامپور آؤں گا۔"[۱]

نواب فردوس مکاں کے دعوت نامہ مورخہ ۲۵ نومبر سنہ ۵۸ء کے جواب میں بھی اسی عذر کا اعادہ کیا ہے۔ تحریر فرماتے ہیں:

میرے حاضر ہونے کو جو ارشاد ہوتا ہے، میں وہاں نہ آؤں گا تو اور کہاں جاؤں گا۔ پنسن کے وصول کا زمانہ قریب آیا ہے، اس کو ملتوی چھوڑ کر کیونکر چلا آؤں؟ سنا جاتا ہے اور یقین بھی آتا ہے کہ جنوری ۱۸۵۹ء آغاز سال ۵۹ عیسوی میں یہ قصہ انجام پائے۔ جس کو روپیہ ملنا ہے اس کو روپیہ، جس کو جواب ملنا ہے اس کو جواب مل جائے۔"[۲]

لیکن جنوری سنہ ۵۹ء کا مہینا بھی یونہیں گزر گیا، تو انھوں نے اپنے حسن عقیدت میں اور وسعت پیدا کر لی، اور جب سرکار نے ۱۳ ماہِ اپریل سنہ مذکورہ کو چوتھی بار آمدِ رامپور کی دعوت دی، تو اُس کے جواب میں لکھا:

"پہلے خط میں یہ عرض کیا ہے کہ مجموعہ پنسنداروں کی مثل مرتب ہے، اور ہنوز صدر کو روانہ نہیں ہوئی۔ نواب گورنر جنرل لارڈ کیننگ بہادر نے کلکتے سے میرے پنسن کے کاغذ طلب کیے، اور وہ کاغذ فہرست میں سے الگ ہو کر لفٹنٹ گورنر بہادر پنجاب کی خدمت میں ارسال ہوئے۔ وہاں سے کلکتے کو بھیجے جائیں گے۔ پھر وہاں سے حکم منظوری پنجاب ہوتا ہوا یہاں آئے گا، اور یہاں مجھ کو روپیہ مل جائے گا۔ آج روپیہ ملا، کل میں نے آپ سے سواری اور باربرداری مانگی۔ آج سواری اور باربرداری پہنچی، اور کل میں نے رامپور کی راہ لی۔"[۳]

۱۔ مکاتیب: ۸۶؛ ۲۔ ایضاً: ۱۳؛ ۳۔ ایضاً: ۸۲۔

چھٹی دعوت

اس عذر کو سرکار نے اپنے محولہ بالا فرمان مورخہ ۲ مئی میں تسلیم فرمایا
اور برابر اشتیاقِ ملاقات ظاہر فرماتے رہے، تاآنکہ سنہ ۱۸۵۹ء ختم ہونے کے
قریب آگیا، اور پنشن کا معاملہ ہنوز لیت و لعل ہی میں پڑا رہا۔ آخر سرکار نے
۱۷ دسمبر سنہ ۱۸۵۹ء کو پھر ارقام فرمایا:

سابق میں چند مرتبہ درباب تشریف فرمائی یہاں کے متکلف ہوا ہوں، لیکن
اب تک آپ نے سرور ملاقاتِ بہجت آیات سے مسرور نہیں فرمایا۔
اب لازم اشفاق کا یہ ہے کہ آپ تشریف شریف باسرع ازمنہ ارزانی
فرماویں اور مخلص کو مشکور الطاف کا کریں۔[۱]

میرزا صاحب اس عرصے میں نواب فردوس مکاں کے اخلاص اور اعانت
کے بدل معترف ہو چکے تھے، اور یہ عزم کر کے کہ مقدمۂ پنسن کے منفصل
ہوتے ہی رامپور روانہ ہو جائیں گے، یوسف مرزا کو لکھا تھا:

"میں تو پنسن کے باب میں حکم اخیر سن لوں، پھر رامپور چلا جاؤں گا۔ جمادی
الاول سے ذی الحجہ تک ۸ مہینے، اور پھر محرم سے سنہ ۱۲۷۷ سال شروع ہوگا
اس سال کے دو چار، دس گیارہ مہینے، غرض کہ انیس بیس
مہینے ہر طرح بسر کرتے ہیں۔ اس میں رنج و راحت و ذلت و عزت جو مقسوم
میں ہے وہ پہنچ جائے، اور پھر "علی علی" کہتا ہوا ملک عدم کو چلا جاؤں
جسم رامپور میں اور روح عالم نور میں۔ یا علی! یا علی! یا علی!"[۲]

میرزا صاحب کا عزم سفر اور اس کا مقصد

جب آغازِ سنہ ۱۸۶۰ء میں گورنمنٹ نے مقدمۂ پنشن کا فیصلہ میرزا صاحب
کی خواہش اور امید کے خلاف صادر کیا، تو انھوں نے حسب وعدہ سفر رامپور

۱۔ مکاتیب ۱۷ ح ۳۰ ۔ ۲۔ اردو: ۳۴۵

کی تیاری کی۔ اس سلسلے میں تجزیر کو لکھتے ہیں

"بعد فتح دہلی وہ (نواب فردوس مکاں) ہمیشہ میرے مقدم کے خواہاں رہتے تھے۔ میں عذر کرتا تھا۔ جب جنوری سنہ ۱۸۶۰ء میں گورنمنٹ سے وہ جواب پایا کہ جو اوپر لکھ آیا ہوں، تو میں آخر جنوری میں رامپور گیا"۱

نواب فردوس مکاں ایام غدر میں گورنمنٹ کے وفادار اور معاون تھے انگریز حکام کی نظر میں ان کی بڑی عزت و وقعت تھی۔ میرزا صاحب سے بھی اُن کے تعلقات بیحد پرخلوص تھے۔ مقدمہ خلاف فیصل ہونے کے بعد میرزا صاحب نے مناسب جانا کہ رامپور جائیں اور سرکار کے توسط سے اپنا معاملہ گورنمنٹ سے صاف کرائیں شیو نراین کو ۳ مارچ سنہ ۶۰ء کو رامپور سے لکھا ہے،

"میں حسب الطلب نواب صاحب کے دوستانہ یہاں آیا ہوں، اور اپنی صفائی گورنمنٹ سے بذریعہ اُن کے چاہتا ہوں۔ دیکھوں کیا ہوتا ہے"۲

اس کے علاوہ ایک اور واقعہ، جو قیام رامپور کے زمانے میں پیش آیا، اس امر کا شاہد ہے کہ سفر رامپور سے میرزا صاحب کا مقصد "گورنمنٹ سے اپنی صفائی" تھا۔ ۱۴ فروری سنہ مذکورہ کو حکیم غلام نجف خاں کو تحریر کیا ہے۔

"یہاں کا یہ حال ہے کہ نواب لفٹنٹ گورنر بہادر آگرہ مرادآباد آیا چاہتے ہیں۔ مرادآباد یہاں سے بارہ کوس ہے۔ نواب صاحب دورے کو اپنے ملک کے گئے ہیں دو چار دن میں پھر آئیں گے۔ اگر ان کی ملاقات کو مرادآباد جائیں گے میں بھی ساتھ جاؤں گا۔ اگرچہ گورنر غرب و شمال کو دلی سے کچھ علاقہ نہیں، مگر دیکھوں، کیا گفتگو درمیان آتی ہے"۳

اگر میرزا صاحب کے پیش نظر گورنمنٹ سے صفائی نہ ہوتی، تو یہ جانتے ہوئے کہ غرب و شمال کے گورنر کو دلی سے کچھ واسطہ نہیں، سرکار کے ساتھ مرادآباد جانے کا تہیا نہ کرتے

۱۔ اردوی: ۵۳ ۲) ایضاً: ۱۳۸ ۳) ایضاً: ۲۲۹۔

دلّی سے روانگی

میرزا صاحب نے ارادہ کیا کہ آخر جمادی الآخرہ میں دلی سے روانہ ہوں اور رجب المرجب کا چاند رامپور آکر دیکھیں۔ حسین مرزا کو سہ شنبہ ۳۱ دسمبر سنہ ۵۹ء کو لکھتے ہیں:

رامپور زندگی میں میرا مسکن اور بعد مرگ میرا مدفن ہو بہا جب تم لکھتے ہو کہ "لِلّٰہ تم وہاں جاؤ!" تو مجھ کو ہنسی آتی ہے۔ میں یقین کرتا ہوں کہ ہلال ماہ رجب المرجب رامپور میں دیکھوں۔ [۱]

اس خط کی تحریر سے ۱۹ دن بعد میرزا صاحب دلّی سے روانہ ہوئے دلّی سے روانگی کی تاریخ کا ذکر متعدد خطوں میں پایا جاتا ہے۔ مثلاً تفتہ کو مجملاً لکھ دیا ہے:

جب جنوری سنہ ۱۸۶۰ء میں گورنمنٹ سے وہ جواب پایا کہ جو اوپر لکھ آیا ہوں، تو میں آخر جنوری میں رامپور گیا۔ [۲]

رامپور سے واپس جاکر شیو نراین کو مہینے کے ساتھ تاریخ بھی لکھی ہے فرماتے ہیں:

۱۹ یا ۲۰ جنوری سنہ ۱۸۶۰ء کتاب اور دونوں عرضیاں ولایت کو روانہ کرکے رامپور گیا ہوں۔ [۳]

لیکن آخر عمر میں میرزا صاحب کا حافظہ خراب ہو گیا تھا، اس لیے انھیں صحیح تاریخ یاد نہیں رہی۔ در اصل وہ جنوری سنہ ۶۰ء کو دلی سے روانہ ہوئے تھے۔ چنانچہ ۲۱ جنوری کو میرٹھ پہنچکر تفتہ کو لکھا ہے:

بھائی، میں نے دلّی کو چھوڑا، اور رامپور کو چلا۔ ... ۱۹ کو مرادنگر اور ۲۰ کو میرٹھ پہنچا۔ آج شنبہ ۲۱ کو بھائی مصطفیٰ خاں کے کہنے سے مقام کیا یہاں سے یہ خط تم کو لکھ کر بھیجا۔ کل شاہجہاں پور، پرسوں گڑھ مکتیشر ہوں گا پھر مرادآباد ہوتا ہوا رامپور جاؤں گا۔ [۴]

۱۔ اردوئے معلی: ۲۹۲ (۲) ایضاً: ۲۵۳ (۳) ایضاً: ۳۸۲ (۴) ایضاً: ۸۶۔

اسی تاریخ حکیم غلام نجف خاں کو لکھتے ہیں:

میاں میں تم سے رخصت ہو کر اس دن مراد نگر میں رہا۔ دوسرے دن یعنی جمعے کو میرٹھ ..... پہنچا۔ نواب مصطفیٰ خاں نے ایک دن رکھ لیا۔ آج شنبہ ۱۲ جنوری یہاں مقام ہے۔ نو بج گئے ہیں۔ بیٹھا ہوا یہ خط لکھ رہا ہوں۔ نعمت کا کھانا ہے۔ خوب پیٹ بھر کر کھاؤں گا۔ کل شاہجہاں پور، پرسوں گڈھ مکتیشر رہوں گا۔ مرادآباد سے پھر تم کو خط لکھوں گا۔"۱

ان تمام تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ جمعرات کے دن صبح کے وقت ۱۹ جنوری سنہ ۶۰ء کو میرزا صاحب دلی سے روانہ ہوئے۔

اخفای حال

روانگی سے پہلے میرزا صاحب نے کسی مصلحت کے ماتحت احباب سے مختلف مقامات کے سفر کا اظہار کیا تھا میرٹھ پہنچکر اخفا کی ضرورت نہ سمجھی اور وہیں سے حکیم غلام نجف خاں کو لکھا

ہاں بھائی میں ازروی مصلحت اپنے کو مقامات مختلف کا عازم کہہ آیا ہوں اب جو شخص تم سے پوچھا کرے، اس سے پردہ نہ کرنا اور صاف کہہ دینا کہ رام پور گیا ہے۔ یعنی سب کو معلوم ہو جائے، اور کوئی تذبذب میں نہ رہے۔"۲

اس مکتوب میں میرزا صاحب نے اس مصلحت کو ظاہر نہیں کیا، جو مقام سفر کے اخفا کی بنا تھی۔

منازل سفر

۱۷ جنوری کی صبح کو دلی سے روانہ ہو کر میرزا صاحب نے شام کو مراد نگر میں قیام کیا۔ دوسرے دن جمعے کو میرٹھ پہنچے۔ ایک دن نواب مصطفیٰ خاں بہادر شیفتہ کے یہاں ٹھہر کر اتوار کو شاہجہانپور اور پیر کو گڈھ مکتیشر میں اترے۔ یہاں

۱۔ اردوی: ۲۳۲؛ ایضاً: ۲۳۳۔

سے مراد آباد تک کے منازل کا پتا نہیں، جو منگل اور بدھ دو دن میں طے کیے ہوں گے، لیکن یہ یقینی ہے کہ آخری منزل مراد آباد تھی۔ یہ تمام تفصیل مرزا تفتہ اور حکیم غلام نجف خاں کے نام کے مکاتیب میں ابھی گزر چکی ہے۔

رفقای سفر

اس سفر میں عارف مرحوم کے دونوں لڑکوں، باقر علی خاں اور حسین علی خاں، کے علاوہ کلو خانساماں[1]، عنایت اللہ خادم، اور غالباً دو ملازم اور میرزا صاحب کے ہمرکاب تھے[2]۔ لڑکوں کا ذکر متعدد خطوط میں کیا گیا ہے۔ یہاں صرف اس خط کا اقتباس کافی ہوگا، جس میں تمام ہمراہیوں کا ذکر ہے۔ حکیم غلام نجف خاں کے خط کے آخر میں لکھتے ہیں:

لڑکے بھی تندرست، آدمی بھی توانا، مگر ہاں ایک عنایت اللہ دو دن سے کچھ بیمار ہے۔ خیر اچھا ہو جائے گا۔"[3]

ورود رامپور کی تاریخ

غالباً میرزا صاحب جمعرات کے دن مراد آباد پہنچے، اور وہاں ..... رات کو آرام کر کے دوسرے دن جمعے کو رامپور ..... وارد ہوئے۔ جمعہ ۳ فروری کو رامپور سے حکیم غلام نجف خاں کو لکھتے ہیں:

"آج تک کہ جمعہ آٹھواں دن میرے پہنچنے کو ہے، کچھ کلام نہیں ہوا۔"[4]

اس سے صرف اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ میرزا صاحب جمعے کے دن رامپور پہنچے۔ مرزا تفتہ اور حکیم غلام نجف خاں کو میرٹھ سے جو خطوط لکھے ہیں، اُن میں میرزا صاحب نے جمعے کو ۲۰ اور شنبے کو ۲۱ جنوری تاریخ تحریر کی ہے۔ اس حساب سے جس جمعے کو میرزا صاحب نے سرزمین رامپور پر قدم رکھا، ۲۷ جنوری

۱۔ میرزا صاحب نے ۱۵ مارچ سنہ ۱۸۶۰ء کو ۳ سو روپے کی ایک رسید لکھ کر دی تھی۔ اس کے نچلے گوشے میں خزانچی نے لکھا ہے: "حوالہ کلو خانساماں خواجہ نوشہ صاحب نمودہ بشد۔" یہ رسید کتاب الی امداد کی بحث میں حاشیے کے اندر نقل ہوگی۔ ۲۔ دو اور ملازموں کا قیاس دوسرے سفر میں ۲ ملازموں کے ساتھ ہونے پر مبنی ہے۔ ۳۔ اردوی: ۲۶۔ ۴۔ ایضاً: ۲۲۔

سنہ ۱۸۶۰ء تاریخ انگریزی ہونی چاہیے۔

قیام گاہ

رامپور پہنچ کر میرزا صاحب نے سرکار کی خاص کوٹھی میں قیام کیا باقر علی خاں اور حسین علی خاں میرزا صاحب کے ساتھ تھے۔ یہاں چار دن گزارنے کے بعد از روئے احتیاط جداگانہ مکان کی خواہش کی سرکار نے ایک مکان جو تین چار حویلیوں پر مشتمل تھا، قیام کے لیئے عطا فرمایا۔ میرزا صاحب نے شفتہ کے پتہ پوچھنے پر جو خط لکھا ہے، اس میں فرماتے ہیں:

"پہلے تو یہ تباؤ کہ رامپور میں مجھے کون نہیں جانتا۔ کہاں مولوی وجیہ الزماں صاحب کہاں ہیں؟ ان کا مسکن میرے مسکن سے دور۔ پھر دولت رئیس کہاں اور میں کہاں؟ چار دن والیٔ شہر نے اپنی کوٹھی میں اتارا جب نے مکان جداگانہ مانگا دو تین حویلیاں برابر برابر مجھ کو عطا ہوئیں اب اس میں رہتا ہوں بسبب اتفاق ڈاک گھر مسکن کے پاس ہے۔ ڈاک منشی آشنا ہوگیا ہے۔ برابر دلی سے خط چلے آتے ہیں۔ صرف رامپور کا نام اور میرا نام محلے کی اور عرف کی حاجت نہیں بلکہ در دولت اور مولوی صاحب کے نشان سے شاید خط تلف ہو جائے۔"[1]

حکیم غلام نجف خاں کو لکھا ہے:

"مکان کا پتہ ضرور نہیں۔ ڈاک گھر میرے گھر کے پاس۔ ڈاک منشی میرا آشنا . . . . ایک مکان کہ وہ تین چار مکانوں پر مشتمل ہے، رہنے کو ملا ہے۔"[2]

مجروح کو تحریر کیا ہے:

"تمہارا خط پہنچا تردد عبث۔ میرا مکان ڈاک گھر کے قریب اور ڈاک منشی میرا دوست ہے۔"[3]

۱۔ اردوئے معلیٰ، ۱۰۱، ۳ لاہور ایڈیشن (۲)، ایضاً: ۲۲۵ (۳)، ایضاً: ۱۹۱۔

مکان کی تحقیق

بزرگانِ شہر سے تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ محلۂ راجدوارہ کی اس شاہراہ پر، جو خاص باغ کو جاتی ہے، مفتی احمد یار خاں صاحب کے مکان کے محاذ میں ڈاک خانہ تھا، اور میرزا صاحب نے اُس کے متصل مکان میں قیام کیا تھا۔ چونکہ یہ مکان اردو ادب کے نیرِ رخشاں کی فرودگاہ رہ چکا تھا، عالی مرتبت صاحب چیف منسٹر بہادر کے حسب الحکم ۲۱ فروری سنہ ۴۴ ۱۹ء کو اس پر یادگاری پتھر لگایا گیا، اور ۲۲ فروری کو بندگانِ ہمایونِ اعلیٰحضرت شہریارِ رامپور دام اقبالہم و ملکہم نے ایک نمایندہ ادبی مجمع کے روبرو اس کی نقاب کشائی فرمائی۔

مہمانداری

میرزا صاحب کے لیے ابتداءً سرکاری باورچیخانے سے کھانا آتا رہا۔ حکیم غلام نجف خاں کو لکھتے ہیں:

"کھانا دونوں وقت سرکار سے آتا ہے، اور وہ سب کو کافی ہوتا ہے۔ غذا میرے بھی خلافِ طبع نہیں۔"[۱]

مجروح کے خط میں بھی سرکاری مہمانداری کا ذکر کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

"۔۔ یہاں کا حال سب طرح خوب ہے۔ اور صحت مرغوب ہے۔ اس وقت تک مہمان ہوں۔"[۲]

چند دن کے بعد کھانے کے سو روپے ماہوار مقرر کر دیے گئے۔ دلی جاکر میرزا صاحب نے مجروح کو لکھا ہے:

"۔۔ اب جو میں وہاں گیا، تو سو روپیہ مہینا بنام دعوت اور دیا۔ یعنی رامپور رہوں تو دو سو روپے مہینا پاؤں، اور دلی رہوں تو سو روپے۔"[۳]

۱۔ اردوی: ۸۰۲ (۲) ایضاً: ۴۹۲ (۳) ۱۶۲۔

آب و ہوائے رامپور

رامپور کی آب و ہوا میرزا صاحب کے مزاج کے موافق ثابت ہوئی
آمدِ رامپور کے ۸ دن بعد حکیم غلام نجف خاں کو لکھا ہے:

" پانی کا شکر کس منھ سے ادا کروں! ایک دریا ہے کوسی۔ سبحان اللہ
اتنا میٹھا پانی کہ پینے والا گمان کرے کہ یہ پھیکا شربت ہے۔ صاف ہے، سبک
گوارا، ہاضم، سریع النفوذ۔ اس آٹھ دن میں قبض و انقباض کے صدمے سے
محفوظ ہوں۔ صبح کو خوب بھوک لگتی ہے۔ لڑکے بھی تندرست، آدمی بھی توانا، مگر ہاں،
ایک عنایت اللہ دو دن سے کچھ بیمار ہے۔ خیر اچھا ہو جائے گا"۔ ۱

رامپور ہی سے مجروح کو تحریر کیا ہے

" یہ رامپور ہے۔ دار السرور ہے۔ جو لطف یہاں ہے، وہ اور کہاں ہے!
پانی سبحان اللہ! شہر سے تین سو قدم پر ایک دریا ہے، اور کوسی اُس کا نام
ہے۔ بے شبہ چشمۂ آبِ حیات کی کوئی سوت اس میں ملی ہے۔ خیر اگر یوں
بھی ہے، تو بھائی آبِ حیات عمر بڑھاتا ہے، اتنا شیریں کہاں ہوگا؟"

ملاقات اور تعظیم و توقیر

نواب فردوس مکاں کا اخلاق میرزا صاحب کی امید کے مطابق ثابت
ہوا۔ سرکار نے بر وقت ملاقات احباب کی طرح معانقہ کیا، اور احباب میں
تعظیم و توقیر کی جو رسم ہے اس کو ملحوظ رکھا۔ میرزا صاحب نے دونوں لڑکوں
سے نذر دلوائی۔ سرکار کے اس برتاؤ کے بارے میں مجروح کو لکھتے ہیں:

" تعظیم و توقیر میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں ہے"۔ ۲

بعد ازاں دلی جا کر لکھا ہے:

" ملاقات بھی دوستانہ رہی۔ معانقہ و تعظیم جس طرح احباب میں رسم ہے

۱۔ اردوی: ۲۲۲ (۲)، ایضاً ۱۹۲۔

وہ صورت ملاقات کی ہے۔ لڑکوں سے میں نے نذر دلوادی تھی، بس۔" ۱

اسی سلسلے میں رامپور سے حکیم غلام نجف خاں کو تحریر کیا ہے:

اب میرا حال سنو تعظیم و توقیر بہت۔ ملاقاتیں تین ہوئی ہیں۔" ۲

ابھی گفتگو نہیں ہوئی

نواب فردوس مکاں نے جولائی سنہ ۵۹ء سے میرزا صاحب کو سو روپے ماہوار عطا فرمانا شروع کر دیئے تھے، جو انھیں بذریعہ ہنڈوی ماہ بماہ ارسال ہوا کرتے۔ میرزا صاحب رامپور تشریف لائے، اور چند روز تک خدمت، اور معاوضے کے بارے میں سرکار سے رو در رو گفتگو نہیں ہوئی، تو انھیں مختلف خطرات پیدا ہوئے۔ خدمت اور درماہے کے خطرے کو حکیم غلام نجف خاں کے نام کے مکتوب میں اس طرح ظاہر کیا ہے:

"ہنوز کچھ گفتگو درمیان نہیں آئی۔ میں خود اُن سے ابتدا نہ کروں گا۔ وہ بھی مجھ سے بالمشافہ نہ کہیں گے، مگر بواسطۂ کار پردازان سرکار دیکھوں کیا کہتے ہیں اور کیا مقرر کرتے ہیں۔" ۳

یہ خط ۳ فروری کو لکھا گیا تھا۔ اس کے بعد ۱۴ فروری کو پھر لکھتے ہیں:

"یہاں کا رنگ نواب صاحب کے آنے پر جو ہوگا، اور جو قرار پائے گا وہ مفصل تم کو لکھوں گا۔

مجروحؔ کو بھی دبے الفاظ میں لکھا ہے:

"اس وقت تک مہمان ہوں۔ دیکھوں کیا ہوتا ہے۔" ۴

رامپور کی اقامت کے خطرے کو تفتہ کے خط میں ظاہر کیا ہے فرماتے ہیں:

"دوسری بات جو تم نے لکھی ہے وہ بھی مطابق واقع و مناسب حال نہیں اگر اقامت قرار پائی، تو تم کو بلالوں گا۔" ۵

۱۴ فروری کو تفتہؔ کے خط کے جواب میں پھر لکھا ہے:

۱۔ اردوی: ۱۲۲، ۲۔ ایضاً: ۴۴، ۳۔ ایضاً: ۲۳، ۴۔ ایضاً: ۱۶۹، ۵۔ ایضاً ۷۲، ۳ لاہور ایڈیشن۔

میری جان! آخر لڑکے ہو، بات کو نہ سمجھے۔ میں اور تفتہ کا اپنے پاس ہونا غنیمت نہ جانوں۔ میں نے یہ لکھا تھا کہ بشرط اقامت بلا لوں گا۔ اور پھر لکھتا ہوں کہ اگر میری اقامت یہاں کی ٹھہری، تو بے تمہارے نہ رہوں گا، نہ تمہارا نہ رہوں گا۔

سہ بارہ یکم مارچ کو لکھتے ہیں:

"بالفعل نواب لفٹنٹ گورنر بہادر، مراد آباد اور وہاں سے رامپور آئیں گے۔ بعد اُن کے جانے کے کوئی طور اقامت یا عدم اقامت کا ٹھہرے گا۔ منظور مجھ کو یہ ہے، کہ اگر یہاں رہنا ہوا، تو فوراً تم کو بلا لوں گا۔"[۲]

تعیین خدمت واقامت

آخر کار یہی طے پایا کہ میرزا صاحب رامپور کی اقامت اختیار کرنے پر مجبور نہیں۔ البتہ رامپور آ کر رہیں گے، تو دعوت کے سو روپے ماہوار مزید عطا ہوں گے، اور دلی رہیں گے، تو صرف سو روپے تنخواہ ملے گی اس تصفیے کے متعلق میرزا صاحب نے مجروح کو لکھا ہے:

"قرارداد یہ ہے کہ نواب صاحب جولائی سنہ ۱۸۵۹ء سے، کہ جس کو یہ دسواں مہینا ہے، سو روپے مجھے ماہ بماہ بھیجتے ہیں۔ اب جو میں وہاں گیا تو سو روپے مہینا بنام دعوت اور دیا یعنی رامپور رہوں تو دو سو روپے مہینا پاؤں، اور دلی رہوں تو سو روپے۔ بھائی، سو دو سو میں کلام نہیں۔ کلام اس میں ہے کہ نواب صاحب دوستانہ و شاگردانہ دیتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بہرحال غنیمت ہے۔ رزق کے اچھی طرح ملنے کا شکر چاہیے۔ کمی کا شکوہ کیا۔"[۳]

تفتہ کو تحریر کیا ہے:

۱۔ اردوی: ۳ ح ۳۔ (۲) ایضاً: ۷۰ (۳) ایضاً: ۱۶۲۔

دہ سو روپے مہینا یہاں رہوں، وہاں رہوں، خدا کے ہاں سے میرا
مقرر ہے" ۱

جنونؔ بریلوی کو لکھا ہے:

"حق تعالیٰ والیٔ رامپور کو صد ہا سال سلامت رکھے! اُن کا عطیہ
ماہ بماہ مجھ کو پہنچتا ہے۔ کرم گستری اور استاد پروری کر رہے ہیں۔
میرے رنجِ سفر اٹھانے کی اور رامپور جانے کی حاجت نہیں" ۲

علائی کو قدرے تفصیل سے لکھتے ہیں:

"رئیس کی طرف سے بطریق و کیل محکمہ کمشنری متعین نہیں ہوں
جس طرح امرا واسطے نفرے کے وجہ معاش مقرر کر دیتے ہیں، اسی طرح اس
سرکار سے میرے واسطے مقرر ہے۔ ہاں فقیر سے دعائے خیر اور مجھ سے اصلاحِ
نظم مطلوب ہے۔ چاہوں دلی رہوں، چاہوں اکبر آباد، چاہوں لاہور،
چاہوں بہار رہوں" ۳

لڑکوں کی شرارت

رامپور کی آب و ہوا کی موافقت اور سرکار کی تعظیم و توقیر کے باعث سے میرزا صاحب زیادہ قیام کرنا چاہتے تھے لیکن باقر علی خاں اور حسین علی خاں ساتھ تھے۔ میرزا صاحب نے اُن کا دل بہلنے کے خیال سے طفلانہ کھیل کود کے تمام لوازم مہیا کر دیے تھے اس پر بھی یہ برابر اُن کے سکون و آرام میں خلل ڈالتے رہے۔ ۱۴ فروری کو میرزا صاحب نے حکیم غلام نجف خاں کو لکھا ہے:

"لڑکے دونوں اچھی طرح ہیں۔ کبھی میرا دل بہلاتے ہیں، کبھی مجھ کو ستاتے
ہیں، بکریاں، کبوتر، بٹیریں، تکل، کنکوا سب سامان درست ہے" ۴

اپنے ارادۂ قیام اور اُن کی شرارت کے متعلق یوسف مرزا صاحب کو تحریر کرتے ہیں:

"مجھ کو لڑکوں نے بہت تنگ کیا ورنہ چند روز اور رامپور میں رہتا" ۵

---

۱ اردوئے معلیٰ ۵۸ (۱)، ۲ ایضاً ۱۱۱ (۳)، ۳ ایضاً ۳۰۴ (۲)، ۴ ایضاً ۲۲۶، ۵ ایضاً ۱۴۳۔

مجروح کو لکھا ہے:

"لڑکوں کو ساتھ لے گیا تھا وہاں انھوں نے میرا ناک میں دم کر دیا تنہا بھیجنے میں وہم آیا، کہ خدا جانے، اگر کوئی امر حادث ہو، تو بدنامی عمر بھر رہے۔ اس سبب سے جلد چلا آیا، ورنہ گرمی برسات وہاں کاٹتا۔ اب بشرط حیات جریدہ بعد برسات جاؤں گا، اور بہت دنوں تک یہاں نہ آؤں گا"[۱]

دلی کو واپسی

لڑکوں کی شرارت سے تنگ آکر میرزا صاحب نے برسات تک کے ارادۂ قیام رامپور کو فسخ کر دیا۔ سرکار نے ہرچند روکا اور آموں کا لالچ دیا لیکن میرزا صاحب نہ رکے، اور آخر مارچ مطابق آخر شعبان میں دلی کو روانہ ہو گئے رامپور سے روانگی کی تاریخ بھی میرزا صاحب نے متعدد خطوط میں تحریر کی ہے جنون بریلوی کو لکھتے ہیں:

"سال گذشتہ انھی دنوں میں رامپور تھا۔ مارچ سنہ ۶۰ء میں یہاں آگیا ہوں"[۲]

تفتہ کو لکھتے ہیں

"مہاراج میں جو آخر جنوری کو رامپور جا کر آخر مارچ میں یہاں آگیا ہوں، تو کیا کہوں کہ یہاں کے لوگ میرے حق میں کیا کیا کچھ کہتے ہیں"[۳]

مجروح کو تحریر کرتے ہیں:

"میر مہدی، تم میری عادت کو بھول گئے۔ ماہ مبارک رمضان میں کبھی جامع مسجد کی تراویح ناغہ ہوئی ہے؟ میں اس مہینے میں رامپور کیونکر رہتا؟ نواب صاحب مانع رہے، اور بہت منع کرتے رہے برسات کے آموں کا لالچ دیتے رہے۔ مگر بھائی، میں ایسے انداز سے چلا کہ چاند رات کے دن یہاں آ پہنچا۔ یکشنبے کو غرۂ ماہ مقدس ہوا"[۴]

۱۔ اردوئے معلیٰ: ۱۷۰ (۲) ایضاً: ۱۲۱ (۳) عود: ۹۶ (۴) ایضاً: ۱۲۵ (۵) ایضاً: ۱۲۱۔

قدر بلگرامی کو سہ شنبہ ۱۳ مارچ سنہ ۶۰ء کو لکھا ہے:

"اب جو خط بھیجئے، دلی کو بھیجئے گا، کہ میں اس مہینے میں اُدھر کو جاؤں گا

رویت ماہِ صیام، اغلب ہے کہ دلی ہی میں ہو۔"[۱]

ان خطوط سے صرف اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ میرزا صاحب آخر شعبان سنہ ۱۲۷۶ھ مطابق آخر مارچ سنہ ۱۸۶۰ء میں رامپور سے روانہ ہو کر ۳۰ شعبان کو دلی پہنچے، اور وہاں پہنچکر رمضان المبارک کا چاند دیکھا۔ ابھی انگریزی و ہجری تاریخوں کا تعین باقی ہے۔ انگریزی تاریخ کے بارے میں شیونراین کو رامپور سے لکھتے ہیں:

"اب میں شنبے کے دن، ۱۷ مارچ کو دلی روانہ ہوں گا۔"[۲]

یوسف میرزا کو ۹ رمضان مطابق ۲ ماہ اپریل کو ہجری تاریخ کے متعلق تحریر کیا ہے:

"میں ۲۴ شعبان کو رامپور سے چلا اور ۳۰ شعبان کو دلی پہنچا۔ اسی دن چاند ہوا۔"[۳]

میرزا صاحب نے اس خط میں رمضان کی نویں تاریخ کو اپریل کی دوسری تاریخ کے مطابق لکھا ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ اس سال رمضان کا چاند ۳۰ کا ہوا تھا۔ اس حساب سے ۲۴ شعبان سنہ ۱۲۷۶ھ کا تطابق ۱۷ مارچ سنہ ۱۸۶۰ء کے ساتھ، اور ۳۰ شعبان سنہ مذکورہ کا ۲۴ مارچ سنہ ۶۰ء کے ساتھ ہو گا۔ لہٰذا میرزا صاحب کی رامپور سے روانگی کی تاریخ ۲۴ شعبان ۷۶ھ مطابق ۱۷ مارچ سنہ ۶۰ء اور دلی پہنچنے کی تاریخ ۳۰ شعبان ۷۶ھ مطابق ۲۴ مارچ سنہ ۶۰ء قرار پائی ہے۔

مراد آباد میں قیام

خواجہ حالی مرحوم نے حیات جاوید میں لکھا ہے کہ سرسید کہتے تھے کہ جب

۱۔ اردوی: ۴۰۶، لاہور ایڈیشن (۲) ایضاً: ۳۰۵ (۳) ایضاً: ۳۲۸۔

میں مراد آباد میں تھا، اس وقت میرزا صاحب نواب یوسف علی خاں مرحوم سے ملنے کو رامپور گئے تھے۔ ان کے جانے کی تو مجھے خبر نہیں ہوئی، مگر جب دلی کو واپس جاتے تھے، میں نے سنا کہ وہ مراد آباد میں سرائے میں آکر ٹھہرے ہیں۔ میں فوراً سرائے میں پہنچا اور میرزا صاحب کو مع اسباب اور تمام ہمراہیوں کے اپنے مکان پہلے آیا۔ ظاہرا جب سے کہ سرسید نے تقریظ کے چھاپنے سے انکار کیا تھا، وہ میرزا سے اور میرزا ان سے نہیں ملے تھے، اور دونوں کو حجاب دامنگیر ہو گیا تھا، اور اسی لیے میرزا نے مراد آباد آنے کی اُن کو اطلاع نہیں دی تھی۔ الغرض جب میرزا سرائے سے سرسید کے مکان پر پہنچے، اور پالکی سے اترے، تو ایک بوتل اُن کے ہاتھ میں تھی، جنھوں نے اُس کو مکان میں لاکر ایسے موقع پر رکھ دیا جہاں ہر ایک تم نفے جاتے کی نگاہ پڑتی تھی۔ سرسید نے کسی وقت اُس کو وہاں سے اٹھا کر اسباب کی کوٹھری میں رکھ دیا۔ میرزا نے جب بوتل کو وہاں نہ پایا، تو بہت گھبرائے۔ سرسید نے کہا: "آپ خاطر جمع رکھیے۔ میں نے اس کو بہت احتیاط سے رکھ دیا ہے۔" میرزا نے کہا: "بھئی، مجھے دکھا دو تم نے کہاں رکھی ہے۔" اُنھوں نے کوٹھری میں لیجا کر بوتل دکھا دی۔ آپ نے اپنے ہاتھ سے بوتل اٹھا کر دیکھی، اور مسکرا کر کہنے لگے کہ "بھئی، اس میں تو کچھ خیانت ہوئی ہے۔ سچ بتاؤ کس نے پی ہے۔ شاید اسی لئے تم نے کوٹھری میں لاکر رکھی تھی۔ حافظ نے سچ کہا ہے:

واعظان کیں جلوہ بر محراب و منبر می کنند چوں بخلوت میروند آں کار دیگر می کنند

سرسید ہنس کے چپ ہو رہے، اور اس طرح وہ رکاوٹ، جو کئی برس سے چلی آتی تھی، رفع ہو گئی۔ میرزا دو ایک دن وہاں ٹھہر کر دلی چلے آئے۔"[1]

۱۔ حیات جاوید: ۱، ۷۵۔ مگر از روئی حساب منازل، میرزا صاحب نے سرسید کے پاس دو ایک دن قیام نہیں کیا تھا، بلکہ اسی دن وہاں سے روانہ ہو گئے تھے۔

کل مدتِ قیام رامپور

میرزا صاحب کے بعض خطوں میں رامپور کے قیام کی کل تخمینی مدت کا بھی ذکر آیا ہے۔ تفتہ کو لکھتے ہیں:

"میں آخر جنوری میں رامپور گیا۔ چھ سات ہفتے وہاں رہ کر دلی آیا۔"[1]

تفتہ کو لکھتے ہیں:

"نواب یوسف علی خاں بہادر... بلاتے رہتے تھے۔ اب میں وہاں گیا، دو مہینے رہ کر چلا آیا۔"[2]

علائی کو تحریر فرماتے ہیں:

"سالِ گزشتہ بیڑی کو زاویۂ زنداں میں چھوڑ مع دونوں ہتکڑیوں کے بھاگا۔ میرٹھ، مرادآباد ہوتا ہوا رامپور پہنچا۔ کچھ دن کم دو مہینے وہاں رہا تھا کہ پھر پکڑ آیا۔ اب عہد کیا کہ پھر نہ بھاگوں گا۔"[3]

اِن خطوں میں "چھ سات ہفتے"، "کچھ دن کم دو مہینے" اور "دو ماہ" تین مختلف بیان ملتے ہیں۔ ان میں سے "کچھ دن کم دو مہینے" صحیح ہے، اس لیے کہ میرزا صاحب ایک ماہ بیس یوم رامپور میں رہے تھے۔

رامپور میں عدیم الفرصتی

قیامِ رامپور کے زمانے میں میرزا صاحب اس قدر عدیم الفرصت رہے کہ اکثر احباب کے محبت ناموں کا بروقت جواب تک نہ دے سکے۔ ایک خط میں اس کی وجہ تحریر فرماتے ہیں:

"ازبسکہ یہاں کے حضرات مہربانی فرماتے ہیں، اور ہر وقت آتے ہیں، فرصتِ مشاہدۂ اوراق نہیں ملی۔"[4]

شوخی رامپوری کا بیان ہے کہ رامپور میں میرزا صاحب کا یہ معمول تھا کہ جس دن نواب صاحب کے یہاں جاتے، سہ پہر کا دیوان خانہ ملتوی رہتا،

---

(۱) اردوئے معلیٰ: ۲۸۳ (۲) ایضاً: ۵۴ (۳) ایضاً: ۴۰۰ (۴) ایضاً: ۴۳

ورنہ سہ پہر کو عام طور پر لوگوں سے ملاقات کرتے۔ ریاست میں جس قدر اہلِ علم و فن تھے، میرزا صاحب کی موجودگی کو مغتنم تصور کرتے، اور بالالتزام آیا کرتے۔ شب کی صحبت خاص ہوتی تھی، کیونکہ یہ اُن کے کیف و سرور کا وقت تھا۔ صرف اُنھیں لوگوں کو حاضری کا موقع دیتے، جن سے کسی طرح کا تکلف نہ ہوتا۔"(۱)

واپسی پر دلّی میں چہ میگوئیاں

میرزا صاحب نے دلّی سے روانہ ہوتے وقت اپنی واقعی منزلِ سفر ظاہر نہیں کی تھی۔ جب رامپور سے واپس دلّی پہنچے، تو حُسّاد نے اس اخفا کا انتقام لیا، اور واپسی پر خوب رای زنی کی گئی۔ میرزا صاحب نے شکایت آمیز لہجے میں تفتہ کو لکھا:

"میاں، میں جو آخرِ جنوری کو رامپور جاکر آخرِ مارچ میں یہاں آگیا ہوں تو کیا کہوں کہ یہاں کے لوگ میرے حق میں کیا کیا کچھ کہتے ہیں۔ ایک گروہ کا قول یہ ہے کہ "یہ شخص والیٔ رامپور کا اُستاد تھا، اور وہاں گیا تھا۔ اگر نواب نے کچھ سلوک نہ کیا ہوگا۔ تو بھی پانچ چار ہزار روپیے سے کم نہ دیا ہوگا۔" ایک جماعت کہتی ہے "نوکری کو گئے تھے، مگر نوکر نہ رکھا۔" ایک فرقہ کہتا ہے کہ "نواب نے نوکر رکھ لیا تھا۔ دو سو روپیے مہینا کر دیا تھا۔ لفٹنٹ گورنر الہ آباد جو رامپور آئے، اور اُن کو غالب کا وہاں ہونا معلوم ہوا، تو اُنھوں نے نواب صاحب سے کہا کہ اگر ہماری خوشنودی چاہتے ہو تو اس کو جواب دو۔ نواب نے برطرف کر دیا۔"(۲)

یہ اربابِ دہلی کی خیال آرائیاں تھیں۔ اصل حقیقت کے متعلق فرماتے ہیں:

"یہ تو سب سُن لیا۔ اب تم اصل حقیقت سنو۔ نواب یوسف علی خاں بہادر تیس بتیس برس کے میرے دوست اور پانچ چھ برس سے میرے شاگرد

(۱) غالب: ۱۳۴، طبع ثانی۔ (۲) اردوی: ۵۴

ہیں۔ آگے گاہ گاہ کچھ بھیج دیا کرتے تھے۔ اب جولائی سنہ ۱۸۵۹ء سے سو روپیہ ماہ بماہ بھیجتے ہیں۔ بلاتے رہتے تھے۔ اب میں گیا دو مہینے رہ کر چلا آیا۔ بشرطِ حیات بعد برسات کے پھر جاؤں گا دو سو روپیہ مہینا، یہاں رہوں، وہاں رہوں، خدا کے ہاں سے میرا مقرر ہے ۱۱؎

<u>نواب فردوس مکاں کی علالت اور میرزا صاحب کا تردد</u>

ماہ اکتوبر سنہ ۶۴ء کے آخر یا نومبر کے آغاز میں نواب فردوس مکاں عارضۂ سرطان میں مبتلا ہوئے۔ میرزا صاحب کو کسی ذریعے سے اس کی اطلاع ملی، تو انھیں اپنے سخی داتا شاگرد کی علالت سے تردد لاحق ہوا۔ نواب صاحب اُن کے پورے خاندان کے مربی تھے۔ اس لیے میرزا صاحب کی بی بی اور حسین علی خاں بھی اس خبر سے پریشان ہوئے۔ اُس وقت تک میرزا صاحب کو یہ معلوم نہ ہو سکا تھا کہ سرکار کو کیا مرض لاحق ہوا ہے اس امر کی تحقیق کے لیے اُنھوں نے ۸ نومبر سنہ ۱۸۶۴ء کو انتہائی احتیاط کے ساتھ تحریر کیا:

"جب سے حضرت کی ناسازیٔ مزاجِ مبارک کا حال خارج سے مسموع ہوا ہے، عالم الغیب گواہ ہے کہ مجھ پر اور میری بی بی پر اور میرے فرزند حسین علی خاں پر کیا گزر رہی ہے۔ ایک دن رات میرے گھر میں روٹی نہیں پکی، ہم سب نے فاقہ کیا۔ مارے وہ خیر وحشت اثر غلط نکلی، حواس ٹھکانے ہوئے۔ بالکل اطمینان جب ہوگا کہ آپ کے غسل صحت کی نوید سنوں گا، اور قطعۂ تاریخ غسل صحت لکھ بھیجوں گا۔ فی الحال اتنا چاہتا ہوں، کہ اس خط کا جواب پاؤں اور حقیقتِ مرض سے آگہی حاصل ہو۔"(۲)

---

(۱) اردوی: ۵۰ (۲) مکاتیب: ۲۴

۱۲ نومبر کو سرکار کا نامہ مبارک موصول ہوا غالباً اُس میں نوعیتِ کیفیتِ مرض کا ذکر نہ تھا، جس سے تشویش رفع ہوئی، اس لیے اُس کے جواب میں ۱۳ نومبر کو میرزا صاحب نے پھر لکھا:

"ابتدای یکم نومبر سے ۱۱ نومبر تک عرض نہیں کر سکتا کہ لیل و نہار مجھ پر کیسے گزرے ہیں۔ راہ دور، میں رنجور، معہذا بے مقدور۔ اگر دلّی سے رامپور تک شکرم کی ڈاک جاتی ہوتی، تو میں یہاں ایک دم نہ ٹھہرتا، اور خدمت میں حاضر ہوتا۔ تار برقی بھی نہیں، جو صحت و عافیت کی خبر جلد حاصل ہو۔ ناچار از راہِ اضطرار ۸ ماہِ حال یعنی نومبر کو عریضہ روانہ کیا۔ خدا کی عنایت اور مرشدِ کامل، یعنی حضرت، کی ہدایت نے اُس خط کے جواب آنے کی مدت سے پہلے مجھے گردابِ اضطراب سے نکالا۔ کل ۱۲ نومبر کو نوازش نامہ آگیا۔ گویا میری جان بچ گئی، بلکہ ایک اور نئی جان میرے بدن میں آگئی۔ اب استدعا یہ ہے کہ حالِ ناسازیِ مزاجِ اقدس مفصل معلوم ہو۔"(۱)

اس عریضے کے جواب میں ۱۹ نومبر کو سرکار کی جانب سے پھوڑا اچھا ہو کر افاقہ ہو جانے کی اطلاع دی گئی۔ میرزا صاحب اس خبر سے بحد مسرور ہوئے اور ۲۷ نومبر کو اس کے جواب میں لکھا:

"کس زبان سے کہوں، اور کس قلم سے لکھوں کہ یہ ہفتہ عشرہ کس تردد و تشویش سے بسر ہوا ہے! ہر روز شام تک جانبِ در نگراں رہتا کہ ڈاک کا ہرکارہ آئے، اور حضرت کا نوازش نامہ لائے۔ بارے خدا کی مہربانی ہوئی، از سرِ نو میری زندگانی ہوئی، کہ کل چار گھڑی رات گئے ڈاک کے ہرکارے نے وہ عطوفت نامہ عالی دیا، جس کو پڑھ کر

---

(۱) مکاتیب: ۲۸

روحِ تازہ رگ و پے میں دوڑ گئی۔ نیند کس کی؟ سونا کس کا؟ روشنی کے سامنے بیٹھا، اور اشعارِ تہنیت لکھنے لگا۔ سات شعر مع مادہ حصولِ صحت جب لکھ لیے تب سویا۔"[۱]

غسلِ صحت کی تہنیت

سرکار کے خط سے صحت و افاقتِ مرض کی اطلاع مل گئی، لیکن یہ معلوم نہ ہو سکا کہ غسلِ صحت ہو چکا ہے یا نہیں، اور بصورتِ دیگر کونسی تاریخ اس تقریبِ سعید کے لیے مقرر ہوئی ہے۔ اس تحقیق کے لیے میرزا صاحب نے منشی سیلچند کو ۲۵ دسمبر کو لکھا:

"اگرچہ از روے خطوطِ حضور صحت و عافیتِ حضور معلوم ہوتی ہے، لیکن یہ کہیں سے نہیں سُنا کہ غسلِ صحت کیا، یا کس دن کریں گے۔ آپ سے یہ فقیر کا سوال ہے کہ مجھ کو لکھیے کہ حضرت غسلِ صحت کس دن فرمائیں گے اور اگر موافق میری آرزو کے نہا چکے ہوں، تو غسل کی تاریخ سے اطلاع دیجیے۔"[۲]

منشی صاحب نے جواباً لکھا کہ غالباً رمضان المبارک میں یہ تقریب عمل میں آئے گی۔ میرزا صاحب کو ۱۴ جنوری سے قبل سرکار کا نامۂ صحت مل چکا تھا، اور وہ اس عرصے میں قصیدۂ تہنیت بھی ارسال کر چکے تھے۔ التواۓ تاریخ غسل پر ۱۹ جنوری سنہ ۶۵ء کو پھر منشی صاحب کو لکھا:

"یہ جو میں نے قصیدۂ تہنیت لکھ کر بھیجا ہے، منشا اس کا یہ ہے کہ شاہ کبیر الدین صاحب رامپور سے آئے، اور اُنھوں نے کہا کہ نواب صاحب جمعے کے دن ساتویں تاریخ شعبان کو نہائیں گے۔ اب تمھاری تحریر سے معلوم ہوا، کہ ماہِ آیندہ، یعنی رمضان، میں نہائیں گے۔ خیر، وہ کاغذ تو حضور کی نظر سے گزرے گا۔ اگر موقع

(۱) مکاتیب: ۹؛ قطعہ تاریخ اسی صفحے کے حاشیہ ۱ میں ملاحظہ ہو (۲) ایضاً: ۱۰

پاؤ، تو حضور میں یہ ماجرا عرض کر دینا کہ میں نے بموجب روایتِ شاہ کبیر الدین کے اس کے ارسال میں جلدی کی ہے؟"[1]
تجویز یہ تھی کہ غسلِ صحت کا جشن ما و عید میں منایا جائے، لیکن ابھی مرض قدرے باقی تھا اور رامپور سے جس قدر سرکاری تحریریں جاتی تھیں اُن میں مزاج کی کیفیت کا مذکور نہیں ہوتا تھا، اس لیے میرزا صاحب نے ۱۴ مارچ سنہ ۶۵ء کو منشی صاحب سے پھر استفسار کیا:

"منشی صاحب، عجب اتفاق ہے کہ حضور اپنے خط میں اپنے مزاجِ مبارک کا حال کچھ نہیں لکھتے، اور میرا دھیان لگا ہوا ہے خدا کے واسطے تم مفصل حال لکھو کہ کیا عارضہ باقی ہے، اور صورت کیا ہے! دربار بدستور ہوتا ہے یا نہیں؟"

منشی صاحب کا جواب مثل میں موجود نہیں، اس لیے نہیں کہا جا سکتا کہ اُنھوں نے مرض کے متعلق کیا لکھا۔ میرزا صاحب کے فارسی تہنیت نامے سے، جو ۲۳ شوال سنہ ۱۲۸۱ھ (۲۲ مارچ سنہ ۱۸۶۵ء) کو لکھا تھا، معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ مذکور تک میرزا صاحب کو سرکار کی صحت ہی کی اطلاع تھی۔

عود مرض اور وفات

سرکار کا مرض بالکل اچھا نہیں ہوا تھا۔ کسی بے احتیاطی سے دوبارہ اتنا شدید حملہ ہوا کہ اطبا عاجز ہوگئے، اور حالت روز بروز خراب ہوتی چلی گئی، یہاں تک کہ جمعے کے دن ۲۴ ذیقعدہ سنہ ۱۲۸۱ھ (۲۱ اپریل سنہ ۱۸۶۵ء) کو سرکار کا انتقال ہوگیا۔

خلد آشیاں کی تخت نشینی اور میرزا صاحب کا وظیفہ

نواب فردوس مکاں کے بعد، نواب خلد آشیاں نے مسندِ آبائی پر

(۱) مکاتیب ۱۱۰

قدم رنجہ فرمایا۔ میرزا صاحب کا تعلق سرکار کی ذات سے تھا، اس لیے دورِ جدید میں اُس کے ختم ہو جانے کا خطرہ تھا۔ اس خطرے کا میرزا صاحب کو احساس ہوا اور اُنھوں نے فوراً تہنیت نامہ لکھا۔ سوءِ اتفاق سے یہ مکتوب مثل میں موجود نہیں، لیکن نواب خلد آشیاں نے یکم مئی سنہ ۶۵ء کو اس کے جواب میں تحریر فرمایا:

"مشفقا، آنچہ مشاہرۂ آن کرم فرما از عہدِ نواب صاحب قبلہ فردوس مکان مقرر است، انشاء اللہ تعالےٰ، بدستور جاری ماندہ حسبِ ضابطہ بخدمتِ سامی رسیدہ خواہد ماند۔"[1]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میرزا صاحب نے تہنیت کے ساتھ اپنے وظیفے کے متعلق بھی کوئی درخواست کی تھی۔ یہ خواہش معرضِ قبول تک پہنچی، اور وظیفہ بدستور جاری رہا۔ اس سلسلے میں میرزا صاحب نے ۳۰ جولائی کو سیاح کو لکھا ہے:

"اپریل کا روپیہ رئیسِ حال سے میں نے پایا۔"[2]

اس مکتوب سے ۲۴ روز قبل تجنیر کو قدرے تفصیلاً تحریر فرمایا تھا:

"والیٔ رامپور کو خدا سلامت رکھے! اپریل مئی ان دونوں مہینوں کا روپیہ موافقِ دستورِ قدیم آیا۔ جون ماہِ گزشتہ کا روپیہ خدا چاہے تو آ جائے۔ آج جمعہ ۶ جولائی ہے۔ معمول یہ ہے کہ دسویں بارھویں کو رئیس کا خط مع ہنڈوی آیا کرتا ہے۔"[3]

تہنیت نامے کا امید افزا جواب پا کر، میرزا صاحب نے قصیدۂ مبارکباد ارسال کیا، جسے عودِ ہندی سے چھیالیسویں عریضے کے حاشیے میں نقل کر دیا ہے۔ اس قصیدے کی پذیرائی موافقِ امید ہوئی، اور میرزا صاحب کو بڑھاپے کی تمام مجبوریوں کے باوجود سفرِ رامپور کے لیے آمادہ ہونا پڑا۔

(۱) مکاتیب: ۳۶ ح (۲)، اردوی: ۱۶۷ (۳) ایضاً: ۲۸

نواب خلد آشیاں کا دعوت نامہ

میرزا صاحب نے اپنے ارادۂ سفر کی اطلاع مرزا داغ کو دی۔ انھوں نے کسی مناسب موقع پر سرکار کے حضور میں ذکر کیا۔ سرکار نے ۱۱ جون سنہ ۶۵ء کو قصیدے کے ذکر کے بعد تحریر فرمایا:

"و درین ولا زبانیِ نواب مرزا عزم سامی باین طرف مسموع گشتہ، موجبِ کمال مسرتہاست، چراکہ راقم نیز متمنیِ ملاقاتِ شریف است۔ او تعالیٰ شبِ یلدای فراق را بزودی ہرچہ تمامتر بایام وصال مبدل گرداند۔"(۱)

سرکار نے جشنِ تخت نشینی کے لیے دسمبر کا پہلا ہفتہ مقرر فرمایا تھا میرزا صاحب نے اسی زمانے کو سفر کے لیے مناسب خیال کیا، اور سرکار کو لکھا:

"حضرت کی خدمت میں نہ آؤں گا تو اور کہاں جاؤں گا؟ وہ آگ برس رہی ہے کہ طیور کے پر جل رہے ہیں۔ بعد آگ کے پانی برسے گا سفر خصوصاً بوڑھے رنجور آدمی کو دونوں صورت میں متعذر۔ آفتاب میزان میں آیا، اور ہنگامۂ آتش و آب رفع ہوا، اور میں نے احرامِ بیت المعمورِ رامپور باندھا۔ انشاء اللہ العلی العظیم۔"(۲)

چنانچہ ماہِ اکتوبر سنہ ۶۵ء میں، جب کہ "ہنگامۂ آتش و آب" رفع ہو چکا تھا، "احرامِ بیت المعمورِ رامپور" باندھنے کی نوبت آگئی۔

سفر کی غرض

میرزا صاحب کے اس سفر کی غرض و غایت نواب فردوس مکاں کے انتقال کی تعزیت اور نواب خلد آشیاں کی مسند نشینی کی تہنیت تھی۔ شاکر کو سفر کی اطلاع دیتے ہوئے لکھا ہے:

(۱) مکاتیب: ۳۰ ح ۳ (۲) ایضاً: ۳۰

"قبلہ وکعبہ، فقیر پا برکاب ہے۔ سہ شنبہ چہارشنبہ ان دو نوں
دنوں میں سے ایک دن عازم رامپور ہوے گا۔ تقریب وہاں جانے
کی رئیس مرحوم کی تعزیت اور رئیس حال کی تہنیت دو چار مہینے وہاں
رہنا ہوگا۔"[۱]

جنون بریلوی کو رامپور سے تحریر فرمایا تھا:
"پیرومرشد، نواب صاحب کا وظیفہ خوار، گویا اس در کا فقیر تکیہ
دار ہوا۔ مسند نشینی کی تہنیت کے واسطے رامپور آیا ہوں۔"[۲]

لیکن اس تعزیت و تہنیت کی تہ میں جو غرض پنہاں تھی، اس کا اظہار مرزا
تفتہ کے خط میں کیا ہے۔ فرماتے ہیں:
"میں نثر کی داد اور نظم کا صلہ مانگنے نہیں آیا۔ بھیک مانگنے آیا ہوں۔"[۳]

تاریخ روانگی

شاکر کے خط کے مطابق میرزا صاحب کا ارادہ منگل یا بدھ کو رامپور
روانہ ہونے کا تھا۔ اس کے بعد کسی وجہ سے رائے بدلی، تو علائی کو ۷
اکتوبر سنہ ۶۵ء کے خط میں لکھا:
"میاں تم جانتے ہو کہ میں عازم رامپور تھا۔ اسباب مساعد ہو گئے۔
بشرطِ حیات جمعے کو روانہ ہوں گا۔"[۴]

لیکن ثاقب کے نام کے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ ہفتے کو دو تین گھڑی
دن چڑھے دلی سے روانہ ہوے۔ فرماتے ہیں:
"ہفتے کے دن دو تین گھڑی دن چڑھے احباب کو رخصت کر کے
راہی ہوا۔ قصد یہ تھا کہ پلکھوے رہوں۔ مگر وہاں قافلے کی گنجایش
نہ پائی۔"[۵]

(۱) اردوی: ۲۱۶ دعود: ۱۰۰ مؤخرالذکر میں "عازم رامپور ہوں گا" ہے۔ (۲) اردوی: ۲۰۸
دعود ۹۹؛ (۳) اردوی: ۹۰ (۴) ایضاً: ۳۹۵ (۵) ایضاً، ۲۹۲

حکیم غلام نجف خاں کو مرادآباد پہنچ کر جو خط لکھا ہے، اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہفتے کو ماہِ اکتوبر کی ، تاریخ تھی۔ فرماتے ہیں:

"بدھ کا دن پہر بھر دن چڑھا ہوگا کہ میں فقط پالکی پر مرادآباد پہنچا۔

۱۰ جمادی الاولیٰ کی اور ۱۱ اکتوبر کی ہے"(۱)

حکیم احمد حسن مودودی کو صراحت سے لکھا ہے کہ

"ہفتم اکتوبر کو دلّی سے رامپور کو روانہ ہوا"(۲)

رفقای سفر

اس سفر میں میرزا صاحب کے ساتھ باقر علی خاں، حسین علی خاں کلّو خانساماں، نیاز علی اور دو آدمی اور تھے۔ میرزا صاحب نے پالکی میں اور دونوں لڑکوں نے کبھی رتھ اور کبھی گھوڑوں پر راستہ طے کیا۔ بقیہ چار آدمیوں اور سامانِ سرمائی کے لیے دو گاڑیاں ہمراہ تھیں۔ حکیم غلام نجف خاں کو محولۂ بالا خط میں لکھا ہے:

"میں فقط پالکی پر مرادآباد پہنچا... دونوں لڑکے، دونوں گاڑیاں اور رتھ اور آدمی سب پیچھے ہیں"

ثاقب کے خط میں لکھا ہے:

"دونوں گھوڑے کوتل آ گئے، دونوں لڑکے رتھ میں سوار آتے ہیں"

آدمیوں کے بارے میں رامپور سے روانگی کے وقت علائی کو لکھا ہے:

"آج صبح کے سات بجے باقر علی خاں اور حسین علی... دلی کو روانہ ہوئے۔ دو آدمی میرے اُن کے ساتھ گئے۔ کلّو اور لڑکا نیاز علی، یعنی ڈیڑھ آدمی میرے پاس ہیں"(۳)

کیفیتِ منازلِ سفر

میرزا صاحب نے دلّی سے رامپور تک ۲ منزلیں طے کی تھیں۔ حکیم

(۱) اردوی: ۲۳۳ (۲) ایضاً: ۲۴۳ (۳) ایضاً: ۳۴۹۔

احمد حسن مودودی کو تحریر فرمایا ہے:

"ہفتم اکتوبر کو دلی سے رامپور کو روانہ ہوا۔ بعد قطع منازل ستہ وہاں پہنچا۔"(۱)

ثاقب کو ان منازل کی تفصیل بتاتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"غازی آباد کا حال شمشاد علی سے سنا ہوگا۔ ہفتے کے دن دو تین گھڑی دن چڑھے احباب کو رخصت کر کے راہی ہوا۔ قصد یہ تھا کہ پلکھوے رہوں، وہاں قافلے کی گنجایش نہ پائی۔ ہاپوڑ کو روانہ ہوا۔ دونوں برخوردار گھوڑوں پر سوار پہلے چل دیے۔ چار گھڑی دن رہے میں ہاپوڑ کی سرائے میں پہنچا۔ دونوں بھائیوں کو بیٹھے ہوئے اور گھوڑوں کو ٹہلتے ہوئے پایا۔ گھڑی بھر دن رہے قافلہ آیا... آج میں نے تمھارے والد کی نصیحت پر عمل کیا۔ چار بجے پانچ کے عمل میں ہاپوڑ سے چل دیا۔ سورج نکلے بابوگڈھ کی سرائے میں آ پہنچا۔ چارپائی بچھائی، اس پر بچھونا بچھا کر حقہ پی رہا ہوں، اور یہ خط لکھ رہا ہوں۔ دونوں گھوڑے کوتل آ گئے، دونوں لڑکے رتھ میں سوار آتے ہیں۔ اب وہ آئے اور کھانا کھا لیا اور چلے۔"(۲)

حکیم غلام نجف خاں کو ہاپوڑ سے مراد آباد پہنچ کر لکھا ہے:

"بدھ کا دن پہر بھر دن چڑھا ہوگا کہ میں فقط پالکی پر مراد آباد پہنچا۔ ۱۰ جمادی الاول کی اور ۱۱ اکتوبر کی ہے... رات بخیر گزرے، بشرط حیات کل رامپور پہنچ جائیں گے۔"(۳)

منازلِ سفر کے متعلق حکیم غلام رضا خاں کو تحریر کرتے ہیں:

"تم سے رخصت ہو کر اور تمھیں خدا کو سونپ کر روانۂ رامپور ہوا۔ موسم اچھا تھا۔ گرمی گزر گئی تھی۔ جاڑا ابھی چمکا نہ تھا۔ عالم اعتدال آب وہوا،

(۱) اردوی: ۳۴۳ (۲) ۲۹۳ (۳) ایضاً: ۲۳۳

سایہ و سرچشمہ جا بجا۔ آرام سے رامپور پہنچا۔"(۱)

توشۂ راہ

ثاقب کے خط میں میرزا صاحب نے ہاپڑ کی سرا کے کھانے اور لڑکوں کے اتحاد کے متعلق لکھا ہے:

"میں نے چھٹانک بھر گھی داغ کیا۔ دو شامی کباب اُس میں ڈال دیے رات ہو گئی تھی۔ شراب پی لی، کباب کھائے، لڑکوں نے ادھر کی کھچڑی پکوائی۔ خوب گھی ڈال کر آپ بھی کھائی، اور سب آدمیوں کو بھی کھلائی۔ دن کے واسطے سادہ سالن پکوایا، ترکاری نہ ڈلوائی۔ بارے آج تک دونوں بھائیوں میں موافقت ہے۔ آپس کی صلاح و مشورت سے کام کرتے ہیں۔ اتنی بات زائد ہے کہ حسین علی منزل پر اُتر کر پاپڑ اور مٹھائی کے کھلونے خرید لاتا ہے۔ دونوں بھائی مل کر کھا لیتے ہیں۔"(۲)

ناسازیٔ طبیعت

اوقاتِ غذا میں اختلال اور راستے کی تھکن سے میرزا صاحب کو قبض کی شکایت ہو گئی تھی۔ حکیم غلام نجف خاں کو مراد آباد سے تحریر کیا ہے:

"گھبرایا ہوا ہوں، تیسرا دن ہے پاخانہ پھرے کو۔"(۳)

تاریخ ورودِ رامپور

مذکورہ چھ منزلیں طے کر کے، میرزا صاحب جمعرات کے دن ۱۲ اکتوبر سنہ ۶۵ء کو رامپور تشریف لائے۔ جنون بریلوی کو رامپور سے تحریر فرمایا ہے:

"۱۲ اکتوبر کو یہاں پہنچا۔ بشرطِ حیات آخرِ دسمبر تک دہلی جاؤں گا۔"(۴)

حکیم غلام نجف خاں کے محولۂ بالا خط میں بھی، جو ۱۱ اکتوبر کو مراد آباد سے لکھا تھا، یہی تحریر کیا ہے کہ کل ۱۲ اکتوبر کو رامپور پہنچ جاؤں گا۔ حکیم سید احمد حسن مودودی کے نام کے خط سے بھی یہی تاریخ مستنبط ہے۔ فرماتے ہیں:

(۱) اردوی ۲۱ ۴۸ (۲) ایضاً: ۲۹۲ (۳) ایضاً ۲۳۳ (۴) ایضاً: ۲۰۸، ۶ عود ۱۶۹۔

"ہفتم اکتوبر کو دلّی سے رامپور کو روانہ ہوا۔ بعدِ قطعِ منازل ستہ وہاں پہنچا۔"(۱)

نواب خلد آشیاں کی تواضع

نواب خلد آشیاں نے میرزا صاحب کی خوب خاطر و تواضع کی۔ قیام کے لیے جرنیلی کی کوٹھی(۲) اور باورچی خانے سے کھانا مقرر ہوا۔ حکیم غلام نجف خاں نے اپنے خط میں غذا کے متعلق تشویش کا اظہار کیا تھا۔ اس سلسلے میں میرزا صاحب نے صبحِ شنبہ ۲۱ اکتوبر سنہ ۶۵ء کو لکھا ہے:

"تمہارے خط سے معلوم ہوا کہ تم کو میرے کھانے پینے کی طرف سے تشویش ہے۔ خدا کی قسم! میں یہاں خوش اور تندرست ہوں: دن کا کھانا ایسے وقت آتا ہے کہ پہر دن چڑھے تک میرے آدمی بھی روٹی کھا چکتے ہیں۔ شام کا کھانا بھی سویرے آتا ہے۔ کئی طرح کے سالن، پلاؤ، متنجن، پیندے، دونوں وقت روٹیاں خمیری، چپاتیاں، مربے، آچار، میں بھی خوش، لڑکے بھی خوش۔ کلو اچھا ہو گیا ہے۔ سقا، مشعلچی، خاکروب سرکار سے متعین ہے۔ حجام اور دھوبی نوکر رکھ لیا ہے۔"(۳)

۲۴ اکتوبر کو میرزا صاحب نے پھر حکیم صاحب کو خط لکھا تھا۔ اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عرصے میں سرکار نے کھانے اور جانوروں کے گھاس دانے کی نقدی مقرر فرما دی تھی۔ فرماتے ہیں:

"آج منگل کا دن ۴ جمادی الثانی کی اور ۲۴ اکتوبر کی ہے۔ کھانے کی اور گھوڑوں اور بیلوں کے گھاس دانے کی نقدی ہو گئی۔ لیکن اس میں میرا فائدہ ہے، نقصان نہیں۔"(۴)

تعظیم و توقیر اور اخلاص

نواب خلد آشیاں قدر دانیٔ علم و ہنر میں اپنے والدِ مرحوم کے سچے

(۱) اردوی: ۲۴۳ (۲) یہ عمارت قلعۂ معلّٰی کے مشرقی دروازے کے باہر واقع تھی نواب جنت مکاں نے قدیم عمارتیں منہدم کرا کے نئی عمارات تعمیر کراتے وقت بعد ترمیم مناسب اسے قلعے کے اندر داخل کر لیا ہے۔ (۳) اردوی: ۲۱۹ و ۲۲۰ (۴) ایضاً ۲۴۳

جانشین تھے۔ اُنھوں نے میرزا صاحب کی تعظیم و توقیر اور خاطر تواضع کا بیحد لحاظ کیا۔ میرزا صاحب ۲۱ اکتوبر کو حکیم صاحب کو لکھتے ہیں:

"آجتک دو ملاقاتیں ہوئی ہیں۔ تعظیم، تواضع، اخلاق، کسی بات میں کمی نہیں ہے"(۱)

سرکار کا التفات روز افزوں دیکھ کر میرزا صاحب نے ۲۴ ماہِ مذکور کو پھر حکیم صاحب کو تحریر کیا ہے:

"اب روداد سنو۔ نواب صاحب کا اخلاص و التفات روز افزوں ہے"(۲)

اُس بات کی کچھ اصل نہیں

رامپور کے سفر سے قبل میرزا صاحب نے کوئی مخفی بات اپنی بیوی سے کہی تھی۔ یہاں آ کر اُس کی تغلیط ہوگئی، تو حکیم صاحب کے خط کے آخر میں اُن کے صاحبزادے کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا:

"ظہیر الدین خاں بہادر کو دعا پہنچے۔ یہ خط لے کر تم اپنی دادی صاحب پاس جاؤ اور یہ خط پڑھ کر سناؤ اور اُن سے یہ کہدو کہ وہ بات جو میں نے تم سے کہی تھی، وہ غلط ہے۔ اُس کی کچھ اصل نہیں ہے"(۳)

نواب خلد آشیاں کے متعلق میرزا صاحب کی رائے

میرزا صاحب، سرکار کے حُسنِ صورت و سیرت کے اس قدر گرویدہ ہوئے کہ اُنھیں بعض شیوہ و روش میں نواب فردوس مکاں پر ترجیح دینے لگے اُس زمانے میں سرکار نے بعض عُمالِ ریاست کو سرکاری مطالبات اور عام رعایا کو غلّے کا محصول معاف کر دیا تھا۔ ان تمام واقعات نے میرزا صاحب کے دل پر اچھا نقش کیا۔ حکیم غلام رضا خاں کے خط میں اُن کا اس طرح ذکر کیا ہے۔

"نواب صاحب بہ حال بمقتضائی "اَلْوَلَدُ سِرٌّ لِاَبِیہ" حُسنِ اخلاق میں

(۱) اردوی: ۲۲۲ (۲) ایضاً: ۲۲۳ (۳) ایضاً: ۲۰۹ و ۲۲۰

نواب فردوس آرام گاہ کے برابر، بلکہ بعض شیوہ و روش میں اُن سے بہتر ہیں۔ بیجرد مسند نشینی کے غلے کا محصول یک قلم معاف کیا۔ علی بخش خاں خانساماں کو ۳ ہزار روپیہ بابت مطالبۂ سرکاری بخش دیا۔ مفصل حالات بذل نوال حند الملاقات زبانی کہوں گا۔"(۱)

مرزا تفتہ کو لکھتے ہیں:

"نواب صاحب از روی صورت روحِ مجسم، اور باعتبارِ اخلاق آیتِ رحمت ہیں۔ خزانۂ فیض کے تحویلدار ہیں۔ جو شخص دفترِ ازل سے جو کچھ لکھوا لایا ہے، اُس کے بٹنے میں دیر نہیں لگتی۔ ایک لاکھ کئی ہزار روپیے سال غلے کا محصول معاف کر دیا۔ ایک اہلِ کار پر ساٹھ ہزار کا مواخذہ معاف کیا، اور بیس ہزار روپیہ نقد دیا۔ منشی نولکشور صاحب کی عرضی پیش ہوئی۔ خلاصہ عرضی کا سُن لیا۔ واسطے منشی صاحب کے کچھ بتقریب شادی صبیہ تجویز ہو رہا ہے۔ مقدار مجھ پر نہیں کھلی۔"(۲)

علائی کے خط میں نواب صاحب کی تصویر کھینچتے ہیں:

"رئیس کی تصویر کھینچتا ہوں۔ قد، رنگ، شکل، شمائل بعینہ بھائی ضیاء الدین خاں۔ عمر کا فرق اور کچھ کچھ چہرہ اور لہجہ متفاوت۔ حلیم، خلیق باذل، متواضع، متشرع، متورع، شعر فہم، سینکڑوں شعر یاد۔ نظم کی طرف توجہ نہیں، نثر لکھتے ہیں اور خوب لکھتے ہیں۔ جلالائی طباطبائی کی طرز برتتے ہیں۔ شگفتہ جبیں ایسے کہ اُن کے دیکھنے سے غم کوسوں بھاگ جائے۔ فصیح بیان ایسے کہ اُن کی تقریر سُن کر ایک اور نئی روح قالب میں آ جائے۔ اَللّٰھُمَّ دَامَ اِقْبَالُہٗ وَدَادَ اِجْلَالُہٗ۔"(۳)

نواب خلد آشیاں جشنِ تخت نشینی سے قبل اضلاعِ ریاست کے معائنے کو تشریف لے گئے تھے۔ میرزا صاحب نے بھی رضوان کے ۴ نومبر ۱۸۶۵ء کے

(۱) اردوی: ۲۵۲ (۲) ایضاً: ۹۸ و ۹۹ (۳) ایضاً: ۱۴۴۔

خط میں اُن کے سفر کے پروگرام کی ان لفظوں میں اطلاع دی ہے :

"آج شنبہ ۴ نومبر کی ہے۔ پرسوں نواب صاحب دورے کو گئے ہیں فرما گئے ہیں کہ دو ہفتے میں آؤں گا۔ آکر چار روز یہاں رہیں گے۔ پھر نمائش گاہِ بریلی کی سیر کو جائیں گے۔ وہاں سے پھر کر جب آئیں گے، تو کمشنر بریلی کا انتظار فرمائیں گے۔ وہ پنجم دسمبر تک آجائیں گے۔ تین دن جشن رہے گا۔ اُس کے دو چار روز بعد غالب رخصت ہوگا۔ خدا کرے تم تک زندہ پہنچ جائے۔"(۱)

جب سرکار سوار ہونے لگے، تو مشایعت کے لیے میرزا صاحب بھی سواری تک ساتھ آئے۔ سرکار پا بر کاب ہوئے۔ تو حاضرین کے ساتھ میرزا صاحب نے بھی آداب و کورنش ادا کی۔ سرکار نے میرزا صاحب کے آداب پر تبسم کے ساتھ ارشاد فرمایا: "خدا کے سپرد" میرزا صاحب کی شوخیِ طبع نے گدگدایا اور آپ قدرے حزیں صورت بنا کر بولے: "حضرت، خدا نے تو مجھے آپ کے سپرد کیا ہے۔ آپ پھر اُلٹا مجھ کو خدا کے سپرد کرتے ہیں۔"(۲)

جشنِ جمشیدی

دسمبر کا پہلا ہفتہ جشنِ تخت نشینی کے لیے مقرر ہوا تھا، اور اس تقریب کا اس درجہ شاندار اہتمام کیا گیا تھا کہ میرزا صاحب نے اس کو "جشنِ جمشیدی" سے تعبیر کیا ہے۔ حکیم غلام نجف خاں کو لکھتے ہیں :

"نواب صاحب دورے سے یا آج شام کو یا کل آجائیں گے۔ جشنِ جمشیدی کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔"(۳)

۲۴ اکتوبر کو تاریخِ جشن کے متعلق لکھتے ہیں :

"دسمبر کی پہلی سے جشن شروع ہوگا۔ ہفتے دو ہفتے کی مدت اُس کی ہے بعد جشن کے رخصت ہوں گا۔ خدا چاہے، تو آخرِ دسمبر تک تم کو آ دیکھنا ہو۔"(۴)

(۱) اردوی: ۳۰۰ (۲) یادگارِ غالب: ۴۲ (۳) اردوی: ۲۳۱ (۴) ایضاً: ۲۲۴

مرزا تفتہ کو تحریر کیا ہے:

"جشن یکم دسمبر سے شروع، ۵ دسمبر کو خلعت کا آنا مسموع ہے"[۱]

۱۰ دسمبر سنہ ۱۸۶۵ء کو علائی کے خط میں اس جشن جمشیدی کی روداد لکھتے ہوئے فرماتے ہیں:

"یہاں جشن کے وہ سامان ہو رہے ہیں کہ اگر جمشید دیکھتا، تو حیران رہ جاتا۔ شہر سے دو کوس پر آغاپور نامی ایک بستی ہے۔ آٹھ دن سے وہاں خیام برپا تھے۔ پرسوں صاحب کمشنر بہادر بریلی مع چند صاحبوں اور میموں کے آئے، اور خیموں میں اترے۔ کچھ کم سو صاحب اور میم جمع ہوئے، سب سرکار رامپور کے مہمان۔ کل سہ شنبہ ۵ دسمبر حضور پرنور بڑے تجمل سے آغاپور تشریف لے گئے۔ بارہ پر دو بجے گئے اور شام کو پانچ بجے خلعت پہنکر آئے۔ وزیر علی خاناماں خواصی میں سے روپیہ پھینکتا ہوا آتا تھا۔ دو کوس کے عرصے میں دو ہزار روپے سے کم نہ ایثار ہوا ہوگا۔ آج صاحبانِ عالی شان کی دعوت ہے۔ "ڈنر" شام کا کھانا یہیں کھائیں گے۔ روشنی، آتشبازی کی وہ افراط کہ رات دن کا سامنا کرے گی۔ طوائف کا وہ ہجوم، حکام کا وہ مجمع کہ اس مجلس کو طوائف الملوک کہا چاہئے۔ کوئی کہتا ہے۔ کہ صاحب کمشنر بہادر مع صاحبانِ عالی شان کے کل جائیں گے، کوئی کہتا ہے پرسوں"[۲]

مبارکبادِ خلعت

میرزا صاحب نے اس تقریب پر ایک فارسی نثر اور ۳۰ شعر کا ایک قصیدہ خلد آشیاں کے حضور میں پیش کیا۔ نثر کے انجام میں لکھتے ہیں:[۳]

(۱) اردوی: ۹۹ (۲) ایضاً: ۱۴۴ (۳) یہ نثر کلیاتِ نثر فارسی: ۹۱ میں چھپ چکی ہے۔

آخر بفضای بارگاہ آمدہ است — ہنگامِ فروزشِ نگاہ آمدہ است

چون نور کہ از مہر بماہ آمدہ است — تشریفِ شہنشاہ بشاہ آمدہ است

قصیدے کے یہ شعر امیرِ مینائی مرحوم کے انتخاب کیے ہوئے ہیں:(۱)

تا چہ نیرنگ است این کاندر جہان آوردہ اند — نوبہاری طرفہ در فصلِ خزان آوردہ اند

دہ بہشت آن جو د نما شد، بگر ز از اُردی بہشت — رونقی کز بہرِ باغ و بوستان آوردہ اند

چون بجا ابر را شماری ہست، گویم مجملاً — حاصلِ صد سالۂ دریا دکان آوردہ اند

تا ز تختہای شاہنشاہِ ہند و انگلند — خلعت از بہرِ خدیوِ شہ نشان آوردہ اند

از شعاعِ مہر تار، از پرتوِ مہتاب پود — جامہ ہای زرنگار و زرفشان آوردہ اند

در حمائل، کز گلوی شہریار آویختند — گوہر از پروین و تار از کہکشان آوردہ اند

تیز دم تیغی کہ، ہمچون برقش از روزِ ازل — بی نیاز از گردشِ سنگِ فسان آوردہ اند

وز برای حل، بمکر سر، کز سرِ دفعِ تیغ و تیر — از سوادش جسم را حرزِ امان آوردہ اند

اسپ یا ماپیل، کز رعدش صد انجم زدہ اند — برق وش توسن، کہ از بادش عنان آوردہ اند

دگر آ د ، ، رس ہنر خر سر شہ منظر بالکی — کز ئی نم دادہ توسش در میان آوردہ اند

دولت و اقبال و فخر و عزت و جاہ و جلال — کز فراوانی نہ گنجد در گمان آوردہ اند

شاہِ داور را نویدِ دولت و دین دادہ اند — شہریان را مژدۂ امن و امان آوردہ اند

<u>عزمِ مراجعت</u>

ابتداءً میرزا صاحب کا یہ ارادہ تھا کہ دو چار مہینے رامپور میں قیام کریں گے۔ چنانچہ شاکر کو تاریخِ روانگیِ رامپور کی اطلاع دیتے ہوئے تحریر کیا تھا:

”دو ما مہینے وہاں رہتا ہوگا۔ اب جو کوئی خط آپ بھیجیں، تو رامپور بھیجیں۔“(۲)

رامپور میں کچھ عرصہ قیام کرنے کے بعد یہ طے کیا کہ اختتامِ جشن کے بعد

(۱) انتخابِ یادگار: ۴۹-۴۴، پورا قصیدہ ”سید چینی“ (۲) میں طبع ہو چکا ہے (۲) اردوی: ۱۶۲، و عود: ۱۶۰

رخصت طلب کریں، اور آخر دسمبر تک دلی جا پہنچیں۔ حکیم غلام نجف خاں کے خط میں اس کا ذکر آچکا ہے[1]۔ علائی کو ۶ دسمبر کو تحریر کرتے ہیں:

"بعدِ اختتامِ محافل طالبِ رخصت ہوں گا۔ بعدِ حصولِ رخصت دلی جاؤں گا"[2]

اسی طرح جنون بریلوی کو بریلی کی دعوتِ قدوم کے جواب میں لکھا ہے:

"پیرومرشد، نواب صاحب کا وظیفہ خوار، گویا اس در کا فقیر تکیہ دار ہوں۔ مسند نشینی کی تہنیت کے واسطے رامپور آیا۔ میں کہاں اور بریلی کہاں! ۱۲ اکتوبر کو یہاں پہنچا۔ بشرطِ حیات آخر دسمبر تک دلی جاؤں گا"[3]

لڑکوں کی روانگی

باقر علی خاں اور حسین علی خاں اب نوجوان تھے۔ میرزا صاحب نے دونوں کو جمعے کے دن ۲۴ دسمبر کو روانہ کرکے علائی کو لکھا:

"آج صبح کے سات بجے باقر علی خاں اور حسین علی خاں، ۱۴ مرغ، ۶ بڑے اور آٹھ چھوٹے (لے) کے دلی کو روانہ ہوئے۔ دو آدمی میرے ان کے ساتھ گئے۔ کلو اور لڑکا نیاز علی، یعنی ڈیڑھ آدمی میرے پاس ہیں۔ نواب صاحب نے وقتِ رخصت ایک ایک دوشالہ مرحمت کیا"[4]

میرزا صاحب کی تاریخ روانگی

اسی خط کے آخر میں اپنی روانگی کے متعلق لکھتے ہیں:

"میرے چلنے کا حال یہ ہے کہ انشاءاللہ تعالیٰ اسی ہفتے میں چلوں گا"

۲۶ دسمبر کو پھر تحریر فرماتے ہیں:

"جانا! جانا! ایک خط میرا تمہارے دو خطوں کے جواب میں تم کو پہنچا ہوگا۔ آج منگل ہے، ۲۲ شعبان کی اور ۲۲ دسمبر کی۔ دونوں بھتیجے

(۱) اردوی: ۲۲۴ (۲) ایضاً: ۲۴۲ (۳) ایضاً: ۲۸۱، دعو ۱۶۹ (۴) اردوی: ۳۹۴

تمہارے جمعے کے دن ۲۲ دسمبر کو روانۂ دہلی ہوئے۔ میں پرسوں یوم

الخمیس کو مرحلہ پیما ہوں گا۔"(۱)

اس حساب سے میرزا صاحب جمعرات کے دن ۲۸ دسمبر سنہ ۶۵ء کو رامپور سے رخصت ہوئے۔

احباب رامپور سے آخری ملاقات

سرکار سے رخصت حاصل کر کے میرزا صاحب قیام گاہ پر تشریف لائے۔ رامپور کے بعض احباب الوداع کہنے کے لیے پہلے سے جمع تھے۔ صاحبزادہ سید نجابت علی خاں بہادر نے حقیر عرشی سے بیان کیا کہ جب میرزا صاحب سرکار سے رخصت ہو کر قیام گاہ پر دالیس آئے، تو میں اپنے والد سید ہدایت علی خاں بہادر کے ہمراہ وہاں موجود تھا۔ میرزا صاحب نے احباب کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا: "بھئی! ہم نے ابھی یہ شعر کہا ہے:

اب ہے دلّی کی طرف کوچ ہمارا غالبؔ آج ہم حضرتِ نواب سے بھی مِل آئے"(۲)

رخصتانے کی رقم

میرزا صاحب نے ۲۸ نومبر کو رامپور سے تفتہ کو لکھا تھا:

"میں نثر کی داد اور نظم کا صلہ مانگنے نہیں آیا، بھیک مانگنے آیا ہوں، روٹی اپنی گرہ سے نہیں کھاتا، سرکار سے ملتی ہے۔ وقتِ رخصت میری قسمت اور منعم کی ہمت۔"(۳)

---

(۱) اردوی: ۲۹۶ (۲) مولانا نظامی بدایونی نے شرح دیوانِ غالب اردو (مطبوعہ نظامی پریس بدایوں ۱۹۲۲ء) کے صفحہ ۲۰۴ پر یہ مقطع اور ایک شعر نقل کر کے حاشیے میں لکھا ہے: "حضرتِ نواب سے نواب یوسف علی خاں ناظم والیٔ رامپور کی طرف اشارہ ہے۔ یہ اس غزل کے شعر ہیں جو رامپور سے رخصت ہوتے وقت لکھی تھی۔ چونکہ دیوان اس وقت مرتب ہو کر شائع ہو چکا تھا، اس لیے دیوان میں شامل نہیں ہوئی۔" اس بیان میں مولانا سے تسامح ہوا ہے، کیونکہ ایک عینی شاہد کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں نواب سید محمد کلب علی خاں بہادر مراد ہیں۔ علاوہ ازیں چونکہ پہلے سفر میں میرزا صاحب رامپور سے دیوانِ اردو کی نقل لے گئے تھے جس سے دیوان طبع ہوا، اس لیے نواب فردوس مکاں کے بجائے نواب خلد آشیاں کے عہد کی غزل کا اس میں شامل نہ ہونا قرینِ قیاس اور مطابقِ واقعہ ہو سکتا ہے۔ (۳) اردوی: ۹۸۔

نواب خلد آشیاں ۳۰ اکتوبر سنہ ۶۶ء کو ایک ہزار روپے عطا فرما چکے تھے[1] تاہم ۲۲ دسمبر سنہ ۶۵ء کو ۲۰۰ روپے بوجہ زاد راہ مرحمت فرما کر میرزا صاحب کی اس آرزو کی بھی تکمیل کر دی[2]

نواب ضیاء الدین خاں بہادر کی فرمائش

تیر نے میرزا صاحب سے فرمائش کی تھی کہ رامپور سے بانس کی غلیل لائیں۔ میرزا صاحب نے فرمائش پوری کی۔ لیکن غلیل پر جو کچھ بیتی وہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ علائی کے نام رامپور سے ۲۶ دسمبر کو لکھا ہے:

" تو کمان گروہہ کھا کر فارسی بگاڑا کر۔ مجھ سے ہندی کی چندی سن۔ ایک غلیل حضور نے دینی کی ہے۔ ایک علی اصغر خاں سے اینٹھی دو نوں کل آجیں گی"[3]

لیکن سوءِ اتفاق سے فرمائش کی تکمیل میں سعی کے بعض مدارج رہ گئے۔ اور غلیل پر نئی اُفتاد پڑی۔ ۱۳ جنوری سنہ ۶۶ء کو میرزا صاحب علائی کو لکھتے ہیں:

" میاں چلتے وقت تمہارے چچا نے غلیل کی فرمائش کی تھی۔ رامپور پہنچ کر وہ بےسعی و تلاش ہاتھ آگئی، بنوا رکھی۔ لڑکوں نے ملازموں نے مجھ سے سن لیا کہ یہ نواب ضیاء الدین خاں کے واسطے ہے۔ اب چلنے سے ایک ہفتہ پہلے تم نے غلیل مانگی۔ بھائی کیا بتاؤں کہ کتنی

(۱) آداربہ خزانہ سنہ ۶۶-۱۸۶۵ء، مد انعام و عنایات ۹ نومبر سنہ ۱۸۶۵ء (۲) آداربہ خزانہ سنہ ۶۶-۱۸۶۵ء، مد انعام و عنایات ۹ جنوری سنہ ۱۸۶۶ء (۳) صاحبزادہ سید علی اصغر خاں بہادر ولد سید جعفر علی خاں ولد سید نظام علی خاں ولد نواب سید فیض اللہ خاں بہادر عرش منزل مراد ہیں۔ نواب فردوس مکاں نے ۱۸۵۷ء کی شورش میں ریاست کی فوج کے ساتھ مرادآباد و امروہہ کی شورش مٹانے کے لیے بھیجا اور ذرا بعد امروہے کا ناظم بنا دیا۔ بعد غدر خدمات کے صلے میں ۲ ہزار روپے سالانہ مالگزاری کی ضبط شدہ جاگیر گورنمنٹ سے واگزاشت کرائی، اور ۵ ہزار روپے کا خلعت دلایا۔ نواب خلد آشیاں کے ابتدائے عہد میں کل افواج ریاست کے جنرل مقرر ہوئے اور وجیہ الزماں خاں کے انتقال کے بعد انگریزی حکومت میں ریاست کی جانب سے سفیر بھی بنا دیے گئے۔ ۴ سو روپے ماہوار تنخواہ پاتے تھے ۲۲ شعبان ۱۲۹۵ھ (۲۲ اگست ۱۸۷۸ء) کو انتقال کیا۔ اخبار الصنادید (۲) ۱۹۷

جستجو کی ؛ کہیں بہم نہ پہنچی۔ دس روپے تک مول کو نہیں ملی۔ نواب صاحب سے مانگی۔ توشے خانے میں بھی نہ تھی۔ ایک امیر کے ہاں پتا لگا، دوڑا ہوا گیا۔ پچی موجود پائی۔ لیکن کیا پچی ، جیسے نجف خاں کے عہد میں تورانیوں میں ہماری تمہاری ہڈی۔ بنوانے کی فرصت کہاں؟ آج لی، کل چلدیا۔ اس بانس کی قدر کرنا، اور اس کو اچھی طرح بنوا لینا۔"[1]

سفر کے مصائب

رامپور سے واپسی میں میرزا صاحب کو سخت تکالیف کا سامنا کرنا پڑا مراد آباد کے نیچے دریای رام گنگا بہتا ہے۔ سرمائی بارش کے سبب اُس میں سیلاب آگیا تھا۔ میرزا صاحب کی پالکی پار ہوتے ہی پانی کے زور سے کشتیوں کا عارضی پُل ٹوٹ گیا۔ اسباب کی گاڑیاں اور ملازم اُس پار رہ گئے، اور میرزا صاحب یکہ و تنہا ایک کمبل ساتھ لیے مراد آباد کی سرائے میں جاکر اقامت گزیں ہوے۔ بڑھاپے کی کمزوری سرمائی تکلیفوں کا مقابلہ نہ کرسکی اور یہ بیمار ہوگئے۔ پانچ دن صدر الصدورِ مراد آباد کے یہاں قیام کیا، اور جب قدرے روبصحت ہوے، تو دلی کا عزم کیا۔ دلی پہنچ کر نواب خلد آشیاں کو لکھتے ہیں :

"بعد تسلیم معروض ہے۔ مراد آباد پہنچنا، بعد پالکی کے اُتر آنے کے پُل کا ٹوٹ جانا، گاڑی اسباب یہاں تک کہ رختِ خواب کا مع آدمیوں کے اُسی زمہریر کے میدان میں رہنا، بغیر جاڑے کے کچھ نہ کھانا خیر جو اُن پر گزری رہ جائیں، میں مراد آباد کی سرا میں ایک چھوٹی سی حویلی میں ٹھہرا۔ بھوکا پیاسا کمبل اوڑھ کر پڑ رہا۔ یہ شعر اپنا پڑھ پڑھ کر صبح کی۔
ژرمِ فریاد رکھا شکل نہانی نے مجھے تب اماں ہجر میں دی بردِ لیالی نے مجھے
صبح کو خستہ و رنجور اٹھا۔ صاحبزادہ ممتاز علی خاں بہادر کے بھیجے ہوے

(۱) اردوی: ۱۵ام، نسخہ میں "کرتا" اور "بنوالیتا" ہے۔

دو فرشتے آئے، اٹھا کر سعید الدین خاں صاحب کے ہاں لے گئے صاحب زادہ صاحب نے وہ تعظیم و تکریم، اور سعید الدین خاں صاحب نے وہ تکریم و تعظیم کی کہ میری ارزش سے زیادہ تھی۔ ناگاہ مولوی محمد حسن خاں بہادر صدر الصدور آئے اور مجھے اپنے گھر لے گئے۔ پانچ دن وہاں رہا۔ بھائی نواب مصطفیٰ خاں وہیں مجھ سے آکر ملے۔ دوسرے دن وہ رہگرائے دار الریاست رامپور اور میں جادہ نورد مستم آبادِ دہلی ہوا۔"(۱)

سرکار کی ہمدردی

یہ عریضہ ۱۰ جنوری سنہ ۶۶ء کو لکھا گیا تھا۔ سرکار کو اس کے پہنچنے سے پہلے ہی شیفتہ کی زبانی تمام حالات کی اطلاع مل چکی تھی۔ اور انھوں نے مراد آباد کے پتے سے میرزا صاحب کو لکھا تھا:

"زبانی نواب مصطفیٰ خاں بہادر کے دریافت ہوا کہ مراد آباد میں کچھ طبیعت آپ کی علیل ہو گئی ہے۔ باستماع اس امر کے باعث کمالِ تردد کا ہوا۔ اس واسطے حالۂ خامۂ محبت نگار کے ہوتا ہے کہ خیریت مزاج سے مطلع کیجئے۔ اور اگر ہنوز طبیعت مائل باعتدال نہ ہو، اور آپ کا ارادہ قیامِ مراد آباد کا تا درستیٔ طبیعت ہو، تو آپ رامپور میں تشریف لائیے یہاں معالجہ بخوبی عمل میں آئے گا۔"(۲)

میرزا صاحب اُسی دن مراد آباد سے روانہ ہو گئے تھے، جس دن شیفتہ وہاں سے رامپور کو چلے تھے، اِس لیے یہ فرمان اُنھیں نہ مل سکا۔ دلی پہنچ کر ۱۰ جنوری کو میرزا صاحب نے رودادِ سفر پر مشتمل عریضہ روانہ کیا، تو اس کے جواب میں خلد آشیاں نے تحریر فرمایا:

"الحمد للہ کہ وصولِ نمیقۂ لطیف آگیں باعثِ اطمینان ہوا۔"

اس فرمان کے جواب میں میرزا صاحب نے ۲۱ جنوری کو لکھا:

---

(۱) مکاتیب: ۸۴ (۲) ایضاً: ح ۶۷

"اس سفر کا حال کیا عرض کروں۔ دلّی سے رامپور تک ذوقِ قدمبوسی میں جو انا نہ گیا۔ اختلافاتِ آب و ہوا و تفرقۂ اوقاتِ غذا کو ہرگز نہ مانا۔ اور رنج راہ کو ہرگز خیال میں نہ لایا۔ وقتِ معاودت اندوہِ فراق نے وہ فشار دیا کہ جوہرِ روح گداز پا کر ہر بُنِ مو سے ٹپک گیا۔ اگر آپ کے اقبال کی تائید نہ ہوتی، تو دلی تک میرا زندہ پہنچنا محال تھا۔ جاڑا، مینہ، قبض و انقباض، فقدانِ جوع، فاقہ ہای متواتر، منزلہای نامانوس، ہاپوڑ تک آفتاب کا نظر نہ آنا، شب و روز ہوای زمہریر کا جانگزا رہنا۔ بارے ہاپوڑ سے چل کر نیرِ اعظم کی صورت دکھائی دی دھوپ کھاتا ہوا دلّی پہنچا۔ ایک ہفتہ کوفتہ و رنجور رہا۔ اب ویسا ہی ناتواں ہوں، جیسا کہ اس سفر سے پہلے تھا۔ خدا وہ دن کرے کہ پھر اُس در پر پہنچوں۔"(۱)

لُٹ گئے

اس سفر میں میرزا صاحب کی تکالیف اس حد کو پہنچ گئی تھیں کہ وہ اُسے حُسنِ فکر کی بربادی سے تعبیر کرتے تھے۔ رضوان کو لکھتے ہیں:

"رامپور کے سفر میں تاب و طاقت، حُسنِ فکر، لطفِ طبیعت، یہ اسباب لُٹ گیا ہے۔"(۲)

رہ آورد

ان جسمانی اذیتوں نے میرزا صاحب کی صحت پر بہت بُرا اثر کیا، اور اُنھیں رعشہ و ضعفِ بصر کی شکایت زیادہ ہو گئی۔ ۱۲ مئی سنہ ۶۶ کو ذکا کو تحریر فرماتے ہیں:

"تم کو میری خبر بھی ہے۔ آگے ناتواں تھا، اب نیم جان ہوں۔ آگے بہرا تھا، اب اندھا ہوا چاہتا ہوں۔ رامپور کے سفر کا رہ آورد ہے

(۱) مکاتیب: ۴۹ (۲) اردوی: ۳۲۱

رعشہ وضعفِ بصر جہاں چار سطریں لکھیں، انگلیاں ٹیڑھی ہوگئیں، حرف سوجھنے سے رہ گئے۔"[۱]

وقت و تاریخ ورودِ دہلی

عناصر کی اس بے رخی کا مقابلہ کرتے ہوئے میرزا صاحب ۸ جنوری سنہ ۱۸۶۶ء کو دوشنبے کے دن گیارہ بجے دلّی پہنچے۔ مرزا تفتہ کو ورود کی اطلاع دیتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

"لو صاحب! کھچڑی کھاتی دن بہلائے، کپڑے بھائے گھر کو آئے۔ ۸ جنوری ماہ و سالِ حال دوشنبے کے دن غضبِ الٰہی کی طرح اپنے گھر پر نازل ہوا۔ تمھارا خط مضامینِ دردناک سے بھرا ہوا رامپور میں میں نے پایا۔ جواب لکھنے کی فرصت نہ ملی۔ بعد روانگی کے مرادآباد میں پہنچ کر بیمار ہوگیا۔ پانچ دن صدر الصدور صاحب کے ہاں پڑا رہا۔ اُنھوں نے بیمارداری اور غمخواری بہت کی۔"[۲]

حکیم احمد حسن مودودی کو لکھا ہے:

"ہشتم جنوری کو دلّی پہنچا۔ عرضِ راہ میں بیمار ہوا۔ پانچ دن مرادآباد میں صاحبِ فراش رہا۔ اب جیا فرسودہ روان و ناتواں تھا، دلیا ہوں۔"[۳]

مجروح کو لکھتے ہیں:

"بندۂ گنہگار شرمسار عرض کرتا ہے کہ پرسوں غازی آباد کا اٹھا ہوا گیارہ بجے اپنے گھر پر مثلِ بلای ناگہانی نازل ہوا ہوں۔

باید کہ کنم ہزار نفریں بر خویش اما زبانِ جادۂ راہِ دہلی"[۴]

شاکر کو لکھا ہے:

"قبلہ! یہ تو آپ کو معلوم ہوگیا ہوگا کہ ۸ جنوری کو فقیر دلّی پہنچا، تھکا ماندہ، خستہ و رنجور۔ ہنوز افاقتِ کلی نہیں پائی۔"[۵]

۱- اردوی: ۲۵ رامپور کی ان سوغاتوں کی تحقیق عرشیؔ ۲۶۳، ۳۰، کے حاشیوں میں ملاحظہ ہو
۲- ایضاً: ۱۰۸ (۳) ایضاً: ۲۲۳ (۴) عود: ۲۷۹، ۵ ایضاً: ۱۶۲

یہی تاریخ نواب خلد آشیاں کو بھی لکھی ہے۔ فرماتے ہیں:

> "دوشنبہ ۲۰ شعبان ۱۲۸۲ جنوری ۶۶ء ۱۸ درغمکدہ پر پہنچ۔ حضور کے اقبال کی تائید تھی، ورنہ میں اور جیتا دلّی پہنچتا!"[1]

باہر رہنے کی کل مدت

میرزا صاحب ، اکتوبر سنہ ۶۵ء کو دلّی سے روانہ ہوئے اور ۸ جنوری سنہ ۶۶ء کو واپس پہنچے۔ اس حساب سے اُن کی دلّی سے باہر رہنے کی کل مدت تین ماہ ہوتی ہے۔

ارسال ہدایا

حسبِ ضابطۂ مودت و خلوص، رامپور سے میرزا صاحب کو تحفے تحائف بھی بھیجے جاتے، جو بیشتر رامپور کے آم ہوتے تھے۔ میرزا صاحب کو آم طبعاً مرغوب تھے، اس لیے یہ تحفے اُنھیں انگریزی خلعت اور سرکاری عطیات سے کم نہ معلوم ہوتے ہوں گے۔ ۱۷ جون سنہ ۶۲ء کو سیاح کو لکھتے ہیں:

> "رامپور سے نواب صاحب اپنے باغ کے آموں میں سے اکثر بسبیل ارمغاں بھیجتے رہتے ہیں۔"[2]

سرکاری کاغذات سے پتا چلتا ہے کہ ۸ جون سنہ ۶۰ء کو نواب فردوس نے آموں کی دو بہنگیاں تحفۂ بہار یہ کہہ کر روانہ کی تھیں[3]۔ اس کے بعد ۲۹ جون کو دو بہنگیاں اور ارسال کی گئیں[4]۔ ۲۱ جون سنہ ۶۳ء کو قلمی آموں کی دو بہنگیاں روانہ کرتے ہوئے سرکار نے "حسبِ دستور" کے الفاظ سے اس تحفے کو تعبیر فرمایا[5]۔ آغازِ جولائی سنہ ۶۴ء میں بھی سرکار نے دو سو آم بھیجے۔ میرزا صاحب ۵ جولائی کو اس عنایت کی رسید میں لکھتے ہیں:

۱- مکاتیب ۱۳۱ (۲) اردوی ۲۹۶ (۳) مثل نمبر ۲۰۰ (۴) مثل نمبر ۳۱۹ (۵) مثل نمبر ۴۴۰

"نوازش نامہ اور اُس کے ساتھ دو بہنگیاں دو سو آموں کی پہنچیں؛
بشکر نعمتہای تو چنداں کہ نعمتہای تو"[1]

فرمایشیں

اس کے علاوہ کبھی کبھی دونوں طرف سے بعض چیزوں کی فرمایش بھی ہوتی تھی۔ ۱۷ اپریل سنہ ۶۰ء کو نواب فردوس مکاں نے میرزا صاحب کو لکھا:

"مشفقا، چونکہ ایام رنگترہای درمزیری کے ہیں، اس واسطے حوالے خامۂ محبت نگار کے ہوتا ہے کہ آپ بمقتضای لطف و عنایت فرمائی مخلصانہ کے ایک ایک بہنگی رنگترہای سبز درمزیری کی بیتفاوت دس دس روز کے تا اختتام فصل معاونہ اس سرکار کے فرماتے رہیے، اور قیمت رنگتروں اور اُجرت کہاروں بہنگی سے مخلص کو مطلع فرما دیجیے، تاکہ مطابق اُس کے ہنڈوی آپ کی سامی خدمت میں بھیجی جائے۔ اگرچہ آپ کو اس خصوص میں تکلیف ہوگی۔ لیکن آپ کی محبت ... از العنایت قلبی سے چشمداشت یہ ہے کہ اس باب میں جانب طازمان سامی سے بخوبی عمل میں آئے گا۔"[2]

میرزا صاحب نے اس فرمایش کی تعمیل کی۔ سرکار نے ۲۹ اپریل کے مکتوب میں اس کا شکریہ ادا فرمایا۔[3] اس کے بعد اپریل سنہ ۶۱ میں بھی میرزا صاحب نے رنگترے ارسال کیے۔ ۲۰ اپریل سنہ ۶۱ء کو سرکار نے ان کا بھی شکریہ ادا کیا۔[4] سنہ ۶۴ء میں نواب فردوس مکاں نے چوب چینی کی فرمایش

---

[1] مکاتیب: ۲۲ (۲) مثل نمبر ۲۲۶ (۳) مثل نمبر ۲۵۲ سنہ ۶۰ ۱۸۵۹ء کے آخر میں شاہ جہاں آباد سے رنگتروں کی خرید کا حساب واضح نہ ہونے کے باعث یہ بتانا دشوار ہے کہ میرزا صاحب کو رنگتروں کی قیمت وغیرہ ملی یا نہیں (۴) مثل نمبر ۳۳۴ آوارجہ خزانہ بابت سلطنت ۱۲۶۰-۱۲۷۰ (دوق ۳۰-۱۳۱) میں ۲ مئی سنہ ۶۱ء کے تحت شاہ جہاں آباد سے رنگتروں کی خرید کا حساب درج ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ... پھلوں کی قیمت پر اور پیے کہار کی مزدوری میں صرف ہوے تھے۔ مگر اس میں میرزا صاحب کے بجائے محمد وزیر علی خانساماں کی معرفت خرید لکھی ہے۔ میرا خیال ہے کہ خانساماں صاحب ڈالی خانے کے افسر ہوں گے اور اس لیے دفتری ضابطہ کی رو سے میرزا صاحب کی جگہ اُن کا توسط کاغذات میں ظاہر کیا گیا ہوگا۔

کی میرزا صاحب نے بڑی کوشش سے پانچ سیر نگین وسنگین و بے گرہ یا کم گرہ قطعاتِ چوب چینی مہیا کرکے سرکاری کہار کے ہاتھ روانہ کیے، اور از راہِ معذرت لکھا:

"دلّی اب شہر نہیں، چھاؤنی ہے، کیمپ ہے۔ نہ قلعہ، نہ شہر کے امرا نہ اطرافِ شہر کے رؤسا۔"[۱]

۱۱ جولائی سنہ ۱۸۶۱ء (غرۂ محرم سنہ ۱۲۷۸ھ) کو میرزا صاحب نے آموں کی فرمایش کی۔ اس کے جواب میں نواب فردوس مکاں نے تحریر فرمایا:

"در بارہ ترسیل انبہ ہای کے کہ زیب رقم فرمایا ہے، حال یہ ہے کہ امسال بہار انبہ کی باغات اس سرکار میں بہت قلیل اور کم رہی اور علاوہ اس کے عجب کیفیت اُن میں پیدا ہوئی کہ قابل رکھنے دو چار دن کے نہ تھے، یعنی در صورت رکھنے کے خراب اور بوسیدہ ہو جاتے تھے۔ اس سبب سے بھیجنا انبہ ہای کا متصور نہ ہوا۔ ظہور اس امر کا بعالم مجبوری تصور فرمایئے۔"[۲]

رامپور کے دوسرے سفر میں نیّر کے لیے میرزا صاحب نے نواب خلد آشیاں سے ایک بانس کی غلیل مانگی۔ سرکار نے حکم دیا کہ توشہ خانۂ خاص سے عطا کر دی جائے۔ میرزا صاحب رامپور سے ۶ شعبان سنہ ۱۲۸۲ھ مطابق ۲۷ دسمبر ۱۸۶۵ء کو علائی کے خط میں لکھتے ہیں:

"مجھ سے ہندی کی چندی ہوئی۔ ایک غلیل حضور نے دینی کی ہے۔"[۳]

بعد ازاں اسی غلیل کے متعلق ۲۵ شعبان، مطابق ۱۳ جنوری سنہ ۱۸۶۶ء کو لکھا ہے:

"اب چلنے سے ایک ہفتہ پہلے تم نے غلیل مانگی۔ بھائی، کیا بتاؤں کہ کتنی جستجو کی کہیں بہم نہ پہنچی، دس روپے تک مول کو نہ ملی۔ نواب صاحب

۱۔ مکاتیب: ۳۰ (۲) مثل نمبر ۲ (۳) اردو: ۳۹۲۔

سے مانگی۔ توشے خانے میں بھی نہ تھی۔"[۱]

دیگر خدمات

میرزا صاحب سرکارِ رامپور کی دیگر خدمات بھی بجا لاتے تھے۔ دسمبر سنہ ۶۱ء میں نواب فردوس مکاں نے چوبے گردھاری لال کے لیے حکیم نیاز علی صاحب سے نسخہ تجویز کرا دینے کے متعلق تحریر فرمایا، تو میرزا صاحب نے جواباً لکھا کہ حکیم صاحب مریض کا معائنہ کرنے کے بعد دوا تجویز کریں گے۔ اس کے جواب میں ۱۹ دسمبر کو سرکار نے تحریر فرمایا:

"الحال چوبے مزی الیہ قصد آنجا بضرورت استعلاج از حکیم صاحب می دارند۔ لہٰذا حوالۂ خامۂ محبت نگار می شود کہ ہنگام رسیدن چوبے صاحب از حکیم صاحب ملاقات شان بخوبی کنانند تجویز علاج بخوبی عمل آید۔"

۱۰ ربیع الاول سنہ ۱۲۸۰ھ مطابق ۱۴ اگست سنہ ۶۳ء کو نواب فردوس مکاں نے تحریر فرمایا:

"دربنولالا شب سہای ساہو رہنے والے رامپور کے واسطے معالجے آنکھوں اپنی کے شاہجہاں آباد کو آتے ہیں۔ اور لالہ مذکور متوسل اس سرکار کے ہیں۔ اس سطح حوالے خامہ محبت نگار کے ہوتا ہے کہ در بارۂ علاج لالہ معزی الیہ کے اطبای حاذق سے مراتب لطف اور مہربانی کے ان کے حال پر مرعی اور مبذول فرماویں۔"[۲]

جولائی سنہ ۶۲ء میں نواب خلد آشیاں نے دلّی کے ایک شطرنج باز فاضل نامی کو رامپور بھیجنے کی تحریک کرائی۔ میرزا صاحب نے اُسے روانہ کر کے اطلاعاً نواب صاحب کی خدمت میں لکھا:

"بموجب تحریر میرزا رحیم الدین بہادر حیا کے، فاضل شطرنج باز

۱۔ اردوی: ۱۵ (۲۱۶)، مثل نمبر ۹۹ (۲) ۳، مثل نمبر ۴۸

کو خرچ دے کر روانہ کیا ہے۔[۱]

سرکار کا طریقِ خطاب

سرکاری فرامین کے القاب، آداب اور خاتمے میں، ہر جگہ بزرگی و محبت کا لحاظ پایا جاتا ہے اور عام طور پر فرمان کا انداز یہ ہوتا ہے:

"نواب صاحب مشفق مہربان کرم فرمائی مخلصان سلمہ اللہ تعالیٰ۔
بعدِ اشتیاقِ مواصلتِ موفور المسرت کہ مجتبا وز التحریر ہے مشہودِ ضمیرِ مودت تخمیر کے ہو۔۔۔ زیادہ جمعیت و نشاط ہو۔"

اثنائی مطالب میں جہاں میرزا صاحب کے خط کا حوالہ آیا ہے، وہاں اُن کے مکتوب کو "سامی صحیفہ لطف آگیں" یا "نمیقہ انیقہ بلاغت مشحون" یا و دیگر تعظیمی الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اسی طرح ہر جگہ لفظ "مشفقا" سے تخاطب ہے۔ ایک مکتوب میں نواب فردوس مکاں نے اپنے تعلقات کی صراحت بھی فرما دی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

"چونکہ آپ خفا ہونا مخلص کا بسببِ عدم رسیِ رقائمِ اخلاص محتوی رسیدات صحائفِ موصوفہ اپنے تحریر فرماتے ہیں، اے حضرت، مخلصِ صمیم تو آپ کو بزرگ اور عنایت فرما اپنا جانتا ہے۔ توقف رسیِ رقائمِ نیاز کی باعثِ خفگی نہ تصور فرمائیے۔"[۲]

ان مراسم و آداب سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ سرکارِ رامپور سے میرزا صاحب کے تعلق کی نوعیت کیا تھی۔

میرزا صاحب کا طریقِ خطاب

خود میرزا صاحب کے عرائض کے القاب، آداب اور خاتمے بھی اس پر شاہد ہیں کہ اس رشتے کی بنا احسان و عنایت کے ساتھ محبت

۱۔ مکاتیب: ۴۲۔ اوارچے میں ۱۶ ستمبر ۱۸۶۰ء کے تحت ۲۵ روپے کی ایک رقم کا فاضل شطرنج باز کو عطا کیا جانا دریافت ہوتا ہے (۲) مثل نمبر ۲۲، صلۂ احباب

وخلوص پرتھی۔ تقریباً تمام عرائض میں "ولی نعمت" سے مخاطب کیا ہے، اور "بعدِ تسلیم معروض ہے" سے مطلب کا اظہار شروع کر کے "زیادہ حدِ ادب" پر عریضے کو ختم کر دیا ہے۔ خاتمے میں بالعموم دعائیہ شعروں میں سے ایک اور کبھی کبھی دونوں پائے جاتے ہیں۔ دو چار خطوں کے اندر ان شعروں کا ایک ایک مصرع لے کر تیسرا شعر بھی بنا لیا ہے۔ یہ یکسانی اور تکرار خود تصنع سے پرہیز پر دلالت کرتی ہے۔

رامپور سے کل مالی امداد

میرزا صاحب کو بارہ برس میں دربارِ رامپور سے جو مالی مدد ملی، اُس کی مجموعی مقدار ۱۶ ہزار، سو ۲۵ روپے ہے![۱] اس رقم میں سے کچھ اوپر دس ہزار نواب فردوس مکاں نے اور باقی نواب خلد آشیاں نے عطا فرمائے تھے۔

اس امداد میں وقتی عطیے اور وظیفہ دونوں شامل ہیں۔ وظیفے کا تقرر جولائی سنہ ۵۹ء میں ہوا تھا، جو میرزا صاحب کی تاریخِ انتقال ۱۵ فروری سنہ ۶۹ء تک برابر ملتا رہا۔ اس کی کل مقدار ۱۱ ہزار ۵ سو ۵۰ روپے ہوتی ہے۔

عطیات کا سلسلہ ۵ فروری سنہ ۵۷ء سے شروع ہو کر میرزا صاحب کے انتقال کے بعد تک جاری رہا۔ اس مد میں جتنا روپیہ انھیں مرحمت ہوا اُس کی تاریخ وار تفصیل یہ ہے:

(۱) ۵ فروری سنہ ۵۷ء	۲۵۰ روپے	بتقریبِ شیرینیِ شاگردی
(۲) ۲۳ مارچ ″ ″	۲۵۰ ″	″ تبریہ نوشی
(۳) ۲۷ جولائی ۱۸۵۷ء (۵ ذیحجہ ۱۲۷۳ھ)	۲۵۰ ″	بغرضِ امدادِ مالی

(۱) یہاں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ تنخواہ کی رقم میں وہ سو روپے ماہوار شامل نہیں کیے گئے ہیں، جو رامپور کے قیام میں بنامِ دعوت ملا کرتے تھے کیونکہ مصارفِ مہمانداری سے تعلق رکھنے کے باعث انھیں مالی امداد میں شمار کرنا کسی طرح مناسب نہ ہوگا۔

(۴) ۳۱ اگست سنہ ۵۸ء	۲۵۰ رُوپے		بغرضِ امدادِ مالی
(۵) ۲۵ نومبر ؍؍	۲۵۰	؍؍	؍؍
(۶) ۲۰ مئی سنہ ۵۹ء	۲۵۰	؍؍	بغرضِ مصارفِ خدام[1]-
(۷) ۱۶ دسمبر ؍؍	۲۰۰	؍؍	بغرضِ امدادِ مالی[2]
(۸) ۱۵ مارچ سنہ ۶۰ء	۳۰۰	؍؍	؍؍ [3]
(۹) ۲۴ جنوری سنہ ۶۱ء	۲۰۰	؍؍	بتقریب شادیٔ نواب سید حیدر علی خاں بہادر
(۱۰) ۱۱ جولائی ؍؍	۱۲۵	؍؍	؍؍ (توڑے اور جوڑے کے)
(۱۱) ۱۱ مارچ سنہ ۶۳ء	۲۰۰	؍؍	بغرضِ خرچ ابنالہ برائے شرکتِ دربار گورنر جنرل
(۱۲) ۳ اکتوبر ؍؍	۲۰۰	؍؍	بغرضِ امدادِ مالی
(۱۳) ۱۶ اگست سنہ ۶۵ء	۲۰۰	؍؍	بتقریب غسلِ صحتِ نواب خلد آشیاں

(۱) آورجہ سنہ ۶۰-۱۸۵۹ء ورق ۲۰۹ ب پر ماہ اکتوبر ۵۹ء کے تحت ۲۵۰ کی رقم لکھ کر تحریر کیا گیا ہے:
"وجہ عنایات بابت تنخواہ مرزا نوشہ کہ قبل از تقرر تنخواہ بصیغۂ عنایات بذریعۂ ہنڈوی رفتہ بود، بموجب حکم مثبتۂ عرضی منشیان محکومہ ۱۵ اکتوبر سنہ ۱۸۵۹ء"۔ (۲) آورجے میں اس تاریخ کو تین سو رُپے کی رقم کا خرچ دکھایا ہے۔ مگر میرزا صاحب اور نواب فردوس مکاں کے خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ دو سو رُپے مانگے اور بھیجے گئے تھے۔ اس صورت میں تین سو کا اندراج بشمولِ وظیفۂ ماہواری ہوگا
(۳) اس رقم کی حسب ذیل رسید مثل میں شامل ہے:

رسید مرزا نوشہ صاحب

مبلغ سہ صد روپیہ کہ نصفہ یک صد پنجاہ روپیہ می شود، بصیغۂ عنایات از سرکار فیض آثار معرفت لالہ گوکل پرشاد و پورن پرشاد خزانچیان وصول یافتم۔
بنابراں رسید نوشتہ شد۔

ہنڈوی — سکار — نقد
ما

العبد مرزا نوشہ [illegible] گواہ شد

اسد اللہ خاں [illegible]

حوالۂ کلو خانساماں مرزا نوشہ صاحب نمودہ شد — مرقوم ۱۵ مارچ سنہ ۱۸۶۰ء

اس رسید میں صرف مرزا نوشہ غالب کے قلم کا نوشتہ ہے۔ بقیہ عبارت غالباً کسی اہلکار نے لکھی ہے۔ ۱۵ مارچ کو دیوان نے اس رقم کے باضابطہ حکمِ عطا کی رپورٹ کی تھی ۱۸ کو حکم عطا نافذ ہوا۔ اور ۲۰ کو حساب کی مجرائی کا حکم ہو کر یکم اپریل کو آورجہ سنہ ۶۰-۱۸۵۹ء ورق ۳۶۰ (الف) میں اندراج ہوا۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ رقم ۱۵ مارچ کو علی بخش خانساماں نے زبانی حکم کے مطابق نزواتِ خزانہ سے دلوا دی تھی۔ بعد ازاں رپورٹ کرکے باضابطہ حکم ۱۸ مارچ کو حاصل کیا۔

(۱۴) ۱۸ نومبر سنہ ۶۵ء	۱۰۰۰	روپے بتقریب جشنِ تخت نشینیٔ نواب خلد آشیاں
(۱۵) ۹ جنوری سنہ ۶۶ء	۲۰۰	" نماد دادِ دہلی
(۱۶) ۵ اکتوبر ۱۸۶۶ء اور ۲ جنوری ۱۸۶۷ء (کے درمیان)، ۵۰۰		" بغرضِ ادائی قرض
(۱۷) ۱ نومبر سنہ ۶۹ء	۶۰۰	" بیگم غالب کو میرزا صاحب کا قرض ادا کرنے کے لیے

ان خلعتوں کی مجموعی رقم ۵ ہزار ایک سو ۲۵ رُپے ہوتی ہے۔ ان میں سے نمبر ۱، ۳، ۵، ۷، ۱۰، ۱۱، ۱۳ اور ۱۶ کا ذکر مکاتیب میں، اور بقیہ کا خزانے کے سنہ وار آوار جوں میں موجود ہے۔

۴ اکتوبر سنہ ۶۳ء کو دو سو رُپے کی جو رقم ارسال ہوئی تھی، اُس کے متعلق میرزا صاحب نے سرکار سے دریافت کیا تھا کہ تنخواہ میں سے پیشگی تو عطا نہیں ہوئی ہے۔ نواب فردوس مکاں نے اپنے دستِ خاص سے منشی سیل چند کو تحریر فرمایا:

"منشی سیل چند! میرزا نوشہ صاحب کو خط لکھ کر روانہ کرو کہ یہ دو سو روپیہ تنخواہ سے کچھ علاقہ نہیں رکھتے ہیں۔ آپ شوق سے صرف کیجیے۔ تنخواہ حسبِ معمول کے پہنچ جائے گی۔ یہ علاوہ تنخواہ سے ہیں۔ فقط"[۱]

منشی صاحب نے سرکار کی طرف سے محولۂ بالا مضمون کا جواب ۱۱ اکتوبر کو روانہ کر کے میرزا صاحب کو اطمینان دلا دیا کہ یہ سراسر فتوح ہے۔

قاطع برہان کی طباعت میں امداد

طباعتِ قاطع برہان کے لیے دو سو رُپے کی ایک رقم کا ذکر خود میرزا صاحب نے سیاح کے نام کے خط میں کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

"میرے پاس روپیہ کہاں، جو قاطع برہان کو دوبارہ چھپواؤں پہلے بھی نواب مغفور نے دو سو روپیے بھیج دیے تھے، تب پہلا مسودہ صاف ہو کر چھپوایا گیا تھا۔ اب بھی وعدہ کیا تھا کہ اپریل کی وجہ مقرری

---

[۱] مینۂ احباب، عہد فردوس مکاں۔

کے ساتھ دو سو پہنچیں گے، وہ آخر اپریل سنہ ۱۸۶۵ء حال میں مرگئے اپریل کا روپیہ رئیسِ حال سے میں نے پایا۔ معروف کتاب کا روپیہ نہ آیا۔ یاد دلاؤں گا۔ مگر اس مرحوم کا وعدہ سررشتۂ دفتر سے نہ تھا جو از روی دفتر اس کی تصدیق ہو۔ بہرحال فکر میں ہوں۔"[۱]

یہ رقم قاطعِ برہان کی تاریخِ طباعت[۲] ۲۰ رمضان سنہ ۱۲۷۸ھ (۲۲ مارچ ۱۸۶۲ء) سے قبل عطا ہونی چاہیے۔ لیکن کسی مثل میں حوالہ نہ ملنے کی بناپر اس کی صحت کے بارے میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ اسی لیے میں نے عطیات کے حساب میں اسے شامل نہیں کیا ہے۔

ہر قصیدے پر انعام

میرزا صاحب نے نواب خلد آشیاں کو لکھا ہے کہ میں نواب فردوس مکاں کی خدمت میں مدحیہ قصیدہ بھیجتا، تو وہ ۲۵۰ روپے کی ہنڈوی بھیجا کرتے تھے، جس کی دفتر سے تصدیق کی جاسکتی ہے۔[۳]

میرزا صاحب نے فردوس مکاں کی مدح میں ۸ قصیدے لکھے تھے، پہلے کا مطلع ہے:

ہمانا اگر گوہر جان فرستم ۔۔۔ بہ نواب یوسف علی خاں فرستم

یہ ۱۱ فروری سنہ ۱۸۵۷ء کو بھیجا گیا تھا۔[۴] دوسرے کا مطلع ہے:

چون نیست مرا شربتِ آبی ز تو حاصل ۔۔۔ دانم کہ تو دریائی و من سبزہ ساحل

یہ غالباً اگست سنہ ۱۸۵۸ء میں لکھا گیا تھا۔[۵] تیسرے کا مطلع ہے:

تعلیم غسلِ صحت نواب کم مگیر ۔۔۔ زان عید کان مضاف بود جانبِ غدیر

یہ ۲۷ نومبر سنہ ۱۸۶۳ء کو روانہ کیا گیا تھا۔[۶] چوتھے کا مطلع ہے:

مرحبا سالِ فرخی آئین ۔۔۔ عیدِ شوال و ماہِ فروردین

---

(۱) اردوی معلیٰ (۲) قاطع برہان: ۹۳ (۳) مکاتیب: ۳۸ (۴) ایضاً: ۵ (۵) ایضاً: ۱۸

(۶) ایضاً: ۲۹۔

یہ ۲۵ دسمبر سنہ ۱۸۶۴ء اور ۸ جنوری سنہ ۱۸۶۵ء کے درمیان کہا گیا تھا![1]

عطیات کی فہرست دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سنہ ۵۷ء اور سنہ ۵۸ء میں ڈھائی سو روپے کی رقمیں پانچ بار عطا ہوئی تھیں ان میں سے ۲۳ مارچ ۵۷ء کی رقم پہلے قصیدے کا اور سنہ ۵۸ء کی دونوں رقموں میں سے کوئی ایک، دوسرے کا صلہ ہو سکتی ہے، مگر فردوس مکاں نے اول الذکر کو بتقریب تربد نوشی اور مؤخر الذکر کو امدادی عطیہ ظاہر کیا ہے۔

تیسرا اور چوتھا قصیدہ علی الترتیب نومبر اور دسمبر سنہ ۶۴ء میں بھیجے گئے تھے؛ مگر اس سال کے اندر کسی رقم کا عطا ہونا ثابت نہیں۔ اس صورت میں میرزا صاحب کا دعویٰ ہنوز محتاج ثبوت ہے۔

۱- مکاتیب: ۳۳-۱۳۲

اصلاحِ غالب

فروری سنہ ۶۵ء سے اپریل سنہ ۶۵ء تک میرزا صاحب "معدر خدمت" بھی تھے، اور "شریکِ دولت" بھی۔ اپریل سنہ ۶۶ء میں نواب فردوس مکاں کا انتقال ہوا، تو صرف شرکتِ دولت باقی رہ گئی، جس کا سلسلہ میرزا صاحب کے انتقال تک جاری رہا۔

یہ خدمت نواب فردوس مکاں کے کلام پر اصلاح تھی۔ میرزا صاحب کی دستگیری میں نواب فردوس مکاں سے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں ہوا وہ اُن سے دوستانہ ملتے، اور شاگردانہ وظیفہ مرحمت فرماتے تھے۔ میرزا صاحب نے بھی ان تعلقات کو نعمتِ غیر مترقبہ سمجھا، اور تا بمقدور تندہی سے سرکار کی خدمت بجا لاتے رہے۔

مروت

یہ سرکار عالمِ ضعیفی میں میرزا صاحب کی دستگیری کر رہی تھی، اِس لیے اُن کا اصلاحِ سخن میں سعی و جانفشانی کرنا ہرگز تعجب انگیز نہیں۔ حیرت اس پر ہوتی ہے کہ اُنھوں نے دوسرے اہلِ سخن کے کلام پر اصلاح سے بھی کبھی دریغ نہ کی۔ اور یہ مشغلہ اُس وقت بھی ترک نہ ہو سکا، جب کہ اُنھیں کا فور و کفن کی پڑی ہوئی تھی۔

۲۱ ستمبر سنہ ۱۸۶۰ء کو سید احمد حسن قنوجی کو لکھا ہے:

"تمہاری نثر کی طرز پسند، تمہاری خواہش مقبول، دیکھو، سید احمد حسن صاحب کی خدمت گزاری منظور۔

ضعف نے غالب، نکما کر دیا ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

۶۵ برس کی عمر ہوئی۔ اضمحلالِ قوا، ضعفِ دماغ، فکرِ مرگ، غمِ عقبیٰ

جو آپ مجھ کو دیکھ گئے ہیں، میں اب وہ نہیں ہوں۔ نظم و نثر کا کام صرف ۵۰ برس کی مشق کے زور سے چلتا ہے، ورنہ جوہرِ فکر کی رخشندگی کہاں: بوڑھا پہلوان پیچ بتاتا ہے، زور نہیں دو اسکتا بہرحال، حکیم صاحب کو میرا سلام کہیے اور کہیے کہ آپ بے تکلف اپنا کلام بھیج دیا کریں۔ یہاں سے بعد حک و اصلاح خدمت میں پہنچ جایا کرے گا۔"[۱]

حکیم احمد حسن مودودی کو ۲۴ جولائی سنہ ۱۸۶۵ء کو لکھا ہے:[۲]

"اب میں اپنی زبان سے یہ کیوں کر کہوں کہ اچھا ہوں۔ مگر بیمار اور عوارض میں گرفتار نہیں ہوں۔ بوڑھا، اپاہج، بدحواس، ناتوان فلک زدہ آدمی ہوں۔ عہد کرتا ہوں کہ جب آپ کا خط آئے گا، اُس کا جواب لکھوں گا۔ جب غزل آئے گی، اُس کو دیکھ کر پھر بھیجوں گا۔"[۲]

شنبہ ۲ جون سنہ ۶۶ء کو پھر انھیں کو لکھتے ہیں:

"آپ پر اور میر ابراہیم علی خاں پر میری جان نثار ہے۔ معنی مافی اب ایک ایک غزل آپ تینوں صاحب بھیج دیا کیجیے۔ اسی طرح میں فرداً فرداً بعد اصلاح بھیج دیا کروں گا۔ مگر میرے قبلہ و کعبہ، واسطے خدا کے، شجرۂ منظومہ ارسال نہ فرمائیے گا۔ اس کی اصلاح میری حدِ وسع سے باہر ہے۔"

انھیں کو شنبہ یکم ستمبر سنہ ۱۸۶۶ء کو ایک خط لکھا ہے۔ اس میں فرماتے ہیں:[۴]

"میں علی کا غلام اور اولادِ علی کا خانہ زاد، لیکن بوڑھا، ناتوان اور مسلوب الحواس اور بے سر و سامان۔ خدمت بجا لانے میں عذر کروں گا تو گنہ گار۔ درنگ و توقف کا مضائقہ نہیں۔"

۱۔ اردوی: ۱۸، طبع لاہور (۲) ایضاً: ۱۸۲ (۳) ایضاً: ۲۴۴ (۴) ایضاً: ۱۸۱

پھر ۱۰ اکتوبر سنہ ۱۸۶۶ء کو لکھتے ہیں:
"حضرت، یہ آپ کے جدِّ امجد کا غلام تو مر گیا۔ کثرتِ احکام، تواترِ ورودِ اشعار، پھر یہ ہنجار کہ سو روپیے کے نوٹ کی رسید، سو بار مانگتے ہو۔ غزلیں آپ کی برستی ہیں۔ کہاں تک دیکھوں۔ آپ کی غزلوں کے ساتھ اور غزلیں بھی گم ہو جاتی ہیں۔
بہتر برس کا آدمی، پھر رنجورِ دائمی۔ غذا یک قلم موقوف، آخر پہر میں ایک بار آبِ گوشت پی لیتا ہوں۔ نہ روٹی، نہ بوٹی، نہ پلاؤ نہ خشکا، آنکھ کی بینائی میں فرق، ہاتھ کی گیرائی میں فرق، رعشہ مستولی، حافظہ معدوم۔ جہاں جو کا غذ رہا، وہ وہیں رہا.... مدعا یہ کہ آپ اور دونوں سید صاحب اس کا التزام کریں کہ ایک غزل اپنے خط میں بھیجیں۔ جب وہ غزل اور اس خط کا جواب پہنچ جائے، تب دوسری غزل خط میں ملفوف ہو کر بھیجی جائے۔ اور خط ہر صاحب کا جدا ہو۔"[1]
پھر ۱۷ جولائی سنہ ۱۸۶۸ء کو لکھا ہے:
"یہ جو آپ نے اپنی اور نواب صاحب کی غزلوں کی اصلاح کے واسطے لکھا ہے، مجھے اس حکم کی تعمیل بدل منظور ہے۔ جس مہینے تک میں زندہ ہوں، اُس مہینے تک خدمت بجا لاؤں گا۔"[2]
نواب میر ابراہیم علی خاں بہادر وفا کو ۲۰ اکتوبر سنہ ۱۸۶۶ء کو لکھتے ہیں:
"بسببِ ضعفِ پیری کے خدمت گزاری میں درنگ واقع ہو جائے تو معاف رہوں۔ قاصر کبھی نہ ہونگا انشاء اللہ العظیم۔
دو غزلوں میں سے ایک غزل بعدِ اصلاح پہنچتی ہے دوسری غزل ہفتۂ آیندہ میں پہنچ جائے گی۔
ضعفِ اعضا اور دوامِ مرض سے علاوہ، اختلالِ حواس کا کیا

(۱) اسعدی: ۱۰۵ (۲) ایضاً: ۱۰۴

حال لکھوں؟ مگر تین دن ہوئے کہ قبلہ و کعبہ میر عالم علی خاں کا خط آیا،
وہ لکھتے ہیں کہ آزردہ تخلص کی دو غزلیں اصلاحی پہنچیں۔ دیکھیے اس
سہو کو کہ کس کی غزلیں کس کو پہنچیں۔ مزا اس میں ہے کہ اب یہ بھی یاد نہیں
آتا کہ آزردہ کا نام کیا ہے اور وہ کون ہے اور کہاں کا ہے۔ شاید اس
بندۂ خدا کو حضرت کی غزلیں بھیجی ہوں گی۔ خدا کرے، وہ بزرگ وار میر صاحب کی
غزلیں میر صاحب کی طرح میرے پاس بھیج دے، تو میر صاحب کی خدمت
میں بھیج دوں۔ اگر ایسا نہ ہوا، تو ان غزلوں کو جواب آئی ہیں،
دیکھوں گا۔"

یہ اکہتر برس کی عمر کی خوبی ہے۔ آپ میر صاحب قبلہ کو خط پڑھوا دیجیے گا۔
میر صاحب ہی کو ۹ ربیع الثانی سنہ ۱۲۸۳ھ کو لکھتے ہیں:

"قبلہ، آپ کے بھائی، میر عالم علی خاں صاحب مجھ پر کیوں خفا ہیں کہ اپنی
غزل نہیں بھیجتے؟ یہ امر ان کے خاطر نشان ہو جائے کہ غالب آپ کے
دادا کا غلام اور خدمت بجا لانے کو آمادہ ہے۔"[۱]

ذکا کو لکھتے ہیں:

"مجموعۂ کلامِ سابق اگر بھیج دو گے، میں بجمالِ طیبِ خاطر اس کو دیکھ کر
بھیج دوں گا۔ استجازت کیا ضرور ہے۔"[۲]

<u>تواضع</u>

وہ عام شاگردوں سے بھی تواضع و انکسار کے ساتھ پیش آتے تھے۔
شاکر کو لکھتے ہیں:

"آپ اپنی طرف سے اس کو اصطلاح سمجھتے ہیں، اور میں اس کو اپنی جانب
سے استفادہ جانتا ہوں۔"[۳]

<u>انھیں کو یہ بھی لکھا ہے:</u>

۱۔ اردوی: ۱۷۷ (۲)، ایضاً ۱۷۵ (۳) ادبی خطوط: ۱۷۷ (۴) عود: ۱۵۸

"آپ کا داسطہ اصلاحِ کلام کے رجوع کرنا میری طرف موجب میری نازش کا ہے۔"[۱]

سہ بارہ تحریر فرماتے ہیں:

"اشعار بعد حک و اصلاح کے پہنچے ہیں۔ یہ رتبہ میری ارزش کے فوق ہے کہ میں آپ کے کلام میں دخل و تصرف کروں۔"[۲]

سرور کو لکھا ہے:

"جناب شیخ صاحب کیوں مجھ کو محجوب کرتے ہیں۔ اس باب میں اس سے زیادہ عرض نہیں کر سکتا کہ افادہ مشترک ہے۔ قصیدہ و مثنوی بھیج دیجیے۔ لطف اُٹھاؤں گا، اور جو کچھ میرے خیال میں آئے گا، بے تکلف عرض کر دوں گا۔ میرا سلام کہیے، اور مثنوی اور قصیدہ اُن سے لے کر بھیج دیجیے۔"[۳]

قدر بلگرامی کی استدعای اصلاح کے جواب میں لکھا ہے:

"خواہش آپ کی کیا ممکن ہے کہ مقبول نہ ہو؟ جب مزاج میں آئے، آپ نظم و نثر بھیج دیں۔ میں دیکھ کر بھیج دیا کروں گا۔ اور آرائش گفتار یعنی حک و اصلاح میں کوشش دریغ نہ ہوگی۔"[۴]

تفتہ کو لکھتے ہیں:

"سنو صاحب! یہ تم جانتے ہو کہ زین العابدین خاں مرحوم میرا فرزند تھا، اور اب اس کے دونوں بچے، کہ وہ میرے پوتے ہیں، میرے پاس آ رہے ہیں، اور دم بدم مجھ کو ستاتے ہیں اور میں تحمل کرتا ہوں۔ بس تمہارے نتائج طبع میرے معنوی پوتے ہوئے۔ جب ان عالم صورت کے پوتوں سے، کہ مجھے کھانا نہیں کھانے دیتے، مجھ کو دوپہر کو سونے نہیں دیتے، ننگے ننگے پاؤں میرے پلنگ پر رکھتے ہیں،

(۱) مجموعہ ۱۵۵، (۲) ایضاً: ۱۵۶، اردوی: ۲۱۴ (۳) اردوی: ۹۷ لاہور ایڈیشن۔
(۴) خطوط: ۱/۱۷۷

کہیں پانی بڑھاتے ہیں، کہیں خاک اُڑاتے ہیں۔ میں نہیں تنگ آتا، تو اُن منوی بیتوں سے کہ اُن میں یہ باتیں نہیں ہیں، کیوں گھبراؤں گا! آپ اُن کو جلد میرے پاس بھیں ڈاک بھیج دیجیے کہ میں اُن کو دیکھوں وعدہ کرتا ہوں کہ پھر اُن کو تمھارے پاس بہ سبیلِ ڈاک بھیج دوں گا۔"[۱]

ذکا کو تحریر کرتے ہیں :

اپنے آپ کو ایسا نہیں جانتا کہ تمھارے کلام کو اصلاح دوں قدر دانی کیوں کہوں، قدر افزائی کرتے ہو۔ دوستانہ واُستادانہ جو خیال میں آئے گا، کہا جائے گا۔"[۲]

شاگرد کی غلطی پر تنبیہ میں لطف اور تہذیب کا بھی بہت لحاظ رکھتے تھے نواب انور الدولہ بہادر شفق سے ایک غلطی ہوتی۔ اُس کی طرف ان لفظوں سے متوجہ کیا ہے :

"ہاں، ایک جگہ آپ تحریر میں سہو کر گئے ہیں۔ ای مطرب جادوفن بازم رہ ہوشم زن، دو میم آپڑے ہیں۔ ایک میم محض بیکار ہے۔ دیگر کی جگہ آپ بازم لکھ گئے ہیں۔ ای مطرب جادو فن، دیگر رہ ہوشم زن"[۳]

نواب فردوس مکاں کے ایک شعر میں "بے دیتے" کی جگہ "دیئے" بنا کر لکھتے ہیں :

میں اپنی طرف سے اس لفظ کی شفارش کرتا ہوں۔ مگر آپ کی اطاعت منظور ہے، ایک بار عرض کر کے پھر نہ کہوں گا۔"[۴]

شاگرد کے اس مطلع کے متعلق فرماتے ہیں :

"کوئی آتا نہیں آگے ترے ہمتا ہو کر آئینہ جب نظر آتا ہے تو اندھا ہو کر یہ مطلع دل نشیں ہے، مگر اتنا تامل ہے کہ آئینے کو اندھا کہا چاہیے یا نہیں۔"[۵]

ذکا کو لکھا ہے :

خطوط: ۱/۱۰۸ (۲) ادبی خطوط۔ ۱۶۰ (۳) اردوی۔ ۲۱۳، عود: ۵۴ (۴) مسودہ غزلیات ناظم۔ ۱۰۴ (۵) عود: ۶۶

"مقطع میری پسند نہیں۔ میرے سر کی قسم، اس کو نہ رکھو، اور مقطع لکھ لو۔"[1]

شرائط اصلاح

مگر میرزا صاحب یہ ضرور چاہتے تھے کہ اُن سے اصلاح لینے والا
(۱) نظم و نثر کو چھدرا چھدرا لکھے،
(۲) سطروں اور مصرعوں کے درمیان فاصلہ زیادہ چھوڑے،
(۳) اتنے باریک کاغذ پر نہ لکھے کہ دوسری طرف سیاہی کے دھبے نظر آئیں،
(۴) تحریر کو پُرپیچ نہ بنائے، اور
(۵) کتابت صاف اور روشن ہو، پھیکی سیاہی سے ہرگز نہ لکھے۔

ان شرائط کو موقع بہ موقع شاگردوں کو بتایا ہے۔ تفتہ کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"دوسرا پارسل، جس کو تم نے بتکلف خط بنا کر بھیجا ہے، پہنچا۔ نہ اصلاح کو جگہ، نہ تحریرِ سطور کا پیچ و تاب سمجھ میں آتا ہے۔ تم نے الگ الگ دو ورقے پر کیوں نہ لکھا؟ اور چھدرا چھدرا کیوں نہ لکھا؟ ایک آدھ دو ورق زیادہ ہو جاتا، تو ہو جاتا۔"[2]

قدر بلگرامی کو تحریر کیا ہے:

"حضرت! میں نے چاہا کہ حکم بجا لاؤں اور عبارت کو اصلاح دوں، مگر کیا کروں؟ آپ غور کریں کہ اصلاح کی جگہ کہاں ہے؟ اگر بخشش آپ خود نظرِ ثانی میں کوئی لفظ بدلا چاہیں، تو ہرگز جگہ نہ پائیں۔ جس کاغذ پر اصلاح منظور ہوتی ہے، تو بین السطور زیادہ چھوڑتے ہیں۔"[3]

---

(۱) ادبی خطوط: ۱۶۸ (۲) خطوطِ غالب: ۲۰۱ (۳) ایضاً: ۶۸۰

اُنھیں کو دوسرے موقع پر ہدایت کی ہے:

"حضرت، آپ کے خط کا کاغذ باریک اور ایک طرف سے سراسر سیاہ۔ دوسری طرف اگر کچھ لکھا جائے، تو میری تحریر ایک طرف، تم خود اپنی عبارت کو درست نہ پڑھ سکو گے۔"[۱]

جنونؔ بریلوی کے خط میں تفصیل کے ساتھ لکھتے ہیں:

"دو عنایت نامے آپ کے اوقاتِ مختلف میں پہنچے۔ پہلے خط کے حاشیے اور پشت پر اشعار لکھے ہوئے ہیں۔ سیاہی اس طرح کی پھیکی کہ حروف اچھی طرح پڑھے نہیں جاتے۔ اگرچہ بینائی میری، جو ہے، اور میں عینک کا محتاج نہیں، لیکن بااین ہمہ اُس کے پڑھنے میں بہت تکلف کرنا پڑتا ہے۔ علاوہ اس کے جگہ اصلاح کی باقی نہیں.....

واسطے اصلاح کے جو غزل بھیجیے، اُس میں بین الافراد و بین المصرعین فاصلہ زیادہ چھوڑیے۔ اب کے خط میں جو کاغذ اشعار کا ہے، حروف اُس کے روشن ہیں، مگر بین السطور مفقود اور اصلاح کی جگہ معدوم ہے۔"[۲]

تفتہؔ نے ایک گنجان اور پیچ و تاب سے بھری ہوئی اصلاحی تحریر بھیجی تھی۔ میرزا صاحب نے اُسے "اوراقِ طلسمی" خطاب دیا، اور انھیں لکھا:

"سوالات ڈھونڈ ڈھونڈ کر اُن کا جواب لکھوایا۔ اب اشعار کو دیکھتا ہوں۔ خدا کرے، مجھ سے کوئی سوال باقی نہ رہ گیا ہو اور تم بھی جب اِن اوراقِ طلسمی کو دیکھو، تو کوئی اصلاح کا اشارہ تم سے باقی نہ رہ جائے۔"[۳]

میرزا صاحب اِن اوراقِ طلسمی سے بہت گھبراتے تھے۔ تفتہؔ کے حوالہ بالا خط میں سامنے لکھ دیا ہے کہ "اب پھر اس طرح کبھی نہ لکھنا۔ میں

۱ خطوط: (۱) ۱۰۳ (۲) ایضاً، ۱۰۱، ۱۱۳ (۳) الیف، ۲۰۱

بہت گھبراتا ہوں"۔ بعض شاگردوں کو ایسی تحریریں واپس بھی کردی ہیں۔ چنانچہ قدرؔ بلگرامی کے محولۂ بالا خط میں فرماتے ہیں:

• جب اس عبارت کو اور کاغذ پر نقل کروں، تب تک واصلاح کا طور بنے۔ میرا کام اصلاح جا ... ہے، نہ کتابت ہوا

جنونؔ بریلوی کے محولۂ بالا خط کے آخر میں لکھا ہے:

• اُس ورق کو آپ کی خدمت میں واپس بھیجتا ہوں، تاکہ آپ یہ نہ جانیں کہ میرا خط پھاڑ کر پھینک دیا ہوگا۔ اور مقصد میرا اندیشہ آپ کو بدیہی ہو جائے۔ آپ خود دیکھ لیں کہ اس میں اصلاح کہاں دی ہے"

لیکن بعض اوقات از راہِ مروّت خود زحمتِ نقل برداشت کر لیتے تھے جنونؔ بریلوی کی دو تحریروں میں سے ایک کو واپس کرکے دوسری کو خود نقل کیا ہے، اور جواب میں اُنھیں لکھتے ہیں:

• آپ کی خاطر سے رنجِ کتابت اٹھاتا ہوں، اور ان دونوں غزلوں کو اس ورق پر بعد اصلاح لکھتا جاتا ہوں۔ مسودہ تو آپ کے پاس ہوگا۔ اُس سے مقابلہ کر کر معلوم کر لیجیے گا کہ کس شعر پر اصلاح ہوئی اور کیا اصلاح ہوئی، اور کونسی بیت موقوف ہوئی"

قدرؔ بلگرامی کی باریک کاغذ والی تحریر کے متعلق لکھا ہے کہ "ناچار جدا گانہ ورق پر سوالات کا جواب لکھتا ہوں"

نواب فردوس مکاں خود بہت احتیاط کرتے تھے۔ اُن کی جس قدر غزلیں یہاں سے جاتیں، نہایت صاف، روشن اور خوشخط قلم کی ہوتیں، اور اُن کی اصلاح میں میرزا صاحب کو کوئی دقت پیدا نہیں ہوتی، اسی لیے مکاتیبِ رام پور میں اس قسم کی کوئی شکایت نظر نہیں آتی

ملحوظہ: ۱۱/ ۸۔۱۰

طریق اصلاح

بعض خطوط میں میرزا صاحب نے اپنے طریقِ اصلاح کی بھی صراحت کی ہے۔ بیتابؔ رام پوری کو تحریر فرماتے ہیں:

"قبلہ! جس شعر پر صاد ہے، وہ بہت خوب ہے، اور جس کو کاٹ دیا ہے، وہ معیوب ہے، اور جس پر صاد نہیں، وہ بے عیب اور ہموار، اور جس کے معنے میں مجھے تامل ہے، اُس پر نظر، علامت اُس کی تھی۔ باقی جا بجا منشاءِ اصلاح اور حقیقتِ الفاظ لکھ دی ہے۔"[۱]

شاکرؔ کو مختصراً لکھتے ہیں:

"میرا طریق اس فنِ خاص میں یہ ہے کہ جو شعر بے عیب ہوتا ہے، اُس کو بدستور رہنے دیتا ہوں، اور جہاں لفظ کے بدلے لفظ لکھتا ہوں، اُس کی وجہ خاطرنشان کر دیتا ہوں، تاکہ آئندہ صاحبِ کلام اُس قسم کے کلام میں خود اپنے کلام کا مصلح رہے۔"[۲]

جنوںؔ بریلوی کو تحریر کیا ہے:

"فقیر کا قاعدہ یہ ہے کہ اگر کلام میں اغلاط و اسقام دیکھتا ہوں، تو رفع کر دیتا ہوں اگر سقم سے خالی پاتا ہوں، تو تصرف نہیں کرتا۔"[۳]

قدرؔ بلگرامی کو الملامت دیتے ہیں:

"صاحب، تم نے مثنوی خوب لکھی ہے۔ کہیں املا میں، کہیں انشا میں، جو اغلاط تھے، دور کیے اور ہر اصلاح کی حقیقت اُس کے تحت میں لکھ دی۔"[۴]

اِن اصولوں کی ترتیب حسبِ ذیل ہے:

(۱) معیوب شعر کو قلمزد کر دینا،

(۲) جس شعر کے معنی میں تامل ہو، اُس کو نظری قرار دینا،

---

[۱] مکاتیب: ۸۸ (۲) عود: ۱۵۵ (۳) اردوی: ۱۵۹ (۴) خطوط: ۱: ۹۸.

(۳) بے عیب اور ہموار شعر کو بدستور رہنے دینا،
(۴) اچھے شعر پر صاد کر دینا، اور
(۵) قابلِ تغیر لفظ کو بدل کر منشاء اصلاح اور حقیقت الفاظ بتا دینا۔

اس سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ میرزا صاحب کا اندازِ اصلاح کتنا دل پسند اور شاگرد کے حق میں کس درجہ مفید تھا۔ وہ شعر میں ایسا دخل و تصرف بہت کم کرتے تھے، جس سے شاعر کے بنیادی خیال میں تغیر ہو جاتے۔ اسی لیے ایسے شعروں کو یا تو یکسر قلمزد کر دیتے، یا نظری قرار دے کر چھوڑ دیتے، تاکہ شاعر خود اُس میں مناسب ترمیم کرے![1] اسی طرح کسی شعر یا غزل میں اصلاح کی حاجت نہ ہوتی، تو اُسے جوں کا توں واپس کر دیتے تھے۔ قدر بلگرامی کی ایک نظم کے متعلق لکھا ہے :

"حضرت کشفی کے دیوان کے انطباع کی تاریخ اچھی ہے، کہیں اصلاح کی حاجت نہیں۔"[2]

جنوں بریلوی کی غزلوں کو واپس کر کے تحریر کیا ہے :

"قسم کھا کر کہتا ہوں، ان غزلوں میں کہیں اصلاح کی جگہ نہیں۔"[3]

ذکا کو لکھتے ہیں :

"یہ شعر ہموار ہے، نہ صاد کے قابل، نہ اصلاح کا محتاج ہے اور ۵ ی و د شعر، واہ کیا کہنا ہے۔"[4]

اچھے شعروں پر صاد بنانے سے شاگرد کی خاصی ہمت افزائی ہو جاتی ہے میرزا صاحب نے بعض اشعار پر ایک، بعض پر دو اور بعض پر تین صاد بھی کیے ہیں، تاکہ شعروں کے حسن اور اُستاد کی پسندیدگی کے مختلف درجے

۱۔ بیتاب اور شاکر کے متعدد شعر قلمزد اور نظری قرار دیئے ہیں۔
۲۔ خطوط : ۱/ ۱۹۹ (۳) اردوی ۱۵۹؛ (۴) ادبی خطوط ۷۷۔

بخوبی ظاہر ہو سکیں۔ وہ صرف اسی پر اکتفا نہیں کرتے تھے، اچھے شعر یا غزل کی جی کھول کر داد بھی دیتے۔ ایک صاحب کو لکھتے ہیں:

"ہائے کیا غزل لکھی ہے! قبلہ آپ فارسی کیوں نہیں کہا کرتے؟ کیا پاکیزہ زبان ہے، اور کیا طرزِ بیان! کیا میں سخن ناشناس اور ناانصاف ہوں، کہ ایسے کلام کی حک و اصلاح پر جرأت کروں؟"[۱]

سیاح کو تحریر کیا ہے:

"میرا شیوہ خوشامد نہیں اور فن شعر میں اگر اس شیوے کی رعایت کی جاوے، تو شاگرد ناقص رہ جاتا ہے۔ یاد کرو، کبھی کوئی غزل تمہاری اس طرح کی نہیں ہوئی کہ جس میں اصلاح نہ ہوتی ہو خصوصاً روزمرہ اردو میں۔ دونوں غزلیں لفظاً اور معناً بے عیب ہیں۔ کہیں اصلاح کی حاجت نہیں، آفرین، ہزار آفرین!"[۲]

نواب فردوس مکاں اور رہتاب کے مسودوں میں بھی اس قسم کے جملے ملتے ہیں۔

منشاءِ اصلاح کے سلسلے میں میرزا صاحب اس کا لحاظ رکھتے تھے کہ صرف اُنھیں اصلاحوں کے منشا کو ظاہر کیا جائے، جنھیں شاگرد ازخود نہ سمجھ سکے، ورنہ الفاظ یا فقروں کے بدل دینے پر اکتفا کی جائے۔ اسی لیے وہ اس کے متوقع رہتے تھے کہ شاگرد اُن کی اصلاحوں کو غور سے دیکھے گا۔ تفتہ کو لکھا ہے:

"بھائی، ہمارے اوراقِ اصلاحی غور سے دیکھا کرو۔ ہماری محنت تو ضائع نہ جاتے"[۳]

اس کا اُنھوں نے التزام کیا ہے کہ منشاءِ اصلاح کو حاشیوں پر درج کریں۔ مگر بدلے ہوئے لفظ اکثر بین السطور میں اور کبھی کبھی حاشیے پر بھی لکھے ہیں

(۱) اردو ی: ۲۱۳، عود: ۴۰ (۲) اردوی: ۲۹ (۳) خطوط: ۱، ۲۷

اصلاح کے باب میں تکرار سے بھی ناخوش نہ ہوتے تھے، اِلّا یہ کہ شاگرد کی طرف سے ہٹ دھرمی کا اظہار ہو۔ تفتہ کو لکھا ہے۔

"یاد رہے، یہ نکات سوائے تمہارے اور کو میں نہیں بتاتا ہوں۔

میری بات کو غور کر کے سمجھ لیا کرو۔ میں پوچھنے سے اور تکرار سے ناخوش نہیں ہوتا، بلکہ خوش ہوتا ہوں، مگر ہاں، ایسی تکرار، جیسی بیش اور بیشتر کے باب میں کی تھی، ناگوار گزرتی ہے کہ وہ صریح تہمت تھی مجھ پر جو میں آپ لکھوں گا، تم کو اُس کے لکھنے کو کیوں منع کروں گا" ۱

شاگردوں کو اساتذہ کی اُن زمینوں میں طبع آزمائی کرنے سے باز رکھتے تھے، جو حسن کلام کی انتہا کو پہنچ چکی ہیں چنانچہ ۲۵ ستمبر ۱۸۶۶ء کو حکیم احمد حسن مودودی کو لکھتے ہیں:

"غزل کا کاغذ واپس بھیجتا ہوں۔ نہ اُس کو پھاڑ سکوں، نہ پانی میں دھو سکوں، شیدی کی غزل ان قافیوں میں بہ تغیر ردیف ایسی ہے کہ اب ان قافیوں کا باندھنا ہرگز نہ چاہیے۔ آپ اور غزل لکھیے اس کو ہرگز دیوان میں نہ رکھیے" ۲

اس کو بھی مناسب نہ سمجھتے تھے کہ بالالتزام اصلاح لینے والا شاگرد اصلاح سے پہلے کلام کو منظرِ عام پر لے آئے۔ ذکا کو نصیحت کی ہے:

"اگر آپ نے اس روش کا یعنی استصلاح کا التزام کیا ہے، تو جب تک کاغذِ اشعار میرے پاس سے نہ جایا کرے، ما کتب فیہ شہرت نہ پایا کرے" ۳

میرزا صاحب کی اصلاحوں کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ وہ ایک دو لفظ یا فقرے سے زیادہ تغیر و تبدل بہت کم کرتے اور شاگرد کو خود

---

۱ خطوط: ۱، ۲۲ (۲) اردوئے معلّیٰ، طبع لاہور (۳) ادبی خطوط ۱۰۰۶

اپنی طبیعت پر زور دینے کی صلاح دیتے تھے۔ تفتہ کو لکھتے ہیں[1]

"پر جو تم نے التزام کیا ہے ترصیع کی صنعت کا اور دو نخت شعر لکھنے کا

اُس میں ضرور نشستِ معانی بھی ملحوظ رکھا کرو، اور جو کچھ کہو، اُس کو

دوبارہ سہ بارہ دیکھا کرو"[2]

اُسی کا نتیجہ ہے اُن کے شاگردوں کے کلام میں اُستاد کے رنگ کی جھلک کم اور اپنی اُفتادِ طبع اور ذوقِ شعری کا اثر زیادہ ہے۔ تفتہ، شیفتہ، مجروح، بیتاب اور ناظم کے کلام کا مقابلہ کرنے سے یہ حقیقت بخوبی واضح ہو جاتی ہے۔

ناظم کے کلام پر اصلاح

خوش قسمتی سے نواب ناظم کی غزلوں کے چند اصلاحی مسودے دستیاب ہو گئے ہیں۔ بظاہر یہ مسودے ترتیبِ دیوان کے وقت نظرِ ثانی کے ہیں، اور اس بنا پر ان میں کہیں کہیں معمولی تغیر و تبدل نظر آتا ہے، تاہم اُن سے بھی اندازہ ہو سکتا ہے کہ میرزا صاحب نے ناظم کی غزلوں کی اصلاح میں کتنی توجہ صرف کی تھی۔ وہ اصلاحیں یہ ہیں:

(۱) صاحب آفتاب کہاں اور ہم کہاں — عاقل ~~نہیں~~ (احمق نہیں)، ہم اس کو نہ سمجھیں اگر غلط

اُس رُخ کا جلوہ تجھ کو مضر ہے، دلِ فگار — سب چاندنی سے کرتے ہیں [illegible] کی احتیاط

بے دیے لے اڑا کبوتر خط — یوں پہنچتا ہے اوپرا دیر خط

اگر "بن دیے" رکھنا منظور نہیں، تو "بے دیے" رہنے دیجیے۔ لیکن میرے نزدیک "بن دیے" فصیح ہے۔ چنانچہ میرا شعر ہے:

میں بلاتا تو ہوں اُس کو مگر اے جذبۂ دل — اُس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے

اس سے قطعِ نظر، یہ جو مثل خصوصِ زبانِ زدِ جمہور ہے کہ "بن آئے کوئی نہیں مرتا" اس کو کوئی کیا کرے گا۔ غرض کہ میں اپنی طرف سے اس لفظ کی سفارش کرتا ہوں۔ مگر آپ کی اطاعت منظور ہے۔ ایک بار عرض

---

[1] اردوئے معلیٰ: ۳۶، فاروقی دہلی، ۱۳۲۶ھ

کر کے پھر نہ کہوں گا۔ غالب

پڑھ تو لیں گے وہ نامہ میرا ابھی آتے رہتے ہیں اُس کے اکثر خط

یوں تو ہو جاتا ہے ہر ایک عیش و عشرت کا شریک
دوست کہتے ہیں اُسے جو ہو مصیبت کا شریک

جہاں "ہر ایک" اچھی طرح نہ آتے، وہاں "ہر یک" لکھیے "ہر ایک" کیوں لکھیے؟ غالب

مبدءِ فیاض سے دونوں ہیں، ناظمؔ، بہرہ یاب
میں بھی ہوں اُستاد کے حسنِ طبیعت کا شریک

بلکہ شریک غالب

پیری میں بھی ہے ولولۂ شوق نہیں ہم
رکھتے ہیں ابھی ایک دلِ ہنگامہ گزیں ہم

یہاں "ایک" کی جگہ "اک" بے یای تحتانی درست ہے۔ مگر "ہر" کے ساتھ "ہر یک" ہو، نہ "ہر اک"۔ غالب

سیاحِ جہاں گرد ہیں، آ نکلے یہاں بھی
کچھ تیرے پُجاری تو نہیں، اے بتِ چیں ہم

"یہاں" بروزنِ "یاں" فصیح نہیں۔ بے ضرورت نہ چاہیے۔ "یہاں" بہ یای مختلط التلفظ افصح ہے۔ غالب

جو اپنے ہی سے اپنا پردہ کریں تو وہ بندِ قبا کس طرح وا کریں

وفا شعاری ناظمؔ یقیں نہیں، نہ سہی یہ کون شخص ہے، اس کا بھی کچھ خیال نہیں

سبحان اللہ! کیا امیرانہ مضمون ہے۔ غالب

قاصدوں کے کہیں انعام میں بنجائے نہ ملک
جلد جلد اب مرے ناموں کے جواب آتے ہیں

یہ مضمون سوائے آپ کے کون باندھ سکتا ہے؟ غالب

غلطی غیر کی گفتار کی دیکھی، ناظم! وہاں میں جاتا ہوں، تو کہتا ہے نواب آتے ہیں

ہاے، کیا نیا مضمون ہے! غالب (۱)

روتے کی یہ شدت ہے کہ گھبرا گئیں آنکھیں
اشکوں کی یہ کثرت ہے کہ تنگ آگئیں آنکھیں
ہے یہی گریۂ خونیں، تو کسی دن، ناظم
یوں ہی رہ جائیں گی آپس میں جھپک کر پلکیں

"جھپکنا" اور ہے، یہاں "چپکنا" منظور ہے، غالب

وہ سہرا چاہتے ہیں دوزخ بھی یہاں یہ خواہش کہ ہم کو جنت ہو
ہوے ہو ایک بتِ دلفریب پر عاشق ق زبس کہ آپ کو ناکردہ کار سمجھے ہو
صلاح و مشورہ رکھتے ہو مجھ سے اور نہ مجھے فنونِ عشق کا آموزگار سمجھے ہو
شریکِ دولتِ ناز و نیاز رکھتے ہو انیسِ خلوتِ شبہای تار سمجھے ہو
اگرچہ خوش ہوں، پر آتا ہے رحم بھی تم پر کہ مجھ سے غمزدہ کو غمگسار سمجھے ہو

ہاے، کیا قطعہ ہے! غالب

نالے کے مجھے طور بہت یاد ہیں، لیکن طاقت کا گماں بھی ہے تو دلِ غمزدہ پر کچھ
تم آتو جاؤ صومعے میں ایک دن کہ ہیں اپنے کو دورِ مردم دیندار کھینچتے
نگاوٹ غیر سے دیکھو، اُس کی جل کر خاک ہو جاتے
سمجھتے گر نہ ہم دل میں کہ وہ بے مہر کس کا ہے

ہو رات تو جیتے رہیں امیدِ سحر پر یہ روزِ سیہ ہے، شبِ دیجور نہیں ہے
خستہ پیکانِ غم ہر ایک جوان و پیر ہے
اور پھر دیکھو، تو ترکش ہی میں پنہاں تیر ہے
ملا کر مُنھ سے مُنھ بوسہ ذقن کا دیکے کہتے ہیں
پیاسے پاس کیا آنا کنویں کا امرِ مشکل ہے!

---

(۱) بظاہر یہ کتابت کی غلطی تھی۔ عرشی

اگر "پیاسے" کے لفظ میں یائے تحتانی کا اعلان نہ منظور ہو، تو آغازِ مصرع میں کاف لکھ دیجیے۔ غالب[1]

دیکھے دل، مل گئی دلبر کی طبیعت مجھ سے
سیکھنے آتا ہے آئینِ محبت مجھ سے

سبحان اللہ! اس غزل میں معشوق کے عاشق ہونے کا بیان کیا خوب ہے! اگرچہ معشوق کے معشوق کو مخاطب نہیں کیا۔ مگر معشوق کو کس کس لطف سے سمجھایا ہے! غالب

تنگ ہوں جینے سے اب مرنا کہاں!
سچ ہے نوح ~~ہونے سے~~ [ضیق ہو جانے سے بچتی] بچتا مات ہی

مانا ہے مجھ کو قیسِ بیاباں نورد نے
گر پوچھتی [پوجتی][2] ہے لیلیٰ محمل نشیں تجھے

یہاں "پوجنا"، بمعنی پرستش ہے، "پوچھنا"، بمعنی پرسش نہیں۔ غالب

لکھ کے دو بحروں میں، ناظمؔ، یہ غزل
نازشِ حسنِ طبیعت ہے مجھے

دو بحریں ایک تو یہ "فعلاتن فعلاتن فعلن"، دوسری یہ "فاعلاتن فاعلاتن فاعلن" کیا اچھی صنعت ذو بحرین کی۔ اور پھر باوجودِ رعایتِ صنعت، اشعار کیا خوب! غالب

اصلاحِ املا

میرزا صاحب کی اصلاح کا دائرہ انشا اور املا دونوں کی غلطیوں کو محیط تھا۔ قدر بلگرامی کے خط میں صاف صاف لکھ دیا ہے کہ:

"تم نے مثنوی خوب لکھی ہے! کہیں املا میں، کہیں انشا میں جو اغلاط تھے، دور کیے، اور ہر اصلاح کی حقیقت اُس کے تحت میں لکھ دی"[3]

مگر املا کے معاملہ میں اُنھوں نے کچھ مخصوص نظریے قرار دے دیے تھے، بنابریں اس قسم کی اصلاحوں سے "املائے غالب" میں بحث کی جائے گی۔

---

(۱) یعنی مصرع اس طرح بنا لیا جائے: "کہ پیاسے پاس کیا آنا کنویں کا امرِ مشکل ہے"، عرشی

(۲) یہ بھی کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے۔ (۳) خطوط: ۱، ۱۸۸۔

انشائے غالب

مرزا صاحب کے عہد تک ہندوستان کا تعلیم یافتہ طبقہ فارسی زبان میں اظہارِ خیالات پسند کرتا، اور دیسی زبان کا پایہ اپنے مرتبے سے فروتر جانتا تھا۔ عرصہ دراز تک مرزا صاحب بھی اسی روشِ عام کے دلدادہ رہے۔ رفتہ رفتہ فارسی خط و کتابت کی جگہ اردو نے حاصل کرنی شروع کر دی، جو آخر عمر تک پہنچ کر اُن کے اظہارِ خیالات کا واحد ذریعہ ہو گئی۔

اُردو انشا کا آغاز

اُردو مراسلت کی ابتدا کے متعلق خود مرزا صاحب کا کوئی تصریحی بیان موجود نہیں ہے۔(۱) البتہ خواجہ حالی مرحوم فرماتے ہیں:

۱۔ پروفیسر رسا ہمدانی نے ۱۹۶۱ء میں ایک مجموعہ "خطوط بنام" اور "خطوطِ غالب" شائع کیا ہے۔ اس کا پہلا خط ان لفظوں سے شروع ہوتا ہے: "شاہ صاحب کو غالبِ ناتواں کا سلام پہنچے۔ یہ پہلا خط ہے، جو میں بھتیس اردو زبان میں لکھ رہا ہوں۔ زبانِ فارسی میں خطوں کا لکھنا آج سے متروک ہے" خط پر یکم جنوری ۱۸۴۸ء تاریخ مندرج ہے۔ اس سے رسا صاحب نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ تاریخ مذکور سے مرزا صاحب نے فارسی ترک کر کے اردو میں خط کتابت شروع کی جہاں تک رسا صاحب کے دادا کرامت ہمدانی کے نام کے خطوط کا تعلق ہے، مالک رام صاحب نے رسالہ جامعہ (مارچ ۱۹۶۲ء) میں اور قاضی عبدالودود صاحب نے رسالہ معاصر پٹنہ (جنوری ۱۹۶۲ء) میں اندرونی شہادتوں کی بنا پر ثابت کر دیا ہے، کہ یہ خط جعلی ہیں جن کے تار و پود خود غالب کے دوسرے خطوں اور یادگارِ غالب سے مستعار لیے گئے ہیں۔ قاضی صاحب کے جواب میں ایک مضمون رسا ہمدانی صاحب نے رسالہ ندیم (اپریل ۱۹۶۲ء) میں شائع کیا ہے۔ اس کے ساتھ مرزا صاحب کے چار خطوں کے عکس بھی شامل ہیں۔ پہلا خط قاضی عبدالجمیل صاحب جنون بریلوی کے نام، دوسرا نادر شاہ خاں شوخی رامپوری کے نام، اور تیسرا اور چوتھا جناب کرامت ہمدانی کے نام ہیں۔ رسا صاحب کہتے ہیں کہ "ان سب خطوں کی عبارت کی شان، حروف کے لکھنے کا انداز اور کتابت کی ترکیب وہ ہی ہے، جو غالب مرحوم کے اس کے خط کی ہے، جو دیوانِ غالب مطبوعہ نظامی پریس میں شائع ہو چکا ہے۔ اگر جعلی ہیں تو سب جعلی ہیں، اور اصلی ہیں، تو سب اصلی ہیں، بیجا اعتراض کرنے والے جو اعتراض چاہیں کریں۔ مگر خدا کے لیے نئی تحقیقات کی دھن میں عقل و بینائی سے کام لینے سے معذور نہ ہو جایا کریں"

میں نے غالب کے قلم کے لکھے ہوئے سو سے زائد خط اور تقریباً اتنی ہی اصلاحیں دیکھی ہیں

"معلوم ہوتا ہے کہ میرزا سنہ ۱۸۵۰ء تک ہمیشہ فارسی میں خط کتابت کرتے تھے۔ مگر سنۂ مذکور میں جبکہ وہ تاریخ نویسی کی خدمت پر مامور کیے گئے، اور ہمہ تن مہر نیمروز کے لکھنے میں مصروف ہو گئے، اُس وقت بضرورت اُن کو اردو میں خط کتابت کرنی پڑی ہوگی۔ وہ فارسی نثر میں اور اکثر فارسی خطوط، جن میں قوتِ متخیلہ کا عمل اور شاعری کا عنصر نظم سے بھی کسی قدر غالب معلوم ہوتا ہے، نہایت کاوش سے لکھتے تھے۔ پس جب اُن کی ہمت مہر نیمروز کی ترتیب والشا میں مصروف تھی، ضرور ہے کہ اُس وقت اُن کو فارسی زبان میں خط کتابت کرنی اور وہ بھی اپنی طرزِ خاص میں شاق معلوم ہوئی ہوگی اس لیے قیاس چاہتا ہے کہ انھوں نے غالباً سنہ ۵۰ء کے بعد سے اردو میں خط لکھنے شروع کیے ہیں"[1]

(بقیہ حاشیہ ص ۱۵۷) اُن سب کے پیشِ نظر یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ علاوہ جنون بریلوی والے خط کے بقیہ تینوں خطوں کا غالب کے قلم سے کوئی تعلق نہیں۔ چونکہ غالب کی اصلی تحریریں سامنے رکھ کر نقل کی کوشش کی گئی ہے، اس لیے کہیں کہیں معمولی سی مشابہت کا پیدا ہو جانا گریز تھا۔ صورتِ حروف کے علاوہ یہ امر بھی قابلِ لحاظ ہے کہ ان خطوں میں جگہ جگہ جملوں کے اختتام پر ڈلیش استعمال کیا گیا ہے، حالانکہ یہ غالب کی عادت بالکل نہیں تھی۔ یہ امر بھی لائقِ توجہ ہے کہ نادر شاہ خاں شوخی رامپوری کے نام کا خط بلی ماروں کے محلے سے ۲۰ جون سنہ ۱۸۵۱ء کو لکھا گیا ہے۔ اس میں میرزا صاحب نے لکھا ہے کہ اصلاحی غزل دیر میں پہنچے تو شکایت نہ کرنا کہ میں حوادثِ زمانہ اور عوارضِ جسمی سے نیم جان ہوں۔ اولاً تو یہی درست نہیں کہ میرزا صاحب اس تاریخ سے قبل بلی ماروں میں آچکے تھے۔ کیونکہ میرزا صاحب کا شاہ نصیر الدین عرف کالے صاحب کے مکان سے منتقل ہو کر بلی ماروں کے محلے میں آنا ۹ ستمبر سنہ ۱۸۵۰ء کے بعد کا اور ۲ مارچ سنہ ۱۸۵۱ء سے پہلے کا واقعہ ہے۔ ثانیاً خود شوخی نے اپنی شاگردی کا مفصل واقعہ مولانا ابوالکلام آزاد کے روبرو بیان کیا تھا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ میرزا صاحب کے قیامِ رامپور کے موقع پر شاگرد ہوئے ہیں۔ میرزا صاحب صرف دو بار رام پور آئے۔ پہلا سفر جولائی سنہ ۱۸۶۰ء اور دوسرا اکتوبر سنہ ۱۸۶۵ء میں اختیار کیا گیا تھا۔ ایسی حالت میں زیادہ سے زیادہ سنہ ۱۸۶۰ء کو سالِ شاگردی کہا جا سکتا ہے۔ ان وجوہ سے میں ان خطوں کو شہادت میں پیش کرنے کے قابل نہیں سمجھتا۔

(۱) یادگارِ غالب ۱۴۲، ۱۴۱۔

لیکن واقعہ یہ ہے کہ میرزا صاحب اس سے پہلے بھی اُردو زبان میں خط لکھتے رہے تھے۔ چنانچہ اُن کا مکتوب بنام جواہر سنگھ جوہر جس میں ... کی ارسال کرنے کا تقاضہ ہے، یکم دسمبر ۱۸۴۸ء کے کچھ بعد کا، اور دوسرا خط بنام میرزا تفتہ جس میں اُن کے دیوان کی تقریظ کی ترمیم کا ذکر ہے، ۴ اگست ۱۸۴۹ء سے پہلے کا نوشتہ ہے (۱)

اردو پر انحصار

"پنج آہنگ" کے خاتمہ میں فارسی مراسلت بالکل ترک کر کے صرف اُردو میں خط کتابت کرنے کی تاریخ خود میرزا صاحب نے بیان کی ہے۔ فرماتے ہیں:

"یزداں داند" و مدعیانِ دانش را توفیقِ دانستن دہد تا دانند کہ خامۂ غالب سیہ نامہ مسلک دشوار گزار پارسی آئینہ تبازی را بکدام دلاویز رفتار پیمودہ است۔ دریں شصت و ہشت سالہ زندگی کہ جزو در بازی رکل و در سخن طرازی گزشت و بسا گزین روشہا

(۱) تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، غالب: ۴۰۲، ۳، طبع ثانی، و رسالۂ معاصر علی گڑھ: ج (۲) نمبر ۸، ص ۲۳ - ۷۴۔ تفتہ کے نام کے خط کو میں نے ۴ اگست سے پہلے کا اس لیے قرار دیا ہے کہ میرزا صاحب کی تقریظ، پنج آہنگ کی اشاعت میں بالفاظِ موجودہ چھپی ہے۔ اور پنج آہنگ کے اس نسخے کے خاتمہ میں کاتب نے لکھا ہے کہ "بتاریخ سیزدہم رمضان ۱۲۶۵ھ مطابق چہارم اگست ۱۸۴۹ء در مطبع شاہی (سلطانی دہلی) بقلم شکستہ رقم احقر العباد شیخ احمد صورت اتمام یافت" (نسخۂ مملوکہ ہارڈنگ لائبریری دہلی) لہذا تقریظ کے اندر ترمیم اور اس کی اطلاع یہ دونوں امر ۴ اگست سے قبل ہی انجام پا چکے ہوں گے۔ اندازے کے لیے یہ عرض کرنا مفید ہوگا کہ یہ نسخہ چھوٹے ناپ کے ۴۹۲ صفحات پر مشتمل ہے، جن میں سے ۹۴ تا ۹۸ تقریظ نے گھیر لیے ہیں۔ اس صورت میں بعید نہیں کہ کاتب نے آغاز جولائی میں اس حصہ کی کتابت کی ہو، اور ترمیم والا خط جون میں لکھا گیا ہو۔ یہاں یہ اشارہ بھی مناسب ہوگا کہ مذکورہ بالا نسخے میں تقریظِ دیوانِ تفتہ، کے بعد سر سید احمد خاں مرحوم کی آثار الصنادید کی تقریظ چھپی ہے۔ اس کو بعد میں درج کرنے سے یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ بعد میں لکھی بھی گئی تھی۔ آثار الصنادید ۱۲۶۳ھ (۱۸۴۷ء) میں پہلی بار چھپی تھی۔ ظاہر ہے کہ میرزا صاحب نے چھپنے سے پہلے ہی تقریظ لکھ دی ہوگی۔ اگر یہ درست ہے، تو پھر دیوانِ تفتہ کی تاریخ تصنیف بھی کم از کم ۱۲۶۳ھ کے کسی مہینے میں واقع ہونا چاہیے

در نثر نظر فروز آمد، از دو سال در بند آن بودم کہ ..... دیگر در خامہ فرسائی اندازِ خود نمائی فرو ہلم..... پنجاہ سال نئی بی برگ را ہنجارِ اور امہ سرایانِ پارس بہ نوا داشتہ ام اکنون آن روش فرو گزاشتہ ام۔ سپس نانی الضمیر را کہ با یارانِ نزدیک و دور عرضہ باید داد، در زبانِ اردوی و آن ہم سرسری واز تکلف بری رقم خواہم کرد، تا زندگی آسان گردد۔[1]

یہ خاتمہ سنہ ۱۲۸۰ھ (۱۸۶۳ء) میں لکھا گیا تھا، جب کہ میرزا صاحب کی عمر ۶۸ سال کی تھی۔ اُنھوں نے اس ۶۸ سالہ زندگی میں سے ۱۶ سال کھیل کود میں گزار کر ۱۲۲۸ھ (۱۸۱۳ء) سے ادبی زندگی کا آغاز کیا تھا، اور تقریباً ۵۰ سال فارسی نظم و نثر لکھتے رہے تھے، لیکن ۱۲۸۰ھ (۱۸۶۳ء) سے دو سال قبل سنہ ۱۲۷۸ھ (۱۸۶۱ء) میں یہ عزم کیا تھا کہ اب فارسی آمیختہ و نا آمیختہ بتازی کو ترک کرکے سادہ اُردو میں اظہارِ مطالب کریں گے، کیونکہ فارسی کے لیے جس فراغِ خاطر و قوتِ دماغ کی ضرورت تھی، غلبۂ پیری کے سبب سے میرزا صاحب اُس سے محروم ہو چکے تھے۔ اردوی معلی اور عودِ ہندی کے مختلف خطوط سے اس کی تصدیق بھی ہوتی ہے کہ میرزا صاحب نے سنہ ۱۲۷۸ھ (۱۸۶۱ء) سے قبل ہی فارسی نگاری سے احتراز شروع کر دیا تھا۔ پنجشنبہ ۸ ستمبر سنہ ۱۸۵۹ء (صفر سنہ ۱۲۷۶ھ) کو جنون بریلوی کو لکھتے ہیں:

" فارسی کیا لکھوں، یہاں ترکی تمام ہے۔ اخوان و احباب یا مقتول یا مفقود الخبر۔ ہزار آدمی کا ماتم دار ہوں۔ آپ غمزدہ اور آپ غمگسار ہوں اس سے قطع نظر کہ تباہ اور خراب ہوں، مرنا سر پر کھڑا ہے۔

---

(۱) کلیاتِ نثر فارسی، ص ۲۵۴

کے لیے عموماً اور اہلِ دہلی کے لیے خصوصاً، سخت ابتلا و مصائب کا دور تھا، جس نے اعزا و احباب کی بڑی تعداد کو موت کے گھاٹ اتار کر بقیہ اصحاب کو شہر بدر کر دیا تھا، اور میرزا صاحب ہندوستان کے برِاعظم میں اپنے آپ کو یکہ و تنہا محسوس کرنے لگے تھے۔ اس عہدِ افسردگی کو فرحت و انبساط کے ساتھ گزارنے کی یہی ایک ترکیب باقی تھی کہ جو دو چار دوست آشنا رہ گئے تھے، اُن سے خط و کتابت کا سلسلہ جاری رکھا جائے، تاکہ اپنا دُکھ اُنھیں سُنانے اور اُن کا درد خود سُننے سے کچھ غم غلط ہو جایا کرے۔ چنانچہ مجروح، تفتہ، بے خبر اور چند دوسرے احباب سے میرزا صاحب کی کثرتِ مراسلت کا باعث یہ بھی تھا۔ اُن میں سے جس کا خط آتا اُس کو جواب، اور جس کا نہ آتا اُس کو شکوہ و عتاب لکھتے رہتے۔ اُس زمانے میں ایک بار تفتہ نے کوتاہ قلمی سے کام لیا، اور ایک ماہ تک کوئی خط نہ بھیجا، تو میرزا صاحب نے ۱۹ جون ۱۸۵۸ء کو پُر حسرت انداز میں لکھا:

"کیوں صاحب، مجھ سے کیوں خفا ہو! آج مہینہ بھر ہو گیا ہو گا۔ یا بعد دو چار دن کے ہو جائے گا، کہ آپ کا خط نہیں آیا۔ انصاف کرو کہ کتنا کثیرالاحباب آدمی تھا۔ کوئی وقت ایسا نہ تھا کہ میرے پاس دو چار دوست نہ ہوتے ہوں۔ اب یاروں میں ایک شیو جی رام برہمن اور بالمکند اُس کا بیٹا، یہ دو شخص ہیں کہ گاہ گاہ آتے ہیں۔ اس سے گذر کر لکھنؤ اور کالپی اور فرخ آباد کس کس ضلع سے خطوط آتے رہتے تھے۔ اُن دوستوں کا حال ہی نہیں معلوم کہ کہاں ہیں اور کس طرح ہیں۔ وہ آمدِ خطوط کی موقوف، صرف تم تین صاحبوں کے خط کے آنے کی توقع۔ اُس میں یہ دونوں صاحب گاہ گاہ، ہاں، ایک تم کہ ہر مہینہ میں ایک دو بار مہربانی کرتے ہو

سنو، صاحب، اپنے پر لازم کر لو ہر مہینے میں ایک خط مجھ کو لکھنا اگر کام آ پڑا دو تین خط، ورنہ صرف خیر و عافیت لکھی اور ہر مہینے میں ایک بار بھیج دی۔[1]

اُس کے بعد پھر تفتہ سے تاخیر ہوئی، تو میرزا صاحب نے ۱۲ نومبر ۱۸۵۸ء کو مزاحاً تحریر کیا:

"کیوں، صاحب، کیا یہ آئین جاری ہوا ہے کہ سکندر آباد کے رہنے والے دلّی کے خاک نشینوں کو خط نہ لکھیں؟ بھلا اگر یہ حکم ہوا ہوتا، تو یہاں بھی تو اشتہار ہو جاتا کہ زنہار، کوئی خط سکندر آباد کو یہاں کی ڈاک میں نہ جاوے۔"[2]

لیکن تفتہ نے اُس کے بعد بھی تساہل سے کام لیا، تو میرزا صاحب نے ۲۷ دسمبر سنہ ۱۸۵۸ء کو لجاحت سے لکھا:

"کیوں، صاحب، روٹھے ہی رہو گے یا کبھی منو گے بھی؟ اور اگر کسی طرح نہیں منتے، تو روٹھنے کی وجہ تو لکھو۔ میں اس تنہائی میں صرف خطوط کے بھروسے جیتا ہوں۔ یعنی، جس کا خط آیا، میں نے جانا کہ وہ شخص تشریف لایا۔ خدا کا احسان ہے کہ کوئی دن ایسا نہیں ہوتا، جو اطراف و جوانب سے دو چار خط نہیں آرہتے ہوں۔ بلکہ ایسا دن بھی ہوتا ہے کہ دو دو بار ڈاک کا ہرکارہ خط لاتا ہے؛ ایک دو صبح کو، اور ایک دو شام کو۔ میری دل لگی ہو جاتی ہے۔ دن اُن کے پڑھنے اور جواب لکھنے میں گزر جاتا ہے۔ یہ کیا سبب؟ دس دس بارہ بارہ دن سے تمہارا خط نہیں آیا، یعنی تم نہیں آئے۔ خط لکھو۔ صاحب نہ لکھنے کی وجہ لکھو۔ آدھ آنے میں بخل نہ کرو۔ ایسا ہی ہے، تو بیرنگ بھیجو۔"[3]

(۱) اردوئے معلیٰ: ۷۳ (۲) ایضاً: ۷۵ (۳) ایضاً: ۸۱۔

لفافے بنا کر دل بہلاتے

اُس زمانے میں میرزا صاحب غم غلط کرنے کے اس قدر درپے تھے کہ جب خط کتابت کے بعد بھی وقت بچ رہتا، تو آیندہ مراسلت کے لیے لفافے بنانے لگتے۔ منشی نبی بخش کو ۱۰ ستمبر سنہ ۵۸ء کے خط میں لکھتے ہیں:

"اللہ اللہ! یہ دن بھی یاد رہیں گے۔ خط سے خط لکھے گئے ہیں: مجھ کو اکثر اوقات لفافے بنانے میں گزرتے ہیں۔ اگر خط نہ لکھوں گا تو لفافے بناؤں گا!"[1]

منشی شیو نراین نے کچھ لفافے بھیجے اور بذریعۂ تحریر ارسال کی اطلاع دی، تو اُس کے جواب میں میرزا صاحب نے لکھا:

"لفافوں کی خبر پہنچی۔ آپ نے کیوں تکلیف کی؟ لفافے بنانا دل کا بہلانا ہے۔ بیکار آدمی کیا کرے۔ بہرحال جب لفافے پہنچ جائیں گے، ہم آپ کا شکر بجا لائیں گے۔ ہرچہ از دوست میرسد نیکوست"[2]

تیسرا سبب خط نہیں باتیں

تیسرا سبب یہ ہے کہ میرزا صاحب نے تحریر کو تقریر کا پیرایہ دیدیا تھا۔ وہ جب کسی دوست کو خط لکھتے، تخاطب میں وہی انداز اختیار کرتے جو اُس مکتوب الیہ سے ملاقات کے زیبا ہوتا۔ اور چونکہ ہر شخص گفتگو میں سادگی، برجستگی اور ظرافت پسند کرتا ہے — اور یہ سب خوبیاں اُن کی تقریر میں موجود تھیں۔ اس لیے اُن کی تحریر میں بھی وہی ادا جلوہ نظر آتی تھی، جو تقریر کا طرۂ امتیاز تھی۔ دراصل میرزا صاحب اس قسم کی مراسلت کرنے پر مجبور بھی تھے۔ اُنھیں دور اُفتادہ دوستوں کو اپنی پریشانیاں سنانی تھیں۔ اگر یہ پریشانیاں قدیم انداز تحریر کے لباس میں جلوہ گر ہوتیں، تو مکتوب الیہ بہت جلد اکتا جاتے، اور میرزا صاحب کو مراسلت کا زیادہ

(۱) اردوی: ۲۶۲ (۲) ایضاً: ۲۹۶۔

موقع نہ ملتا۔ لہٰذا اُنھوں نے اپنے تمام خطوط کو مکالمہ بنا کر اُس میں طبعی ظرافت کی تخم ریزی کی، جس کے سبب سے احباب و اعزا اُن کے خطوں کے انتظار میں رہا کرتے۔

چونکہ میرزا صاحب نے یہ طریقہ جان بوجھ کر اختیار کیا تھا، اس لیے جب اُنھیں اس کی کامیابی کا یقین آگیا، تو اس کی ایجاد کو فخراً اپنی ذات کی طرف منسوب بھی کرنے لگے تھے۔ مہر کے نام کے ایک خط میں فرماتے ہیں:

"مرزا صاحب، میں نے وہ اندازِ تحریر ایجاد کیا ہے، کہ مراسلے کو مکالمہ بنا دیا ہے۔ ہزار کوس سے بزبانِ قلم باتیں کیا کرو، ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو۔"[۱]

تفتہ کو لکھا ہے:

"بھائی، مجھ میں تم میں نامہ نگاری کاہے کو ہے، مکالمہ ہے۔"[۲]

منشی نبی بخش کو تحریر کیا ہے:

"بھائی، مجھ کو اس مصیبت میں کیا ہنسی آتی ہے، کہ یہ ہم تم اور مرزا تفتہ میں مراسلت گویا مکالمت ہو گئی ہے۔ روز باتیں کرتے ہیں۔ غنیمت ہے کہ محصول آدھ آنہ ہے، ورنہ باتیں کرنے کا مزا معلوم ہوتا۔"[۳]

حکیم غلام نجف خاں کے خط کے آخر میں لکھا ہے:

"اُس وقت جی تم سے باتیں کرنے کو چاہا۔ جو کچھ دل میں تھا وہ تم سے کہا۔"[۴]

شفق کی خدمت میں بھی اسی طرح عرض کیا ہے:

"پیر و مرشد، یہ خط لکھنا نہیں ہے۔ باتیں کرنی ہیں۔"[۵]

اُنھیں کو ایک خط کے آخر میں لکھتے ہیں:

---

(۱) اردوی ۲۵۰ (۲) ایضاً: ۵۸ (۳) ایضاً ۳۷۲ (۴) ایضاً: ۲۶۹ (۵) ایضاً، ۳۱۲۔

پابرکاب ہوں"۱
رفعت بھوپالی کو ۴ ربیع الاول سال "رستاخیز" (۱۲۷۸ھ؍۱۸۶۱ء) کو تحریر کرتے ہیں:

"از دیر باز بہ نظم و نثر نمی گرایم، نظم، خواہی پارسی و خواہی اُردو، خوابی ست فراموش۔ نامہ در پارسی نوشتن نیز آئین نماندہ۔ ہرچہ نوشتہ می شود یک دست و یک دست۔ اینک ۔۔ مولانا عباس ۔۔۔ از بھوپال فرمان فرستاد کہ غالب ۔۔۔ نامہ در پارسی زبان نویسد۔ یارب، فرمان چون بجا آورم، و در نامہ چہ نویسم! باری نہ از توانائی بنان بلکہ از اثر روائی آن فرمان جنبش خامہ لفظی چند کہ بخواندن نیرزد، بر روی ورق ریخت"۲

ان دونوں خطوں میں میرزا صاحب نے ترکِ فارسی کا سبب غلبۂ رنج و غم اور ضعفِ پیری کو قرار دیا ہے۔ یہی سبب شاکر کے نام کے مکتوب میں بھی ذکر کر چکے ہیں۔

خلاصۂ بحث

الغرض میرزا صاحب ایک ایسے دشوار گزار مسلکِ فارسی نگاری کے موجد تھے، جو اطمینانِ خاطر و توانائی دماغ و قلب کا مقتضی تھا۔ سنہ ۱۸۵۰ء (۱۲۶۶ھ) تک یہ دونوں اسباب میسّر رہے۔ اس لئے میرزا صاحب زیادہ تر اسی زبان میں خامہ فرسائی کرتے رہے۔ سنہ مذکورہ میں بادشاہِ ظفر نے تاریخ نگاری کی خدمت سپرد کی اور فراغِ خاطر میں کمی ہو گئی، تو میرزا صاحب نے اردو نثر کو زیادہ نوازنا شروع کیا ۱۲۷۱ھ (۱۸۵۴ء) میں ذوق کا انتقال ہوا، تو اصلاحِ کلام بھی میرزا صاحب کے سپرد کی گئی، اور یہ فرصت سے محروم ہو گئے، جب

۱۔ عود ۱۶۵؛ خطوط: ۱: ۱۱۲ (۲) انشای نورچشم: ۵۱: دکلیات نثر فارسی ۱۲۴ لیکن عبارت میں قدرے تغیر و تبدل ہے۔

کے سبب سے مسلکِ فارسی کی گامزنی کے بجائے اور کم وقت میسر آنے لگا۱ اور اردو کو مزید غلبہ حاصل کرنے کا موقع ملا۔ سنہ ۱۸۵۷ء کے بعد ہجومِ مصائب و آلام نے اطمینانِ خاطر کا قطعی خاتمہ کر دیا۔ نیز انوکا ہ کی زیادتی اور معاشی پریشانی کے سبب رفتہ رفتہ امراض مستولی ہوتے چلے گئے۔ اب اردو نہایت سرعت کے ساتھ اُن کی انشا پر چھانے لگی، تاآنکہ سنہ ۱۲۷۸ھ (۱۸۶۱ء) میں میرزا صاحب کو عزم کرنا پڑا کہ آیندہ فارسی نظم و نثر کچھ نہ لکھیں گے۔ لیکن اس عہد کی عملی تکمیل سنہ ۱۸۶۵ء سے پہلے نہ ہو سکی جس کے بعد کی فارسی تحریریں کالمعدوم ہیں۔

اُردو کی فرمائش

میرزا صاحب اپنے عہد کے ممتاز فارسی ادیب تھے، اور اکثر اربابِ علم و فضل کی طرح اسی کو سرمایۂ نازش و افتخار خیال کرتے تھے جب بعض معاصرین نے اپنی اردو شاعری کے بل بوتے پر اُن کی ہمسری کا دعویٰ کیا، تو انھیں میدانِ سخن کے ان یکہ تازوں سے کہدینا پڑا:۲

فارسی بین تا ببینی نقش ہای رنگ رنگ | بگذر از مجموعۂ اُردو کہ بیرنگِ منست
راست میگویم من و از راست سر نتوان کشید | ہرچہ در گفتار فخرِ تست آں ننگِ منست۳

میرزا صاحب کا یہ خیال نظمِ اُردو ہی تک محدود نہ تھا۔ وہ نثرِ اُردو کو بھی اپنے پایۂ کمال سے فروتر جانتے تھے۔ منشی شیو نرائن کے توسط سے ہنری اسٹوارٹ ریڈ صاحب نے نثرِ اُردو کی فرمائش کی، تو میرزا صاحب نے

۱۔ میرزا صاحب نے سنہ ۱۸۵۰ء سے پہلے قدر بلگرامی کو اپنی مصروفیت کا حال لکھا ہے۔ فرماتے ہیں: "رہا جواب کا لکھنا، کاش، آپ یہاں ہوتے اور میرا حال دیکھتے! ہر روز صبح کو قلعے جانا اور دوپہر کو آنا۔ بعد کھانا کھانے کے حضرت کے مسودوں کا درست کرنا۔ احباب کے خط لکھنے کی فرصت بہت کم ہاتھ آتی ہے۔ (۲) اردوی معلی: لاہور ایڈیشن، ضمیمہ سرخوش، ۱۸۔ اردو خطوط کے جواب کے متعلق معذرت ہے۔ ایسی حالت میں فارسی نگاری کی مہلت ملنے کی امید رکھنا کس طرح ممکن ہو سکتا ہے؛ (۳) کلیاتِ نظمِ فارسی، ۱۳۰۔

۱۱ دسمبر سنہ ۵۸ء کو منشی صاحب کو لکھا:

"مگر بھائی غور کرو، اُردو میں میں اپنے قلم کا زور کیا صرف کروں گا، اور اس عبارت میں معانی نازک کیوں کر بھروں گا؟"[۱]

۱۸ دسمبر کو دوبارہ تحریر کیا:

"جناب سید صاحب حاجی کرتے ہیں۔ میں اُردو میں اپنا کمال کیا ظاہر کرسکتا ہوں؟ اس میں گنجائش عبارت آرائی کی کہاں ہے؟ بہت ہوگا تو یہ ہوگا کہ میرا اردو بہ نسبت اوروں کے اردو کے فصیح ہوگا۔"[۲]

۴ جنوری سنہ ۵۹ء کو سہ بارہ بگڑ کر لکھا:

"میاں، اُردو کیا لکھوں؟ میرا یہ منصب ہے کہ مجھ پر اُردو کی فرمائش ہو؟"[۳]

نظم و نثر میں سہلِ ممتنع

اس کے باوجود میرزا صاحب یہ ضرور جانتے تھے کہ اُن کا کلام نظم ہو یا نثر، حسن و خوبی کے اُس درجہ پر پہنچ چکا ہے۔ جسے علمائے بلاغت "سہلِ ممتنع" کہتے ہیں۔ چنانچہ بیخبر کے ایک خط کے جواب میں لکھتے ہیں:

"پیر و مرشد،... سہلِ ممتنع اُس نظم و نثر کو کہتے ہیں کہ دیکھنے میں آسان نظر آئے اور اُس کا جواب نہ ہو سکے۔ بالجملہ سہلِ ممتنع کمالِ حسنِ کلام ہے، اور بلاغت کی نہایت ہے۔ ممتنع درحقیقت ممتنع النظیر ہے۔ شیخ سعدی کے بیشتر فقرے اس صفت پر مشتمل ہیں اور رشید وطواط وغیرہ شعرائے سلف اس شیوے کی رعایت منظور رکھتے ہیں۔ خودستائی ہوتی ہے۔ سخن فہم اگر غور کرے گا، تو فقیر کی نظم و نثر میں سہلِ ممتنع اکثر پائے گا۔"[۴]

---

(۱) اردوی ۳۶۳ و خطوط: ۳۹۶ (۲) ایضاً: ۳۶۶ (۳) ایضاً: ۳۶۰ (۴) عود: ۱۴۰

اور واقعہ بھی یہی ہے کہ میرزا صاحب کی نثر اُردو شیخ سعدی کی گلستاں کی طرح بظاہر اس قدر سہل معلوم ہوتی ہے کہ انسان سمجھتا ہے میں بھی ایسی نثر لکھ سکتا ہوں، مگر لکھنے بیٹھتا ہے، تو ایک جملہ بھی نہیں لکھ سکتا۔ اور یہی کلام کی خوبی کی آخری حد ہے، جس تک رسائی کے لیے زور دماغ سے زیادہ بخشش معنوی کی ضرورت ہے۔

برتری کا پہلا سبب، استعداد فارسی

میرزا صاحب کی اُردو نثر کی برتری و دلچسپی کے متعدد اسباب ہیں ان میں سب سے اہم یہ ہے کہ اُردو زبان کی نثر اُن کی پختہ عمر کا کارنامہ ہے، جب وہ فردوسی و نظامی سے حزیں و قاآنی تک تقریباً ہزار سالہ فارسی نظم و نثر مطالعہ کر کے اس زبان کی سادگی و پرکاری سے آگاہ ہو چکے تھے۔ انہوں نے کامیاب کوشش کی کہ اس دیسی زبان میں بھی وہی جدت، شیرینی، سادگی اور لطف پیدا کریں، جو سعدی جیسے اساتذہ ایران کی نثر کا طرۂ امتیاز ہے۔ اگر وہ فارسی کے بلند پایۂ ادیب نہ ہوتے یا اپنے کلام اُردو میں فارسی جیسی جدت، شیرینی اور تناسب پیدا کرنے کی کوشش نہ کرتے، تو ناممکن تھا کہ اُن کا کلام زبانِ اُردو میں پائدار حیثیت حاصل کر سکتا۔

دوسرا سبب خلوص سے تفریح

دوسرا سبب یہ ہے کہ اُردو مکاتیب اُن کے تفریحی مشغلوں کا جز بن گئی تھی۔ وہ جو کچھ لکھتے تھے اپنا اور مکتوب الیہ کا دل بہلانے کی خاطر لکھا کرتے تھے۔ قدرت نے بذلہ سنج طبیعت عطا کی تھی، اس لیے خطوط سے خود لطف اٹھانے اور دوسروں کے لئے سامان انبساط مہیا کرنے میں اُنھیں خاطر خواہ کامیابی بھی ہوئی۔ غدر سنہ ۵۷ء کے بعد تمام مشاغل میں سے صرف اسی ایک مشغلے پر اکتفا کرنا پڑا۔ یہ دور اہلِ ہند

"اَب میں حضرت سے باتیں کر چکا۔ خط کو سرنامہ کر کے کہار کو دیتا ہوں"[1]

بیخبر کو لکھا ہے:

"اس افسردگی میں جی چاہا کہ حضرت سے باتیں کروں۔ باآنکہ خط جواب طلب نہ تھا، جواب لکھنے لگا"[2]

میرزا صاحب احباب سے بھی اِسی طرح کی مراسلت کے امیدوار رہتے تھے۔ کوئی شاگرد اُن کے تتبع میں مراسلت کو مکالمے کا رنگ دیتا، تو تعریف کیا کرتے۔ ایک بار تفتہ کا پیرائیہ بیان پسند آیا، تو اظہار خوشنودی کے لیے انھیں لکھا:

"جیتے رہو اور خوش رہو!... زیادہ خوشی کا سبب یہ کہ تم نے تحریر کو تقریر کا پرواز دیدیا تھا"[3]

مراسلت کا محمد شاہی طرز

میرزا صاحب کے وقت تک اُردو فارسی دونوں زبانوں کی خط کتابت کا انداز یہ تھا کہ شروع میں بھاری بھرکم القاب و آداب لکھے جاتے، ازاں بعد متعلقین کی خیریت کی اطلاع اور استفسار ہوتا اور اُس کے بعد استعاروں، تشبیہوں اور کنایوں کے پردے میں دو چار مطالب لکھ کر عربی یا فارسی دعائیہ جملے پر ختم کر دیا جاتا۔ میرزا صاحب ابتدا سے اِس روش کو ناپسند کرتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ مکتوب الیہ کے مناسبِ حال دو چار لفظ کا القاب لکھ کر سیدھے سادے جملوں میں اظہارِ مطالب کر دیا جائے۔ پنج آہنگ کے دیباچے میں اس روش سے بیزاری ظاہر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"بیگانگیِ این روش از شیوۂ غالبِ مستمند نہ چنداں است کہ بگفتن نیاز داشتہ باشد۔ داد اشناش داند کہ ہنجارِ من در نگارش این سٹ

(۱) اردوی : ۲۱۰ (۲) ایضاً ۲۶۹ (۳) ایضاً : ۱۰۴۔

کہ چون کلک و ورق بکف گیرم، مکتوب الیہ را بلقبی کہ فراخورِ حالت اوست، در سرآغازِ صفحہ آواز دہم، و زمزمہ سنج مدعا گردم۔ القاب و آداب و خیریت گوئی و عافیت جوئی حشو زائد است، و پختگان حشو را دخل نہند[1]

میرزا صاحب نے مراسلت کی اُس روش کا نام، جس میں بڑے بڑے القاب و آداب اور حشو و زوائد سے پُر خیریت گوئی و عافیت جوئی کے جملے ہوتے "محمد شاہی روش" رکھا تھا، اور اس سے اس قدر بیزار تھے کہ مجروح کے نام کے خط میں اس کی ہنسی اڑاتے ہوئے فرماتے ہیں:

"ہاں صاحب، تم کیا چاہتے ہو؟ مجتہد العصر کے مسودے کو اصلاح دے کر بھیجدیا۔ اب اور کیا لکھوں؟ تم میرے ہم عمر نہیں، جو سلام لکھوں، میں فقیر نہیں، جو دعا لکھوں۔ تمہارا دماغ چل گیا ہے۔ لفافہ کو کریدا کرو، مسودے کو بار بار دیکھا کرو، پاؤ گے کیا؟ یعنی تم کو وہ محمد شاہی روشیں پسند ہیں: "یہاں خیریت ہے۔ وہاں کی عافیت مطلوب ہے۔ خط تمہارا بہت دن کے بعد پہنچا۔ جی خوش ہوا۔ مسودہ بعد اصلاح کے بھیجا جاتا ہے۔ برخوردار میر سرفراز حسین کو دعا، اور دعا کہنا اور ہاں حکیم میر اشرف علی اور میر افضل علی کو بھی دعا کہنا۔ لازمۂ سعادتمندی یہ ہے۔ کہ ہمیشہ اسی طرح خط بھیجتے رہو" کیوں، سچ کہیو، اگلوں کے خطوط کی تحریر کی یہی طرز تھی؟ ہاتے، کیا اچھا شیوہ ہے! جب تک یوں نہ لکھو، وہ خط ہی نہیں ہے۔ چاہ بے آب ہے، ابر بے باراں ہے، نخلِ بے میوہ ہے، خانہ بے چراغ ہے، چراغ بے نور ہے۔ ہم جانتے ہیں، تم زندہ ہو۔ تم جانتے ہو کہ ہم زندہ ہیں۔ امرِ ضروری کو لکھ لیا۔ زوائد کو اور وقت پر موقوف رکھا

1. کلیاتِ نثرِ غالب: ۵۰۔

اور اگر تمھاری خوشنودی اُسی طرح کی نگارش پر منحصر ہے، تو بھائی! ساڑھے تین سطریں ویسی بھی میں نے لکھ دیں۔ کیا نماز قضا نہیں پڑھتے اور وہ مقبول نہ ہوگی؟“[۱]

شفق کے خط میں القاب و آداب سے آغاز کرنے کی جگہ انتہائی پاکیزہ انداز سے اُس متعارف طرز کی سبکی اور عدم احتیاج کا اظہار کیا ہے فرماتے ہیں:

”کیونکر کہوں کہ میں دیوانہ نہیں ہوں، ہاں، اتنے ہوش باقی ہیں کہ اپنے کو دیوانہ سمجھتا ہوں۔ واہ کیا ہوشمندی ہے، کہ قبلۂ ارباب ہوش کو خط لکھتا ہوں، نہ القاب، نہ آداب، نہ بندگی نہ تسلیم؛ سُن غالب، ہم تجھ سے سبکتے ہیں، بہت مصاحب نہ بن۔ ای ایاز! حدِ خود بشناس۔ مانا کہ تو نے کئی برس کے بعد نوبت کی غزل لکھی ہے اور آپ اپنے کلام پر وجد کر رہا ہے۔ مگر یہ تحریر کی کیا روش ہے؟ پہلے القاب لکھ، پھر بندگی عرض کر، پھر ہاتھ جوڑ کر مزاج کی خبر پوچھ، پھر عنایت نامے کے آنے کا شکر ادا کر۔“[۲]

<u>میرزا صاحب کی روش</u>

میرزا صاحب کے عہد میں جو روش پسند کی جاتی تھی، اُس کے سمجھ لینے کے بعد ضروری ہے۔ کہ خود میرزا صاحب کا اندازِ مراسلت دریافت کیا جاوے۔

پنج آہنگ کے دیباچے میں اُنھوں نے تفصیل سے بتایا ہے کہ کاتب کو کن امور کا لحاظ رکھنا چاہیئے۔ فرماتے ہیں:

”نامہ نگار را آن باید کہ

(۱) نشستن را رنگ گفتن دہد،

(۲) و مطلب را بداں روش گزارد کہ دریافتِ آن دشوار نہ بود،

۱- اردوئے معلیٰ: ۱۸۱ (۲) ایضاً، ۳۰۴۔

و اگر مطلبی چند داشته باشد، در تقدیم و تاخیر رعایت نظمی بکار برد، و ازاں پرہیزد کہ سخن گرہ در گرہ گردد و اجزای مدعا بہم گرفرد خورد
(۳) زنہار استعارہ ہای دقیق، و لغاتِ مشکل نامانوس در عبارت درج نکند،
(۴) و در ہر تور رعایتِ رتبۂ مکتوب الیہ در نظر دارد۔
(۵) تا تواند، سخن را درازی نہ دہد،
(۶) و از تکرارِ الفاظ محترز باشد،
(۷) و بیشتر بمذاقِ اہلِ روزگار حرف زند، و از احاطۂ قواعد و قوانینی کہ قرار دادۂ این مردم است، بدر نرود،
(۸) و اندازۂ خوبیِٔ زبان نگاہ دارد، و این پارسی آمیختہ بتازی را در کشاکشِ تصرفاتِ ہندی زبانانِ پارسی نویس ضایع نگزارد، و لغاتِ عربی جز بقدرِ بایست صرف نہ نماید کہ پیوستہ دراں کوشد کہ سادگی و نغزی شعارِ او گردد۔
(۹) و در اقسامِ مکاتیب، خاصتہ در خطوط و عرائضی کہ بحکام نویسد و مشتمل بر معاملات باشد، از اغلاق و اغراق احتراز واجب داند، و سخن باستعارہ و اشارہ نگزارد، و نرم گوید، و سنجیدہ گوید، و آسان گوید[1]

در اصل ان تمام ہدایتوں کی روح یہ ہے کہ "بنشتن را رنگِ گفتن دہد" اسی کو میرزا صاحب نے ایک خط میں اس طرح تعبیر کیا ہے کہ "میں نے مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا ہے"

جب ہم کسی سے بات چیت کرتے ہیں، تو کوشش کرتے ہیں کہ مخاطب کو سہولت کے ساتھ اپنا مطلب سمجھا دیں۔ چند باتیں کہنا ہوتی ہیں تو جو پہلے کہنے کی ہیں، پہلے اور جو بعد میں کہی جا سکتی ہیں، بعد میں کہتے ہیں

۱۔ کلیاتِ نثرِ غالب ۵۰

پیچیدہ اور گرہ در گرہ باتیں کرنے سے بچتے ہیں۔ مشکل اور نامانوس لفظوں اور ترکیبوں سے گریز کرتے ہیں۔ مخاطب کے رتبے کے لائق لفظ زبان سے نکالتے ہیں حتی الامکان گفتگو کو لمبا نہیں کرتے۔ ایک بات یا ایک لفظ کو بار بار زبان سے نہیں نکالتے۔ وہی باتیں باہم کرتے ہیں، جو زمانے کی روش اور پسندیدگی کے مطابق ہوں۔ اپنے زمانے کے اصول زبان کا لحاظ رکھتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ قواعد و ضوابطِ زبان کی پابندی کے ساتھ دوسرے محاسنِ کلام بھی گفتگو میں برتے جائیں اہل زبان کی طرح بولنے اور دوسری زبان کے الفاظ کو بقدرِ ضرورت استعمال کرنے کی سعی کرتے ہیں، اور سب سے آخر میں اس کا لحاظ رکھتے ہیں کہ بات چیت میں سادگی اور حسن پیدا ہو جائے۔ اشاروں اور کنایوں سے کام نہیں لیتے، اور نرمی و سنجیدگی برتتے ہیں، بالخصوص جب کسی معاملہ پر برابر والے یا حاکم سے عرض کرتا ہو، تو ان آخری باتوں کا اور زیادہ خیال کرتے ہیں۔

میرزا صاحب چاہتے تھے کہ خطوں میں بھی ان اصول کو برتا جائے۔ خود اُنھوں نے اپنی انشا میں ان پر کس حد تک عمل کیا ہے؟ اس کی جانچ کے لئے اُن کے مکاتیب کے اجزا سے جدا جدا بحث کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

القاب و آداب

سب سے پہلے القاب و آداب کو لیجیے۔ میرزا صاحب کے یہاں یہ اجزا اس قدر مختصر، مکتوب الیہ کے رتبے کے مطابق اور متعارف روش سے جدا ہیں کہ انھوں نے ان کے ترک کر دینے کا دعویٰ کر دیا ہے فرماتے ہیں:

"پیر و مرشد، یہ خط لکھنا نہیں ہے، باتیں کرنی ہیں۔ اور یہی سبب

ہے کہ میں القاب و آداب نہیں لکھتا؟[۱]"

دراصل انھوں نے القاب و آداب کا پرانا اور فرسودہ طریقہ ترک کیا تھا۔ یہ نہ تھا کہ مکتوب الیہ کے مرتبہ کا لحاظ کیے بغیر ہر خط کو بغیر القاب و آداب کے شروع کردیتے ہوں۔ انھوں نے بزرگ یا بلند مرتبہ اصحاب کو جس قدر خط لکھے ہیں، اُن سب میں الفاظ اور پرداز کے تنوع کے ساتھ یہ دونوں جز موجود ہیں۔ مثلاً نواب فردوس مکاں اور خلد آشیاں کی خدمت میں جس قدر عرضیاں ارسال کی ہیں، اُن سب میں بجز دو ایک کے "حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت بعد تسلیم معروض ہے:" ہوتا ہے۔ اور بشکل چار پانچ عرضیوں میں لفظِ حضرت ساقط ہوا ہے۔ ہاں، بے تکلف احباب یا شاگردوں کے نام کے مکاتیب میں کبھی تو سرے سے القاب ہوتا ہی نہیں، اور ہوتا ہے، تو "میاں، برخوردار، بھائی صاحب، سید صاحب، مرزا، میری جان کیوں صاحب، منشی صاحب، بندہ پرور،" یا اور کوئی مختصر اور بے تکلف لفظ یا فقرہ۔ کبھی کبھی مزاحاً چھوٹوں کو بھی "قبلہ و کعبہ"، "مولانا" یا "پیرو مرشد" لکھ دیا ہے۔ بعض خطوط ایسے بھی ہیں، جن میں پورا القاب تحریر کیا ہے، مگر اُس میں بھی سادگی و بے تکلفی مفقود نہیں ہوئی ہے۔ مثلاً میر سرفراز حسین کو لکھتے ہیں:

"نورِ چشم، راحتِ جان، میر سرفراز حسین جیتے رہو اور خوش رہو۔"

یا انھیں کو لکھا ہے:

"میری جان کے چین، میر سرفراز حسین"

تفتہ کو تحریر کیا ہے

"میرے مہربان، میری جان، مرزا تفتہ سخندان"

یا "نورِ نظر، لختِ جگر مرزا تفتہ"

۱- اردوی ۱۲۳ء

علائی کو لکھتے ہیں۔

"سعادت و اقبال نشان، مرزا علاؤالدین خاں بہادر کو فقیر غالب کی دعا پہنچے۔"

یہی حال آداب و تسلیمات کا ہے۔ نواب میر غلام بابا خان بہادر کو لکھا ہے:

"سلام مسنون الاسلام و دعای دوام دولت و اقبال کے بعد عرض کیا جاتا ہے۔"

بعض اصحاب کو لکھ دیا ہے: "... فقیر غالب کا سلام" یا "سلام علیکم" یا "بعد دعا کے معلوم ہو" یا صرف "آداب" یا زیادہ مزاحیہ انداز میں "اگر خفا نہ ہوں تو دعا اور اگر آزردہ ہوں تو بندگی" وغیرہ۔

خیریت گوئی و عافیت جوئی

خیریت گوئی سے میرزا صاحب سخت متنفر تھے۔ وہ اس حصے کو حشو شمار کرتے تھے؛ اس لیے کسی ایک میں بھی "یہاں خیریت ہے اور آپ کی خیریت نیک مطلوب" نہیں پایا جاتا۔ ہاں 'مطالب کے ساتھ ساتھ اپنی خیریت کا ذکر اور مکتوب الیہ کی عافیت کا استفسار کر لیتے'، اور اس روش کو "کار پختگاں" شمار کرتے تھے۔

اظہارِ مطالب

میرزا صاحب کا ادای مطالب کا طریقہ بالکل ایسا ہے۔ جیسے دو آدمی بالمشافہ۔ بات چیت یا سوال و جواب کرتے ہیں۔ مثلاً اُن کو یہ لکھنا تھا کہ محمد علی بیگ میرے کوٹھے کے نیچے سے گزرا، میں نے پوچھا کہ لوہارو کی سواریاں روانہ ہوگئیں؟ اُس نے کہا ابھی نہیں ہوئیں۔ میں نے پوچھا کیا آج جائیں گی؟ اُس نے کہا آج ضرور جائیں گی۔ تیاری

(۱) اس عنوان کے ماتحت جو کچھ لکھا گیا ہے، وہ یادگار غالب (ص ۱۰۶-۱۰۹) کا بلفظہٖ خلاصہ ہے۔

ضروری ہے۔ اس مطلب کو آنھوں نے اس طرح ادا کیا ہے:

"محمد علی بیگ ادھر سے نکلا کہ بگی محمد علی بیگ، لوہارو کی سواریاں روانہ ہو گئیں؟ حضرت ابھی نہیں، کیا آج نہ جائیں گی؟ ضرور جائیں گی۔ تیاری ہو رہی ہے"

میر مہدی مجروح کو خط لکھا ہے۔ اُس میں لکھنا یہ ہے کہ میرن صاحب آئے اور اُن سے یہ یہ باتیں ہوئیں۔ مگر وہ اس طرح نہیں لکھتے، بلکہ اُس کو اس طرح شروع کرتے ہیں۔

"اے میرن صاحب، السلام علیکم! حضرت آداب۔ کہو، صاحب، آج اجازت ہے۔ میر مہدی کے خط کا جواب لکھنے کی؟ حضور، میں کیا منع کرتا ہوں؟ مگر میں اپنے ہر خط میں آپ کی طرف سے دعا لکھ دیتا ہوں۔ پھر آپ کیوں تکلیف کریں؟ نہیں، میرن صاحب، اُس کے خط کو آئے ہوئے بہت دن ہوئے ہیں۔ وہ خفا ہوا ہو گا، جواب لکھنا ضرور ہے۔ حضرت، وہ آپ کے فرزند ہیں۔ آپ سے خفا کیوں ہوں گے؟ بھائی آخر کوئی وجہ تو بتلاؤ کہ تم مجھے خط لکھنے سے کیوں باز رکھتے ہو؟ سبحان اللہ! اُئے لو، حضرت آپ تو خط نہیں لکھتے، اور مجھے فرماتے ہیں کہ تو باز رکھتا ہے۔ اچھا تم باز نہیں رکھتے، مگر یہ کہو کہ تم کیوں نہیں چاہتے کہ میں میر مہدی کو خط لکھوں؟ کیا عرض کروں؟ سچ تو یہ ہے کہ جب آپ کا خط جاتا اور وہ پڑھا جاتا، تو میں سُنتا اور حظ اٹھاتا۔ اب جو میں وہاں نہیں ہوں، تو نہیں چاہتا کہ آپ کا خط جائے۔ میں اب پہنچنے کو روانہ ہوتا ہوں۔ میری روانگی کے تین دن بعد آپ شوق سے لکھیے گا۔ میاں بیٹھو۔ ہوش کی خبر لو۔ تمہارے جانے نہ جانے سے مجھے کیا علاقہ؟ میں بوڑھا آدمی تمہاری باتوں میں

آگیا، اور آج تک اُسے خط نہیں لکھا۔ لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّةَ "

اس کے بعد میر مہدی سے مخاطب ہو کر اصل مطلب لکھتے ہیں:-

بعض جگہ مکتوب الیہ کو خطاب کرتے کرتے غائب فرض کر لیتے ہیں، یہاں تک کہ جو لوگ میرزا صاحب کے اندازِ بیان سے واقف نہیں، وہ اُس کو مکتوب الیہ کا غیر سمجھ لیتے ہیں۔ مثلاً میر مہدی کو لکھتے ہیں:

"میر مہدی، جیتے رہو! آفریں صد ہزار آفریں! اردو لکھنے کا کیا اچھا ڈھنگ پیدا کیا ہے، کہ مجھ کو رشک آنے لگا ہے۔ سنو، دلّی کے تمام مال و متاع و زر و گوہر کی لوٹ پنجاب احاطہ میں گئی ہے یہ طرز عبارت خاص میری دولت تھی، سو ایک ظالم پانی پت انصاریوں کے محلے کا رہنے والا لوٹ لے گیا۔ مگر میں نے اس کو بحل کیا۔ اللہ برکت دے "

مغربی طریقے پر جو قصے لکھے جاتے ہیں، اُن میں اکثر اس قسم کے سوال و جواب ہوتے ہیں، جیسے کہ میرزا صاحب کی تحریروں میں ہم اوپر دکھا چکے ہیں مگر وہاں ہر سوال و جواب کے سرے پر سائل اور مجیب کا نام یا ان کے ناموں کی کوئی علامت لکھ دی جاتی ہے، ورنہ یہ نہیں معلوم ہو سکتا کہ سوال کہاں ختم ہوا اور جواب کہاں سے شروع ہوا؟ میرزا صاحب ایسے موقع پر سائل و مجیب کا نام نہیں لیتے، اور نہ اُن کے نام کی علامت لکھتے ہیں۔ مگر سوال یا جواب کے ضمن میں ایک ایسا لفظ لے آتے ہیں، جس سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ سوال کیا ہے، اور جواب کیا۔

میرزا صاحب کی طرزِ تحریر کی جو خصوصیتیں اوپر مذکور ہوئیں یہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ اور لوگ اس کی پیروی نہ کر سکیں۔ مگر وہ چیز جس نے اُن کے مکاتبات کو ناول یا ڈرامے سے زیادہ دلچسپ بنا دیا ہے، وہ شوخیٔ تحریر ہے، جو اکتساب یا مشق و مہارت یا پیروی و تقلید

سے حاصل نہیں ہو سکتی۔۔۔ معلوم ہوتا ہے کہ میرزا صاحب خط لکھتے وقت ہمیشہ اس بات کو نصب العین رکھتے تھے کہ خط میں کوئی ایسی بات لکھی جائے کہ مکتوب الیہ اس کو پڑھ کر محظوظ اور خوش ہو۔ پھر جس رتبے کا مکتوب الیہ ہوتا تھا، اس کی سمجھ اور مذاق کے موافق خط میں شوخیاں کرتے تھے۔ مثلاً اپنے ایک دوست کو خط لکھا ہے۔ اس میں اُن کی لڑکی کو، جو بچپن میں میرزا صاحب کے سامنے آتی تھی، اور اب جوان ہوگئی ہے، بعد دعا کے لکھتے ہیں:

"کیوں بھئی، اب ہم اگر کوئی آئے بھی تو تم کو کیونکر دیکھیں گے؟ کیا تمہارے ملک میں بھتیجیاں چچا سے پردہ کرتی ہیں؟"

یا مثلاً نواب امیر الدین احمد خاں، رئیس لوہارو، کو ان کے بچپن کے زمانے میں اُن کے رقعے کا جواب، جس میں میرزا کو دادا صاحب لکھا تھا، اس طرح لکھتے ہیں:

"اے مردم چشم جہاں بین غالب، پہلے القاب کے معنی سمجھ لو۔ یعنی چشم جہاں بینِ غالب کی پتلی۔ "چشم جہاں بین" تمہارا باپ مرزا علاء الدین احمد خاں بہادر، اور پتلی تم۔ میاں، تمہارے دادا نواب امین الدین خاں بہادر ہیں۔ میں صرف تمہارا دادا ہوں گا۔"

ایک دوست کو دسمبر سنہ ۵۸ء کی اخیر تاریخوں میں خط لکھا ہے، انہوں نے اس کا جواب جنوری سنہ ۵۹ء کی پہلی یا دوسری کو لکھ بھیجا۔ اس کے جواب میں اُن کو اس طرح لکھتے ہیں:

"دیکھو صاحب، یہ باتیں ہم کو پسند نہیں۔ سنہ ۱۸۵۸ء کے خط کا جواب سنہ ۱۸۵۹ء میں بھیجتے ہو۔ اور مزا یہ کہ جب تم سے کہا جائے گا تو یہ کہو گے کہ میں نے دوسرے ہی دن جواب لکھا ہے۔"

الغرض میرزا صاحب کے خطوط و رقعات میں ایسے خطوط بہت کم نکلیں گے، جن میں اس قسم کی ظرافت اور ہنسی کی باتیں مندرج نہوں یہاں تک کہ رنج و افسردگی کا بیان بھی اس قسم کی چھیڑ سے خالی نہیں ہوتا۔ منشی نبی بخش کو لکھتے ہیں:

"بھائی صاحب، میں بھی تمہارا ہمدرد ہو گیا۔ یعنی منگل کے دن ۱۸ ربیع الاول کو شام کے وقت میری وہ پھپھی کہ میں نے بچپن سے آج تک اس کو ماں سمجھا تھا اور وہ بھی مجھ کو بیٹا سمجھتی تھی، مر گئی۔ آپ کو معلوم رہے کہ پرسوں میرے گویا نو آدمی مرے تین پھپھیاں اور تین چچا اور ایک باپ اور ایک دادی اور ایک دادا۔ یعنی اس مرحومہ کے ہونے سے میں جانتا تھا کہ یہ نو آدمی زندہ ہیں، اور اس کے مرنے سے میں نے جانا کہ یہ نو آدمی آج ایک بار مر گئے۔"

میرزا صاحب نے بعض اردو خطوں میں ... مسجع عبارت لکھنے کا التزام کیا ہے۔ عربی اور سنسکرت زبان کے سوا اور زبانوں کی مسجع نثروں میں عموماً یہ رنگ ہوتا ہے کہ دوسرے فقرے میں جو پہلے فقرے کی رعایت سے خواہ مخواہ قافیہ تلاش کرنا پڑتا ہے، تو اس میں تصنع اور آورد کا عیب پیدا ہو جاتا ہے، اور اس لئے پہلے فقرے کے مقابلے میں دوسرا فقرہ بسبب لزوم مالا یلزم کے کم قدر ہو جاتا ہے۔ مگر میرزا صاحب کی مسجع نثر میں یہ بات بہت کم دیکھی جاتی ہے۔ دوسرے فقرے میں تقریباً ویسی ہی بے تکلفی پائی جاتی ہے۔ جیسی پہلے فقرے میں۔ اور یہ بات اُسی شخص سے بن پڑتی ہے، جو باوجود خوش سلیقگی اور لطافت طبیعت کے شاعری میں غایت درجے کا کمال رکھتا ہو، اور وزن و قافیے کی جانچ اور تول میں ایک عمر بسر کر چکا ہو۔ مگر یہ معلوم رہے کہ

مقفّیٰ عبارت میرزا صاحب بیشتر اُن خطوں میں لکھتے تھے، جن سے ہنسی یا ظرافت اور مخاطب کا خوش کرنا مقصود ہوتا تھا۔(۱)

عرائض کی طرزِ ادا

اگرچہ میرزا صاحب کے عرائض کا اندازِ بیان اُن خطوں کے مقابلے میں، جو اردوئے معلّی اور عودِ ہندی میں شائع ہو چکے ہیں، باتکلف ہے، اور یہاں وہ رنگارنگی نہیں پائی جاتی، جو مذکورہ مجموعوں کے خطوط کی جان ہے، تاہم یہ عرائض بھی اُسی نادرہ کار قلم کی پیداوار ہیں، جو ادبِ اردو کے دامنِ کوتاہ کو سدا بہار پھولوں سے بھر چکا ہے اس لیے ان سرکاری درخواستوں میں بھی وہ سادگی، شوخی اور ظرافت موجود ہے، جس کے سبب سے ادائے مطلب میں میرزا صاحب کی انشا دیگر انشا پردازوں کی تحریروں سے گوی سبقت لے گئی ہے۔

لیکن یہ محاسن اُن خطوں میں زیادہ پائے جاتے ہیں، جن میں حسنِ طلب ہے۔ چونکہ سرکارِ رامپور میرزا صاحب کی مالی دستگیری کی واحد کفیل تھی، اس لیے وہ ہر ضرورت کے موقع پر سوال کر بیٹھتے، اور یہ سوچ کر کہ ابھی سابق امداد کو زیادہ زمانہ نہیں ہوا ہے، ہمیشہ ایسے انداز سے سوال کرتے تھے کہ انکار کی گنجائش باقی نہ رہے۔ مثلاً نواب فردوس مکاں نے سید حیدر علی خاں بہادر کی شادی کے موقع پر میرزا صاحب کو تورے اور خلعت کے نام سے ۱۲۵ روپے نقد ارسال کیے ہیں۔ میرزا صاحب اس روپے کو خرچ کرنے کے بعد آیندہ کے لیے سبیل نکالتے ہوئے لکھتے ہیں:

"یہ تحریر نہیں مکالمہ ہے۔ گستاخی معاف کرو لکے اور آپ سے اجازت لے کے بطریق انبساط عرض کرتا ہوں۔ کہ یہ سوا سو روپے، جو تورہ خلعت

(۱) مسجّع عبارات کے سلسلے میں مکاتیب نمبر(؟) ۵، ۹، ۱۰، ۱۱، ۱۶، ۱۷، ۲۱، ۳۰، ۳۶، ۳۹، ۴۲، ۴۷، ۵۱، ۵۳، ۵۵، ۵۹، ۶۲، ۶۸، ۷۱، ۸۲، ۸۵، ۹۰، ۹۵، ۱۰۳ ملاحظہ ہوں۔

کے نام سے مرحمت ہوئے ہیں، میں کال کا مارا اگر یہ سب
روپیہ کھا جاؤں گا، اور اس میں لباس نہ بناؤں گا، تو
میرا خلعت حضور پر باقی رہے گا یا نہیں؟" (۱)

نواب فردوس مکاں کی وفات کے بعد نواب خلد آشیاں کی خدمت میں قصیدۂ تہنیت ارسال کیا ہے۔ یہاں سے صلے میں تاخیر ہوتی ہے میرزا صاحب کو روپے کی ضرورت ہے، اس لئے نامۂ تقاضائی لکھتے ہیں:

"پیر و مرشد، حضرت فردوس مکاں کا دستور تھا کہ جب میں قصیدہ
بھیجتا، اس کی رسید میں خط تحسین و آفرین کا، شرم آتی ہے کہتے
ہوئے، مگر کہے بغیر بنتی نہیں، ما حصہ کی ہنڈوی اس خط میں ملفوف
عطا ہوا کرتی تھی .... یہ رسم بری نہیں ہے۔ اگر جاری
رہے، تو بہتر ہے۔" (۲)

ایک سال دلّی میں بارش کم اور رامپور میں کافی ہوئی ہے۔ اس سلسلے میں تحریر فرماتے ہیں:

"اگرچہ یہاں مینہ اسی قدر برسا ہے کہ جس کے پانی سے زمیندار
حاصل فصل ربیع سے ہاتھ دھولیں، مگر چونکہ بفرمانِ ازلی میرے
رزق کی برات آپ پر ہے، اور آپ کے ملک میں بارش خوب
ہوئی ہے۔ ابر رحمت کے شکریے میں ایک قطعہ ملفوف اس عرضی کے
بھیجتا ہوں۔ بنظر اصلاحِ نظم و اصلاحِ حال ملاحظہ ہو۔" (۳)

نواب خلد آشیاں نے جشنِ تخت نشینی میں شرکت کی دعوت دی ہے، اس کا شکریہ ادا کر کے لکھتے ہیں:

"حضرت کی خدمت میں نہ آؤں گا، تو اور کہاں جاؤں گا۔ وہ

---

(۱) مکاتیب: ۱۲ (۲) ایضاً: ۳۳ (۳) ایضاً: ۴۰

آگ برس رہی ہے کہ طیور کے پر جل رہے ہیں۔ بعد آگ کے پانی برسے گا۔ سفر خصوصاً بوڑھے رنجور آدمی کو دونوں صورت میں متعذر۔ آفتاب میزان میں آیا، اور ہنگامۂ آتش و آب رفع ہوا، اور میں نے احرامِ بیت المعمورِ رامپور باندھا۔"(۱)

ایک مرتبہ نواب خلد آشیاں نے اپنی ایک فارسی نثر اصلاح کو بھیجی ہے۔ میرزا صاحب بعض محاوروں کی تغلیط کرتے ہیں، اہل دربار بہارِ عجم اور فرہنگ جہانگیری وغیرہ کے حوالے سے اس اصلاح کو غلط ٹھہراتے ہیں۔ نواب صاحب یہ حوالے نقل کرکے میرزا صاحب سے اصلاح پر نظرِ ثانی کی درخواست کرتے ہیں۔ اس کے جواب میں میرزا صاحب نے تحریر کیا ہے:

"مجھے اس امرِ خاص میں نفسِ مطمئنہ حاصل ہے۔ مگر دعویٔ اجتہاد نہیں ہے، بحث کا طریقہ یاد نہیں۔ میاں انجو جامع فرہنگ جہانگیری شیخ رشید راقم فرہنگ رشیدی فضلائے عجم میں سے نہیں۔ ہند ان کا مولد، ماخذ ان کا اشعارِ قدما، ہادی ان کا ان کا قیاس، ٹیک چند اور سیالکوٹی مل ان کے پیرو۔ سبحان اللہ! ہندی بھی اور ہندو بھی! نورٌ علیٰ نور!!"(۲)

باغِ بے نظیر کی نمایش کا حال اخبار میں پڑھا ہے، اور چاہتے ہیں کہ نواب صاحب کو اس جشنِ بے نظیر کی مبارک باد دیں۔ اس مضمون کو اس طرح ادا فرماتے ہیں:

"نمایش گاہ سراسر سعیدِ رامپور کا ذکر اخبار میں دیکھتا ہوں اور خونِ جگر کھاتا ہوں کہ ہائے، میں وہاں نہیں! بالاخانے پر رہتا ہوں، اتر نہیں سکتا، مانا کہ آدمیوں نے گود میں لے کر اتارا، اور پالکی میں بٹھا دیا۔ کہار چلے۔ راہ میں نہ مرا اور

(۱) مکاتیب: ۱۸۵؛ (۲) ایضاً: ۷۰

رامپور پہنچ گیا۔ کہاروں لے جاکر بے نظیر میں میری پالکی رکھدی، پالکی قفس، اور میں طائر اسیر، اور وہ بھی بے پر و بال۔ نہ چل سکوں نہ پھر سکوں۔ جو کچھ اوپر لکھ آیا ہوں، یہ سب بطریق فرض محال ہے۔ ورنہ ان امور کے وقوع کی کہاں مجال ہے ''(۱)

نواب سکندر زمانی بیگم کی تعریف کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''چاہتا ہوں کہ کچھ لکھوں، مگر نہیں جانتا کہ کیا لکھوں۔ لازم تھا کہ تعزیت نامہ بزبان فارسی و عبارتِ بلیغ لکھوں۔ آپ کے قدموں کی قسم، دل نے قبول نہ کیا، آرائش گفتار ''نظماً'' اور ''نثراً'' واسطے تہنیت کے ہے، کہ دل کثرتِ انبساط سے گل کی طرح کھل رہا ہے طبیعت راہ دیتی ہے، الفاظ ڈھونڈے جاتے ہیں، معنی پیدا کیے جاتے ہیں۔ اب میں نیم مردہ، دل پژمردہ، خاطر افسردہ جس بات کا تصور ناگوار ہو، اس کے تذکرے سے جی کیوں نہ بے قرار ہو'' (۲)

نواب زین العابدین خاں بہادر سے خواہش کرتے ہیں کہ اپنے نام کا خط سرکار کو دکھا دینا، مگر ساتھ ہی فرماتے ہیں:

''لیکن تم سے یہ تو نہ کہو کہ پڑے؟ کس واسطے کہ تم نے اردو دیوان کے پہنچنے نہ پہنچنے کا حال جناب والی سے دریافت کرکر کب لکھا ہے، جو اس بات کا جواب لکھو گے'' ۲

خاتمہ

میرزا صاحب خط کے آخر میں بالعموم ایک دو دعائیہ لفظ لکھا کرتے تھے۔ اردوی معلی اور عود ہندی میں بعض مقامات پر یہ جز متروک ہو گیا ہے، یا اپنی خیریت یا دنیا کی بے ثباتی سے متعلق کسی جملے سے بدل گیا ہے لیکن عرائض میں کبھی نظر انداز نہیں ہوا۔ ان میں اکثر:

---

(۱) مکاتیب: ۱۶۹ (۲) ایضاً: ۱۶۴ (۳) ایضاً: ۷۵۔

"زیادہ حدِ ادب۔ تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!"

یا "تم سلامت رہو قیامت تک دولت و عز و جاہ روز افزوں"

تحریر کیا کرتے ہیں۔ دو چار خطوں میں پہلے شعر کا مصرعِ اول اور دوسرے کا مصرعِ ثانی ملا کر بھی لکھ دیا ہے۔ چونکہ اس جز میں رنگارنگی میرزا صاحب کے یہاں کبھی نہیں پائی جاتی، اس لئے تمثیل و استشہاد بیکار رہے۔

کاتب کا نام

میرزا صاحب کاتب کی شخصیت کا تعین نئے نئے اسلوب سے کرتے تھے۔ عام انشا پرداز کی طرح آخر میں نام لکھنے کا طریقہ اُن کے ہاں صرف پُرتکلف مراسلت کے ساتھ مخصوص تھا۔ مساویانہ یا بزرگانہ خط کتابت میں کبھی خط کے شروع یا درمیان میں اس طرح نام لکھتے ہیں کہ مکتوب الیہ کو خیال تک نہیں ہو سکتا کہ یہاں نام لکھنے سے مقصود کاتب کا تعارف ہے مثلاً بیجبر کو لکھا ہے:

"قبلہ، کبھی آپ کو یہ بھی خیال آتا ہے، کہ کوئی ہمارا دوست، جو غالب کہلاتا ہے، وہ کیا کھاتا پیتا ہے، اور کیونکر جیتا ہے؟"[1]

یا مثلاً شفق کو تحریر کیا ہے:

"کیونکر کہوں کہ میں دیوانہ نہیں ہوں؛ ہاں اتنا ہوش باقی ہے کہ اپنے کو دیوانہ سمجھتا ہوں، واہ! کیا ہوشمندی ہے کہ قبلۂ ارباب ہوش کو خط لکھتا ہوں، نہ القاب، نہ آداب، نہ بندگی، نہ تسلیم! سن غالب، ہم تجھ سے کہتے ہیں: "بہت مصاحب نہ بن۔"[2]

اور کبھی آخر میں نام لکھتے ہیں، جو بیشتر تو اُن کا تخلص "غالب" ہوتا ہے اور تنہا یا کسی ہم قافیہ فقرے کے ساتھ آتا ہے۔ مثلاً:

۱۔ اردوی: ۲۰۲، ۲۰۳، (۲) ایضاً: ۱۴۳۔

"بندۂ علی ابن ابی طالب، آرزومندِ مرگ غالب، نجات کا طالب غالب، عفوِ جرم کا طالب، غالب داد کا طالب غالب، اس خط کی رسید کا طالب، غالب، ترحم کا مستحق اور تفقد کا طالب غالب وغیرہ"

لیکن بعض خطوں میں اصلی نام "اسد اللہ خاں" یا "اسد اللہ" یا صرف "اسد" یا اسد اللہ خاں غالب" یا اسد اللہ غالب" بھی لکھا ہے۔ اسد اللہ کے ساتھ بھی میرزا صاحب ہم قافیہ فقرہ استعمال کر جاتے ہیں۔ مثلاً:

"عرضداشت بہ خواہ، اسد اللہ"(۱)

متعدد خطوط میں میرزا صاحب نے یہ جز ترک بھی کر دیا ہے۔ ان میں چند ایسے ہیں جن میں کنایۃً نام آگیا ہے، مثلاً علائی کو لکھتے ہیں:

"نام اپنا بدل کر مغلوب رکھ لیا ہے"(۲)

انھیں کو دوسرے خط میں لکھا ہے:

"کاتب کا نام غالب ہے کہ دستخط سے پہچان جاؤ گے"(۳)

ایک اور خط میں تحریر کیا ہے:

"کاتب کا نام غالب ہے کہ تم جانتے ہو گے"(۴)

سرور کو بالکل نئے انداز سے لکھا ہے:

"کاتب وہی ہے جو لفافہ ملفوفہ کا مکتوب الیہ ہے"(۵)

دو چار خط ایسے بھی ہوں گے، جن کے آخر میں دیا بالارادہ یا سہواً نام لکھنے سے رہ گیا ہوگا۔ لیکن اکثر کے متعلق میرا خیال یہ ہے کہ ان کے آخر میں نام کی جگہ "غالب" نام کی مہر ثبت تھی، جو نقل کرنے سے رہ گئی ہے۔

تاریخ کتابت

میرزا صاحب خط کی تاریخ بھی ہمیشہ ایک انداز سے نہیں لکھتے۔

۱۔ مکاتیب: ۳۳ (۲) اردوی ۱۵۰ (۳) ایضاً ۳۴ (۴) ایضاً ۴۲۲ (۵) ایضاً: ۱۳۲

انکی تنوع پسند طبیعت اس خشک جزو مکتوب میں بھی نئے نئے شگوفے کھلاتی ہے۔ وہ کبھی آغاز، کبھی درمیان اور کبھی آخر میں تاریخ ثبت کرتے اور بعض اوقات تاریخ کے ساتھ دن گھڑی اور سال بھی تحریر کرتے تھے۔ انگریزی اور ہجری تاریخوں میں سے اکثر صرف انگریزی یا صرف ہجری اور کبھی کبھی دونوں اُن کے یہاں پائی جاتی ہیں مگر سنہ لکھنے کا التزام کم اور علامت ہجری و عیسوی کا التزام کمتر ہے۔

آغاز کی تاریخ

میرزا صاحب موجودہ یورپی طرز کے مطابق القاب و آداب سے قبل تاریخ بہت کم لکھتے تھے۔ اُن کے خطوں میں القاب کے بعد آغاز مطلب میں تاریخ زیادہ ہوتی ہے۔ مجروح کو لکھتے ہیں:

"میاں آج پکھشنبے کا دن ساتویں فروری کی اور شاید بائیسویں جمادی الثانی کی ہے۔ دوپہر کے وقت شیخ مشرف علی، رہنے والے اشاحامد کے کوچے کے، میرے پاس آئے اور انھوں نے تمہارا خط لکھا ہوا ۱۵ جمادی الثانی کا دیا۔"[۱]

یوسف میرزا کو لکھا ہے:

"آؤ صاحب، میرے پاس بیٹھ جاؤ۔ آج پکھشنبے کا دن ہے، ساتویں تاریخ رمضان کی اور فیسویں اپریل کی۔"[۲]

تفتہ کو تحریر کرتے ہیں:

"آج منگل کے دن پانچویں اپریل کو تین گھڑی دن رہے ڈاک کا ہرکارہ آیا۔"[۳]

علائی کو لکھا ہے:

"چارشنبہ ۱۸ مئی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لقول جواہر با ۔ عیدکے دن صبح کا وقت۔"[۴]

---

(۱) اردوی: ۷ ۵ ا ر ۲) ایضاً: ۳۰ ۳ ۳ ر ۳) ایضاً: ۵ ۳ ر ۴) ایضاً: ۶۹ :

شفق کو لکھتے ہیں:

"خداوند نعمت، آج دوشنبہ ۸ رمضان کی اور ۱۵ فروری کی ہے اس وقت کہ بارہ پر تین بجے ہیں، عطوفت نامہ پہنچا۔"(۱)

بیخبر کو تحریر کیا ہے:

"جناب عالی، آج دوشنبہ ۳ جنوری ۱۸۵۹ء کی ہے۔ پہر دن چڑھا ہوگا کہ ابر گھر رہا ہے، ترشح ہو رہا ہے، پینے کو کچھ میسر نہیں، ناچار روٹی کھائی ہے۔"(۲)

وسط کی تاریخ

کبھی مطالب کے ضمن میں اس طرح تاریخ لکھتے کہ بظاہر پڑھنے والے کو تاریخ کا خیال تک نہ گزرتا، بلکہ تاریخ بھی منجملہ مطالب معلوم ہوتی تھی۔ مثلاً علائی کو لکھا ہے:

"تمہارے پاس جو قاطع برہان ہے، اگر چھاپے کی ہے، تو صحیح ہے، جہاں تردد ہو، غلط نامہ ملحقہ میں دیکھ لو۔ زیادہ اختلاف منظور ہو تو مجھ سے پوچھ لو۔ اور اگر قلمی ہے، تو اور بھی اعتبار سے ساقط ہے۔ اس کو میری تالیف نہ سمجھو۔ بلکہ مجھ کو مول لے لو اور اس کو پھاڑ ڈالو۔ آج یوم الخمیس ۱ جون المبارک بارہ پر تین بجے تمہارا خط آیا۔ اُدھر پڑھا، اِدھر جواب لکھنے بیٹھا۔ یہاں تک لکھ چکا تھا کہ شیخ شہاب الدین سہروردی آئے۔ تمہارا خط اُن کو دیا، وہ پڑھ رہے ہیں، ہم لکھ رہے ہیں، ابر آیا ہوا ہے، ہوا سرد چل رہی ہے۔"(۳)

شاہ عالم مارہروی لکھا ہے:

"یاں تحتانی لکھ چکا تھا کہ ایک چپراسی آیا، اور اس نے خط تمہارے

---

(۱) اردو؛ ۲۹۵ (۲) ایضاً: ۷۵ (۳) ایضاً: ۴۱۲۔

نام کا ٹکٹ لگا ہوا دیا اور کہا کہ ڈپٹی صاحب نے سلام کہا ہے اور یہ خط دیا ہے۔ اب میں یہ خط اپنا مع اُن کے خط کے ڈاک گھر میں بھیجتا ہوں۔ صبح کا وقت پنجشنبہ کا دن ۸ صفر اور ۲۵ اگست کی ہے ڈپٹی صاحب چاندنی چوک حافظ قطب الدین سوداگر کی حویلی میں رہتے ہیں۔"(۱)

مجروح کو لکھتے ہیں:

"تمہاری شکایت بالکل بیجا کا جواب یہ ہے کہ تم نے جو خط مجھ کو پانی پت سے بھیجا تھا اور کرنال کی روانگی کی اطلاع دی تھی، میں نے تجویز کر لیا تھا کہ جب کرنال سے خط آئے گا، تو میں جواب لکھوں گا۔ آج شنبہ ۱۵ اکتوبر صبح کا وقت، ابھی کھانا پکا بھی نہیں، تبرید پی کر بیٹھا تھا کہ تمہارا خط آیا اور پڑھا اور یہ جواب لکھا۔"(۲)

خاتمے کی تاریخ

خاتمے کی تاریخ میں بھی میرزا صاحب موجودہ رسم تحریر کی مخالفت کرتے نظر آتے ہیں۔ اُن کے یہاں آخری تاریخ کا مذکور بھی ضمن مطالب میں ہوتا ہے۔ البتہ عرائض میں دو چار مقامات کے علاوہ ہر جگہ ختم کرنے کے بعد تاریخ ثبت کی ہے۔ مثلاً قہر کو لکھا ہے:

"دوشنبہ کا دن ۸ دسمبر کی صبح کا وقت ہے، انگیٹھی رکھی ہوئی ہے، آگ تاپ رہا ہوں، اور خط لکھ رہا ہوں۔ یہ اشعار یاد آ گئے۔ تم کو لکھ بھیجے۔ والسلام"(۳)

ذکا کو تحریر کیا ہے:

"در جواب خط کا طالب غالب سہ شنبہ از روی جنتری ۲۶ اور از روی رویت ۲۵ رجب سنہ ۱۲۸۳ھ اور ۴ دسمبر سنہ ۱۸۶۶ء بجائی یہ خط

---

(۱) اردوی: ۱۰۷-۱۰۸ (۲) ایضاً: ۸۰ (۳) ایضاً: ۲۶

ازراہِ احتیاط بیرنگ بھیجتا ہوں۔"[۱]

علائی کو لکھتے ہیں:

"۲۶ دسمبر سنہ ۱۸۶۵ء کی بدھ کا دن صبح کے آٹھ بجا چاہتے ہیں۔ کاتب کا نام غالب ہے کہ تم جانتے ہو گے۔"[۲]

انھیں کو لکھتے ہیں:

"..... مرقومۂ شنبہ یکم جون وقتِ صبح چھ بجے ساتھ کے عمل میں۔"[۳]

خاتمے میں اعادۂ تاریخ

کبھی کبھی میرزا صاحب آغاز میں تاریخ لکھ دینے کے بعد خاتمے میں اس کا دوبارہ اجمالی ذکر کرتے ہیں۔ علائی کو لکھا ہے:

"دن، تاریخ، اپنا نام، آغازِ کتابت میں لکھ آیا ہوں۔ اب ارسالِ جواب کی تاکید کے سوا اور کیا لکھوں۔"[۴]

انھیں کو ایک اور خط میں لکھتے ہیں:[۵]

"دن، تاریخ صدر میں لکھ آیا ——— کاتب کا نام غالب ہے کہ دستخط سے پہچان جاؤ۔"

سہ بارہ تحریر کیا ہے:

"تاریخ اوپر لکھ آیا ہوں۔ نام اپنا بدل کر مغلوب رکھ لیا ہے۔"[۶]

وقتِ کتابت کا ماحول

بعض اوقات میرزا صاحب تاریخ کے علاوہ خط لکھتے وقت کی حالت کا نقشہ بھی مکتوب الیہ کی نگاہوں کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کرتے، تاکہ مکتوب الیہ یہ محسوس کرے کہ خود میرزا صاحب کے پاس بیٹھا ہوا اُن کی زبان سے مکتوبہ واقعات سن رہا ہے، مطالب خط سے زیادہ لطف اندوز ہو مثلاً گرمی کا موسم ہے، رامپور کے پہلے سفر سے واپس دلی پہنچے ہیں؛

(۱) اردوی: ۳۴۱، (۲) ایضاً: ۲۴۴، (۳) ایضاً: ۲۰۸، (۴) ایضاً: ۴۴۴، (۵) ایضاً: ۴۳۴، (۶) ایضاً: ۳۶۵

اور مجروح کی فرمایش پر رودادِ سفر لکھی ہے۔ اس کے آخر میں فرماتے ہیں:

"کوٹھری میں بیٹھا ہوں، ٹٹی لگی ہوئی ہے، ہوا آ رہی ہے، پانی کا جھجر دھرا ہوا ہے، حقہ پی رہا ہوں، تم سے باتیں کرنے کو جی چاہا، یہ باتیں کریں۔" (۱)

برسات کے موسم میں بجنر کو تحریر کرتے ہیں:

"پہر دن چڑھا ہوگا کہ ابر گھر رہا ہے، ترشح ہو رہا ہے، ہوا سرد چل رہی ہے، پینے کو کچھ میسر نہیں، ناچار روٹی کھائی ہے۔

افق ہا پر از ابر بہمن مہی		سفالینہ جام من از می تہی

غمزدہ و درد مند بیٹھا تھا کہ ڈاک کا ہرکارہ تمہارا خط لایا۔" (۲)

شفق کو لکھتے ہیں:

"پیر و مرشد، شب رفتہ کو مینہ خوب برسا۔ ہوا میں فرطِ رطوبت سے گزند پیدا ہو گیا۔ اب صبح کا وقت ہے۔ ہوا ٹھنڈی بے گزند چل رہی ہے، ابر تنک محیط ہے، آفتاب نکلا ہے، پر نظر نہیں آتا ہے۔" (۳)

انجمن کو ایک خط میں لکھا ہے:

"پیر و مرشد، ۱۲ بجے تھے، میں ننگا اپنے پلنگ پر لیٹا ہوا حقہ پی رہا تھا کہ آدمی نے آ کر خط دیا۔ میں نے کھولا، پڑھا۔ بھلے کو انگرکھا یا کرتا گلے میں نہ تھا، اگر ہوتا تو میں گریبان پھاڑ ڈالتا حضرت کا کیا جاتا؟ میرا نقصان ہوتا۔" (۴)

میرزا صاحب کا خط

میرزا صاحب کا خط نہایت پختہ شفیعا آمیز نستعلیق تھا۔ وہ ایرانی اداؤں کے دلدادہ تھے، اس لیے خط سے بھی ولایتی شان زیادہ نمایاں ہے

(۱) اردوی: ۲۱۲ (۲) ایضاً: ۲۷۵ (۳) ایضاً: ۳۰۰ (۴) ایضاً: ۳۰۲۔

آخر عمر میں رعشہ پیدا ہو جانے سے دائروں اور کششوں میں پہلی سی خوشنمائی باقی نہیں رہی تھی، تاہم پختگی میں کوئی فرق نہیں آنے پایا۔

سامان کتابت۔ کاغذ

میرزا صاحب کے خطوط میں سامان کتابت کا بھی ذکر آیا ہے اس لیے اس پر اجمالی نظر مناسب ہوگی۔

میرزا صاحب بالعموم باریک ولایتی کاغذ استعمال کرتے تھے، جو نیلگوں یا سفید یا گلابی ہوتا۔ دربار رامپور میں اُن کی جس قدر عرضیاں پیش ہوئی ہیں۔ وہ بجز ایک دو کے تمام اسی قسم کے گراں قیمت کاغذ پر لکھی ہوئی ہیں۔ منشی سیلچند اور خلیفہ احمد علی صاحب کے نام کے خطوط گھٹیا کاغذ پر ہیں، اس سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ میرزا صاحب کاغذ کے انتخاب کے وقت مکتوب الیہ کے رتبے کا لحاظ رکھتے تھے۔

بعض اوقات تنگدستی کی وجہ سے میرزا صاحب کے پاس کاغذ کا ذخیرہ ختم ہو جاتا، تو جواب دینے کے لیے روپے کا انتظار کرنے کے عوض کتاب میں سے سادہ ورق پھاڑ لیتے تھے۔ ۸ نومبر سنہ ۱۸۵۹ء کو مجروح کو خط لکھتے وقت یہی صورت اختیار کرنی پڑی تھی، اسی خط میں فرماتے ہیں:

"بھائی، نہ کاغذ ہے، نہ ٹکٹ ہے۔ اگلے لفافوں میں سے ایک بیرنگ لفافہ پڑا ہے۔ کتاب میں سے یہ کاغذ پھاڑ کر تم کو خط لکھتا ہوں، اور بیرنگ لفافے میں لپیٹ کر بھیجتا ہوں۔ غمگین نہ ہونا کل شام کو کچھ فتوح کہیں سے پہنچ گئی ہے۔ آج کاغذ و ٹکٹ منگاؤں گا۔"(۱)

قلم

میرزا صاحب کے زمانے تک لوہے کے قلم کا رواج عام نہ ہوا تھا،

---

(۱) اردو ی: ۱۵۵۔

اس لیے وہ نیزے کا قلم استعمال کرتے تھے۔ ایک مرتبہ قلم بناتے میں چاقو سے انگوٹھا زخمی ہوگیا، اور اس بنا پر منشی شیو نراین کے خط کے جواب میں تاخیر ہوئی، تو میرزا صاحب نے تحریر کیا:

"صاحب، تم خط کے جواب نہ بھیجنے پر گھبرا رہے ہوگے۔ حال یہ ہے کہ قلم بناتے ہیں میرا ہاتھ انگوٹھے کے پاس سے زخمی ہوگیا اور ورم کر آیا۔ چار دن روٹی بھی مشکل سے کھائی گئی ہے۔ بہرحال اب اچھا ہوں۔"(۱)

یہ سنہ ۱۸۵۸ء کا واقعہ ہے۔ آخر عمر میں رعشے کے سبب سے خود قلم بنانے کے قابل نہ رہے تھے، لڑکوں سے بنوا لیتے تھے۔ ۱۲ مارچ سنہ ۱۸۶۷ء کو نواب علاء الدین خاں علائی کو لکھتے ہیں:

"دوران سر اور رعشہ ضعف بصر، تین بیماریاں نئی پیدا ہوئی ہیں۔ قلم نہیں بنا سکتا، لڑکوں سے بنوا لیتا ہوں۔"(۲)

<u>لفافے</u>

شروع میں میرزا صاحب اپنے ہاتھ سے لفافے بنا کر ادھر ادھر بھیجتے تھے۔ ایک بار منشی شیو نراین نے لفافوں کے اوپر "از مقام در مقام، تاریخ و ماہ" طبع کر کے پارسل بھیجا۔ میرزا صاحب ان باتوں کو ناپسند کرتے تھے۔ انھوں نے یہ ہدیہ دوستوں میں تقسیم کر دیا اور جب منشی صاحب نے ۱۸ دسمبر سنہ ۱۸۵۸ء کو دوبارہ اسی قسم کے لفافے ارسال کیے، تو لکھا:

"برخوردار، اس وقت تمھارا خط مع لفافوں کے لفافے کے آیا۔ دل خوش ہوا۔ بھائی میں اپنے مزاج سے ناچار ہوں۔ یہ لفافے "از مقام و در مقام و تاریخ و ماہ" مجھ کو پسند نہیں۔ آگے جو تم نے

---

(۱) اردوی: ۶۲ (۲۳۲)، مکاتیب: ۶۸۔

سب مجھے بھیجے تھے، وہ بھی میں نے دوستوں کو بانٹ دیے۔ اب یہ
لفافوں کا لفافہ اس مراد سے بھیجتا ہوں کہ ان کے عوض یہ لفافے
جو "در مقام لازم مقام" سے خالی ہیں، جن میں تم اپنے خط بھیجا کرتے ہو،
مجھ کو بھیجو، اور یہ لفافے اس کے عوض مجھ سے لے لو۔ اور اگر
اس طرح کے لفافے نہ ہوں، تو ان کی کچھ ضرورت نہیں"۱

اس کے بعد منشی صاحب نے جو کیا، اس کے متعلق کچھ معلوم نہیں
لیکن منشی نبی بخش کے نام کے مکتوب مورخہ ۲۲ ستمبر سنہ ۱۸۵۸ء سے اتنا
پتا چلتا ہے کہ سنہ ۱۸۵۸ء میں لفافہ سازی کا خاصا مشغلہ رہا تھا۔
فرماتے ہیں:

"اللہ اللہ یہ دن بھی یاد رہیں گے۔ خط سے خط نہیں گئے ہیں، مجھکو
اکثر اوقات لفافے بنانے میں گزرتے ہیں۔ اگر خط نہ لکھوں گا، تو
لفافے بناؤں گا۔"

رامپور بھیجے ہوئے بیشتر لفافے محفوظ ہیں۔ ان میں سے نواب فردوس
مکاں کی خدمت میں بھیجے ہوئے کل، اور نواب خلد آشیاں کے نام
کے ۸ نومبر سنہ ۱۸۶۲ء سے پہلے کے تمام لفافے دستی بنے ہوئے
ہیں۔ [illegible] کو ۲۵ دسمبر سنہ ۱۸۶۲ء سے حاشیوں پر بیل
چھپے ہوئے لفافے بھیجے ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ بانکلف مکتوب
الیہ کی خدمت میں بیل دار حاشیوں کے لفافے لکھنا میرزا صاحب
کے نزدیک نامناسب تھا۔ جب ضعف نے مجبور کر دیا، تو ناچار
چھپے ہوئے لفافے لکھنا شروع کیے تھے۔

میرزا صاحب کے اپنے ہاتھ کے تیار کیے ہوئے لفافوں میں ایک
کا رنگ پیلا اور دوچار کا گلابی ہے۔ باقی ہلکے آسمانی یا سفید رنگ

۱۔ اردوی: ۲۵۶ (ص) [illegible]

کے ہیں۔ یہ لفافے بالعموم اسی کاغذ سے بنائے گئے ہیں، جس پر خط لکھا ہے، اور تمام مستطیل شکل کے ہیں۔ البتہ دستی بنے ہوئے لفافے حسب اقتضائے وقت چھوٹے بڑے ہو گئے ہیں۔ ان میں سب سے بڑا ۱۸ انچ لمبا اور ۳ ½ انچ چوڑا، اور سب سے چھوٹا ۵ انچ لمبا اور ۱ ¾ انچ چوڑا ہے۔ مطبوعہ کا ناپ ۶ ½ × ۳ اور ۵ ½ × ۲ ½ ہے۔

سرنامے

میرزا صاحب کے لفافے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے سرناموں میں وہ سادگی نہیں برتی ہے، جو ان کے خطوط کا طرۂ امتیاز ہے۔ ان کے ابتدائی چند لفافوں پر یہ عبارت مندرج ہے۔

۱

> بہ رامپور مینو سواد، بحضور پرنور جناب مستطاب نواب والا مناقب عالیجناب معلّیٰ القاب فیض و جود احسان حقوق دام ... بہادر دام اقبالہ
> بگزرد از غالب مسکین مقام دہلی مرسلہ چہار شنبہ ۲۸ جنوری ۱۸۵۷ء پوسٹ پیڈ

۲

> ... رامپور مینو سواد بحضور ــــ ۱ ــــ عمان احسان جناب مستطاب ــــ متبلا ...
> از غالب ... روز ... چہار شنبہ ... فروری ...

۳

> بحضور پرنور جناب مستطاب ــــ مبدا احسان حضرت نواب محمد ــــ بعز قبول مقرون باد

۱۔ اس لکیر کا مقصد ہے کہ سابق سرنامے کی تمنی عبارت اس سرنامے میں بھی پائی جاتی ہے۔

> بنظرِ انور جناب نواب صاحب —— محیطِ احسان نواب —— عزّ نصرہ و دام اقبالہٗ بگزرد
> بندہ مخلص غالب

تیرھویں لفافے پر " در رام پور موصول دیجز بمت فیض موہبت نواب صاحب الخ"
اور چودھویں پر " رام پور سرا سر سرور بمحفل فیض منزل نواب صاحب "
لکھا ہے ۔ بعد ازاں عام طور پر سرنامے کی یہ صورت اختیار کرلی ہے:

> رام پور سرا سر سرور — جمعہ ۱۲ جولائی سنہ — اسٹامپ پیڈ
> بحضور نواب صاحب والا مناقب —— مقبول باد
> محمد

نواب خلد آشیاں کے لیے صرف "امیر المسلمین" بڑھا دیا ہے ۔
انھیں کے ایک لفافے پر تاریخ کی جگہ لکھا ہے " سہ شنبہ نو اکتوبر
دن کو بارہ بجے ڈاک میں بھیجا"۔ بعض لفافوں پر ایسی باتیں بھی لکھدی ہیں،
جو آجکل کوئی نہیں لکھتا۔ مثلاً نواب زین العابدین خاں بہادر کے لفافے
پر تحریر فرماتے ہیں:

> در شہر رام پور موصول و بحضور بہت نواب صاحب مشفق و مکرم منظم سلطنت و کرم نواب زین العابدین خاں صاحب عرف
> کن میاں سلمہ اللہ تعالیٰ مقبول باد از غالب بیچہ رنگ بیر جنگ سلہ ۵ مارچ ۱۸۵۰ فرد ی جواب طلب شتاب طلب
> چوں عجلت در ارسال مکتوب می بایست ہم بروز چہار شنبہ آخر روز ۲۲ مارچ فرستادہ شد فقط

میرزا صاحب کے جس قدر لفافے میری نظر سے گزرے ہیں، ان

ملا ہے صرف دو پر پتا وغیرہ اردو میں ہے، اور سب کی زبان فارسی ہے۔ اردو والوں میں سے ایک مولوی محمد حسین خاں، مالک مطبع حسنی رام پور کے نام ہے، جس کا سرنامہ حسب ذیل ہے:

ٹکٹ	رام پور آزاد خاں کا بنگلہ دبدبہ سکندری کا مطبع محمد حسین خاں مالک مطبع پیڈ ضروری ۲۰ فروری ۱۸۶۲ء

دوسرا جنرل بریلوی کو تحریر کیا گیا ہے۔ اس کا عکس خطوط غالب میں صفحہ ۱۱۲ کے مقابل شائع ہو چکا ہے۔ اس کے سرنامے کی عبارت یہ ہے:

بریلی جامع مسجد کے پاس حضرت قاضی عبدالجلیل صاحب کی خدمت میں پہنچے اسے بیرنگ بیرنگ ۱۷ ماہ اکتوبر ۱۸۶۲ء

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ آخر عمر میں میرزا صاحب بے تکلف احباب اور شاگردوں کو اردو ہی میں پتا لکھنے لگے تھے۔

ٹکٹ :

میرزا صاحب بیشتر پوسٹ پیڈ خط بھیجتے، اور اوپر کے بائیں گوشے میں "پیڈ" پوسٹ پیڈ، اسٹامپ پیڈ، پیڈ ضروری، ڈبل پیڈ ضروری، پیڈ ضروری واجب العرض، اسٹامپ پیڈ ضروری، اسٹامپ، اسٹامپ ضروری۔ یا پیڈ واجب العرض ضروری، لکھ دیتے تھے۔

لفافے پر ٹکٹ لگانے کا مقام بھی مخصوص نہ تھا۔ کبھی لفافے کے رخ پر اور کبھی پشت پر، اور رخ پر بھی کبھی دائیں اوپر یا نیچے کے گوشے میں، کبھی وسط میں نیچے کی طرف، اور کبھی بائیں اوپر یا نیچے کے گوشے میں

چسپاں کرتے تھے۔

مرزا صاحب نے ایک ادھ چھوڑ کر باقی ہر ٹکٹ پر اپنا تخلص "اسد" یا "غالب" اور اگر دو ٹکٹ ہوے، تو پہلے پر اسد اور دوسرے پر غالب ضرور لکھا ہے۔ ایک دو پر اسد اللہ بھی ہے۔ غالباً اس سے مقصود یہ تھا کہ دوسرا شخص اس ٹکٹ کو استعمال نہ کر سکے۔ لیکن قدر بلگرامی کو ایک خط میں بھی لکھا ہے کہ

"یہاں بھی ٹکٹ پر تحریر کی ممانعت ہے۔ بہتر یہ ہے کہ طرفین سے خطوط بیرنگ بھیجے جائیں کہ یہ قصہ مٹ جائے"[1]

یہ خط مرتب خطوط غالب کے نزدیک جون ۶۲ء اور فروری ۶۳ء کے درمیان کسی تاریخ کو لکھا گیا تھا۔ اگر مرزا صاحب کا مطلب یہ ہے کہ ٹکٹ پر نام لکھنا ممنوع ہے، تو وہ اپنے اکتوبر سنہ ۱۸۶۸ء تک کے رام پور بھیجے ہوے لفافوں پر دستخطی ٹکٹ چسپاں کرتے رہے ہیں۔

اِن ٹکٹوں پر ڈاک خانے کی جو مہر لگائی گئی ہے، اس پر ۵ نومبر سنہ ۶۵ء تک انگریزی میں "۶۴" اور ۱۳ جولائی سنہ ۶۶ء سے "۲۷" لکھا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک مہر اور ثبت ہے، جس پر انگریزی میں دلی (DELHI) منقوش ہے۔ ۱۱ اپریل سنہ ۶۶ء کے لفافے سے ڈاک خانے والوں نے سرخ روشنائی سے انگریزی میں رامپور بھی لکھنا شروع کر دیا ہے۔ اس لفافے سے دہلی کی مہر کے ساتھ ایک مہر میرٹھ کی بھی شروع ہوئی ہے۔ اس میں اوپر میرٹھ، درمیان میں تاریخ اور نیچے سورٹڈ (SORTED) منقوش ہوتا ہے۔ ۵ جولائی سنہ ۱۸۶۱ء سے مراد آباد کی مہر بھی چسپاں نظر آتی ہے۔

۱۔ خطوط غالب: ۱/ ۱۹۳۔

روشنائی

میرزا صاحب ہمیشہ سیاہ روشنائی استعمال کرتے تھے، جو عموماً روشن اور ریختہ ہوتی۔ آخری ایام کے خطوط میں پھیکی روشنائی بھی نظر آتی ہے، جس کی وجہ خود میرزا صاحب کی قلمدان انشا سے بے توجہی تھی۔ ضرورت کے وقت لڑکوں کے قلم اور انھیں کی روشنائی سے لکھا کرتے ہوں گے اور خود لوح و قلم کی درستی اور اہتمام سے اس لیے بے پروا ہو گئے ہو نگے کہ اب انھیں ان دونوں کی شہادت کی ضرورت باقی نہ تھی، عالمِ ادب اُن کا لوہا مان چکا تھا۔

قواعدِ ڈاک کی پابندی

میرزا صاحب ڈاک کے قاعدوں کے سخت پابند تھے۔ وہ خود بھی خلاف ورزیٔ قانون سے احتراز کرتے، اور احباب کو بھی اسی امر کی ہدایت کرتے رہتے تھے۔ ایک بار تفتہ کو لکھا ہے:-

"خط میں خط ملفوف کرنا جانبِ حکام سے ممنوع ہے۔ اگر یوں نہ ہوتا تو میں اُن کے نام کا خط تمھارے خط میں ملفوف کر کے بھیجتا۔"[1]

منشی غلام بسم اللہ نے اپنی غزل کے ساتھ کسی منصف صاحب کی غزل بھی ارسال کر دی تھی۔ ان کی اس سہل انگاری پر سرزنش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"سنیے۔ حضرت، خط میں خط رکھنا، تداخل بڑا ہے۔ اگر یہاں کی ڈاک میں کبھی خط کھل گیا، تو مجھ سے پچاس روپے لیے جائیں گے یا قید کا حکم ہوگا۔ آیندہ آپ خط جداگانہ بھیجا کیجیے۔ اس باب میں تاکید جانیے۔ کوئی حیلہ جواز کا آپ کی طرف سے مسموع نہ ہوگا۔"

سرور نے پارسل میں کچھ خط رکھ دیے تھے۔ اس کو تحریر کرتے ہیں:

1- مجلہ ۲۵۲۱،۲۵ اردوی ۱۳۷۔

"پارسل میں خط رکھ بھیجنے محل اندیشہ ہے۔ خدا نے بچایا۔ چونکہ اب وہ خط آپ کے کچھ کام کے نہ سمجھا اور از راہِ احتیاط پارسل میں سے نکال لیے"[۱]

ایک بار تفتہ کے نام ایک پارسل حسب قاعدہ ایک آنے کا ٹکٹ چسپاں کر کے ڈاک خانے بھیجا۔ جو شخص پارسل لے کر گیا تھا، اس نے غلطی سے خطوں کے بکس میں پارسل ڈال دیا۔ میرزا صاحب نے واقعے سے مطلع ہو کر تفتہ کو لکھا:

"صاحب، کل پارسل شمار کا ایک آنے کا ٹکٹ لگا کر، اور اس پر یہ لکھ کر کہ یہ پارسل ہے، خط نہیں ہے، ڈاک میں بھیجا۔ ڈاک منشی نے کہا کہ خطوں کے صندوق میں ڈال دو۔ خدمتگار ناخواندہ آدمی، اس حکم کو بجا لایا، اور اس کو خطوں کے صندوق میں ڈال آیا۔ وہ لفظ کہ "یہ خط نہیں ہے، پارسل ہے" دستاویز معقول ہے۔ اگر وہاں کے ڈاکیے تم سے خط کا محصول مانگیں، تو تم اس چلے کے ذریعے سے گفتگو کر لینا۔"[۱]

دراصل میرزا صاحب کی احتیاط کی وجہ یہ تھی کہ وہ ایک بار تفتہ کی غلطی کا خمیازہ بھگت چکے تھے، اور غالباً پارسل کو خطوں کے بکس میں ڈال دینے کی وجہ سے اُن کو پوسٹ پیڈ پارسل کا مزید محصول ادا کرنا پڑا تھا۔ ۲۲ جولائی سنہ ۱۸۵۸ء کو یہ واقعہ خود تفتہ کو لکھا ہے۔

"میرزا تفتہ، کل قریب دوپہر کے ڈاک کا ہرکارہ، وہ جو خط بانٹتا ہے، آیا اور اس نے پارسل موم جامے میں لپٹا ہوا دیا۔ پہلے تو حیران رہا کہ پاکٹ خطوں کی ڈاک میں کیوں آیا! پھر جب اس کی تحریر دیکھی، تو تمہارے ہاتھ کا یہ فقرہ لکھا ہوا دیکھ کر

۱۔ اردوی: ۲۱۳۔ (۲) ایضاً: ۱۰۶

ہوے۔ مگر اس کے آگے کالی مہر اور کچھ انگریزی لکھا ہوا۔ ہرکارے نے کہا کہ ایک روپیہ دس آنے دلوایئے۔ دلوا دیے، اور پارسل لے لیا مگر حیران کہ یہ کیا پیچ پڑا۔ قیاس ایسا چاہتا ہے کہ تمہارا آدمی جو ڈاک گھر گیا، اس کو خطوں کے بکس میں ڈال آیا۔ ڈاک کے کارپردازوں نے غور نہ کی، اور اس کو بیرنگ خطوں کی ڈاک میں بھیج دیا۔"

لطیفہ

ایک بار میرزا صاحب کے نام خط آیا۔ پتہ میں مکتوب الیہ کے نام کے ساتھ جو تعظیمی الفاظ تھے، ان میں ایک لفظ "کیشاں" بھی تھا۔ ڈاکیے نے اسے "کپتان" پڑھا، اور میرزا صاحب کی خدمت میں مبارکباد پیش کی۔ میرزا صاحب نے شفق کو یہ واقعہ لکھا ہے:

فرماتے ہیں:

"ایک لطیفہ نشاط انگیز سنیے۔ ڈاک کا ہرکارہ، جو بلیماروں کے خطوط پہنچاتا ہے، ان دنوں ایک بنیا پڑھا لکھا حرف شناس کوئی فلاں ناتھ ڈھمک داس ہے۔ میں بالاخانے پر رہتا ہوں، حویلی میں آکر اس نے داروغہ کو خط دیا، اور اس نے خط دے کر مجھ سے کہا کہ ڈاک کا ہرکارہ بندگی عرض کرتا ہے، اور کہتا ہے کہ مبارک ہو! آپ کو، جیسا کہ دلی کے بادشاہ سے نوابی کا خطاب ملا تھا، اب کابل سے خطاب کپتانی کا ملا۔ حیران کہ یہ کیا کہتا ہے: سرنامہ کو غور سے دیکھا۔ کہیں قبل از اسم "مخدوم نیاز کیشان" لکھا تھا، اس قرمساق نے اور الفاظ سے قطع نظر کر کے "کیشان" کو کپتان پڑھ لیا۔"

۱۔ اردوئے معلیٰ، ص ۱۰۵، ۲۔ ایضاً، ص ۳۰۰۔

بیرنگ خطوط

بیرنگ خطوط ارسال کرنے کو میرزا صاحب قانونِ محبت و اخلاق کے خلاف جانتے تھے۔ سید احمد حسن مودودی کو ایک بیرنگ خط لکھتے ہوئے فرماتے ہیں:

"میرا شیوہ نہیں ہے خط بیرنگ بھیجنا۔" (۱)

لیکن کبھی بیرنگ خط بھیجتے، تو بیرنگی کی وجہ بھی لکھدیا کرتے تھے۔ اُن کی تحریروں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ

(۱) یا تو اُس وقت بیرنگ خط لکھا کرتے، جب اُن کے پاس ٹکٹ موجود نہ ہوتا، خواہ اس لیے کہ جیب اس کی اجازت نہ دیتی، یا بروقت ڈاک خانے سے ٹکٹ کا حصول دشوار ہوتا۔ مگر اس عذر کے لیے بے تکلف احباب اور شاگرد مخصوص تھے۔ مجروح کو ایک بیرنگ خط میں لکھا ہے:

"بھائی، نہ کاغذ ہے، نہ ٹکٹ ہے۔ اگلے لفافوں میں سے ایک بیرنگ لفافہ پڑا ہے۔ کتاب میں سے یہ کاغذ پھاڑ کر تم کو خط لکھتا ہوں اور بیرنگ لفافے میں لپیٹ کر بھیجتا ہوں۔ خشمگین نہ ہونا۔ کل شام کو کچھ فتوح کہیں سے پہنچ گئی ہے۔ آج کاغذ ٹکٹ منگا لوں گا۔" (۲)

اسی طرح علائی کو لکھتے ہیں:

"بھائی، سچ تو یہ ہے کہ اندنوں میرے پاس ٹکٹ نہیں۔ اگر بیرنگ بھیجوں، تو کہار ماندہ، اٹھ نہیں سکتا۔ ڈاک گھر تک جائے کون؟" (۳)

ثاقب کو زیادہ مضحکانہ انداز میں تحریر کیا ہے:

"آج میرے پاس ٹکٹ ہے، نہ دام، معاف رکھنا۔ والسلام۔" (۴)

(۲) یا اس وقت بیرنگ ارسال کرتے جب خط کے تلف ہو جانے

(۱) اردوی معلیٰ ۳۴۳ (۲) ایضاً: ۵۱۵ (۳) ایضاً: ۵۴۳ (۴) ایضاً: ۲۹۱

کا خطرہ ہوتا۔ چونکہ تلف ہو جانے کا خطرہ اہم مکاتیب کے سلسلے میں زیادہ ناپسندیدہ معلوم ہوتا ہے، اور اہم مکاتیب بے تکلف اور بانکلف دونوں قسم کے مکتوب الیہ کو لکھے جاتے ہیں، بنا بریں اس عذر کے ماتحت میرزا صاحب نے: والیان ریاست اور امرا تک کو بیرنگ خطوط لکھے ہیں(۱) ایک بار شفق نے خط نہ لکھنے کی شکایت کی، تو اس کے جواب میں میرزا صاحب نے لکھا ہے:

"سوچتا ہوں کہ دونوں خط بیرنگ گئے تھے۔ تلف ہونا کسی طرح متصور نہیں"۲

دراصل میرزا صاحب یہ سمجھتے تھے کہ ڈاکیہ بیرنگ خط کوشش کر کے مکتوب الیہ تک جلد پہنچا دیتا ہے، تاکہ اس سے محصول ڈاک وصول کر سکے نہ یہ خیال ۹ مارچ ۱۸۵۹ء کے شفق کے خط میں اس طرح ظاہر کیا ہے:

"بیرنگ پر ضائع ہونے کا گمان کم ہے۔ اس دستور کا بادی اور بانی میں ہوتا ہوں۔ آپ بھی جب کبھی بغرض محال خط بھیجیے، تو بیرنگ بھیجیے"۳

یہی رائے سید احمد حسن مودودی کے خط میں بھی ظاہر کی ہے۔ فرماتے ہیں:

"یہ خط عمداً بیرنگ بھیجتا ہوں۔ کہتے ہیں کہ پیڈ کے تلف ہونے کا احتمال ہے، اور بیرنگ کا نہیں"۴

سیاح کو لکھتے ہیں

"پیڈ خط گاہ گاہ تلف بھی ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اس بات پر یہ خط تم کو

---

(۱) نواب فردوس مکاں کے نام دوسرا خط، جس میں قصیدہ منسلک تھا، بیرنگ بھیجا تھا
(۲، ۳، ۴) اردوی ۲۰۹، ۲۰۳، ۳۰۳، خطوط: ۱۱، ۱۳۱، ۱۳۴، اردوی ۴۹۳

بیرنگ بھیجتا ہوں، تاکہ ضائع نہ ہونے کا احتمال قوی رہے۔"[۱]
سردار کو ضروری خطوط کے بیرنگ ارسال کرنے کی ہدایت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ایک قاعدہ آپ کو بتاتا ہوں، اگر اس کو منظور کیجیے گا، تو خطوط کے نہ پہنچنے کا احتمال اٹھ جائے گا، اور رجسٹری کا دردِ سر جاتا رہے گا۔ آدھ آنہ نہ سہی، ایک آنہ سہی، آپ بھی خط بیرنگ بھیجا کیجیے، اور میں بھی بیرنگ بھیجا کروں۔ اسٹامپ پیڈ خطوط تلف بھی ہوتے ہیں۔ اس قاعدے کا جیسا کہ میں واضح ہوا ہوں، بادی بھی ہوا، اور یہ خط بیرنگ بھیجا ہے۔"[۲]

مولوی عزیزالدین نے، جنون بریلوی کے خط ارسال کرنے کی اطلاع دے کر اس کا جواب نہ لکھنے کی شکایت کی، تو اس کے جواب میں میرزا صاحب نے لکھا ہے:

"خط از روی احتیاط بیرنگ بھیجا ہے۔ پوسٹ پیڈ خط اکثر تلف ہوجاتے ہیں۔ چنانچہ قاضی عبدالجمیل صاحب کا خط، جس کا آپ نے ذکر لکھا ہے، آنکھیں پھوٹ جائیں اگر میں نے دیکھا ہو! آپ ان سے میرا سلام نیاز کہیے، اور خط کے نہ پہنچنے کی ان کو خبر پہنچا دیجیے۔"[۳]

والیِ کھرپتور کا انتقال ہوا اور یہ خبر دلی پہنچی، تو میرزا صاحب کو فکر ہوئی کہ کہیں جانی جی، جو میرزا تفتہ کے مربی تھے، معزول نہ کر دیے گئے۔ اس خبر کے استفسار کے لیے تفتہ کو خط لکھا اور اس میں تمنا کی کہ:

"واسطے خدا کے! نہ مختصر نہ سرسری، بلکہ مفصل اور منقح جو کچھ واقع ہوا ہو، اور جو صورت ہو، مجھ کو لکھو، اور جلد لکھو، کہ مجھ پر خواب و خور

۱: اردوی: ۱۸۱ ۲) عود ہندی: ۲۳ ۳) اردوی: ۲۱۷

حرام ہے۔ کل شام کو میں نے سنا، آج صبح قلعے نہیں گیا، نہ اور یہ خط لکھ کر ازراہ احتیاط بیرنگ روانہ کیا ہے۔ تم بھی اس کا جواب بیرنگ روانہ کرنا۔ آدھ آنہ ایسی بڑی چیز نہیں۔ ڈاک کے لوگ بیرنگ خط کو ضروری سمجھ کر جلد پہنچاتے ہیں، اور پوسٹ پیڈ پڑا رہتا ہے۔ جب اس محلے میں جانا ہوتا ہے، تو اس کو بھی لیجاتے ہیں"۱

دستنبو کی طباعت کے متعلق ضروری ہدایتیں بیرنگ لکھ کر فرماتے ہیں:

"واسطے تاکید کے بیرنگ بھیجا گیا ۲؎"

اسی طرح ذکا کو ایک ضروری خط بیرنگ لکھ کر عذر کرتے ہیں:

"بھائی یہ خط ازراہ احتیاط بیرنگ بھیجتا ہوں ۳؎"

نواب فردوس مکاں کی خدمت میں ایک عریضہ جو اُن کی والدہ ماجدہ کی تعزیت وفات کے متعلق تھا، ارسال کیا ہے، اور اس کا جواب نہ پاکر دوسرا عریضہ بیرنگ ارسال کرتے ہوئے آخر میں ازراہِ معذرت لکھتے ہیں:

"پرسوں ایک قطعہ جناب بیگم صاحبہ و قبلہ کی تاریخ وفات کا بھیجا ہے یقین ہے کہ پہنچے گا۔ ازراہِ احتیاط یہ خط بیرنگ روانہ کرتا ہوں ۴؎"

میرزا صاحب پوسٹ پیڈ خط کے ضائع ہو جانے کے اس درجہ قائل تھے کہ جب کبھی انہیں کوئی خط نہ ملتا، وہ اُسے ڈاک خانے کی سہل انگاری پر محمول کر کے لکھ دیا کرتے کہ ڈاک میں ضائع ہو گیا ہو گا، اور اگر کسی دوست سے جواب خط میں تاخیر ہوتی، یا اُن کے مرسلہ خط کا حوالہ نہ ہوتا، تو باور کر لیتے کہ خط ڈاک میں تلف ہو گیا۔

---

(۱) اردوی: ۱۶۱ (۲) ایضاً: ۵۰ (۳) ایضاً: ۳۲ (۴) مکاتیب: ۱۶۱

میرزا صاحب کا پتا

اگرچہ باعتبار حسب و نسب میرزا صاحب دلّی کے مشاہیر میں شمار کیے جاتے تھے، لیکن اُن کی وسیع اور مسلسل مراسلت نے اس شہرت میں چار چاند لگا دیے تھے۔ اُن کے پاس روزانہ ہندوستان اور بیرون ہند سے اردو، فارسی اور انگریزی خطوط آتے رہتے، جن میں سرکاری اور نجی ہر قسم کی تحریریں ہوتی تھیں۔ چونکہ شہر میں انھیں ہر شخص جانتا تھا، اس لیے اُن کا خیال یہ تھا کہ دلّی کے ڈاک خانے میں پہنچ کر میرے نام کا خط کبھی ضائع نہیں ہوتا۔ اُن کی ڈاک خانے کی معروفیت کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ پورے شہرِ دہلی میں وہ اپنے نام کے اعتبار سے یکہ و تنہا تھے اور ڈاکیا اسد اللہ خاں غالب کا مسمّیٰ ایک ہی ذات کو جانتا تھا۔

میرزا صاحب کو اپنی اس شہرت و ناموری کا اس درجے پاس تھا، کہ کوئی دوست یا شاگرد اُن کے مکان کا پتا دریافت کرتا، یا اُن کے نام کے خط پر لانبا چوڑا پتا لکھ دیتا، تو وہ اس کو اپنی توہین خیال کرتے۔ ایک بار علائی نے مکان کا پتا دریافت کیا۔ میرزا صاحب نے برہم ہو کر لکھا:

"سنو صاحب! حسن پرستوں کا ایک قاعدہ ہے کہ وہ امرد کو دو چار برس گھٹا کر دیکھتے ہیں۔ جانتے ہیں کہ جوان ہے، لیکن بچہ سمجھتے ہیں یہ حال تمہاری قوم کا ہے۔ قسم شرعی کھا کر کہتا ہوں کہ ایک شخص ہے کہ اس کی عزت اور نام آوری جمہور کے نزدیک ثابت اور متحقق ہے اور تم صاحب بھی جانتے ہو۔ مگر جب تک اس سے قطع نظر نہ کرو، اور اس مسخرے کو گمنام و ذلیل نہ سمجھ لو، تم کو چین نہ آئے گا پچاس برس سے دلّی میں رہتا ہوں۔ ہزار ہا خط اطراف و جوانب سے آتے ہیں۔ بہت لوگ ایسے ہیں کہ محلہ نہیں لکھتے۔ بہت لوگ ایسے ہیں کہ محلہ سابق کا نام لکھ دیتے ہیں۔ حکام کے خطوط فارسی و انگریزی

یہاں تک کہ ولایت کے آئے ہوئے، صرف شہر کا نام اور میرا نام یہ سب مراتب تم جانتے ہو، اور اُن خطوں کو تم دیکھ چکے ہو، اور پھر مجھ سے پوچھتے ہو کہ اپنا مسکن بتا۔ اگر میں تمہارے نزدیک امیر نہیں، نہ سہی، اہلِ حرفہ میں سے بھی نہیں ہوں کہ جب تک محلہ اور تھانہ نہ لکھا جائے، ہرکارہ میرا پتا نہ پائے۔ آپ صرف دلّی لکھ کر میرا نام لکھ دیا کیجیے۔ خط کے پہنچنے کا میں ضامن ہے۔"[1]

جنوّن بریلوی نے پتا معلوم نہ ہونے کی وجہ سے خط لکھنے میں تردد کا اظہار کیا۔ اُن کو لکھتے ہیں:

"قبلہ، آپ کو خط کے بھیجنے میں تردد کیوں ہوتا ہے؟ ہر روز دو چار خط اطراف و جوانب سے آتے ہیں، گاہ گاہ انگریزی بھی، اور ڈاک کے ہرکارے بھی میرا گھر جانتے ہیں۔ پوسٹ ماسٹر بھی آشنا ہے۔ مجھ کو جو دوست خط بھیجتا ہے، وہ صرف شہر کا نام اور میرا نام لکھتا ہے، محلہ بھی ضرور نہیں۔ آپ ہی انصاف کریں کہ آپ لال کنواں لکھتے رہے، اور مجھ کو بلی ماروں میں خط پہنچتا رہا۔ خلاصہ یہ کہ خط آپ کا کوئی تلف نہیں ہوا ہے۔"[2]

ذکا نے یکے بعد دیگرے دو نیاز نامے بھیجے، مگر مرزا صاحب کی طرف سے جواب نہ ملا۔ انھوں نے اُس کو دلّی کے ڈاک خانے کی غفلت پر محمول کر کے آخری خط بذریعہ رجسٹری ارسال کیا، اور اس میں جواب نہ دینے کی شکایت لکھی۔ اس کے جواب میں مرزا صاحب الفاظ و مطالب کے گل کھلاتے ہیں:

"میرے مشفق، میرے شفیق، مجھ سے ہیچ و پوچ کے ماننے والے، مجھ سے برے کو اچھا جاننے والے، میرے محب، میرے

---

(۱) اردوی: ۱۸، ۲۰۴؛ (۲) ایضاً: ۲۰۷۔

محبوب! تم کو میری خبر بھی ہے؟ آگے ناتوان تھا، اب نیم جان ہوں۔
آگے بہرا تھا، اب اندھا ہوا چاہتا ہوں۔ رامپور کے سفر کا رہ آورد
ہے، رعشہ و ضعفِ بصر۔ جہاں چار سطریں لکھیں، انگلیاں ٹیڑھی
ہو گئیں۔ حرف سوجھنے سے رہ گئے۔ اکہتر برس جیا، بہت جیا۔
اب زندگی برسوں کی نہیں، مہینوں کی اور دنوں کی ہے۔ پہلا خط
تمھارا پہنچا...... دوسرا خط مع غزل آیا...... غزل بعد مشاہدہ
تم کو بھیج دی گئی۔ اور لکھا گیا، نویدِ حصولِ صحت جلد بھیجو۔ کل ایک خط اخباری
وار آیا۔ گویا ستارۂ دنبالہ دار آیا۔ حیران کہ ماجرا کیا ہے! بارے
کھولا اور دیکھا۔ خط نویدِ رفعِ مرض و حصولِ صحت سے خالی اور
شکوہائے بیجا سے لبریز۔

صاحب! میرے نام کا خط جہاں سے روانہ ہو وہیں رہ جائے تو
رہ جائے، ورنہ دلّی کے ڈاک خانے میں پہنچ کر کیا مجال ہے کہ مجھ
تک نہ پہنچے! اسی طرح میرا خط یہاں کے ڈاک خانے سے روانہ
ہو، کیا معنی! جہاں پہنچے، وہاں کے ڈاک کے کارپردازوں
کو اختیار ہے، مکتوب الیہ کو دیں یا نہ دیں[1]

تفتہ کو ایک خط میں صاف طور پر لکھ دیا ہے کہ نامور آدمی کے واسطے
محلے کا پتا ضرور نہیں۔ فرماتے ہیں:

یہ بات یہ ہے کہ نامور آدمی کے واسطے محلے کا پتہ ضرور نہیں۔ میں
غریب آدمی ہوں، مگر فارسی انگریزی جو خط میرے نام کے آتے
ہیں، تلف نہیں ہوتے۔ بعض فارسی خط پر پتا محلے کا نہیں ہوتا، اور
انگریزی خط پر تو مطلق پتا ہوتا ہی نہیں، شہر کا نام ہوتا ہے یقین جا
خط انگریزی ولایت سے مجھ کو آئے۔ جانے اُن کی بلا کہ

(۱) اردوئے معلیٰ، ۳

بلی ماروں کا محلہ کیا چیز ہے "(۱)

قہر کو تحریر کیا ہے:

"اور یہ بھی آپ کو معلوم رہے، کہ میرے خط کے سرنامے پر محلے کا نام لکھنا ضرور نہیں۔ شہر کا نام اور میرا نام، قصہ تمام "(۲)

ایک بار میرزا صاحب نے مکان تبدیل کیا۔ تفتہ کو تر دو ہوا کہ یہ مکان کس محلے میں واقع ہے۔ اُن کے اس تر دو کے رفع کرنے کے لیے ارشاد ہوا ہے:

"یہ مکان بہ نسبت اُس مکان کے بہشت ہے، اور یہ خوبی کہ محلہ وہی بلیماروں کا۔ اگرچہ یوں کہ نہیں اگر اور محلے میں بھی جا رہتا، تو قاصدان ڈاک وہیں پہنچتے۔ یعنی اب اکثر خطوط لال کنوئے کے پتے سے آتے ہیں، اور بے تکلف یہیں پہنچتے ہیں۔ بہر حال تم وہی "دلی بلیماروں کا محلہ" لکھ کر خط بھیجا کرو۔ "(۳)

تفتہ ہی کو دوبارہ لکھا تھا:

"میرے نام کا کوئی لفافہ ضائع نہیں جاتا۔ خدا جانے، اس پر کیا بجوگ پڑا "(۴)

سید احمد حسن مودودی کی شکایت پر تحریر کیا ہے:

"میرے نام کا لفافہ جس شہر سے چلے اسی شہر کے ڈاک گھر میں رہ جائے تو رہ جائے، ورنہ دلی کے ڈاک میں پہنچکر کیا امکان ہے کہ تلف ہو! "(۵)

ایک بار میرزا صاحب نے میر مہدی مجروح کے نام خط لکھا۔ ڈاکیے نے غلطی سے کسی دوسرے میر مہدی کو جا دیا۔ اُنھوں نے میرزا صاحب کو اس کی اطلاع دی۔ اس اطلاع پر ارشاد ہوتا ہے:

۱) اردوئے معلی ۳۸۷، ۲) ایضاً: ۱۲۵۱، ۳) ایضاً ۵۷۵، ۴) ایضاً ۵۲۸، ۵) ایضاً ۴۴۵۔

"وہ جو تم نے لکھا تھا کہ تیرا خط میرے نام کا میرے ہمنام کے ہاتھ جا پڑا، صاحب قصور تمہارا ہے۔ کیوں ایسے شہر میں رہتے ہو، جہاں دوسرا میر مہدی بھی ہے؛ مجھ کو دیکھو کہ میں کب سے دلی میں رہتا ہوں نہ کوئی اپنا ہمنام ہونے دیا، نہ کوئی اپنا ہم عرف بننے دیا، نہ اپنا ہم تخلص بہم پہنچایا۔"[1]

ابتدائی مراسلت میں نواب فردوس مکاں کے فرامین جامع مسجد کے پتے سے جاتے، حالانکہ میرزا صاحب سات آٹھ برس سے بلیماروں میں چلے آرہے تھے۔ اس کے باوجود یہ فرامین میرزا صاحب کو ملتے رہے جب خود انھوں نے سرکار کو لکھا کہ:

"در دیرزمان خاص بہ عنوان نامہ ہای فیض نشان کلبۂ این درویش دلریش عقب مسجد جامع نبشتہ اند و من از ہفت ہشت سال در محلۂ بلیماران می مانم۔ سپس نشان این محلہ نگاشتہ شود۔"[2]

اور اس پر سرکار نے اہل دفتر کو ہدایت فرمائی، تو یہاں سے خط بلیماروں کے [illegible] جانا شروع ہوئے۔

۱: اردوی معلیٰ: ۹۸ (۲) مکاتیب ۱۰۶۔

متعلقاتِ انشا

اس بحث کے آخر میں بعض ایسے حالات کا تذکرہ بھی ضروری ہے، جو بظاہر میرزا صاحب کے عادات و خصائل کی ایک کڑی معلوم ہوتے ہیں، لیکن اُن کی انشا کی کیفیت و کمیت کے اندازے کے لیے اَن کا مطالعہ افادے سے خالی نہیں، اور اس لیے اُنھیں متعلقاتِ انشا کے عنوان سے ذکر کیا جاسکتا ہے۔

جواب میں جلدی

خطوط کا جواب دینے میں میرزا صاحب بہت باضابطہ تھے۔ وہ یوں تو ہر خط کا جواب فوراً لکھتے، اور غیر اختیاری عذر کے علاوہ کسی اور عذر کے پیش کرنے کا کبھی موقع نہ آنے دیتے، لیکن ضروری اور جواب طلب خط کے جواب میں بےحد جلد بازی سے کام لیتے تھے۔ بسا اوقات ایسا ہوتا کہ یہ جانتے ہوئے کہ اب ڈاک کا وقت گزر چکا ہے، جواب لکھ لیتے اور مکتوب الیہ کو بتا دیتے کہ اس مجبوری کے سبب آج خط سپرد ڈاک نہ ہوسکا۔ مثلاً تجبر کو تحریر کیا ہے:

"جنابِ عالی، آج دوشنبہ ۳ جنوری سنہ ۱۸۵۹ء کی ہے۔ پہر دن چڑھا ہوگا . . . . . . غمزدہ و دردمند بیٹھا تھا کہ ڈاک کا ہرکارہ تمہارا خط لایا . . . . باآنکہ خط جواب طلب نہ تھا، جواب لکھنے لگا"(۱)

شفق کو لکھا ہے:

"خداوند نعمت، آج دوشنبہ ۲ رمضان کی اور ۱۵ فروری کی ہے

۱۔ اردو ی: ۴۷۵۔

اس وقت کہ بارہ پر تین بجے ہیں، عطوفت نامہ پہنچا۔ اُدھر پڑھا،
اِدھر جواب لکھا۔ ڈاک کا وقت نہ رہا۔ خط کو معنون کر رکھتا ہوں۔
کل شنبہ ۱۷ فروری کو ڈاک میں بھجوا دوں گا۔"(۱)

علائی کو لکھتے ہیں:

"آج یوم الخمیس ۱۹ جون المبارک بارہ پر تین بجے تمہارا خط آیا۔ اُدھر پڑھا، اِدھر جواب لکھنے بیٹھا۔"(۲)

ایک بار مجروح کا خط صبح کی ڈاک سے موصول ہوا۔ میرزا صاحب نے اس کا فوراً جواب لکھا اور اس میں تحریر کیا:

"آج شنبہ ۱۵ اکتوبر صبح کا وقت، ابھی کھانا پکا بھی نہیں، تبرید پی کر بیٹھا تھا کہ تمہارا خط آیا اور پڑھا اور یہ جواب لکھا۔"(۳)

منشی بنبیس کو لکھتے ہیں:

"اس وقت تمہارا ایک خط اور یوسف مرزا کا ایک خط آیا۔ مجھ کو باتیں کرنے کا مزا ملا، تو دونوں کا جواب ابھی لکھ کر روانہ کیا۔ اب میں روٹی کھانے جاتا ہوں۔"(۴)

تفتہ کو تحریر کیا ہے:

"آج سنیچر کو دوپہر کے وقت ڈاک کا ہرکارہ آیا، اندر تمہارا خط لایا۔ میں نے پڑھا، اور جواب لکھا، اور کلیان کو دیا وہ ڈاک کو لے گیا۔ خدا چاہے تو کل پہنچ جائے۔"(۵)

معلوم ہوتا ہے کہ دسمبر سنہ ۱۸۵۷ء تک ڈاک کا ہرکارہ تقسیم و جمع خطوط دونوں کام کیا کرتا تھا۔ میرزا صاحب نے تفتہ کے خط میں لکھا ہے:

"اس وقت تمہارا خط پہنچا اور اسی وقت میں نے یہ خط لکھ کر ڈاک کے

(۱) اردوی: ۵۹ (۲) ایضاً: ۲۱۱ (۳) ایضاً: ۱۸۰ (۴) ایضاً: ۱۹۳ (۵) ایضاً: ۸۰۔

ہرکارے کو دیا۔"۱

عذر تاخیر

چونکہ میرزا صاحب خطوط کا جواب باقاعدگی سے دیا کرتے تھے، اس لیے اگر اُن کا کوئی دوست اپنے نیاز نامے کا جواب نہ پانے کی شکایت لکھتا، اور فی الحقیقت کسی وجہ سے جواب میں تاخیر ہو جاتی، تو میرزا صاحب فوراً عذرِ تاخیر لکھ دیتے۔ شکایت بادر ہوا ہوتی، تو اپنے اوپر کبھی ذمہ داری نہ لیتے اور صاف انکار کر دیتے۔ ایک بار میر احمد حسن مودودی نے شکایت کی کہ آپ نے میرے کئی خطوں کا جواب نہیں بھیجا۔ اس کے جواب میں ارشاد فرماتے ہیں:

"آپ کے کسی خط کا جواب میرے ذمے باقی نہیں ہے۔ دو یا تین جن خطوں کا جواب نہیں پہنچا، آپ کو یہ سمجھیے کہ وہ خط راہ میں تلف ہوئے اور میرے پاس نہیں پہنچے۔"۲

ایک بار اپنی عادت کے خلاف قہر کے خط کا جواب دوسرے دن لکھا، تو تاخیر کی تلخی کو ظرافت کی چاشنی سے بدلنے کی بھی کوشش کی۔ فرماتے ہیں:

"بندہ پرور، آپ کا خط کل پہنچا۔ آج جواب لکھتا ہوں۔ داد دینا، کتنا شتاب لکھتا ہوں!"۳

اسی طرح مجروح کے خط کے جواب میں کئی دن کی دیر ہو گئی، تو انھیں لکھا:

"واہ سید صاحب! تم تو بڑی عبارت آرائیاں کرنے لگے۔ نثر میں خود نمائیاں کرنے لگے۔ کئی دن سے تمہارے خط کے جواب کی فکر میں ہوں، مگر جاڑے نے بے حس و حرکت کر دیا ہے۔ آج جو بسبب ابر کے وہ سردی نہیں، تو میں نے خط لکھنے کا قصد کیا ہے۔"۴

۱۔ اردوی: ۵۰۸ (۲) ایضاً: ۴۰۲ (۳) ایضاً: ۲۶۹ (۴) ایضاً: ۱۷۸۔

ایک بار قہر کو خط لکھا، اور بکس میں رکھ لیا۔ کئی دن کے بعد بکس کھولا تو خط برآمد ہوا۔ اس کے متعلق انھیں تحریر فرماتے ہیں:

مرا بسادہ دلیہای من تواں بخشید   خطا نمودہ ام و چشم آفریں دارم

کل دوشنبے کا دن ۹ ستمبر کی تھی۔ صبح کو میں نے آپ کو شکایت نامہ لکھا، اور بیرنگ ڈاک میں بھیجدیا۔ دوپہر کو ڈاک کا ہرکارہ آیا۔ تمھارا خط اور ایک مرزا تفتہ کا خط لایا۔ معلوم ہوا کہ جس خط کا جواب میں آپ سے مانگتا ہوں، وہ نہیں پہنچا، کچھ شکوے سے شرمندگی اور کچھ خط کے نہ پہنچنے سے حیرت ہوئی۔ دوپہر ڈھلے مرزا تفتہ کے خط کا جواب لکھ کر کشت نکالنے لگا۔ بکس میں سے وہ تمہارے نام کا خط کل آیا۔ اب میں سمجھا کہ خط لکھ کر بھول گیا ہوں، اور ڈاک میں نہیں بھیجا۔ اپنے نسیان کو لعنت کی اور چپ ہو رہا۔ متوقع ہوں کہ میرا قصور معاف ہو۔"[1]

ایک مرتبہ میرزا صاحب نے تفتہ کو خط لکھا۔ اُن کی طرف سے جواب نہ ملا۔ بلکہ خط آیا تو الٹی خط نہ بھیجنے کی شکایت درج تھی۔ میرزا صاحب اس کے جواب میں لکھتے ہیں:

"آج پنجشنبے کے دن ۱۰ نومبر کو تمہارا خط آیا۔ اور میں آج ہی جواب لکھتا ہوں۔ کیا تماشا ہے کہ تمہارا خط پہنچتا ہے، اور میرا خط نہیں پہنچتا۔"[2]

لیٹے لیٹے لکھتے

میرزا صاحب شدتِ مرض اور زیادتی ضعف کے باعث نشست و برخاست کی قوت نہ ہونے کی حالت میں بھی جواب خط سے دوستوں کو محروم رکھنا گوارا نہ کرتے، اور لیٹے لیٹے جواب لکھتے تھے۔ ایکبار فردی

۱۔ اردوی: ۲۵۵، ۲، ایضاً ۱۱۔

سنہ ۱۸۵۴ء میں تپ و لرزہ کا شدید دورہ ہوا۔ ابھی مرض کی شدت باقی تھی کہ تفتہ کا خط آگیا۔ میرزا صاحب نے اسی حالتِ ضعف میں جواب دیا، اور اُس میں لکھا:

"میں چار دن سے لرزہ میں مبتلا ہوں۔ . . . . . اتنی سطریں مجھ سے بہزار جرِ ثقیل لکھی گئیں۔"[۱]

صاحبِ عالم مارہروی کو بحالتِ بیماری لکھا ہے:

"جو کچھ لکھنا ہوتا ہے وہ بھی اکثر لیٹے لیٹے لکھتا ہوں۔"[۲]

اسی طرح ایک مرتبہ مجروح کا خط آیا، تو میرزا صاحب کو اٹھنا بیٹھنا دشوار تھا۔ اسی حالت میں جواب لکھ کر آخر میں فرمایا:

"بارہ پر دو بجے ہرکارے نے آپ کا خط دیا۔ پلنگ پر پڑے پڑے خط پڑھا، اور اسی طرح جواب لکھا۔"[۳]

سنہ ۱۸۶۲ء میں تقریباً سارا جسم زخموں سے بھرا ہوا تھا، اور بالخصوص سیدھے ہاتھ کے پھوڑے کی تکلیف سے روح تحلیل ہوئی جاتی تھی۔ اس حالت میں بھی خطوں کے جوابات برابر بھیجتے رہے۔ سرور کو لکھتے ہیں:

"اشعار کی اصلاح یک قلم موقوف۔ خطوط ضروری لیٹے لیٹے لکھتا ہوں۔ دو خط چودھری صاحب کے آئے، اور ایک خط شاہ عالم صاحب کا اور دو خط حضرت صاحب کے آئے، جواب نہ لکھ سکا۔ آج اپنے کو ملنے دے کر مردہ بنایا، جب یہ عبارت لکھی۔"[۴]

انھیں کے ایک خط میں اشعار کے حسن و قبح کا معیار بتاتے ہوئے آتش و ناسخ کا ذکر کرتے ہیں۔ استشہاد میں اُن کا کوئی شعر نہیں آتا، تو کہتے ہیں:

۱۔ اردوئے معلیٰ: ۷۵۔ ۲۔ ایضاً: ۳۰۳۔ ۳۔ عود: ۱۵۴۔ ۴۔ اردوئے معلیٰ: ۱۵۱۔

یاد کیا آدے۔ لیٹا ہوا ہوں۔ دمبدم پانو کے ورم کی بیش ہوشش
اُڑائے دیتی ہے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔"[1]

اسی زمانے میں تفتہ کو لکھا ہے:

میں ناتوان بہت ہو گیا ہوں۔ گویا صاحبِ فراش ہوں۔ کوئی شخص نیا
تکلف کی ملاقات کا آجائے تو اٹھ بیٹھتا ہوں، ورنہ پڑا رہتا ہوں۔
لیٹے لیٹے خط لکھتا ہوں۔"[2]

ضعف کے سبب مراسلت میں کمی

جب بوجہ پیرانہ سالی میرزا صاحب کا ضعف روزافزوں ہونے لگا، تو مجبوراً مراسلت میں کمی کرنی پڑی۔ تاہم اس حالت میں یہ کبھی نہ ہوا کہ کسی جواب طلب کا جواب نہ دیا ہو۔ ہاتھ میں رعشہ اور بینائی میں نقصان آجانے کے بعد اخبارات میں اپنی اس حالت کا اعلان کرکے اربابِ ادب سے التجا کی تھی کہ آیندہ جوابِ خط اور اصلاحِ اشعار سے معاف رکھا جائے۔ اس پر بھی برابر خطوط چلے آتے تھے۔ میرزا صاحب بے تکلف دوست کے منتظر رہتے — جب ایسا دوست آجاتا، اس سے جواب لکھا دیتے۔ ایک بار رضوان نے کوتاہ قلمی کی شکایت کی۔ اس کے جواب میں ارشاد فرماتے ہیں:

"مرزا رسم تحریرِ خطوط بسبب ضعف ترک ہوتی جاتی ہے۔ تحریر کا
تارک نہیں ہوں، بلکہ متروک ہوں۔ . . . . . اگر تمہارے خط کا جواب
نہ لکھوں، تو محلِ ترحم ہے، نہ مقامِ شکایت۔"[3]

اپریل سنہ ۱۸۶۹ء میں سید احمد حسن مودودی کو لکھتے ہیں:

"پیر و مرشد، آپ کو میرے حال کی بھی خبر ہے؟ ضعف نہایت کو پہنچ گیا
رعشہ پیدا ہو گیا، بینائی میں بڑا فتور پڑا، حواس مختل ہو گئے۔ جہاں تک

۱۔ اردوئے معلی: ۱۰۵، (۲) ایضاً: ۹۰، (۳) ایضاً: ۳۲۱۔

ہو سکا، احباب کی خدمت بجا لایا، اوراقِ اشعار لیٹے لیٹے دیکھتا تھا اور اصلاح دیتا تھا۔ اب نہ آنکھ سے اچھی طرح سوجھے، نہ ہاتھ سے اچھی طرح لکھا جائے۔ کہتے ہیں کہ شاہ شرف بوعلی قلندر کو بسبب کبرسنی کے خدا نے فرض اور پیمبر نے سنت معاف کر دی تھی۔ میں متوقع ہوں کہ میرے دوست خدمتِ اشعار مجھ پر معاف کر دیں۔ خطوطِ شوقیہ کا جواب جس صورت سے ہو سکے گا لکھ دیا کروں گا۔ زیادہ حدِ ادب ۔"[1]

ذکا نے کیفیتِ مزاج دریافت کی، تو اُسے یوں دُر فشانی فرماتے ہیں:

"تم میری بات پوچھتے ہو، مگر میں کیا لکھوں! ہاتھ میں رعشہ، انگلیاں کہنے میں نہیں، ایک آنکھ کی بینائی زائل جب کوئی دوست آجاتا ہے، تو اُس سے خطوط کا جواب لکھوا دیتا ہوں۔"[2]

جون سنہ ۱۸۶۷ء میں سیاح کو اپنی حالت لکھتے ہوئے فرماتے ہیں:

"میرا حال اسی سے جانو کہ اب میں خط نہیں لکھ سکتا۔ آگے لیٹے لیٹے لکھتا تھا۔ اب رعشہ و ضعفِ بصارت کے سبب سے وہ بھی نہیں ہو سکتا۔"[3]

اُنھیں کو اگست ۱۸۶۷ء میں لکھا ہے:

"آگے میں لیٹے لیٹے کچھ لکھتا تھا، اب وہ بھی نہیں ہو سکتا۔ ہاتھ میں رعشہ آنکھوں میں ضعفِ بصر۔ کوئی متصدی میرا نوکر نہیں۔ دوست آشنا کوئی آجاتا ہے، تو اُس سے جواب لکھوا لیتا ہوں۔ بھائی، میں تو اب کوئی دن کا مہمان ہوں۔ اور اخبار والے میرا حال کیا جانیں؟ ہاں اکمل الاخبار اور شرف الاخبار والے کہ یہاں کے رہنے والے ہیں، اور مجھ سے ملتے رہتے ہیں۔ سو اُن کے اخبار

[1] عودِ ہندی: ۴۳ (۲) ایضاً: ۱۰۲ (۳) ایضاً: ۴۳

ہیں میں نے اپنا حال مفصل چھپوا دیا ہے، اور اس میں میں نے عذر چاہا خطوں کے جواب سے اور اشعار کی اصلاح سے۔ اس پہ کسی نے عمل نہ کیا۔ اب تک ہر طرف سے خطوں کے جواب کا تقاضا اور اشعار اصلاحوں کے چلے آتے ہیں، اور میں شرمندہ ہوتا ہوں، بوڑھا، اپاہج، پورا بہرا، آدھا اندھا۔ دن رات پڑا رہتا ہوں۔"(۱)

نواب میر غلام بابا خاں بہادر نے کبھی کبھی اطلاع خیریت کی خواہش کی تھی۔ انھیں ۷ اپریل سنہ ۱۸۶۸ء کو لکھتے ہیں:

"آپ جو فرماتے ہیں، کہ تو اپنی خیر و عافیت کبھی کبھی لکھا کر۔ آگے اتنی طاقت باقی تھی کہ لیٹے لیٹے کچھ لکھتا تھا۔ اب وہ طاقت بھی زائل ہو گئی، ہاتھ میں رعشہ پیدا ہو گیا۔ بینائی ضعیف ہو گئی۔ متصدی نوکر رکھنے کا مقدور نہیں۔ عزیزوں اور دوستوں میں سے کوئی صاحب وقت پر آ گئے، تو جو مطلب کہتا گیا، وہ لکھتے گئے۔"(۲)

سید احمد حسن مودودی کو کسی دوست نے اطلاع دی کہ اب میرزا صاحب کو افاقہ ہے۔ انھوں نے میرزا صاحب سے اس کی تصدیق چاہی۔ اس پر تحریر فرماتے ہیں:

"جو آپ نے سنا ہے کہ اب غالب کو مرض سے افاقت ہے، سو محض غلط ہے۔ آگے ناتوان تھا، اب نیم جان ہوں، خط نہیں لکھ سکتا۔ ایک لڑکے سے یہ چند سطریں لکھوا دی ہیں۔ جو میں کہتا گیا ہوں، وہ غریب لکھتا گیا ہے۔"(۳)

اپنی اس مجبوری کے زمانے میں میرزا صاحب دوستوں اور شاگردوں کے خطوط کی طرح اعزہ کے خطوط کا جواب بھی بمشکل دیا کرتے تھے۔ عارف کے بیٹے باقر علی خاں کامل، جنھیں بیٹوں کی طرح پالا تھا، روزگار

۱۔ اردوی: ۲۰ (۲) ایضاً: ۸۰ (۳) ایضاً: ۲۹۶

کی تلاش میں آلور گئے اور دلّی میں بیوی اور ایک بچی چھوڑ گئے۔ میرزا صاحب سے امید تھی کہ اپنی اور بہو اور پوتی کی خیریت سے جلد جلد مطلع کرتے رہیں گے۔ میرزا صاحب اُن کو بھی تا خیر سے جواب دیتے تھے۔ ایک بار اُنھوں نے شکایت کی۔ میرزا صاحب نے جواب میں تحریر فرمایا:

"مجھ سے جو تم گلہ کرتے ہو خط کے نہ بھیجنے کا، بھائی، اب میری انگلیاں نکمی ہو گئی ہیں، اور عبارت میں بھی ضعف آگیا ہے۔ دس سطریں نہیں لکھ سکتا۔ اطراف و جوانب کے خطوط آئے ہوئے دھرے رہتے ہیں۔ جب کوئی دوست آجاتا ہے، میں اس سے جواب لکھوا دیتا ہوں۔ پرسوں کا تمہارا خط آیا ہوا دھرا تھا۔ اب اس وقت مرزا یوسف علی خاں آ گئے۔ میں نے اُن سے یہ خط لکھوا دیا۔"(۱)

۱۔ اردوی: ۲۳۱۔

املای غالب

میرزا صاحب کی نوشتہ تحریروں اور اصلاحوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں صحتِ املا کا بڑا خیال تھا۔ خود بھی غلطیِ املا سے پرہیز کرتے اور شاگردوں سے بھی اسی توجہ کے متوقع رہتے تھے۔ اگر شاگرد معمولی غلطی کا مرتکب ہوتا تو صرف اصلاح پر اکتفا کرتے، ورنہ غلطی اصلاح کا منشا بھی واضح کر دیتے تھے۔ ایک بار جنون بریلوی نے فارسی کے ماضی قریب کے صیغۂ واحد حاضر کو "ی" کے ساتھ لکھا۔ آج کل اہلِ ایران اسی طرح لکھتے ہیں، مگر اس زمانے میں التباس نہ تھا۔ اس کی اصلاح میں ارشاد فرمایا ہے:

"پر وردہ، رفتہ، یہ جتنے الفاظ ہیں ان میں یای تحتانی نہیں لکھتے بس وہی ہای ابنای حرکت رہتی ہے۔ پس اگر وہ ساکن ہے، تو تو رفتہ، بردہ اس صورت پر رہے گی۔ اور اگر اس کو حرکت لازم آئے، تو علامتِ حرکت ہمزہ لکھ دیا جائے گا۔ رفتۂ آمدۂ اور ان مفعول کے سب صیغوں کا یہی حال ہے"(۱)

شیو نراین کو تحریر کیا ہے:

"چونکہ تم کو مشاہدۂ اخبار اطراف اور خود اپنے مطبع کے اخبار کی عبارت کا شغل رہتا ہے، بہ تقلید اور انشا پرداز وں کے تمھاری عبارت میں بھی غلطیاں ہوتی ہیں۔ میں تم کو آگاہ کرتا رہتا ہوں۔ خدا چاہے، تو املا کی غلطی کا ملکہ زائل ہو جائے"(۲)

۱۔ خطوط: ۱۰۱ (۲) اردوی ۱۸۲ ۵۹۔

مبتلا صاحب رامپوری کے کاتب دیوان نے "طیمور" لکھا تھا۔ اس پر فرماتے ہیں:

"یہ لفظ "طوی" سے نہیں "تے" سے ہے اور پھر تیمور بروزن تنبور نہیں۔ دراصل تمر بوزن سمندر ہے۔"(۱)

میرزا صاحب کے قلم کے لکھے ہوئے خطوط اور نواب ناظم اور مبتلا صاحب کے اصلاحی مسودوں کی خاصی تعداد ہمارے سامنے ہے۔ اُن سے نیز دوسرے شاگردوں کی املائی تصحیح سے جو اردوی معلی اور عود ہندی کے اوراق میں محفوظ ہے، املا اور رسم خط سے متعلق حسب ذیل نتائج مستنبط ہوتے ہیں۔

(۱) وہ اپنے عہد کی طرزِ کتابت کے مطابق یای معروف و مجہول کے لکھنے میں بول چال سے زیادہ خطی خوشنمائی اور کاغذ پر باقی ماندہ جگہ کا لحاظ کرتے تھے۔ معروف کی جگہ مجہول اور مجہول کی جگہ معروف "ی" کا استعمال اُن کے یہاں اتنا عام ہے کہ بعض اوقات پڑھنے میں دقت اور تذکیر و تانیث کے متعین کرنے میں دشواری پیدا ہو جاتی ہے۔

(۲) اُن کی تحریروں میں ہای مخلوط دو چشمی "ھ" کی جگہ ہای سادہ کی ہم شکل نظر آتی ہے۔ اُس زمانے کے کاتبوں کا دستور تھا کہ مخلوط "ھ" کو وہ سادہ "ہای ہوز" سے ظاہر کرتے تھے، جیسے آنکہہ، ہاتہہ، لکہہ وغیرہ(۲)

میرزا صاحب اس کے بھی خلاف تھے۔ اُنھوں نے اپنی تحریروں میں اس قسم کے اکثر اور مبتلا صاحب و ناظم کے مسودوں میں اس قسم کے تمام الفاظ کو ایک ہی سادہ "ہ" سے لکھا ہے۔

(۳) اُن کے زمانے تک ترکی رسم الخط کی دیکھا دیکھی اردو خط میں بھی اعراب بالحروف کا طریقہ ایک حد تک مروج تھا۔ مگر میرزا صاحب

مکاتیب: (۱)، (۲) ہندی کے جن الفاظ کا آخری حرف مفتوح ہوتا ہے ان کے زبر کو ظاہر کرنے کے لیے اردو کتابت میں ہای مختفی بڑھائی گئی تھی موجودہ لیجے میں ایسے تمام الفاظ کی آنکھ ہوتے جاتے ہیں۔ اس لئے اب ایک سادہ "ہ" سے ہی لکھنا چاہیے۔

لفظ کے شروع میں واقع ہونے والے الفِ مضموم کے علاوہ ہر جگہ اعراب بالحروف کرنا پسند کرتے تھے۔ بتیاب کے کاتب نے "مہر و مہ" کو "مہر و ماہ" اور "اُسی" کو "ایسی" لکھا تھا۔ انھوں نے اس کتابت کو غلط قرار دیتے ہوئے "مہر و مہ" بحذفِ الف، اور "اسی" بحذفِ یا اپنے قلم سے بنا دیا ہے۔

"مینہ" کا املا بھی بحذفِ "ی" پسند کرتے تھے۔ خود اُن کی اپنی تحریروں میں "مینہ" موجود ہے(۱) لیکن نواب فردوس مکاں کے اس شعر میں

آکر ترے کوچے میں یہ کچھ ہم سے بن آئی جاتے ہوئے اک مینہ تھا کہ برسا گئیں آنکھیں

مینہ کو "منہ" بنا دیا ہے۔

عام طور پر "پہنچنا" اور اُس کے مشتقات میں "ہ" کے بعد لوگ "و" لکھا کرتے ہیں۔ میرزا صاحب کے خود نوشتہ خطوں میں بھی کئی جگہ یہ لفظ آیا ہے، مگر ایک جگہ کے علاوہ انھوں نے "پہونچنا" کبھی نہیں لکھا۔ انتخاب دیوان اردو اور ناظم و بتیاب کے مسودوں کے کاتبوں نے بھی جہاں کہیں واؤ کے ساتھ لکھا تھا، میرزا صاحب نے اُس کی ہر مقام پر اصلاح کی ہے۔

ناظم کا ایک شعر ہے:

واں کے جانے سے رکے اور رُکی فصلِ بہار
تو مبارک جمع پھر وحشت کے ساماں ہو گئے

کاتب نے اس میں "رُوکے" لکھا تھا، میرزا صاحب نے "و" قلمزد کر دیا ہے۔

ایک شعر میں "دوکان" تحریر ہو گیا تھا۔ اس کا بھی واو کاٹ دیا ہے۔

---

(۱) مکاتیب: ۴۰-۹۴، ۲۶؛ انتخاب غالب اردو قلمی: ۹۳۔

بتیابی کے اس شعر میں:

پھکا جاتا ہے دل سینے میں، اللہ چھپاؤں کب تلک سوزِ نہاں کو!

کاتب نے "پھوکا جاتا ہے" لکھ دیا تھا۔ اس میں سے بھی میرزا صاحب نے واو نکال دیا ہے۔

خود میرزا صاحب کے انتخاب دیوان اردو میں کاتب نے لکھا تھا:

"کھولتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ"

اسے میرزا صاحب نے "کھلتا" بنایا ہے[1]۔

"خور اور خورشید" کا عام املا یہ ہے۔ میرزا صاحب خرشید کو بے واو اور خور کو صرف خُر سے التباس دور کرنے کے خیال سے با واو لکھا کرتے تھے۔ اُن کی رائے یہ تھی کہ پارسی قدیم میں "خُر" بضم الخا۔ نور آفتاب کو کہتے ہیں۔ "شید" بکسرِ شین کے معنی روشنی ہیں۔ ایرانی آفتاب کو بعد از خدا بزرگ جانتے تھے، اس لیے انھوں نے سورج کو خُر اور خورشید کہا۔ جب عرب و عجم مل گئے، اکابرِ عرب نے واسطے دفعِ التباس کے "خُر" میں واوِ معدولہ بڑھا کر "خور" لکھنا شروع کیا[2]۔

"منہ" کا پرانا املا "مونہ یا مونہہ" ہے۔ نواب ناظم کے مسودوں میں

(۱) انتخابِ غالب اردو قلمی: ۳۲ (۲) رضا قلی ہدایت نے فرہنگِ انجمن آرای ناصری (لفظ خر) میں لکھا ہے "بانجم آفتاب و متاخرین برای آں کہ بکلمہ خر مشتبہ نشود با واو نویسند۔ لیکن در زبان قدیم بے واو بود" اس سے میرزا صاحب کی رای کی تائید ہوتی ہے۔ مگر ڈاکٹر صدیقی صاحب فرماتے ہیں کہ انھوں نے اپنے اس مسلک کی جو توجیہ کی ہے وہ درست نہیں۔ یہ کہنا صحیح نہیں کہ قدیم فارسی میں "خر" کی خ کو پیش تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ایران کی پرانی زبان میں بعض لفظوں کا پہلا حرف ساکن ہوتا تھا چنانچہ خور اور خود وغیرہ کی خ ساکن تھی اور "واو" مفتوح، یعنی "خ" و "و" آپس میں مل کر ایک دہری آواز پیدا کرتے تھے۔ آگے چل کر جب ابتدا بسکون فارسی زبان میں ترک ہو گئی تو "و" کی تبدیل ہو کر تلفظ میں ایک ضمہ باقی رہ گیا کتابت میں اب تک وہ معدولہ" واو برقرار ہے۔ یہ بھی صحیح نہیں کہ عربوں نے بواسطہ دفعِ التباس کے واو معدولہ بڑھا کے خور لکھنا شروع کیا عربوں کی زبان میں نہ خور کو دخل ہوا نہ خورشید کو، اور نہ خُر ان کی زبان میں دخیل تھا۔ پھر ان کو التباس کے دور کرنے کی فکر کیونکر ہونے لگی" (مقدمہ خطوط صفحہ ز)

متعدد جگہ یہ لفظ آیا ہے، اور ہر جگہ اسے کاتب نے "مونہہ" لکھا ہے میرزا صاحب نے ایک جگہ کو مستثنیٰ کرکے "منہ" بنادیا ہے۔

(۴) فارسی اور ہندی لفظوں کے املا میں عربی کے مخصوص حروف۔ ث ح، ص، ض، ط، ظ، ع، استعمال نہیں کرتے تھے۔ سیاح کو لکھتے ہیں:

"عین کا حرف فارسی میں نہیں آتا۔ جس لغت میں عین ہو اس کو سمجھنا کہ عربی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جس طرح عین فارسی میں نہیں ہے، طوئی بھی نہیں ہے، مثلاً تشت لغتِ فارسی الاصل ہے۔ املا اس کی طوئی سے غلط ہے"(۱)

بتیاب نے "طمانچہ" اور "طیمور" لکھا تھا۔ میرزا صاحب نے طمانچہ کو "تپانچہ" بنادیا، اور طیمور کے بارے میں یہ لکھا:

"یہ لفظ طوئی سے نہیں، تے سے ہے۔ اور پھر تیمور بوزنِ تنبور نہیں۔ دراصل تیمر بوزن سمندر ہے"(۲)

میرزا صاحب "ذ" کو بھی عربی کے مخصوص حرفوں میں شمار کرتے، اور کبھی کسی فارسی لفظ میں "ذ" نہیں لکھتے تھے۔ بتیاب کے مسودے میں "خذف" تھا اسے "خزف" بناکر لکھا ہے:

"خزف بمعنی ٹھیکری کے لغتِ فارسی اور املا اس کی ز سے ہے"(۳)

گذشتن، پذیرفتن، وغیرہ فارسی مصادر کے تمام مشتقات میں جہاں "ذ" مروج ہے، میرزا صاحب نے "ز" استعمال کی ہے۔ ناظم نے "سرگذشت" لکھدیا تھا، تو اسے "سرگزشت" بنالیا ہے۔ ڈاکٹر صدلقی صاحب فرماتے ہیں۔

"گذشتن، گذاشتن، پذیرفتن، یہ سب لفظ ذال سے ہیں۔ البتہ گزاردن" زے سے صحیح ہے۔ میرزا غالب نے پہلے نادانی سے پھر سخن پروری

---

(۱) مقدمہ خطوط (ز)، داردوی معلی: ج ۱، ۲۴۴ (۲) مکاتیب: ۱۰۰ (۳) ایضاً، ۱۰۵۔

اور سینہ زوری سے "ذ" کو فارسی سے خارج کرنے کی کوشش کی اردو میں یہ لفظ "ز" سے لکھیے، تو مضائقہ نہیں، مگر فارسی میں "ذ" لکھنا ضروری ہے۔"(۱)

اس قاعدے کی انھوں نے اتنی پابندی کی ہے کہ اُن عربی لفظوں میں بھی عربی کے مخصوص حرف نہیں لکھتے، جو اپنے معنی کی بنا پر ہندی یا مہنّد بن گئے ہیں، جیسے طیار اور ذرا۔ طیار کے بارے میں قدر بلگرامی کو لکھا ہے۔

"طیار ...... لغت عربی، املا اس کی طای حطی سے ...... باز داروں میں اس لفظ نے جنم لیا، حقیقت بدل گئی، طوی، تے بن گئی۔ یعنی جب کوئی شکاری جانور شکار کرنے لگا، باز داروں نے بادشاہ سے عرض کی کہ "فلاں باز" "فلاں بکرہ طیار شدہ است و صید می گیرد۔"

بہر حال اب تای قرشت سے یہ لفظ نیا نکل آیا۔ اس لفظ کو مستحدثات اردو اصل اردو اور بتای قرشت بمعنی آمادہ، اشخاص اور اشیا پر عام تصور کرنا چاہیے۔"(۲)

"ذرا" اصلاً عربی ہے اور اس کا املا ذرّہ ہے۔ پہلے اردو محاورے میں تشدید بھی بولا جاتا تھا۔ شاہ عالم بادشاہ دہلی آفتاب تخلص کا مقطع ہے:

اے آفتاب دل کو ذرّا نہ چین اُس بن اس رشکِ مہ کو جلدی مجھ سے کوئی ملادے

دوسرے مقطع میں بھی اسی طرح باندھا ہے:

---

(۱) حاشیہ دستور الفصاحت، ص ۱۰، پر ڈاکٹر صاحب نے یہ تحریر لکھ کر خیر عرشی کو بھیجی ہے۔

(۲) خطوط ۱: ۱۸۳۔ مگر خانِ آرزو کا بیان ہے (چراغ ہدایت نولکشور صفحہ) کہ طیار عربی میں بمعنی پرندہ ہے، لیکن ایرانی آمادہ کے معنی میں استعمال کرتے ہیں، اور یہ بطورِ مجاز ہے۔ بعض کے نزدیک ایک صورت یہ بھی ہے کہ تیار عربی میں بمعنی جہندہ ہے۔ بمعنی آمادہ جو فارسی میں آیا ہے ممکن ہے یہی ہو۔ آرزو کا قول صحیح ہے، تو غالب کا بیان کہ آمادہ کے معنی میں اردو ہے قابلِ قبول نہیں اور اس کا املا ت اور ط دونوں سے ہو سکتا ہے۔" (معاصر ح ۸ نمبر ۱ صفحہ)

یک ذرہ تسلی نہ ہو خورشید جہاں کو   اک بوسہ بھی جب تک اُسے انعام نہ ہوگا

اگرچہ اب تنہا مشدد نہیں بولتے، لیکن کسی ایسے لفظ کے ساتھ آئے، جو وزن یا ناپ کو ظاہر کرتا ہو، تو ذرہ ہی تلفظ کرتے ہیں، جیسے "اُسے میری ذرہ بھر پروا نہیں ہے" ظاہر ہے کہ یہ تشدید وہیں باقی رہ گئی ہے جہاں حقیقی معنے مراد ہیں۔ پس اس لفظ کو موجودہ معنی کے لحاظ سے اردو اور مستحدث کہا جائے گا۔ میرزا صاحب اسی کے قائل تھے اور ۱۲ نومبر سنہ ۱۸۶۵ء کے ایک خط میں اُنھوں نے "زرا" ہی لکھا ہے[1]

(۵) جن فارسی الفاظ کے آخر میں الف یا واو کے بعد "ی" آتی ہے، خواہ اصلی ہو یا اضافت وصفت کی علامت، عام کاتب اس "ی" پر ہمزہ لکھدیتے ہیں۔ میرزا صاحب اسے عقل کو گالی دینا جانتے تھے۔ تفتہ کے خط میں صراحت فرماتے ہیں:

"دیکھو پھر تم دنگا کرتے ہو؟ ... غلطی میں جمہور کی پیروی کیا ضرور ہے۔ یاد رکھو، یای تحتانی تین طرح پر ہے۔

(۱) جزوِ کلمہ

همای بر سر مرغان ازان شرف دارد

ای سر نامہ نام تو عقلِ گرہ کشای را

یہ ساری غزل اور مثل اس کے جہاں یای تحتانی ہے، جزوِ کلمہ ہے۔ اس پر ہمزہ لکھنا گویا عقل کو گالی دینا ہے۔

(۲) دوسری تحتانی مضاف ہے۔ صرف اضافت کا کسرہ ہے ہمزہ وہاں بھی مخل ہے، جیسے آسیای چرخ یا آشنای قدیم۔ توصیفی، اضافی، بیانی کسی طرح کا کسرہ ہو، ہمزہ نہیں چاہتا فدای تو شوم، رہنمای تو شوم، یہ بھی اسی قبیل سے ہے۔

(۱) اردوی: ۳۰۳ دیوان غالب کے خوشخط قلمی نسخے میں ایک جگہ کاتب نے ذرا کو دال سے لکھا تھا میرزا صاحب نے یہاں بھی ذال کا سر جا تو سے چھیل کر زرا بنا دیا ہے۔

(۳) تیسری دو طرح پر ہے:

یای مصدری، اور وہ معروف ہوگی؛ دوسری یای توحید و تنکیر، اور اور وہ مجہول ہوگی، مثلاً مصدری، آشنائی۔ یہاں ہمزہ ضرور، بلکہ ہمزہ نہ لکھنا عقل کا قصور۔

توحیدی، آشنائے، یعنی ایک آشنا یا کوئی آشنا۔ یہاں جب تک ہمزہ نہ لکھو گے، دانا نہ کہاؤ گے (۱)

اسی اصول کے ماتحت نواب فردوس مکاں کے مسودوں میں ایک جگہ "موی سر" اور دوسری جگہ "زای" کی ہمزہ کو قلمزد کر دیا ہے۔

مگر جہاں کہیں آخر کلمہ کی "ی" سے قبل الف یا واو مدہ نہیں ہے، وہاں میرزا صاحب نے ہمزہ بھی لکھا ہے۔ چنانچہ نثر تہنیتِ غسلِ صحت میں "خجستگی و فرخندگیٔ چند" (۲) اور خلد آشیاں کے مدحیہ قصیدے میں "گلیم ضیٔ من" (۳) ان کے اپنے ہاتھ کا ملا ہے۔ ان مواقع پر بھی انھوں نے اپنے قلم سے ہمزہ لکھا ہے (۴)

گشتہ تاریکیٔ روزم نہاں | کو چراغی تا بجویم شام را؟
بیہوشی بہ ہمدمیٔ ما بسر برد | در چشم بخت غیر رہا کرد خواب را
سر منزلِ رسائیٔ اندیشہ خود ایم | در ما گسست جلوہ بی رہنمائی را
واں پہنچ کر جو غش آتا پئے ہم ہے ہم کو | صدرہ آہنگ زمیں بوسِ قدم ہے ہم کو (۵)

بینا آب کے اس شعر میں بھی

آج ہیں موزونیٔ طبع پہ نازاں ہوا | صبح ہے کہ رونق پذیرِ لب مرادیواں ہوا

میرزا صاحب نے "موزونیٔ طبع" بنا دیا ہے۔

(۶) ہای مختفی پر ختم ہونے والے مذکر اسموں کو تحریف کی حالت میں بالعموم "ی" کے ساتھ بولا اور "ہ" کے ساتھ لکھا جاتا ہے۔ چنانچہ کعبہ کی

(۱) خطوط ۱: ۲۳۳ (۲) مکاتیب: ۱۳۵ (۳) ایضاً: ۴۰ (۴) انتخاب غالب فارسی قلمی ۷: ۱۵، ۱۶ (۵) انتخاب رد قلمی ۲۴۶۔

دیوار اور منصہ کی بات کو کعبے کی دیوار اور غصے کی بات بولتے ہیں۔ خطوط میں میرزا صاحب نے بھی زیادہ تر اسی رواج عام کی پیروی کی ہے۔

لیکن انتخاب اردو[1] میں تین چار جگہ اور ناظم و بیتاب کے مسودوں میں ایسے تمام الفاظ کی "ہ" قلمزد کر کے "ہ" کی جگہ "ی" بنادی ہے، جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایسے مواقع پر تلفظ کے مطابق املا کو پسند کرتے تھے ہاں، ایک لفظ "ریختہ" ایسا ہے، جسے انھوں نے تلفظ کے خلاف لکھا بھی ہے اور لکھوایا بھی۔ نواب ناظم کے اس شعر میں

یہ طرز کسی اور کو کب یاد ہے ناظم ہیں ریختے میں پیرو انداز حزیں ہم

میرزا صاحب نے ریختے کو اپنے قلم سے ریختہ بنا دیا ہے۔

میری رائے میں ریختہ کی "ہ" پر اصرار "ریختی" سے التباس دور کرنے کے خیال سے ہوگا، جو اس زمانے میں یای معروف و مجہول کی کتابت میں فرق نہ ہونے کے سبب سے بسہولت پیدا ہو سکتا تھا۔

(۱) ہای مختفی پر ختم ہونے والے ہندی یا ہند الفاظ کی کتابت میں میرزا صاحب ایک روش کے پابند نہ تھے۔ "تھانہ، پودینہ، اور کیوڑہ" کو باوجود ہندی ہونے کے اور "نقشا" کو باوجود ہند ہونے کے "ہ" سے لکھا ہے۔ جھروکہ، درشن، پرچہ، ہنڈوی، گل بکچہ، تولہ، چبوترہ، دودقہ، جولاہہ، روزمرہ وغیرہ بھی ان کے خطوں میں موجود ہیں، جنھیں زیادہ تر "ہ" سے اور کمتر الف سے لکھتے ہیں!

لفظ گلہ بمعنی شکوہ کو خوشخط دیوان اردو کے کاتب نے ہر جگہ "گلا" لکھا ہے۔ میرزا صاحب نے کسی جگہ اس کی تصحیح نہیں کی۔ لیکن

۱۔ انتخاب اردو قلمی ۵۷، ۱۵۸، ۹۹، ۱۰۰۔ مقدمہ خطوط غالب میں ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ میرزا صاحب [illegible] وپیہ، واجبہ، اور قالہ وغیرہ کے سوا "ہ" سے نہ لکھتے تھے اور فارسی و عربی کے اردو میں مستعمل ہو جانے والے لفظوں کو اکثر الف ہی سے لکھتے تھے۔ قاضی عبدالودود صاحب نے اس پر تنقید کرتے ہوئے رسالہ معاصر پٹنہ ۔ ۲ نمبر ۳ ص ۴۴ میں میرزا صاحب کی دستی تحریروں سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ وہ کسی ایک روش کے پابند نہ تھے۔ چنانچہ مذکورہ بالا مثالیں انہیں کے مضمون سے نقل کی گئی ہیں۔

ناظم کے مسودے میں "گلہ" بنا دیا ہے۔ اس سے یہ رای قائم کی جاسکتی ہے کہ آخر عمر میں عربی فارسی کے ان لفظوں کو بھی جو اردو میں گھل مل گئے ہیں ہای مختفی سے لکھنا پسند کرتے تھے۔

(۸) اردو کے جن الفاظ میں الف یا واوِ مدّہ کے بعد "ی" واقع ہوتی ہے۔ جیسے جاے، یا ہوے، میرزا صاحب کی تحریروں میں ان کی کتابت بھی یکساں نہیں ہے۔ وہ کبھی انھیں بے ہمزہ کے اور کبھی ہمزہ کے ساتھ "جائے، ہوئے" لکھتے ہیں۔ اسی طرح یای مدّہ کے بعد "ی" ہو جیسے لیئے کیئے تو یای اول کو کبھی بصورت ہمزہ، کبھی بصورت یا اور کبھی "ی" اور ہمزہ دونوں کے ساتھ لکھا ہے۔

لیکن نواب ناظم اور بیتاب کے مسودوں میں "کیجیے، دیکھیے، چاہیے، پوچھیے، ہمسائے، آجائے، لائے، لگ جائیگی، آئے ہو، ہوئے، پھیلا دیئے"، وغیرہ میں سے ہمزہ کو قلمزد کر دیا ہے۔ یہ اس پر دال ہے کہ میرزا صاحب ان لفظوں کو بے ہمزہ کے انسب جانتے تھے۔

(۹) نون غنہ کے استعمال میں میرزا صاحب نے احتیاط کی ہے۔ پانو کا املا تین طرح کا مروج تھا: پانو، پانوں، پاؤں۔ میرزا صاحب اول الذکر کو صحیح اور باقی دونوں کو غلط کہتے تھے، چنانچہ ناظم اور بیتاب کے مسودوں میں جگہ جگہ یہ اصلاح موجود ہے۔ جنون بریلوی نے پاؤں لکھا تھا۔ ان کو بتلاتے ہیں کہ پاؤں کی یہ املا غلط۔ پانو، گانو، چھانو درست ہے[۱]۔ اور کسی شاگرد نے "پانوں" بتحریر کیا تھا۔ اسے لکھتے ہیں:

"پانو قافیہ گانو اور چھانو کا ہے۔ آگے اس کے نون لکھنا غلط ہے مگر ہاں بصیغۂ جمع یوں لکھنا چاہیے، پانوؤں"[۲]

"پوچھنا" کو بیتاب اور نواب ناظم کے کاتبوں نے "پونچھنا" لکھا تھا۔

---

[۱] خطوط: ۱/۱۸۹-(۱) خطوط مقدمہ ۲۰-ح، میں ڈاکٹر صدیقی صاحب فرماتے ہیں۔
"پانو، گانو، چھانو، دانو کی یہ املا یقیناً بہتر ہے، اس لیے کہ ایک تو غنہ یہاں حقیقت میں الف میں ہے۔ دوسرے جمع کی محرف حالت میں ان لفظوں کی صورت یوں ہوتی ہے: پانوں، گانووں وغیرہ۔" الخ

میرزا صاحب نے اس غلطی کی بالالتزام اصلاح کی ہے۔

(۹) "دونوں" کو بعض اصحاب "دونو" بے نون آخر لکھتے ہیں۔ میرزا صاحب اسے نون کے ساتھ لکھتے تھے۔ مذکورۂ بالا مسودوں میں بھی اس لفظ کی اصلاح کی ہے۔

"بھوںکا" کا تلفظ کچھ اس طرح کیا جاتا ہے کہ واو کے بعد نون غنہ محسوس ہوتا ہے۔ بیتاب کے کاتبِ مسودۂ دیوان نے بھونکا لکھ دیا تھا۔ میرزا صاحب نے اسے نون غنہ سے پاک کر کے بھوکا بنا دیا ہے۔

(۱۰) ہائے مخلوط کی کتابت میں شاید فصحائے دہلی کے تلفظ کا لحاظ زیادہ رکھا ہے۔ چنانچہ نثر پنا میں اُن کے نزدیک بائے فارسی اور نون کے درمیان ہائے مخلوط التلفظ ضرور ہے "یہاں" کے مخفف "یاں" کو دلی والے "یہاں" بولتے تھے۔ میرزا صاحب نے اس تلفظ کو افصح قرار دیا ہے۔ "بگھارنا" کی جگہ "بھگارنا" اور "گڑ پنکھ" کی جگہ "گڑھ پھنک" یا "گڑ پھنگ" تلفظ کا اتباع معلوم ہوتا ہے۔ "ٹھہرنا" دلی میں ٹہرنا بولا جاتا ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ میرزا صاحب ہمیشہ ایک "ہ" سے لکھتے ہیں۔ ناظم نے لکھا تھا

"جو آ گئے ہو مرے گھر، تو کوئی دم ٹھیرو"

میرزا صاحب نے اسے "ٹہرو" بنایا۔ بیتاب کا شعر تھا:

کیسا مزہ دکھاتے ہیں ہم بھی تو ٹھیر جا تقریر میں کرکے اور یہ، ناصح تو ہو گیا

اس میں میرزا صاحب نے "ٹہر تو جا" اصلاح دی۔

مخلوط "ھ" جب لفظ کے آخر میں آتی ہے تو اس کی آواز بہت ہلکی

بخلاف اس کے اگر واحد کی لکھاوٹ "پاؤں" یا "پاؤں" قرار دیجیے تو جمع محرف "پاؤنوں" یا "پاؤوں" منتہی ہے جو ہرگز قبول کرنے کے لائق نہیں۔ میں عرض کرتا ہوں کہ اکثر صاحبوں کا استدلال قوی نہیں۔ کنوئیں، دھواں، رواں ہوں کی جمعیں کنوئیں، کنوؤں دھوئیں، دھوؤں۔ روئیں، روؤں اور ہوئیں، ہوؤں ہیں۔ مذکورہ اصول کے پیش نظر ہم یوں کہتے "اس کنوئیں کا پانی شہر بھر کے کنواؤں سے بہتر ہے" حالانکہ "کنوؤں سے بہتر ہے" سب کی بول چال ہے۔ میری ناقص رائے یہ ہے کہ ان لفظوں میں الف اور واو دونوں کے بعد نون غنہ ہے، اس لیے بہتر املا چھاؤں اور گانوں ہے۔

ہو جاتی ہے، ایسی ہلکی گویا اس کا وجود ہی نہیں۔ میرزا صاحب نے اس ہلکی "ہ" کا نام مضمرہ رکھا ہے، اور کتابت میں اکثر حذف کر دیتے ہیں چنانچہ رتھ کو رت، ہاتھی کو ہاتی اور ادھ اور میرٹھ کو اد اور میرٹ اور مجھ کو، تجھ کو کی جگہ مجکو، تجکو[1] لکھا ہے یہ "ہاتھ" کو بھی خود ہات لکھتے تھے[2] مگر ناظم کے مصرعوں ع: ہات سے رشتوال کے چھوٹا شانہ زلفِ حور میں، اور ع: ہاتھ میں خط لیا کہ دم نکلا، میں کاتب نے ہات اور ہاتھ لکھا تھا، ان دونوں شکلوں کو "ہاتھ" میں تبدیل کر دیا۔ مگر ساتھ کو ہمیشہ "ہ" سے لکھتے تھے، تاکہ سات سے، جو عدد ہے، التباس نہ ہو۔ اسی طرح ان لفظوں میں بتاکید ہائے مخلوط لکھواتے تھے، جن میں بول چال کے اندر "ہ" موجود ہے، مثلاً نواب ناظم کے مسودے میں کاتب نے "ڈھونڈا" لکھا تھا، میرزا صاحب نے اسے "ڈھونڈھا" بنا دیا ہے۔ جیسا کہ کاتب دیوان نے "منہ چڑانا" اور "بگلنا" لکھا تھا۔ میرزا صاحب نے چڑھانا اور پگھلنا کر دیا ہے[3]

(۱۱) بعض ہندی الفاظ کا تلفظ ایک مقام پر "ڈ" سے اور دوسرے پر "ڑ" سے کیا جاتا ہے۔ جیسے گاڑی، بوڑھا، کہ اضلاع سہارنپور و میرٹھ میں "گاڈی" اور "بوڈھا" بولتے ہیں۔ میرزا صاحب نے ان دونوں لفظوں میں سے پہلے کو ڈ سے[4] اور دوسرے کو ایک جگہ ڈ سے اور دوسری جگہ "ڑ"[5] سے لکھا ہے۔

(۱۲) پہلے زمانے میں "آن لے" اور "آس سے" کو ملا کر "آنے" اور "آسے" بھی لکھ دیا کرتے تھے۔ میرزا صاحب بھی دو لفظ ملا کر لکھ دینے کے عادی ہیں، مگر ان دونوں لفظوں کو نہیں ملاتے تھے، جن میں سے اول کا حرف اخیر اور دوسرے کا پہلا حرف ایک ہو۔ چنانچہ ان مثالوں میں کاتب کے دیوان کے اندر اصلاح کی ہے۔

(۱) مکاتیب: ۶، ۹، ۷، ۹۱، ۸، ۱۱، ۲۰، وغیرہ (۲) ایضاً: ۹۵، ۱۲۸، (۳) مقدمہ خطوط غالب از ڈاکٹر صدیقی
(۴) مکاتیب: ۱۱۳، ۱۲۲، ۸، ۳، (۵) مکاتیب: ۱، ۸، ۳، ۵

(۱۴) لفظ آئینہ جب فاعلن کے وزن پر نظم میں باندھا ہے، تو گسے "آینہ" لکھا ہے، "آئینہ" نہیں لکھا، اور یہی املا ناظم کو بتایا ہے۔ اسی طرح خامشی اور بیہدہ میں "و" کے اضافے کو منع کیا ہے۔

عربی الفاظ کا املا

میرزا صاحب عربی الفاظ کا املا ایرانیوں کے انداز پر لکھتے تھے۔

(۱) جناب نے ایک شعر میں "جزو لاینفک" لکھا تھا(۱) میرزا صاحب نے انھیں بتایا کہ بجائے اس کے "جزءِ لاینفک" لکھنا چاہیے۔ اس میں شک نہیں کہ ان کا اس لفظ کو سہ حرفی بتانا درست ہے، لیکن اس کے آخر میں ہمزہ کی جگہ واؤ لکھنا عجمیوں کا دستور ہے۔ مولوی نجم الغنی خاں مرحوم لکھتے ہیں:

"تبدیلِ حرف چنال کردہ بد ..... بمعنی ابتدا کردن و آغاز، ہمزۂ آخرا بواو بدل

کردند وہمچنیں در جزء، بمعنی پارۂ چیزی، بجائی ہمزہ واؤ نویسند دخوانند،

مگر بشرطی کہ آں را مضاف نمایند، چوں جزو کتاب وجزو بدن والا

در حالت پارسی بدون ہمزہ نویسند"(۲)

(۲) جن عربی اسم فاعل کے صیغوں میں الف کے بعد "ی" آتی ہے، جیسے دائم، قائم وغیرہ، اُن کا املا ہمزہ کے ساتھ ہے۔ مگر میرزا صاحب نے بیشتر "ی" کے ساتھ لکھا ہے اور اگر ہمزہ ہے، تو "ی" کے اوپر، چنانچہ مائدہ کو مایدہ، مطمئنہ کو مطمینہ، جائز کو جایز، اور طائر کو طایر(۳) لکھا ہے۔ لفظ قائل اور مائل کو پہلے قائل اور مائل لکھا تھا، اس کے تیرھویں بعد قایل اور مایل لکھا(۴)

(۳) یہی حال عربی کی اُن جمعوں کا ہے، جو فواعل وزن پر آتی ہیں، مثلاً حقائق، دقائق۔ میرزا صاحب نے انھیں بھی حقایق، دقایق، طبایع وغیرہ لکھا ہے۔ جو عجمیوں کی پیروی ہے۔

(۴) مولانا اور مولانا کی کتابت میں میرزا صاحب کے یہاں دو رنگی

(۱) مکاتیب: ۱۰۵ (۲) تیغ الادب: ۳۰۸ (۳) مکاتیب: ۲۷۶، ۹۷، ۱۰۱ (۴) ایضاً: ۱۱۱، ۲۲۲

(۵) ایضاً: ۴۰، ۵۴، ۲۰۲۔

پائی جاتی ہے۔ ایک مکتوب میں انھوں نے "مولانا" لکھا ہے۔ مگر اس کے سولہ دن بعد مولٰنا اور اولٰنا لکھا ہے[1]

(۵) لفظ "مؤیّد" اور "رؤسا" کو بے ہمزہ کے "مویّد" اور "ردسا" لکھا ہے[2]
یہ بھی مجمی تتبع ہے۔

املا کی غلطیاں

میرزا صاحب سے بعض الفاظ کے املا میں بھول چوک بھی ہوئی ہے۔
جو عربی، فارسی، اردو اور انگریزی ہر زبان کے لفظوں میں پائی جاتی ہے

(۱) اردو کا لفظ سوچنا ہے۔ اس کے مشتق "سوچ" کو انھوں نے "سونچ" اور سونچنا" لکھ دیا ہے[3] اسی طرح "پہنچنا" کے مشتق "پہنچا" کو ایک جگہ "پونچھا" لکھ گئے ہیں[3]۔ "گھٹائیں" ان کے قلم سے "گٹھائیں" بن گئی ہیں[4]۔ "اکھاڑ ڈالنا" کی جگہ "اُکھاڑ ڈالنا" اور "فرمائیے" کی جگہ "فرمایئے" تشدید ہے[5]۔

(۲) عربی کے معرف باللام اسموں سے پہلے حرفِ جر "ب" ہو، تو اُسے الف کے ساتھ ملا کر لکھتے ہیں۔ میرزا صاحب نے بالکل، بالفعل، باللہ کو "با الکل، با الفعل، اور با اللہ تحریر کر دیا ہے[6]

(۳) فارسی کے جن لفظوں میں الف کے بعد "ی" آتی ہے، جیسے گنجایش آیندہ وغیرہ، اُن کا صحیح املا "ی" کے ساتھ ہے، اور اسی طرح میرزا صاحب نے لکھا ہے، مگر پایندہ اور فزایندہ کو "پائندہ" اور "فزائندہ" لکھ دیا ہے[7]
خرم کو خورم بواو لکھ دیا ہے[8]، حالانکہ اسی کے مرکب "خرمی" کو بغیر واو لکھا ہے[9]

فارسی کے وہ لفظ جن کے آخر میں "بد" آتا ہے، جیسے موبد، اسپہبد، وہ بفتحِ با صحیح ہیں۔ میرزا صاحب نے اسپہبد، کو اسپہبُد بضم با لکھ دیا ہے[10]

(۴) انگریزی الفاظ اپنے زمانے کے تلفظ کے مطابق لکھے ہیں۔ چنانچہ لارڈ کو

(۱) مکاتیب: ۴۸، ۵(۲) ایضاً: ۳۰، ۷۴-(۳) ایضاً: ۴۱، ۷۰(۴) ایضاً: ۷۱(۵) ایضاً-۷۶(۶) ایضاً: ۴۸، ۷۳، ۷۴(۷) ایضاً: ۲۱، ۲۲، ۲۷(۸) ایضاً: ۱۰-(۹) ایضاً: ۷۶-(۱۰) ایضاً: ۳۶

"لارڈ" بورڈ" کو بوڑد، ریونو کو رینو، سارٹیفکٹ کو سارٹیفکٹ، پنشن کو پنسن، کلکٹر کو کلکتر، ہارڈنگ اور ڈلہوزی کو ہاردنگ اور ردلہوسی اور اسٹیشن کو اسٹیسن لکھدیا ہے۔

علاماتِ اوقاف

میرزا صاحب کی تحریروں میں پرانی علاماتِ اوقاف کا استعمال بھی پایا جاتا ہے۔ وہ پیراگراف کے آخر میں اکثر یہ علامت (ڈ) لکھتے ہیں۔ جو لفظ فقط کی طغرائی شکل ہے کبھی بارہ کا ہندسہ (۱۲) بھی اس مقصد کے لیے استعمال کرتے ہیں، جو لفظ "حد" کے عدد ہیں۔ اس ہندسے کے بارے میں لطیفے کے طور پر تہر کو لکھے ہے:

"صاحب، بندہ اثنا عشری ہوں، ہر مطلب کے خاتمے پر بارہ کا ہندسہ کرتا ہوں۔"(۱)

چند خطوں میں یہ علامت (صح) پیراگراف کے آخر میں لکھی ہے، جو لفظِ بیاض کا مخفف ہے۔ یہ علامت بادشاہوں کے فرامین کے آخر میں بھی پائی جاتی ہے، جس سے غرض یہ تھی کہ آگے کوئی لفظ نہیں لکھا جاسکے، اور اگر کوئی لکھدے، تو جعلی متصور ہو(۲) رفتہ رفتہ نہ صرف کسی تحریر کے آخر میں بلکہ ایک پیراگراف کے ختم پر بھی بطور علامتِ خاتمہ لکھنے لگے:

کبھی نئے جملے کے پہلے لفظ کے اوپر یہ شکل (ـــ) بناتے ہیں، جو عربی کے لفظ "بت" بمعنی قطع کی شکل ہے۔ کچھ خطوں میں نئے پیراگراف کے آغاز میں بھی یہ علامت بنائی ہے۔

ایک دو خطوں میں میرزا صاحب نے نئے پیراگراف کو دوسری سطر سے شروع کیا ہے، جو اس کی دلیل ہے کہ وہ انگریزی طریقِ کتابت سے آگاہ تھے۔

ایک خط میں صفحہ ختم ہو جانے کے باعث کچھ عبارت حاشیے پر

---

(۱) اردوی: ۲۵۷ (۲) رسالہ صلای عام دہلی، مئی سنہ ۱۹۱۳ء ص ۲۸۔

لکھنا پڑی تھی۔ اس کے ربط کی طرف اشارہ کرنے کے لیے انھوں نے (۱۵) کا ہندسہ متن کے آخر اور حاشیے کے شروع میں لکھا ہے!

شعر یا مصرع کے پہلے یہ علامت (ہ) ضرور لکھتے تھے، جو لفظ "بیت" کی مخفف شکل ہے۔ ایک بار نام و تاریخ لکھ دینے کے بعد کوئی بات یاد آئی، تو اسے "لہ" لکھ کر تحریر کیا ہے[1] عربی کا یہ فقرہ عموماً مجموعہای اشعار میں استعمال ہوتا ہے۔ چونکہ اس کے معنی ہیں "اس کا"، اس لیے کسی ایک شاعر کے متفرق شعر لکھتے وقت ہر نئے شعر سے پہلے "لہ" لکھ دیتے ہیں، تاکہ پڑھنے والے کو معلوم ہو جائے کہ یہ شعر بھی اسی شاعر کا ہے، جس کا شعر ابھی گزر چکا ہے۔ میرزا صاحب نے اسے نثر میں بھی استعمال کیا ہے۔

حسابی رقوم

میرزا صاحب نے روپیوں کی تعداد ظاہر کرنے کے لیے حسابی رقوم بھی لکھی ہیں، جو بسا اوقات تعداد ظاہر کرنے والے الفاظ کے اوپر لکھی گئی ہے، لیکن چند خطوں میں عبارت کے بجائے رقموں پر اور کچھ میں رقموں کی جگہ عبارت پر بھی اکتفا کی ہے۔

میرزا صاحب نے سَو روپے کی رقم کو اس طرح لکھا ہے (۱۰۰عہ) آج کل اسے ایک سو ایک پڑھا جائے گا۔ لیکن میرا خیال ہے کہ ایک کی رقم (عہ) انگریزی کے لفظ بمعنیٰ صرف کی جگہ لکھی گئی ہے۔ تاکہ کوئی شخص جعلسازی سے سو کی رقم کے آگے کچھ بڑھا نہ سکے۔

[1] مکاتیب: ۸، ۶ح ۱ (۲) ایضاً: ۱۰

طباعتِ خطوط

میرزا صاحب کی ممانعت

سب سے پہلے منشی شیو نرائن اور تفتہ کو میرزا صاحب کے خطوط کی طباعت کا خیال پیدا ہوا۔ ان دونوں نے علیحدہ علیحدہ میرزا صاحب کو اپنی تجویز سے مطلع کر کے اشاعت کی اجازت چاہی۔ اس عہد تک مراسلت میں انشا پردازی کے تمام اصول وضوابط کا لحاظ ضروری شمار ہوتا تھا، اور میرزا صاحب کے خیال میں زبانِ اردو کے لیے اس بارِ گراں کا تحمل دشوار تھا۔ چنانچہ ہنری اسٹوارٹ ریڈ صاحب کی فرمائشِ اردو کے جواب میں انھوں نے یہ لکھ بھیجا تھا کہ اس زبان میں زورِ قلم صرف کر کے معانیٔ نازک پیدا کرنا اور اس طرح اپنا کمالِ انشا ظاہر کرنا مشکل ہے۔ اس میں گنجائشِ عبارت آرائی کہاں، جو کوشش کی جائے؟ لہٰذا مجھے اس خدمت سے معاف رکھا جائے! علاوہ ازیں انھوں نے اردو مراسلت کاوش پژوہی سے بچنے کے لیے شروع کی تھی، اور اس وجہ سے کبھی قلم سنبھال کر اور دل لگا کر کوئی خط نہ لکھا تھا۔ ان یارانِ باصفا کی تجویز منظور کر لینے میں خطرہ ہوا کہ کہیں کمالِ انشائے فارسی کے مداح اردو نثر دیکھ کر شکوۂ سخن وری پر نکتہ چینی نہ کرنے لگیں، اور اردو کا یہ پھیکا پکوان فارسی کی اونچی دکان کی شہرت پر دھبا نہ لگا دے۔ اس لیے ۱۸ نومبر سنہ ۱۸۵۸ء کو منشی شیو نرائن کو جواباً لکھا:

"اردو کے خطوط جو آپ چھاپا چاہتے ہیں، یہ بھی زائد بات ہے۔ کوئی رقعہ

(۱) اردوئے معلیٰ ص ۲۲۳، ۲۲۴، ۳۶۷ پر وہ خطوط ملاحظہ ہوں جن میں میرزا صاحب نے اردو نثر لکھنے سے انکار کیا ہے، اور ساتھ ہی اس انکار کے وجوہ بھی بتائے ہیں۔

ایسا ہوگا کہ جو میں نے قلم سنبھال کر اور دل لگا لکھا ہوگا، ورنہ صرف تحریر سرسری ہے۔ اُس کی شہرت میری سخنوری کے شکوہ کے منافی ہے۔ اس سے قطع نظر کیا ضرور ہے کہ ہمارے آپس کے معاملات اوروں پر ظاہر ہوں، خلاصہ یہ کہ ان رقعات کا چھاپا میرے خلافِ طبع ہے۔"[1]

اسی اثنا میں تفتہ کا پُر زور نیاز نامہ آیا۔ اسے پڑھ کر ۲۰ نومبر ۱۸۵۸ء کو ادھر منشی شیو نراین کو لکھا:

"رقعوں کے چھاپے کے باب میں ممانعت لکھ چکا ہوں، البتہ اس باب میں میری رائے پر تم کو اور مرزا تفتہ کو عمل کرنا ضرور ہے۔"

اور اُس طرف تفتہ کی ہٹ کے جواب میں مشفقانہ تحریر کیا:

"رقعات کے چھاپے جانے میں ہماری خوشی نہیں ہے۔ لڑکوں کی سی ضد نہ کرو۔ اور اگر تمھاری اسی میں خوشی ہے؛ تو صاحب مجھ سے نہ پوچھو۔ تم کو اختیار ہے۔ یہ امر میرے خلاف رای ہے۔"[2]

اس کے بعد ان دونوں نے طباعت مکاتیب کے سلسلے میں کچھ نہیں لکھا جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ارادۂ طباعت فسخ کر دیا گیا تھا۔

<u>غالب کے خطوں کا پہلا مجموعہ: مہر غالب</u>

اس واقعہ کے دو سال بعد سنہ ۱۲۷۸ھ (۱۸۶۱ء) میں سرور اور منشی ممتاز علی خاں رئیس میرٹھ نے میرزا صاحب کی اجازت حاصل کیے بغیر ان خطوط کی طباعت کا تہیہ کیا، جو سرور کے نام میرزا صاحب نے لکھے تھے۔ ترتیب کا کام سرور کے سپرد ہوا اور طباعت کا ذمہ ممتاز علی خاں نے لیا۔ سرور نے کتاب کا نام مہر غالب رکھ کر اس کے

---

(۱) اردوی:۱، ۲۳۲ (۲) ایضاً: ۱۰۵۔

دیباچے میں لکھا ہے:

"ارباب علوم کو معلوم ہو کہ میں انکسار ظہور، عبدالغفور متخلص بہ سرور مارہروی بدو شعور سے اہلِ سخن کا طالب اور صاحبِ کمال کا خواہاں تھا۔ جب کلام بلاغت نظام رشکِ صائب فخرِ طالب، جناب اسد اللہ خاں غالب کا دیکھا، دل کو بھایا، یکتا پایا۔ ترسیلِ مراسلات میں قدم بڑھایا، ہر کتابت کا جواب آیا ...... جو نامہ کہ بنام میرے بعبارتِ اردو تحریر کیا، مکتوب سب سادہ رویوں سے دلربا تر، اور ہر سطر اس کی سلسلہ مویوں سے تاب فرسا زیادہ ہے۔ جس آنکھ نے دیکھا، وہ بینا ہے، جس کان نے سنا، وہ شنوا ہے۔ بس تنہا متلذذ ہونا اور آپ ہی آپ مزہ اٹھانا خلاف انصاف جانا۔ دل مائل تمام بشہرتِ عام ہوا اور ہنوز یہ قصد ناتمام تھا کہ بحسن اتفاق فخرِ زماں۔ وحیدِ دوراں۔ جناب ممتاز علی خاں صاحب، متوطنِ میرٹھ ...... رونق افزائے مارہرہ ہوئے ..... ایک روز محفل ممدوح میں ذکر ہمہ دانی و شیوہ بیانیِ جناب استادی و مخدومی درمیان آیا۔ ارشاد کیا کہ کلام میرزا صاحب نسیم جانفزا اور شمیم دلکشا ہے۔ فارسی کا کیا کہنا! اردو بھی یکتا ہے۔ نظم و نثر فارسی تو محلّی بحلیۂ انطباع ہوا، لیکن نثرِ اردو زیورِ طبع سے عاری رہا۔ اگر وہ خطوط کہ بنام تمھارے آئے اور تم نے سنائے ہیں، جمع کرو تو میں اس کے انطباع کا بیڑا اٹھاتا ہوں۔ اس تقریر سے نسیم تاثیر نے غنچۂ دل کھلایا۔ بخدای

(۱) اگرچہ سرور نے سنہ ۱۸۶۱ء میں میرزا صاحب کے خطوط مرتب کر لیے تھے، لیکن دیباچہ لکھنے کی نوبت سنہ ۱۸۶۳ء میں آئی اس لیے کہ عود ہندی (ص ۹۹) میں میرزا صاحب کا ایک خط اس دیباچے کی تعریف میں درج ہے، اور یہ سنہ ۱۸۶۳ء کا مکتوبہ معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ اس میں میرزا صاحب نے ماقبل مکتوب کا حوالہ دیا ہے اور ماقبل کا خط کثرتِ شور داو رام کی داستان پر مشتمل ہے، جو سنہ ۱۸۶۳ء کا واقعہ ہے۔

خاطر ظہور میں آیا۔ وہ مکتوب کہ بنام میرے آئے تھے، ترتیب دیے۔
گویا جواہرِ بے بہا کان گلدان سے نکال کر کشتیٔ اوراق میں جمع کیے۔

چونکہ محبت جناب غالب میرے حال پر محبت غالب ہے، لہٰذا نام اس
انشا کا مہرِ غالب وبجبر مہیم، مناسب ہے، سالِ ختم تالیف بھی اس نام
سے مطابق پایا۔"

یہ تجویز منظور ہو گئی اور منشی ممتاز علی خاں میرٹھ چلے آئے۔ ابھی طباعت شروع نہ ہوئی تھی کہ اُنھیں خیال پیدا ہوا کہ میرزا صاحب کے مزید رقعات تلاش کر کے اس مجموعے میں شامل کیے جائیں۔ اس خیال کی تکمیل میں قدرت نے امداد کی اور انھیں ایک اور مجموعے کا پتا چلا، جو میرزا صاحب کے علم اور اُن کی امداد سے مرتب کیا جا رہا تھا۔

غالب کے خطوں کا دوسرا مجموعہ

یہ مجموعہ بجنجر مرتب کر رہے تھے۔ انھوں نے اپنے ارادے کی اطلاع میرزا صاحب کو پہلے سے دیدی تھی اور خواہش کی تھی کہ اُن تمام خطوں کی نقول بھی مہیا کر دیں، جو دوسرے احباب اور شاگردوں کے نام لکھے گئے ہیں میرزا صاحب نے اس التماس کو قبول کر لیا تھا۔ لیکن اس وقت تک اُن کا یہ خیال تھا کہ صرف وہ خط مرتب کیے جائیں، جن میں کوئی ادبی خوبی ہو۔ روزمرہ کی نجی ضروریات پر مشتمل خطوں کو خارج کر دیا جائے، اس لیے بجنجر کو جواب میں لکھا تھا:

"آپ کو معلوم ہے کہ منشی حبیب اللہ ذکا اور نواب مصطفیٰ خاں حسرتی کو کبھی اردو خط نہیں لکھا۔ ہاں ذکا کو غزلِ اصلاح کے ہر شعر کے تحت میں منشاءِ اصلاح سے آگہی دی جاتی ہے، نواب صاحب کو یوں لکھا جاتا ہے، وہ کہار آیا۔ خط لایا۔ آم پہنچے۔ کچھ بانٹے، کچھ کھائے۔

۱. عود ہندی: ۶۲۵۔

"بچوں کو دعا۔ بچوں کی بندگی۔ مولوی الطاف حسین صاحب کو سلام۔
یہ تحریر اس ہفتے میں گئی ہے۔ غرضکہ عامیانہ لکھنا اختیار کیا ہے۔ اب
یہ عبارت جو تم کو لکھ رہا ہوں یہ لائقِ شمولِ مجموعۂ نثرِ اردو کہاں ہے؟
یقین جانتا ہوں کہ ایسی نثروں کو آپ خود نہ درج کرینگے۔"

اسی زمانے میں نساخ کو ایک خط لکھا تھا۔ اس کی نقل بیخبر کو روانہ کرتے ہوئے تمہیداً تحریر کرتے ہیں:

"پیرو مرشد، کوئی صاحب ڈپٹی کلکٹر ہیں کلکتے میں مولوی عبدالغفور خاں ان کا نام اور نساخ ان کا تخلص ہے۔ میری ان کی ملاقات نہیں انھوں نے اپنا دیوان چھاپے کا موسوم بہ دفترِ بے مثال مجھ کو بھیجا اس کی رسید مع تقریظ خط میں نے اُن کو لکھا۔ چونکہ یہ خط مجموعۂ نثرِ اردو کے لائق ہے۔ آپ کے پاس ارسال کرتا ہوں۔"[2]

مجموعۂ خطوط میں ان نجی خطوں کی موجودگی سے معلوم ہوتا ہے کہ بیخبر نے اُن کے اس مشورے کو نہ مانا، اور ہر قسم کے خط شاملِ مجموعہ کر لیے۔

مقامِ طباعت

میرزا صاحب کا خیال تھا کہ بیخبر اس مجموعے کو الہ آباد میں جہاں وہ مقیم تھے، طبع کرائیں گے، اس لیے ایک انگریز کے استفسار کے سلسلے میں بیخبر کو لکھا:

"جناب کمپس صاحب بہادر افسر مدارس غرب و شمال کا باوجود عدمِ تعارف خط مجھ کو آیا۔ کچھ اردو زبان کے ظہور کا حال پوچھا تھا۔ اس کا جواب لکھ بھیجا۔ نظم و نثرِ اردو طلب کی تھی۔ مجموعۂ نظم بھیج دیا۔ نثر کے باب میں تمہارا نام نہیں لکھا، مگر یہ لکھا کہ الہ آباد میں وہ مجموعہ چھاپا جاتا ہے۔ بعد انطباع و حصولِ اطلاع وہاں سے منگا کر بھیج دوں گا۔"[3]

(۱) عودِ ہندی: ۷۰، (۲) ایضاً: ۱۲۵، (۳) ایضاً: ۱۲۵۔

مگر بیخبر نے اس غلط فہمی کو دور کرتے ہوئے لکھا کہ منشی ممتاز علی خاں رئیس میرٹھ نے اپنے مطبع میں طباعت کا اہتمام کیا ہے۔ میرزا صاحب ان بزرگ سے واقف تھے، اس لیے بیخبر کی اس خبر پر اطمینان ظاہر کیا، اور جب بیخبر نے دوبارہ اُن کا ذکر کیا، تو تحریر فرمایا:

"حضرت پیر و مرشد، اس سے آگے آپ کو لکھ چکا ہوں کہ منشی ممتاز علی خاں صاحب سے میری ملاقات ہے، اور وہ میرے دوست ہیں"(۱)

طباعت میں تاخیر

بیخبر نے مکاتیب کی جمع و ترتیب کا کام سنہ ۱۸۶۱ء میں شروع کیا۔ میرزا صاحب کے مکتوب الیہوں میں سے جو بزرگ خود ان کے دوست تھے، اُن سے براہ راست، اور جن کی خدمت میں خود نیاز حاصل نہ تھا، اُن سے بتوسطِ غالب خطوط کی نقلیں مہیا کیں اور سنہ ۱۸۶۵ء میں یہ سلسلہ ختم کر دیا۔ لیکن میرزا صاحب نے، جو سنہ ۱۸۶۳ء کے بعد سے طباعت کا انتظار کرنے لگے تھے، آخرِ کار مجبور ہو کر تقاضا شروع کر دیا۔ چنانچہ ایک خط کے آخر میں بیخبر کو لکھا ہے:

"اوہ ہاں حضرت، وہ مجموعہ چھپے گا بالفتح، یا چھپے گا بالضم۔ چھپ چکا ہو تو حق التصنیف کی جتنی جلدیں منشی ممتاز علی خاں صاحب کی ہمت اقتضا کرے، فقیر کو بھیجیے"(۲)

احباب کے تقاضے

اس مجموعے کی ترتیب میں مختلف اصحاب کے پاس سے خطوط کی نقلیں منگائی گئیں تھیں، اس لیے ملک میں اس کی شہرت ہو چکی تھی جب اشاعت میں زیادہ تاخیر ہو گئی، تو میرزا صاحب کے پاس تقاضے کے

(۱) عودِ ہندی: ۱۳۸ (۲) ایضاً: ۱۲۵

خطوط آنے لگے۔ ان تقاضوں سے پریشان ہو کر میرزا صاحب نے ۲ مارچ سنہ ۱۸۶۶ء کو بےخبر کے نام حسب ذیل خط لکھا:

"ہاں، حضرت، کہیے، منشی ممتاز علی خاں کی سعی بھی مشکور ہوگی؟ وہ مجموعہ اردو چھپے گا، یا چھپا ہی رہے گا؟ احباب اس کے طالب ہیں، بلکہ بعض نے طلب کو بسرحد تقاضا پہنچا دیا ہے۔"(۱)

پنجاب احاطے کی مانگ

ان تقاضا کرنے والے احباب میں سب سے زیادہ حصہ زندہ دلانِ پنجاب نے لیا تھا۔ ان سے مجبور ہو کر میرزا صاحب نے منشی ممتاز علی خاں کو ملزم ٹھہراتے ہوئے بےخبر کو تحریر کیا:

"ہاں حضرت! یہ منشی ممتاز علی خاں کیا کر رہے ہیں؟ رقعے جمع کیے اور نہ چھپوائے۔ فی الحال پنجاب احاطے میں اس کی بڑی خواہش ہے۔ جانتا ہوں کہ وہ آپ کو کہاں ملیں گے جو آپ ان سے کہیں۔ مگر یہ تو حضرت کے اختیار میں ہے کہ جتنے میرے خطوط آپ کو پہنچے ہیں، وہ سب یا ان سب کی نقل بطریق پارسل مجھ کو بھیج دیں۔ جی یوں چاہتا ہے کہ اس خط کا جواب وہی پارسل ہو۔"(۲)

میرزا صاحب کا دیباچہ

غالباً اس کے جواب میں بےخبر نے میرزا صاحب کو لکھا کہ آپ مجموعۂ نثر اردو کے لیے دیباچہ لکھ کر روانہ فرمائیں، تو کتاب مطبع کو بھیجی جائے۔ اس سلسلے میں میرزا صاحب نے تحریر فرمایا:

"میں صاحبِ فراش ہوں، اٹھنا بیٹھنا ناممکن ہے۔ خط لیٹے لیٹے لکھتا ہوں۔ اس حال میں دیباچہ کیا لکھوں؟"(۳)

بےخبر نے اس کے بعد بھی دیباچہ لکھنے کی درخواست کی تو انھیں ظریفانہ

(۱) عود: ۱۳۲، (۲) ایضاً: ۱۳۵، (۳) ایضاً: ۱۳۸۔

انداز میں لکھا:

"بندہ پرور! اگر ایک بندۂ قدیم، کہ عمر بھر فرمان پذیر رہا ہو، بڑھاپے میں ایک حکم بجا نہ لائے، تو مجرم نہیں ہو جاتا۔ مجموعۂ نثر اردو کا انطباع اگر میرے لکھے ہوئے دیباچے پر موقوف ہے، تو اس مجموعے کا چھپنا بالفعل میں نہیں چاہتا بلکہ نہ چھپ جانا بالعزم چاہتا ہوں۔ سعدی علیہ الرحمہ، فرماتے ہیں:

رسم است کہ مالکانِ تحریر — آزاد کنند بندۂ پیر

آپ بھی اسی گروہ، یعنی مالکانِ تحریر، میں سے ہیں پھر اس شعر پر عمل کیوں نہیں کرتے۔"

عود ہندی

بیخبر نے میرزا صاحب کا عذر تسلیم کر کے اپنے جمع کردہ خطوط منشی ممتاز علی خاں کے پاس بھیج دیے۔ منشی صاحب نے سرور اور بیخبر کے مجموعہای مکاتیب کو یکجا کر کے عود ہندی نام رکھا، اور خود دیباچہ لکھ جمع و ترتیب میں سعی کرنے والے اصحاب کی محنت کی اس طرح داد دی:

... نجم الدولہ اسد اللہ خاں بہادر غالب مدظلہ کی ذاتِ باکمالات محتاج تعریف نہیں۔ ... سارا ہندوستان جانتا ہے۔ ایران تک ان کی جادو بیانی کا چرچا ہے۔ مجھے مدت سے اس کا خیال تھا کہ فارسی کی تصنیفیں تو ان کی بہت مرتب ہوئیں اور چھاپی گئیں ... مگر کلام اردو نے سوائے ایک دیوان کے ترتیب نہ پائی۔ یہ دولت ارباب شوق کے ہاتھ نہ آئی۔ حالانکہ نثر اردو ان کی اور وں کی

(۱) عود: یہاں یہ امر واضح کر دینا باعث دلچسپی ہوگا کہ تحریر کے معنی غلام آزاد کرنے کے ہیں، اور مالک تحریر وہ شخص کہا جاتا ہے جس کے پاس غلام ہو۔ میرزا صاحب نے ازراہ لطیفہ تحریر سے عام بول چال کے مطابق لکھنا مراد لیا۔ مطلب یہ کہ مالک تحریر کو منشی اور بیخبر ہم معنی قرار دے کر بیخبر سے خواہش کی کہ جب آپ خود مالک تحریر ہیں تو مجھ سے کیوں لکھواتے ہیں، دیباچہ خود کیوں نہیں لکھ دیتے۔

فارسی سے ہزار درجہ بہتر ہے۔ یہ سلاست بیان، یہ شستگیٔ زبان، روزمرہ کی صفائی، اداؤں کی شوخی، کسی کو کب میسر ہے؟ اُسے بھی ترتیب دیجیے۔ قدر دانوں پہ احسان کیجیے۔ میرے عنایت فرما اور میرزا صاحب کے شاگرد یکتا چودھری عبد الغفور صاحب سرور تخلص سے یہ ذکر آیا۔ تو اُنھوں نے جتنے خطوط میرزا صاحب کے اُن کے نام آئے تھے، سب کو یکجا کر کے اور ا سپر ایک دیباچہ لکھ کے وہ مجموعہ عنایت کیا۔ عرصے تک سرگرم تلاش رہا۔ جابجا سے اور تحریریں میرزا صاحب کی بہم پہنچائیں۔ بڑی محنت اٹھائی، تب تمنا بر آئی، اور مجموعہ مرتب ہوا۔ آج پورا اپنا مطلب ہوا۔

خواجہ غلام غوث خاں صاحب بہادر بیخبر، جو نواب معلیٰ القاب لفٹننٹ گورنر بہادر ممالک مغربی و شمالی کے میرمنشی اور میرے مخدوم خاص اور حضرت غالب صاحب کے مخلص باختصاص ہیں، اس تلاش میں میرے معین اور مددگار رہے۔ بہت کچھ ذخیرہ اُن کی بدولت بہم پہنچا۔

اس کتاب کی دو فصل اور ایک خاتمہ ہے۔ پہلی فصل میں چودھری صاحب کے مرتب کیے ہوئے خطوط اور اُن کا لکھا ہوا دیباچہ، دوسری فصل میں میرے جمع کیے ہوئے رقعات، اور خاتمے میں چند نثریں ہیں، جو جناب غالب نے اوروں کی کتابوں پر تحریر فرمائی ہیں۔ عود ہندی اس کتاب کا نام ہے۔"[1]

عود ہندی کا سال طباعت

عود ہندی کا یہ ایڈیشن منشی ممتاز علی خاں نے اپنے مطبع مجتبائی واقعہ شہر میرٹھ میں طبع کیا۔ کتاب ۱۰۸ صفحوں پہ تمام ہوئی۔ خاتمہ قلق

۱۔ عود: ۳۰۲ -

میر تھی نے لکھا۔ آخر میں چار تاریخی قطعے اضافہ کیے گئے۔ ان میں ایک قلق کا، ایک اُن کے شاگرد محمد میرٹھی کا اور بقیہ دو غالباً خود منشی ممتاز علی خاں کے ہیں۔

ان قطعات سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۸۵ ہجری میں طباعت پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ آخری صفحے کے نچلے گوشے میں ۱۰ رجب سنہ ۱۲۸۵ ہجری (۲۷ اکتوبر سنہ ۱۸۶۸ء) درج ہے، جس سے تاریخ و ماہ بھی متعین ہو جاتے ہیں۔

میور صاحب کی نذر

آخری قطعے کے مطالعے سے ایک نئی بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ منشی ممتاز علی خاں نے میور صاحب (سر ولیم میور گورنر ممالک مغربی و شمالی) کی خدمت میں عود کا مطبوعہ نسخہ نذر گزرانا تھا۔ سر ولیم میور علوم مشرقیہ کے عالم تھے۔ بتجربے، جو عود ہندی کی جمع و ترتیب میں برابر کے شریک تھے، طابع کو مشورہ دیا ہوگا کہ مطبوعہ نسخہ صوبے کے اعلیٰ حاکم کے نام معنون کر کے نشر و اشاعت کی تکمیل پر مہر توثیق ثبت کریں۔ اس زمانے میں اردو زبان میں، ایسی نادر کتابیں معدودے چند شائع ہوئی تھیں۔ گورنمنٹ بعض سیاسی مصالح کے ماتحت نئی مفید کتابوں کی اشاعت میں، انعام کے نام سے یا امداد طبع کہہ کر اخراجات کا بار اٹھا لیا کرتی تھی بعید نہیں کہ منشی صاحب کو بھی کچھ روپیہ مل گیا ہو۔

میرزا صاحب کا حق تصنیف

ایک بار میرزا صاحب نے کتاب کی فوری اشاعت کا تقاضہ کرتے ہوئے بیخبر کو لکھا تھا:

"اور ہاں، حضرت، وہ مجموعہ چھپ چکا ہو تو حق التصنیف کی جتنی جلدیں منشی ممتاز علی خاں صاحب کی ہمت اقتضا کرے، فقیر کو بھیجیے۔"

عودِ ہندی میرزا صاحب کے انتقال سے کئی ماہ پہلے شائع ہو چکی تھی۔ لیکن ان کے مکاتیب میں اس کی طباعت یا حقِ تصنیف کے نسخوں کی وصولیابی کا ذکر نہیں پایا جاتا۔

عود کے رقعات کی تعداد

عودِ ہندی کے کل رقعات کی تعداد ۱۶۲ ہے۔ ان میں ۲۵ سرور کے نام، ۲ صاحب عالم مارہروی کے نام، ۲ شاہ عالم مارہروی کے نام، ۲۰ شفق کے نام، ۲ عزیز کے نام، ۱۳ مجروح کے نام، ۱ میر سرفراز حسین کے نام، ۱ اعلائی کے نام، ۱ تفتہ کے نام، ۱۸ قہر کے نام، ۲۵ بیخبر کے نام، ۱ نساخ کے نام، ۱ ظہیر الدین خاں کی طرف سے اُن کے چچا کے نام، ۱۰ شیفتہ کے نام، ۱ رعنا مرادآبادی کے نام، ۱ مرزا رحیم بیگ کے نام، ۱ شاکر کے نام، ۱۵ جنون بریلوی کے نام، ۱ مولوی عزیز الدین کے نام، ۱ سید محمد عباس صاحب کے نام، اور منشی غلام بسم اللہ صاحب کے نام ہے۔

ان خطوط کے علاوہ دو تقریظیں، قہر کی مثنوی کی تقریظ اور سرور کی گلزارِ سرور کی تقریظ، اور تین دیباچے، حدائق الانظار کا دیباچہ، قواعد تذکیر و تانیث کا دیباچہ، اور مرزا قطب حسین خاں بہادر کے مجموعۂ قصائد کا دیباچہ بھی کتاب میں شامل ہیں۔ ایک خط بیخبر کا بھی درج کیا گیا ہے۔ جو میرزا صاحب کے خط کا جواب اور اپنی ادبی خوبیوں کی وجہ سے مرتب کی نظر میں شاملِ مجموعہ ہونے کے قابل تھا۔

غالب کے خطوں کا تیسرا مجموعہ

ابھی عودِ ہندی طبع ہونے نہ پائی تھی کہ اطرافِ ہند سے میرزا صاحب کے مجموعۂ خطوط کی مانگ شروع ہو گئی۔ میرزا صاحب نے بیخبر کو اُن کے مرتب کردہ مجموعے کی طباعت کے متعلق بار بار لکھا، اور جب سال بھر کا

گزرنے لگا اور کسی طرح کتاب نہ چھپی، تو انھیں اس کی طباعت کی طرف سے مایوسی ہو گئی۔ احباب دہلی نے میرٹھ کے کار پردازوں کا تساہل دیکھ کر اس شرف کو خود حاصل کرنے کا تہیہ کیا، اور مالک اکمل المطابع دہلی کو، خراجات طباعت برداشت کرنے پر آمادہ کیا۔ اب خطوط کی فراہمی کا مسئلہ باقی رہتا تھا۔ وہ اس طرح حل ہو گیا کہ خود میرزا صاحب جو اپنی انشا کی حقیقی قدر و قیمت اور بازاری مانگ سے باخبر ہو چکے تھے، اس میں ہاتھ بٹانے کے لیے تیار ہو گئے۔ چاروں طرف اہل خطوط یا ان کے نقول کی طلب میں خطوط لکھے گئے، اور رفتہ رفتہ کافی ذخیرہ فراہم ہو گیا۔ اس سلسلے میں خود میرزا صاحب نے جن احباب کو لکھا اُن میں سے تجبر اور علائی کے متعلق دستاویزی ثبوت موجود ہے۔ بقیہ اصحاب نے میرزا صاحب کے تقاضائی خطوط کی نقلیں نہیں بھیجیں، اس لیے کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کون بزرگ تھے، جنھیں خود میرزا صاحب نے ارسالِ نقول کے لیے لکھا تھا۔ تجبر کے نام کا خط پنجاب احاطے کی مانگ کے تحت درج ہو چکا ہے۔ علائی کو سب سے پہلا مکتوب ان کے لوہارو پہنچنے کے بعد لکھا ہے۔ فرماتے ہیں:

"مقصود ان سطور کی تحریر سے یہ ہے کہ مطبع اکمل المطابع میں چند احباب میرے مسودات اردو جمع کرنے پر اور اس کے چھپوانے پر آمادہ ہوئے ہیں، مجھ سے مسودات مانگے ہیں، اور اطراف و جوانب سے بھی فراہم کیے ہیں۔ میں مسودہ نہیں رکھتا۔ جو لکھا وہ جہاں بھیجنا ہو، وہاں بھیج دیا۔ یقین ہے کہ خط میرے تمھارے پاس بہت ہوں گے۔ اگر ان کا ایک پارسل بنا کر بسبیل ڈاک بھیج دو گے، یا آج کل میں کوئی ادھر آنے والا ہو، اس کو دیدو گے، تو موجب میری خوشی کا ہوگا۔ اور میں ایسا جانتا ہوں کہ اس کے چھاپے

جانتے سے تم بھی خوش ہوگے "۱

اس خواہش کی تکمیل میں علائیؔ نے پس وپیش کیا۔ میرزا صاحب نے سمجھا کہ غالباً نواب صاحب نجی معاملات کی اشاعت کے خیال سے گریز کر رہے ہیں۔ اگرچہ کچھ عرصہ قبل خود میرزا صاحب نے تفتہؔ کو یہ کہکر اشاعت خطوط سے روکا تھا کہ نجی واقعات کو منظرِ عام پر لانا کیا ضرور ہے، لیکن اب انکا ادبی عقیدہ بدل چکا تھا، اس لیے نواب صاحب کے اس خیال کی تردید میں تحریر کیا:

"میرے خطوط اردو کے ارسال کے باب میں جو کچھ تم نے لکھا، تمہارے حسن طبع پر تم سے بعید تھا، میں سخت بے مزہ ہوا۔ اگر بے مزگی کے وجوہ لکھوں، تو شاید ایک تختۂ کاغذ سیاہ کرنا پڑے۔ اب ایک بات موجز و مختصر لکھتا ہوں۔ سنو بھائی، اگر اُن خطوط کا تم کو اخفا منظور ہو، اور شہرت تمھارے منافی طبع ہے، تو ہرگز نہ بھیجو۔ قصہ تمام ہوا۔ اور ان کے تلف ہونے کا اندیشہ ہے، تو میرے دستخطی خطوط اپنے پاس رہنے دو، اور کسی متصدی سے نقل اتروا کر بیجا ہو کسی کے ہاتھ چاہو۔ بسبیل پارسل ارسال کرو، لیکن جلد۔ خدا کے واسطے کہیں غصے میں آ کر عطائی تو بلقای تو، کہکر اصل خطوط نہ بھیجدینا، کہ یہ امر میرے مخالفِ مقصود ہے"۔۲

معلوم ہوتا ہے کہ اس خط کے بعد بھی علائیؔ نے ارسالِ نقول میں توقف کیا تھا، مگر میرزا صاحب نے پھر اس کے متعلق کچھ نہ لکھا، اور جب انہوں نے اصل خطوط بھیجکر میرزا صاحب کے ترکِ طلب کا سبب دریافت کیا، تو صبح شنبہ ۳۰ مئی سنہ ۱۸۶۳ء کو ازراہِ معذرت لکھا:

"لاموجود الا اللہ! اس خدا کی قسم، جس کو میں نے ایسا مانا ہے، اور

۱؛ اردوی ۱۹۰۳، ۲۰۰؛ ایضاً، ۲۲۳۔

اس کے سوا کسی کو موجود نہیں جانتے ہے، کہ خطوط کے ارسال کو مکرر نہ لکھنا از راہ ملال نہ تھا۔ طالب کے ذوق کو سست پاکر میں متوقف ہو گیا۔ متوسط ایک جلیل القدر آدمی اور طالب کتب کا سوداگر ہے۔ اپنا نفع نقصان سوچے گا، لاگت بچت کو جانچے گا۔ میں متوسط کو مہتمم سمجھا تھا، اور یہ خیال کیا تھا کہ یہ چھپوائے گا۔ بہر حال ایک جگہ سے لیکر اُن کو بھیجے۔ اس کی رسید میں تقریباً انھوں نے طلب رقعات بہ تکلیف سوداگر لکھی، اور اس سوداگر کو مفقود الخبر لکھا۔ ظاہرا کتابیں لیکر کہیں گیا ہو گا۔ یا کتابیں لینے گیا ہو گا۔ یہ ۲۳ لفافے اور ۴۳ خط بدستور میرے مجلس میں موجود و محفوظ رہیں گے اگر متوسط بتقاضا طلب کرے گا، ان خطوط کی نقلیں اُس کو اور اصل تم کو بھیجدوں گا، ورنہ تمہارے بھیجے ہوئے کاغذ تم کو پہنچ جائیں گے ۔"[۱]

غالباً اس خط کی روانگی کے بعد ہی مہتمم مطبع نے خطوط کی نقلیں حاصل کرلیں میرزا صاحب یک شنبہ ۳۰ محرم الحرام سنہ ۸۰ ۱۲ (۲۱ جون سنہ ۱۸۶۳ء) کو اصل خطوط واپس کرکے لکھتے ہیں:

"میری جان! مرزا علی حسین خاں آئے اور مجھ سے ملے میں نے خطوط مرسلہ تمہارے یک مشت اُن کو دیے۔ اب تمہارے پاس بھیجے کا اُن کو اختیار ہے، رسید کا البتہ مجھے انتظار ہے۔"[۲]

اردوی معلیٰ

خطوط کا یہ پہلا مجموعہ اردوی معلیٰ کے اسم سے موسوم ہوا۔ مجروح نے اس کا دیباچہ اور سالک نے اس کا خاتمہ لکھا۔ کتاب دو حصوں میں منقسم ہوئی۔ پہلے حصہ میں صاف صاف عبارت کے خط تحریر کیے

(۱) اردوی معلیٰ: ۲۴۰ و ۲۴۲، ایضاً ۴۰۸ ۔

تا طلبائے مدرسہ فائدہ اٹھائیں، دوسرے حصے میں مطالب مشکلہ کی تحریر اور تقریظ وغیرہ تھی۔ ۱ غالباً پہلی بار صرف حصہ اول شائع ہو سکا، اس لیے کہ کتب خانۂ عالیہ رامپور میں جو نسخہ موجود ہے، وہ مکمل ہوتے ہوئے صرف حصہ اول پر مشتمل ہے۔

اردوئے معلیٰ کا سال طباعت

لیکن بظاہر یہ یقین کرنے کے تمام وجوہ موجود تھے کہ خطوط کا یہ مجموعہ جلد از جلد شائع ہوگا۔ لیکن قدرت نے اس ادبی انقلاب کی اولیت کا شرف میرٹھ ہی کو ودیعت کیا تھا۔ عود ہندی ۱۰ رجب سنہ ۱۲۸۵ھ کو شائع ہوگئی، اور اردوئے معلیٰ میرزا صاحب کے انتقال کے ۱۹ دن بعد، ۲۱، ذیقعدہ سنہ ۱۲۸۵ھ (۶ مارچ سنہ ۱۸۶۹ء) کو چھپ کر تیار ہوا۔ ۲

سالک نے سال طبع لکھا:

کیا کہوں کچھ نہیں جاتا — لب پہ نالوں کا ازدحام ہوا
صدمۂ مرگ حضرت غالب — سبب رنج خاص و عام ہوا
ہے یہی سال طبع و سال وفات — آج ان کا سخن تمام ہوا

مقام طباعت اور حق تصنیف

اردوئے معلیٰ، دلی کے مطبع اکمل المطابع میں طبع ہوا۔ حکیم غلام رضا خاں اس کے مالک، میر فخرالدین مہتمم، اور لالہ بہاری لال منشی تھے۔ ۳

کتاب کے آخر میں ایک اعلان شائع ہوا کہ اس کا حق تصنیف میرزا صاحب نے حکیم غلام رضا خاں کو عطا کر دیا ہے، اور ایک رقعہ بطور سند لکھ دیا ہے، لہٰذا کوئی صاحب حکیم صاحب کی بلا اجازت رقعات چھاپنے کا قصد نہ کریں۔ اس کے بعد میرزا صاحب کی حسب ذیل تحریر چھپی:

"پیکر بے روح و رواں، فقیر اسد اللہ خاں غالب تخلص بہ میرزا نوشہ کہتا ہے

۱۔ اردوئے معلیٰ، ۵۰۲۔ ۲۔ ایضاً، ۵۰۸۔ ۳۔ ایضاً، ۵۱۸۔

"اور لکھ دیتا ہے کہ یہ جو اردوئے معلیٰ تصنیف فقیر مطبع اکمل المطابع دہلی میں چھاپا ہوا، سو میں نے از راہِ فرطِ محبت اپنا حق تالیف نورِ چشم اقبال نشان، حکیم غلام رضا خاں کو بخش دیا ہے اور اس حق کو خاص ان کا حق کیا۔ اب اگر کوئی صاحب اگر مالک اکمل المطابع حکیم غلام رضا خاں کے بے اطلاع اردوئے معلیٰ کے چھاپنے کا قصد کریں گے، تو مواخذے سے محفوظ نہ رہیں گے، اور فوراً حسب منشاء قانون بستم سنہ ۱۸۴۷ء سزا پائیں گے۔ مہر نجم الدولہ دبیر الملک اسد اللہ خاں بہادر نظام جنگ ۱۲۸۵ھ"

اردوئے معلیٰ کا پہلا ایڈیشن

اردوئے معلیٰ حصۂ اول کا پہلا ایڈیشن ۴۴۸ صفحات پر مشتمل ہے، جن میں ۵ صفحے مجروح کے دیباچے کے ہیں۔ پانچویں صفحے کی پندرھویں سطر سے خطوط شروع ہو کر صفحہ ۴۰۵ کی تیرہویں سطر پر ختم ہوتے ہیں، اور باقی چار سطریں خاتمۃ الطبع پر مشتمل ہیں۔ صفحہ ۴۰۵ سے ۴۴۲ کی ساتویں سطر تک سالک کا خاتمہ ہے۔ اس کے بعد جوہر کی تاریخ طبع، اور پھر اسی صفحے کی گیارہویں سطر سے صفحہ ۴۴۸ کی تیرہویں سطر تک تصحیح اغلاط کا نقشہ ہے۔ بعد ازاں میرزا صاحب کا اعلان عطیۂ حق تالیف ہے۔ کتاب خانۂ رامپور کے نسخے کے شروع میں زرد رنگ کا سرورق تھا[1] یہ میرزا صاحب کی زندگی ہی میں چھپ گیا تھا، اس لیے اس میں انھیں مرحوم نہیں لکھا گیا ہے۔

رقعات کی تعداد

اردوئے معلیٰ کے اس ایڈیشن کے رقعات کی کل تعداد ۲۰۷ ہے

(۱) اردوئے: ۴۴۹؛ ڈاکٹر صدیقی صاحب (الٰہ آباد) کے پاس اس ایڈیشن کے دو نسخے ہیں؛ ان دونوں کی لوح گہرے سبز رنگ کے کاغذ کی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ لوح کے لیے مختلف رنگوں کے کاغذ کا اہتمام کیا گیا تھا۔

ان میں ۵ نواب میر غلام بابا خاں بہادر کے نام، ۱۰ سیاح کے نام، ۱۰ ذکا کے
نام، ۹، تفتہ کے نام، ۳ شاہزادہ بشیر الدین صاحب بہادر کے نام، ۵ سید
بدر الدین المعروف بہ فقیر کے نام، ۱۲ سرور مارہروی کے نام، ۲ میر سرفراز حسین
کے نام، ۳۴ مجروح کے نام، ۲ شاہ عالم صاحب کے نام ۲ صاحب عالم
کے نام، ا نساخ کے نام، ۱ عزیز کے نام ۱۱ قاضی عبدالجمیل جنون بریلوی
کے نام، ۲ رعنا مراد آبادی کے نام، ۲ شاکر کے نام، ۱ مولوی عزیز الدین کے نام
۱ مفتی سید عباس کے نام، ۲۳ حکیم غلام نجف خاں کے نام، ۱ نجم الدین حید خلل
کے نام ۵ وفا کے نام، ۲ مولوی احمد حسن قنوجی کے نام، ۱ حکیم سید احمد حسن مودودی
کے نام، ۱ تفضل حسین خاں کے نام، ۱۸ قہر کے نام، ۲ منشی نبی بخش کے نام،
۱ منشی عبداللطیف ابن منشی نبی بخش کے نام، ۱۴ ہجر کے نام، ۱ نیر کے نام،
۱ مرزا شہاب الدین احمد خاں کے نام، ۱۹ شفق کے نام، ۳ میرن صاحب
کے نام، ۲ سالک کے نام، ۲ رضوان کے نام، ۲ کاظم کے نام، ۲ حسین مرزا
کے نام، ۱۲ یوسف مرزا کے نام، ۳۴ منشی شیو نراین کے نام، ۲ بابو ہرگوبند
سہای کے نام، ۶ نواب امین الدین احمد خاں بہادر کے نام، ۵۷ علائی کے
نام ۱۰ فرخ مرزا کے نام، ۲ میکش کے نام، ۱ حکیم غلام مرتضیٰ خاں کے نام،
۱ حکیم غلام رضا خاں کے نام، ۲ ماسٹر پیارے لال کے نام ۲۰ جوہر کے نام
۱ منشی ہیرا سنگھ کے نام، ۱ اور ۲ مشتاق کے نام ہیں۔

اردوی معلی حصۂ دوم

غالباً مرزا صاحب کے یکایک انتقال کے صدمے نے مہتممین اشاعت
اردوی معلی کو حصہ دویم کی ترتیب و طباعت کی طرف سے برداشتہ خاطر
کر دیا، اور یہ حصہ دیباچے کے وعدے کے باوجود شائع نہ ہو سکا
سنہ ۱۸۹۹ء میں مولوی عبدالاحد مرحوم، مالک مطبع مجتبائی دہلی
نے اردوی معلی کی اشاعت کا ارادہ کیا۔ خواجہ حالی مرحوم نے حصہ دوم کے لیے

کچھ مواد عطا فرمایا، جو مہتمم طباعت نے حصہ دوم کے نام سے آخر میں شامل کردیا۔ خود عبدالاحد مرحوم کے الفاظ میں: "اس حصے میں خاصکر وہ رقعات ہیں جن میں انھوں نے (میرزا صاحب نے) لوگوں کو اصلاحیں دی ہیں، یا شاعری کے متعلق کوئی ہدایت کی ہے، یا کوئی نکتہ بتایا ہے، اور بعض کتابوں کے دیباچے اور ریویو بھی ہیں"

چونکہ مجروح نے بھی تقریباً اسی قسم کے خطوط مرتب کرنے کا وعدہ کیا تھا، اس لیے کچھ بعید نہیں ہے کہ مجروح کا ذخیرہ خواجہ صاحب کو مل گیا ہو، اور مہتمم مطبع نے اس حقیقت کا اظہار کیے بغیر کتاب چھاپ دی ہو۔

نسخۂ مجتبائی کا حصہ دوم ۶۹ صفحات پر مشتمل ہے۔ ابتدا میں، سفر دں کا ایک مختصر تقریبی نوٹ ہے۔ اس کے بعد سراج المعرفت اور حدائق الانظار کے دیباچے ہیں۔ بعدازاں شاہ ظفر کی ایک کتاب اور سرور کی گلزار سرور کی تقریظیں ہیں۔ ان کے بعد دیوان ذکا، میرزا کلب حسین خاں نادر بنارسی کی ایک کتاب، نیز رسالۂ تذکیر و تانیث مصنفۂ صفیر بلگرامی کے دیباچے ہیں۔ یہ تمام دیباچے اور تقریظیں صفحات ۱۔۱۳ پر درج ہیں۔ ان کے بعد اسی صفحے سے اصلاحی خطوط شروع ہوتے ہیں، جن میں ۴۳ خطوط تفتہ کے نام، ۱ ماسٹر پیارے لال کے نام، ۵ ذکا کے نام، ۵ سیاح کے نام، ۲ شاہزادہ بشیرالدین کے نام، ۱ ہشیار کے نام، ۱ مولوی کرامت علی کے نام، ۱ جوہر کے نام، ۱ منشی ہیرا سنگھ کے نام، اور ۲ مجروح کے نام ہیں۔

ضمیمۂ اردوی معلی

سنہ ۱۲۲۹ء میں شیخ مبارک علی صاحب، تاجر کتب لاہور نے اردوی معلی کے حصہ اول و دوم کے ساتھ خوشتر کا مرتب کیا ہوا ایک ضمیمہ

شائع کیا ہے۔ یہ ۲۳ خطوط پر مشتمل ہے، جن میں سے ۲۲ قدر بلگرامی کے نام، اور ایک شیخ لطیف احمد بلگرامی کے نام ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ تمام خطوط مولوی علی اصغر صاحب بلگرامی نے مولانا حسرت موہانی کے ماہانہ رسالے "اردوئے معلی"، علیگڑھ، کے دسمبر سنہ ۱۹۰۰ء کے پرچے میں شائع کیے تھے۔ سر نوشی نے اس پرچے کے حوالے بغیر خطوط نقل کر دیے ہیں۔

اس ضمیمے کے آغاز میں دو خط اور شامل کیے گئے ہیں، جو شیخ صاحب کو شفیق مکرم آغا محمد باقر، نبیرۂ حضرت آزاد دہلوی، سے دستیاب ہوئے تھے۔

میرزا صاحب کے خطوط کا آخری مجموعہ: مکاتیب غالب

مذکورۂ بالا مجموعوں کی اشاعت سے ساٹھ پینسٹھ برس بعد ریاستِ عالیۂ رامپور کی طرف سے میرزا صاحب کے اُن خطوط کا مجموعہ مکاتیبِ غالب کے نام سے شائع کیا جا رہا ہے، جو موصوف نے نواب فردوس مکاں، نواب خلد آشیاں یا وابستگانِ دربار کو لکھے تھے۔

سرکارِ رامپور سے میرزا صاحب کی مراسلت بارہ سال تک جاری رہی۔ اس عرصے میں اہلِ رامپور سے بھی اُن کے خاصے تعلقات قائم ہو گئے تھے اور متعدد اصحاب سے خط کتابت بھی رہتی تھی۔ لیکن سوءِ اتفاق سے اُس کی مراسلت کا بڑا حصہ ضائع ہو گیا۔ اس مجموعے میں صرف وہ خط مرتب کیے گئے ہیں، جو دار الانشا میں محفوظ تھے۔

مکاتیب کی تعداد

مجموعۂ ہذا کے مکاتیب کی تعداد ۱۱۹ ہے؛ اُن میں سے ۳۴ خط نواب فردوس مکاں کے اور ۳۷، نواب خلد آشیاں کے حضور میں

چھپے ہوئے تھے۔ بقیہ میں سے ۲ صاحبزادہ سید زین العابدین خاں بہادر کے نام، ۲ صاحبزادہ سید عباس علی خاں بہادر بیتاب کے نام، منشی سیلچند میر منشی کے نام، ۱ خلیفہ احمد علی احمد رامپوری کے نام، اور ۱ مولوی محمد حسین خاں، مدیر دبدبۂ سکندری، کے نام ہے۔

نواب فردوس مکاں کے نام کے خطوط میں، ۲ فارسی زبان کے اور بقیہ ۹۳ اردو کے ہیں۔ اور چونکہ مجموعے میں ایک فارسی قصیدہ مستقل نمبر کے تحت درج ہوا ہے، بنا بریں اُن کے نام کے خطوں کی تعداد ۹۶ اور کل مکتوبات کا شمار ۱۳۰ ہو گیا ہے۔

گم شدہ خطوط کی تعداد

نواب فردوس مکاں اور نواب خلد آشیاں کے فرامین کے مسودوں نیز مرزا صاحب کے زیرِ نظر مکاتیب میں تقریباً ۱۳۵ ایسے خطوں کے حوالے ملتے ہیں جو مسلوں میں موجود نہیں ہیں۔ یہ سب خط بھی محفوظ ہوتے، تو مکاتیبِ غالب کی تعداد ۲۶۴ ہوتی، جو اور بڑھ جاتی، اگر اُن کی اہلِ شہر سے خط کتابت بھی دستیاب ہو سکتی۔ لیکن

دردستِ دیگر نیست سفید و سیاہِ ما

مکاتیب غالب

متن

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"بحضورِ نواب صاحب والامناقبِ عالی شان، قلزمِ فیض و عمانِ احسان، جناب نواب محمد یوسف علی خان بہادر دام اقبالہٗ مقبول باد"

[نواب سید یوسف علی خاں بہادر، فردوس مکاں، خلف زادہ، نواب سید محمد سعید خاں بہادر، ابن نواب سید غلام محمد خاں بہادر، ابن نواب سید فیض اللہ خاں بہادر، ابن نواب سید علی محمد خاں بہادر، بانیٔ ریاست روہیلکھنڈ کے فرزندِ اکبر تھے۔ آپ جنابِ عالیہ فتح النسا بیگم صاحبہ، بنتِ محمد نور خاں بڑہیچ، ہمشیرزادۂ نواب سید فیض اللہ خاں بہادر، کے بطن سے دوشنبہ ۵ ربیع الثانی ۱۲۳۱ ہجری (۵ مارچ ۱۸۱۶ء) کو متولد ہوئے، اور دوشنبہ ۱۲ رجب ۱۲۷۱ ہجری (یکم اپریل ۱۸۵۵ء) کو مسندِ حکمرانی پر قدم رکھا۔ جلوس کے دو سال دو ماہ بعد ۱۴ رمضان ۱۲۷۳ھ (۹ مئی ۱۸۵۷ء) کو مشہور واقعۂ غدر رونما ہوا۔ آپ نے اِس فتنے کے فرو کرنے میں حکومتِ ہند کی اعانت کر کے بسلسلۂ اعترافِ خدمات بیس ہزار روپے کا خلعت، ایک لاکھ بیس ہزار روپے سالانہ آمدنی کا جدید علاقہ، اور "فرزندِ دلپذیر دولتِ انگلشیہ" کا خطاب حاصل کیا، سلامی گیارہ ضرب توپ کے بجائے تیرہ ضرب مقرر کی گئی، اور مراسلت میں القاب و آداب "نواب صاحب مشفق بسیار مہربان کرم فرمای مخلصان سلامت، بعد از شوقِ ملاقاتِ مسرت آیات مشہود خاطرِ الطاف ذخائر مید ارد" طے پایا۔ آپ نے خود اس عطیے کی

حسبِ ذیل تاریخ ارشاد فرمائی :-

جب گورمنٹ سے ہوا حاصل — ملک مجھ کو بصیغۂ انعام
ناظم، از روی ہمّتِ عالی — سالِ بخشش ہے "بخششِ حکام"

۱۲۷۶ھ

آپ نے عربی و فارسی کی باقاعدہ تعلیم پائی تھی۔ فارسی میں خلیفہ غیاث الدین عزلت رامپوری، مصنفِ غیاث اللغات، اور میرزا غالب سے، اور علومِ عربی و حکمیہ میں مفتی صدرالدین خاں آزردہ اور مولانا فضلِ حق خیرآبادی سے تلمذ تھا۔ تخت نشینی کے بعد شعر و سخن کا مشغلہ بھی شروع کر دیا تھا۔ ناظم تخلص فرماتے تھے، اور میرزا غالب سے مشورۂ سخن تھا۔ نکتہ رس ذہن، رنگین و شوخ طبیعت، اور اعجوبۂ روزگار اُستاد نے اِن کو زبانِ اُردو کا ایک بلند پایہ شاعر بنا دیا ہے۔ مومن و غالب کے بعد اِن کی نظیر "اِلّا ماشاءاللہ" کا حکم رکھتی ہے۔ دیوان دو بار شائع ہو چکا ہے۔

آپ فنونِ سپہگری میں بھی کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ جسم مضبوط اور چہرہ نہایت خوش قطع تھا۔ داڑھی صاف اور مونچھیں باریک رکھتے اور اُس زمانے کے رواج کے مطابق اکثر رنگین و زرتار لباس زیبِ تن فرمایا کرتے تھے۔

آپ نے دس سال چند ماہ حکومت کرکے جمعے کے دن ۲۴ ذیقعدہ ۱۲۸۱ھ (۲۱ اپریل ۱۸۶۵ء) کو اس دارِ فانی سے رحلت کی، اور قلعۂ معلیٰ کے اندر امام باڑے میں اپنے والدِ ماجد کے پہلو میں مدفون ہوئے۔]

(۱)

بحضورِ سراسر سُرورِ جنابِ مستطاب، نواب ہمایوں القاب، جہانیاں کام بخشِ جہان جہان کامیاب، دَامَ بَقَاءُہٗ بقبولِ الاقبال، سجدہ فشانیٔ قلم با پوزش گستریٔ عریضہ نگار توام افتادہ۔ ہمانا آن درگاہِ اسکندر

ودادا گزرگاہ پیوستہ در نظر است، کہ ہم از دور در زمرۂ نزدیکان بندگی بجا می آورد۔ سپاس این معنی خود از اندازہ افزون تواند بود، کہ بعنوان روشناسی ذرّہ با مہر و آشنائی قطرہ با بحر، گدا را با شاہ بیگانگی درمیان نیست۔ در آن روزگار رنگین تر از نوبہار کہ بہ فرّ فرخندگی وجودِ مسعود، دسادہ باسپہر سادہ دم از برابری زد، نگاشتن و روان داشتن قطعۂ تاریخِ جلوس[1] بہ توانائی آن دانائی و روانی آسائی آن شناسائی صورت پذیرفت۔ اکنون کہ گیتی خدای قلمرو دانش، آن بہ فرتابِ تابِ نظر بر جبین جلیس و آن بہ فرزانۂ فرزانش عل باعقلِ فعال ہمال، امیر الدولہ مولوی حافظ محمد فضلِ حق خان بہادر[2] بہ بندۂ فرمان پذیر فرمان فرستادند کہ غالب بہ پرستش گری کمر بندد و در مشاطگی شاہدانِ افکارِ محسنِ خدمت عرضہ دہد، اندیشۂ مہر پیشہ در رنگ بر تافت و ہم امروز کہ فردای ورودِ نوازش نامۂ مولاناست، این نامہ کہ بخطِ بندگی ماناست، روان داشتہ آمد۔ چشم داشت آنست کہ در ہی راہ تفرقہ درمیان نیندازد و پس در حاضرانِ آن حضرت و دعا گویانِ دولت بشمار آیم۔ زیادہ حدِ ادب بجنبشِ ازل آورد در روز افزونیٔ دولت بہ پیوند باد! عرضداشت ہواخواہ، اسد اللہ نگاشتہ و روان داشتہ چارشنبہ ۲۸ جنوری ۱۸۵۷ء [مہر: نجم الدولہ دبیر الملک اسد اللہ خان بہادر نظام جنگ، ۱۲۶۷][3]

(۲)

ہمانا اگر گوہرِ جان فرستم
بہ نواب یوسف علی خان فرستم

ز نامش، نشانی بلعلان طرازم
ز مدحش، طرازی بدیوان فرستم

ز خلقش، حبابی بہ معدن نویسم
ز بذلش، صلائی بعمان فرستم

ز لطفش کہ عام ست در کام بخشی
نویدی بہ گبر و مسلمان فرستم

ز نطقش کہ خاص ست در ملک گیری
مثالی بشیراز و شروان فرستم

زہی شہسواری کہ گردِ سمندش
پی سرمۂ چشمِ خاقان فرستم

رود سام، چون، بہر پیکار سویش
عزانامہ سوی نریمان فرستم

ورش را بود پایه در خیالم   نگه سویش از دور پنهان فرستم
کلیم، ار عصا ار مغانم فرستد   من این ارمغان بدربان فرستم
وجودش بود فخر اجرام دارکان   تحیت باجرام و ارکان فرستم
ز جودش، بود وعده باز بردستان   بشارت به برجیس و کیوان فرستم
ز مویش، شمیمی به جنت رسانم   ز کویش، نسیمی بر رضوان فرستم
هم از شرقِ اشراقِ وی، آفتابی   باختر شناسانِ یونان فرستم
هم از ردی نیکوی وی، ماهتابی   به شب زنده دارانِ کنعان فرستم
اگر بگذرد تیرش از سینهٔ من   دل از سینه همراهِ پیکان فرستم
وگر سر ازین راه دزد جبین را   چو گویش درین ره بچوگان فرستم
سرشت از خزانست بدخواهِ او را   سه فصلِ دگر هم بدینسان فرستم
هم از آتشِ دوزخ آرم تموزش   هم از زمهریرش زمستان فرستم
وگر تا بهاران بسختی نه میرد   در آردی بهشتش بزندان فرستم
سپه چون کشد، گرنه از ناتوانی   توانم که خود را بمیدان فرستم
درین اِزدِواد، از نفس های گیرا   به رایات، آیاتِ قرآن فرستم
توقیع فضلِ حق، آن عینِ معنی   که "آباد" بردی فراوان فرستم
گزشت اندر اندیشه کز خامه رشحی   بدان قلزم فیض و احسان فرستم
بدل گفتم، البته کاریست مشکل   نباید که این نامه آسان فرستم
سگالش چنین رفت در کارسازی   که فرخ بود، چون بفرمان فرستم
فرستادم، اما نیابد جوابی   که تا هرچه فرمان رسد، آن فرستم
نمانم که شورِ فغانِ گدا را   چسان باز تا گوشِ سلطان فرستم
بدل گفتم، آری، فرستاده باشم   گر از راهِ چاکِ گریبان فرستم
دگر جادهٔ ره نمایان نه گردد   هم از جیب چاکی بدامان فرستم
بدان نارسائی دهم کارِ خود را   ز خونابه موجی بمژگان فرستم

دمم در تن نی دمم آتشین را — فروزنده شمعی بایوان فرستم
برفتارِ تازنده اندر آرم قلم را — تدروی بصحنِ گلستان فرستم
سخن کوته، آن به که از نظمِ خردی — بدیوانِ آن صدرِ گیهان فرستم
فرستم ولیکن خرد چون پسندد — که برگِ گیاهی به بستان فرستم
گرفتم که رنگین خیالم به گیتی — شقائق به بنگاهِ نعمان فرستم
گرفتم که بحر است دانم به معنی — گهر جانبِ ابرِ نیسان فرستم
گرفتم که روشن روانم بدانش — چراغی به مهرِ درخشان فرستم
درین پرده خواهم که از مورِ مسکین — بلامی بسوی سلیمان فرستم
نبشتم که خدمت گزار است غالب — پیِ دعویِ خویش برهان فرستم
بشب بستم این نقش و در بند آنم — که حرزِ دعا بامدادان فرستم
بقا، بهرِ داور، ز دادار خواهم — به آیینِ خروش از زرفشان فرستم[1]

(۳)

بحضورِ پرنور ظهور، حضرتِ نوابِ معلی القاب، جاودان کامیاب، ولیِّ نعمت، ام بہ رحمت، دام اقبالہ، سپاس بجا می آورد و پوزش همی گسترد، آن بارگاہِ سپهر کارگاہ را قبلۂ حاجات میداند، و بهنجارِ سرگزشت حکایتی بعرض میرساند۔ سه شنبه، ۲ جنوری نامۂ مولانا ابوالفضل آذلنا[2] بمن رسید۔ چهارشنبه ۲۸ جنوری عرضداشت روان داشتم۔ چون دو هفته گزشت و سررشتۂ ڈاک درین بند و بستِ جدید استوار نماند[3]، گفتم "مگر نرسیده باشد"۔ دی که چهارشنبه یازدهم فروری ۱۸۵۷ بود، چاشتگاه قصیده[4] بقصدِ اظهارِ فرمان پزیری فرستادم۔ شامگاه سرهنگِ یام منشورِ عطوفت آورد۔ بر مردمکِ دیده سودم، خردۂ جان نثار کردم۔ تا نورد از هم کشودم، دو ورق از فهرستِ گنجینۂ اسرار، یعنی اوراقِ اشعارِ گهربار، و سفتچه[5] دو صد و پنجاه روپیه در آن نورد یافتم۔ دفترِ شعر سجلِ اعتبارِ من شد، و زرِ آن سفتچه بمعرضِ وصول آمد۔ کرم در بنده پروری بهانه میجوید، ورنه این

افتتاح بشیرینی نیاز نداشت۔ کریمان بندہ را بہ نمک ہمی پرورند؛ ولی نعمت را بندہ کبشکر پروردن آئین است شکر این شکر بعہدۂ جانِ شیرین فروگزاشتم، این نامہ بہر آنکہ رسیدنِ عطیہ حالی گردد، بدین زودی نگاشتم۔ اشعار خود بہنگام خویش خواہد رسید و این سررشتہ ہیچگاہ از ہم نخواہد گسست۔ زیادہ حد ادب۔ نیرِ دولت و اقبال سرچشمۂ فروغِ بی زوال باد!!

غالب

پنجشنبہ ۱۲ فروری ۱۸۵۷

(۴)

حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

آداب بجا لاتا ہوں۔ غزلوں کے مسودات کو صاف کرکر[1] حضور میں بھیجتا ہوں۔ مسودات اپنے پاس رہنے دیے ہیں اس نظر سے کہ اگر احیاناً ڈاک میں لفافہ تلف ہو جائے، تو میں پھر اُس[2] کو صاف کرکر بھیجد دں؛ ورنہ موقع حکّ و اصلاح مجھے کیا یاد رہے گا۔[3] فقط

میں نہیں چاہتا کہ آپ کا اسم سامی اور نامِ نامی تخلص رہے۔ ناظم، عالی، انور، شوکت، نیسان، ان میں سے جو پسند آئے، وہ رہنے دیجے مگر یہ نہیں کہ خواہی نخواہی آپ ایسا ہی کریں۔ اگر وہی تخلص منظور رہو، تو بہت مبارک۔ زیادہ حدِ ادب

تم سلامت رہو قیامت تک

عنایت کا طالب غالب۔ روزِ یکشنبہ ۱۵ فروری سنہ ۱۸۵۷[4]

[میرزا صاحب نے ۸ مارچ ۱۸۵۷ء کو ایک عریضہ ارسال کیا تھا، جو ۱۱ ماہِ مذکور کو رامپور پہنچا۔ مثل میں اس کا صرف لفافہ شامل ہے، اور اُس کی پشت پر تحریر ہے: "عرضی حسب الحکم چاک نمودہ شد۔ ۱۶ رجب ۱۲۷۳ھ"

میرزا صاحب نے یکم اپریل سنہ ۱۸۵۷ء کو ایک اور عریضہ ارسال کیا تھا، جو ۳۰ اپریل کو رامپور پہنچا۔ مثل میں اس کا بھی صرف لفافہ شامل ہے اور اُس کی

پشت پر تحریر ہے: "عرضی از دستِ مبارک چاک شد، و بندِ غزلیات مرسلہ در حضور ماند۔ ۹ شعبان سنہ ۱۲۷۳ھ"

(۵)

جنابِ عالی، کچھ کم مہینا ہوا کہ میں نے حضور کی غزلوں کو دیکھ کر خدمت میں روانہ کیا ہے، اور اُس[1] کے پہنچنے سے اطلاع نہیں پائی۔ اب ڈاک میں خط تلف بھی ہو جایا کرتے ہیں۔ اس واسطے میں متردد ہوں، اور مدعا اس تحریر سے یہ ہے کہ اگر وہ لفافہ نہ پہنچا ہو، تو میں اُس مسودے کو پھر صاف کر کر روانہ کروں۔ زیادہ حدِ ادب۔ از غالب۔ نگاشتۂ صبح پنجشنبہ، ۲۷ شعبان سنہ ۱۲۷۳ ہجری[2]

(۶)

جنابِ عالی، آداب بجا لاتا ہوں اور عرض کرتا ہوں کہ اُجورہ دار پہنچا۔ گر لُٹا ہوا، اور بھیگا ہوا، اور بھاگتا ہوا۔ گوجروں نے اُسے لُوٹ لیا۔ روپیہ، کمبل، سب لے لیا۔ خط اُس دار و گیر میں گر پڑا، بھاگ [illegible] لفافہ مجھ تک نہ پہنچا، خط مع ہنڈوی کے پہنچا۔ خط میں سے القاب بہ تکلف پڑھا، اور یہ جملہ "سفتۂ مبلغ دو صد و پنجاہ روپیہ" پڑھا گیا، اور باقی خیر و عافیت "مگر آنکہ" اس کے بعد جو کچھ لکھا تھا، اُس میں سے "مولوی" یہ لفظ، اور بعد ایک لفظ کے "خانصاحب" یہ پڑھا گیا، اور کچھ نہیں۔ مجھ کو[4] غم یہ ہے کہ غزلہای اصلاح اور دیوانِ اُردو کی رسید میں نے نہ پائی ہے[5] فقط

ہنڈوی کا بعینہٖ وہ حال جو میرے خط کا تھا، کچھ پڑھا جائے، کچھ نہ پڑھا جائے۔ آپ کا نام اور ڈھائی سو روپیہ پڑھا گیا۔ چونکہ مہاجن مجھ کو جانتا تھا، اُس نے اُس بھیگے ہوئے کاغذ کو اپنی چِٹھی میں لپیٹ کر اُس مہاجن کے پاس بھیجا ہے۔ جب وہ صحیح کر کر بھیجے گا، تب وہ مجھ کو روپیہ دیگا۔ اُس کے صحیح کرنے میں کیا تامل ہے؟ میں نے صرف بطریقِ اطلاع لکھا ہے۔ اور غزلوں کی اور دیوان کی رسید، اور جو اس خط میں "مگر آنکہ (کے)"[6] بعد مطالب مندرج تھے وہ پھر لیے

ہی باریک کاغذ پر لکھ کر اُس[1] ساہوکار کو دیجے گا، اور اُس کو تاکید کیجے گا کہ اس کو بھیج دے۔ یہاں کے ساہوکار نے میری خاطر سے اس رقعے کو اپنی[2] چٹھی میں روانہ کیا

پنجم ذی الحجہ (۳)

(۷)

بوالا خدمتِ رفعت درجت، جنابِ نواب صاحبِ والا مناقبِ عالیشان قلزمِ فیض و محیطِ احسان، عزَّ نصرہٗ و دامَ مُلکہٗ، آدابِ نیاز بجا می آرد، و نیاز مندانہ عرضہ می دارد۔ در زمانِ چیرہ دستیٔ کور نمکانِ سپاہِ رو سیاہ سررشتۂ یام از ہم گسست۔ ناچار بفرستادنِ نامہ بر، رساندنِ نامہ و پیام صورت بست درین روزگار کہ فرمانِ داورانِ دادگر روائی و سلسلۂ آمد شدِ نامہ رسائی یافت، نامہ در یام روان داشتہ شد، و نارسیدنِ پاسخ آن را چنان پنداشتہ شد کہ مگر آن نیایشنامہ نرسیدہ باشد، یا فرطِ احتیاط مانعِ تحریرِ جواب گردیدہ باشد۔ ہر آئینہ در دل چنان گزشت کہ درین بار بہ انسان سخن سرای توان گشت کہ سرگزشت من از دلِ نعمت نہان و حجابی در میان نماند۔

حالیا برای جہان آرای باد کہ دیرینہ نمکخوارِ سرکارِ انگریزم، و از سرآغازِ سالِ یکہزار و ہشت صد و شش کہ دران گاہ شمارِ سنینِ عمرِ من از دہ نگزشتہ بود، بعوضِ جاگیرِ عمِ حقیقیِ نسبیِ خود، نصر اللہ بیگ خان بہادر[4] کہ با جمعیتِ رسالۂ چہار صد سوار معیت جرنیل لارڈ[5] لیک بہادر[6] در فتحِ ہندوستان کوششہای نمایان کردہ، و پرگنۂ سونک سونسا[7] بقیدِ حینِ حیات جاگیر یافتہ، و ہمدران عہد بمرگِ ناگاہ از جہان رفتہ بود، بفرمانِ جرنیل لارڈ لیک بہادر و منظوریٔ گورمنٹ، مشتِ زری شاملِ جاگیرِ عمِ نسبیِ من، نواب احمد بخش خان بہادر[8]، در وجہِ معاشِ من منجملۂ استمراریٔ سرکاری کہ بذمۂ نواب احمد بخش خان بہرِ دوام واجب الادا بود، قرار یافت چون جانشینِ احمد بخش خان[9] بکیفرِ کردار یافت، و جاگیر بسرکار باز یافت شد، رسیدنِ آن وجہِ مقرری از خزانۂ کلکٹریِ[10] دہلی صورت پذیرفت، چنانکہ تا انجام

اپریل سنه ۱۸۵۷ء از کلکتریِ دہلی یافته ام، و از مئی خود آشکار است که حال چیست. پیوندِ تعلق با بهادر شاه[1] جز آن نبود که از هفت هشت سال بتحریرِ تاریخِ سلاطینِ تیموریه و از دو سه سال به اصلاحِ اشعارِ شهریار می پرداختم. درین هنگامه خود را بکنار کشیدم و بدین اندیشه که مباد، اگر یکقلم ترکِ آمیزش کنم، خانهٔ من بتاراج رود و جان در معرضِ تلف افتد، بباطن بیگانه و بظاهر آشنا ماندم. هرگاه شهر بر دستِ سپاهِ انگریز فتح شد، همه جاگیرداران و پنشنداران[2] از شهر بدر رفتند، چنانکه تا امروز آوارهٔ دشت و کوه اند؛ من از جا نه جنبیدم و همچنان گوشه گیر ماندم. درین بندوبست که خاصه از بهرِ سیاستِ مجرمان ست و تحقیقاتِ جرم از روی دفترِ قلعه و اظهارِ مخبران می کنند، هیچ گونه آلایشِ دامنِ من پدید نیامد و دار و گیر و باز پرس رو نه داد[3]. بودنِ من در شهر از حکام نهان نیست. امّا چون پرسشی درمیان نیست، لاجرم محفوظ مانده ام. می بایست که خود سلسله جنبان گشتمی و با حکّام پیوستمی. درین باره سخن آنست که درین زمانه با هیچ کس سابقهٔ معرفتی ندارم، و معهٰذا هنوز موقع و محلِ آن نمی نگرم که نامه نویسم و خواهشِ ملاقات بمیان آورم. رہتی اینکه درین فتنه و آشوب خدمتی بجا نیاورده ام. لیکن مقامِ شکر است که تبقدیم نرسیدنِ خدمت از راهِ بیدستگاهی است، و ذریعهٔ اخلاص و خلوص همان بیگناهی است.

حالِ خود را، اگرچه پرسش از جانبِ آن والامناقب نبود، گفتم[4] و خون میخورم که صحت و عافیتِ ذاتِ همایونِ اقدس که یا رب، جاودان سلامت باد! چگونه دریابم. همدرین گنج که مسکنِ منست، شنیده ام که والاشان زین العابدین خان بهادر[5] بشهر آمده اند. نیازمندیِ من با مرحومی نواب عبدالله خان بهادر[7] و مهروزیِ من با اصغر علی خانِ مرحوم و محبت و ثقتِ من با نواب عبدالرحمن خان بهادرِ مغفور[9] کجا دیده اند و آن مدارج کی[8] در نظر دارند که ایشان را در ضمیر میگذشت که گدای گوشه نشین را باید دید؟ من خود پائی که رفتار داشته باشد ندارم

وانہ نہا دیہ برون آمدن نتوانم۔ بہ نگاشتن این نامہ زحمتِ اوقاتِ ملازمان ازآن رُو روا داشتہ ام کہ اگر نفرستادن نامہ محض از روی احتیاط است، ہویدا گردد کہ در عنایت تفریط و در رعایت افراط است۔ چشم دارم کہ بتماشائے سوادِ نوازشنامہ فروغ نظر اندوزم۔ شغل شعر و سخن ہر آئینہ یقین دارم کہ درین چنین فتنہ و آشوب دل بدان کار بگونہ گراید؟ دولت پایندہ و نصرت طرب فزایندہ باد! از اسداللہ غالب۔ نگاشتہ در وان داشتہ پنجشنبہ ۱۷ جنوری ۱۸۵۸ء

لہ ٹ

دبیران خاص، بر عنوان نامہ ہای چنین، نشانِ کلبۂ این درویش دل ریش عقب مسجد جامع نبشتہ اند، و من از ہشت ہفت سال در محلۂ بلی ماران می مانم۔ سپس نشان این محلہ نگاشتہ شود۔ فقط

(۸)

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت!

منشورِ عطوفت کے دیکھنے سے زندگی کی صورت نظر آئی مجلس اور غزلوں کے پہنچنے کی اطلاع پائی۔

یہ بھی ایک بخشش کا بہانہ پیدا کرتا ہے، ورنہ حضور کے کلام کو اصلاح کی احتیاج کیا ہے؟ میری کیا سخنوری اور سخن سرائی ہے! آپ کی قدر دانی بلکہ قدر افزائی ہے۔ تکلف ہے، اگر کہوں کہ تا قیامت رہو۔ بے تکلف دعا یہ ہے کہ خدا کرے ایک سو بیس برس تک سلامت رہو!

اِس قرینے سے کہ بسبب کم فرصتی کے اُن کا ملاحظہ نہ کر نا مرقوم ہوا، ریختے کے دیوان اور اس کتاب کا پہنچنا معلوم ہوا۔ دیوان کے دیکھنے نہ دیکھنے میں آپ کو اختیار ہے۔ گر یہ چار جزو کا رسالہ جواب سمجھا ہے، اُس کا دیکھنا ضرور در کار ہے۔ فارسیٔ قدیم اور سحرِ حُسنِ معنی اور صنعتِ الفاظ؛ با این ہمہ ہر امر کی احتیاط اور ہر بات کا لحاظ۔

جنابِ عالی، طُرفہ معاملہ ہے۔ خدا کا شکر ہے اور اپنی قسمت کا گلہ ہے۔ خدا کا شکر یہ کہ باوجودِ تعلقِ قلعہ کسی طرح کے جُرم کا بہ نسبت میرے احتمال بھی نہیں! قسمت کا گلہ یہ کہ عطای پنشنِ قدیم کا حکام کو خیال بھی نہیں۔ یہ نومبر سنہ ۱۸۵۸ء اُنیسواں مہینا ہے۔ گویا بِن کھائے جینا ہے۔ کہتے ہیں کہ جنوری شروع سال میں پنشنداروں کو روپیہ ملے گا۔ دیکھیے کیا نیا گُل کھلے گا! پہلی نومبر کو یہاں اشتہارِ عام ہو گیا ہے، کہ اب قلمروِ ہندوستان میں عملِ ملکۂ معظمہ عالی مقام ہو گیا ہے۔ میں پہلے سے مدّاحوں میں اپنا نام لکھوا چکا ہوں اور وزرای ملکۂ دارا دربان کے دوسارٹی فکٹ پا چکا ہوں۔ اگر اس اجمال کو بہ تفصیل معلوم کیا چاہیے، تو اسی کتاب موسوم بہ دستنبو میں دیکھا چاہیے۔ خوشنودی کا طالب، غالب۔ نگاشتہ روزِ یکشنبہ ہفتم نومبر سنہ ۱۸۵۸ء

(۹)

خداوندِ نعمت سلامت!

جو آپ بِن مانگے دیں، اُس کے لینے میں مجھے انکار نہیں، اور جب مجھ کو حاجت آ پڑے، تو آپ سے مانگنے میں عار نہیں۔

بارِ گرانِ غم سے پست ہو گیا ہوں۔ آگے تنگدست تھا، اب تُہی دست ہو گیا ہوں۔ جلد میری خبر لیجیے، اور کچھ بھجوا دیجے۔ عنایت کا طالب غالب چارشنبہ یازدہم ربیع الثانی سنہ ۱۲۷۵ ہجری و ۱۷ نومبر سنہ ۱۸۵۸ء

(۱۰)

حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعد آداب بجا لانے کے عرض کرتا ہوں کہ منشورِ رافت لکھا ہوا ۲۵ نومبر کا جمعے کے دن تیسری دسمبر کو اس دعاگوی دولت کے پاس پہنچا۔ ڈھائی سو روپے کی ہنڈوی معتمد کے حوالے کی گئی۔ آج یا کل روپیہ آ جائے گا۔ خاطرِ عاطرِ اقدس جمع رہے۔

میرے حاضر ہونے کو جو ارشاد ہوتا ہے، میں وہاں نہ آؤں گا، تو اور کہاں جاؤں گا؛ پنشن کے وصول کا زمانہ قریب آیا ہے۔ اس کو ملتوی چھوڑ کر کیونکر چلا آؤں؟ سُنا جاتا ہے، اور یقین بھی آتا ہے کہ جنوری، آغازِ سالِ ۵۹ عیسوی میں یہ قصہ انجام پائے۔ جس کو روپیہ ملنا ہے اُس کو روپیہ، جس کو جواب ملنا ہے اُس کو جواب مل جائے۔

حضور نے یہ کیا تحریر فرمایا ہے کہ ان بارہ غزلوں کی اصلاح میں کلام خوش مطلوب ہے، اگلی غزلوں کی طرح نہ ہوں؟ اگر اگلی غزلوں کی اصلاح پسند نہ آئی، اور اُن اشعار میں کلام خوش نہ تھا، حضرت کا نواُن غزلوں میں بھی وہ کلام ہے کہ شاید اوروں کے دیوان میں دیبا ایک شعر بھی نہ نکلے گا۔ میں بقدر اپنی فہم و استعداد کے کبھی اصلاح میں قصور نہیں کرتا۔ زیادہ حدِ ادب۔ عرضداشتِ غالب۔ معروضۂ جمعہ ۲۶ ربیع الثانی سنہ ۷۵، ۳ دسمبر ۵۸ء

(۱۱)

حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

میں اس دولتِ ابد مدت کا از راہِ مروت خیر خواہ ہوں۔ امر ملال انگیز اندوہ آور میں آرایشِ گفتار گوارا نہیں کرسکتا۔ نواب مرزا بسنتے دلّی آکر پہلے تو بیزم آرائی سُنائی، چاہتا تھا کہ اُس کی تہنیت لکھوں، کل اُس نے از روئے خطِ آمدہ رامپور حضرت جنابِ عالیہ کے انتقال کی خبر سُنائی۔ کیا کہوں، کیا غم و اندوہ کا ہجوم ہوا؛ حضرت کے غمگین ہونے کا تصور کرکر اور زیادہ مغموم ہوا۔ بیہودہ نہیں ہوں کہ ایسے مقام میں بطریقِ انشا پردازی عبارت آرائی کروں، نادان نہیں ہوں کہ آپ جیسے دانا دلِ دیدہ ور کو تلقینِ صبر و شکیبائی کروں ؎

از دستِ گدای بی نوا ناید ہیچ — جز آن کہ بصدق دل دعائی بکند

حق تعالیٰ ذاتِ ستودہ صفات کو دائماً اور ابداً جاہ و جلال و دولت و اقبال کے ساتھ سلامت باکرامت رکھے!

عریضہ نگار، اسد اللہ المتخلص بہ غالب

مرقومۂ یکشنبہ ۲۱ شعبان و ۲۷ مارچ سالِ حال

(۱۲)

حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

ایک خط مشتمل اپنے حال پر[1] اور ایک خط جناب بیگم صاحبہ و قبلۂ مغفورہ کی تعزیت میں روانہ[2] کر چکا ہوں۔ اب ایک قطعۂ تاریخ بھیجتا ہوں۔ اگرچہ ایک کا تعمیہ ہے، لیکن تعمیہ کتنا خوب اور بے تکلف ہے!

عرضداشت اسد اللہ۔ معروضۂ ۱۳ رمضان و ۱۷ اپریل سالِ حال ؎

جنابِ عالیہ از بخششِ حق	بہ فردوسِ بریں چون کرد آرام
سخن پرداز غالب سالِ رحلت	"خلود خلد" گفت از روی الہام
	(۱۲۷۵ھ)

(۱۳)

حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعد تسلیم کے عرض کرتا ہوں۔ آج دوشنبے کا دن ۱۴ رمضان المبارک کی اور ۱۸ ماہِ اپریل کی صبح کے وقت ڈاک کا ہرکارہ آیا، اور منشورِ عطوفت لایا۔ میں نے سر پر رکھا، آنکھوں سے لگایا۔ تعجب ہے کہ میرے دو خطوں کی رسید اس عنایت نامے میں مرقوم نہیں۔ آیا نہ پہنچے، یا پہنچے اور نہ پڑھے گئے، کچھ معلوم نہیں۔

پہلے خط میں یہ عرض کیا ہے کہ مجموع پنشنداروں کی مثل مرتب ہے اور ہنوز صدر کو روانہ نہیں ہوئی۔ نواب گورنر جنرل لارڈ کیننگ بہادر نے کلکتے سے میرے پنشن کے کاغذ طلب کیے، اور وہ کاغذ فہرست میں سے الگ ہو کر لفٹنٹ گورنر بہادر پنجاب کی خدمت میں ارسال ہوئے، وہاں سے کلکتے کو

بھیجے جائیں گے۔ پھر وہاں سے حکمِ منظوری پنجاب ہوتا ہوا یہاں آئے گا، اور یہاں مجھ کو روپیہ مل جائے گا۔ آج روپیہ ملا، کل میں نے آپ سے سواری اور باربرداری مانگی۔ آج سواری اور باربرداری پہنچی، اور کل میں نے رامپور کی راہ لی۔ بلکہ اسی نیاز نامے میں کچھ حسنِ طلب بھی تھا۔ افسوس کہ ایسا خط ضروری نہ پہنچے!

دوسرا خط جناب عالیہ مغفورہ کی تعزیت میں تھا۔ اس کا بھی ذکر اس عنایت نامے میں نہ تھا۔ ناچار پہلے خط کا مضمون اس ورق میں مکرر لکھ دیا، اور دوسرے خط کے صرف ذکر پر اکتفا کیا۔ حق تعالیٰ آپ کو سلامت رکھے، اور صبر و ثبات و دولت و اقبال و عمر و جاہ و جلال بطریق دوام عنایت کرے!

دو غزلیں منجملہ بارہ غزلوں کے بعد اصلاح ارسال کر چکا ہوں۔ خدا کرے، پہنچ گئی ہوں! پرسوں ایک قطعہ جناب بیگم صاحب قبلہ کی تاریخ وفات کا بھیجا ہے۔ یقین ہے کہ پہنچے گا۔ از راہِ احتیاط وہ قطعہ اس ورق میں پھر لکھتا ہوں، اور نیز از راہِ احتیاط یہ خط بیرنگ روانہ کرتا ہوں۔ زیادہ حدِ ادب۔ عریضۂ اسد اللہ خاں، معروضۂ دوشنبہ چہاردہم رمضان سنہ ۷۵، ۱۲ مطابق ہژدہم اپریل سنہ ۱۸۵۹ء

قطعہ

جناب عالیہ از بخشش حق	بفردوس برین چون کرد آرام
سخن پرداز غالب، سالِ رحلت	"خلوت خلد" گفت از رو‌ی الہام

(۱۲۷۵ھ)

(۱۴)

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت!

نوازش نامے کے ورود مسعود کی اطلاع دیتا ہوں، اور ہنڈوی کے پہنچنے کا شکر بجا لاتا ہوں۔ ستمبر سنہ ۱۸۵۹ کے مہینے کے سو روپے پہنچے۔ خاطرِ اقدس جمع رہے۔

عزم ولایت کا حال معلوم ہوا۔ حق تعالیٰ آپ کو ہر جگہ مظفر و منصور و کامیاب رکھے! اخدمت گزار ہوں، اور دعا گو ثنا میرا کام ہے۔ بڑھاپے نے کھو دیا۔ مجز نفسے چند مجھ میں کچھ باقی نہیں۔ زیادہ حدِ ادب۔
عرضداشت غالب۔ معروضۂ یکم اکتوبر سنہ ۱۸۵۹ء

(۱۵)

حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعد تقدیم تسلیم گزارش کرتا ہوں۔ پرسوں ایک نیاز نامہ بھیجا ہے۔ یقین ہے کہ پہنچے گا اور اُس کا جواب جلد عنایت ہوگا۔ کل نوازش نامۂ حسی میں سو روپیے کی ہنڈوی بابت ماہ اکتوبر سنہ ۱۸۵۹ء ستی، شرفِ ورود لایا۔ ڈر مندرجۂ ہنڈوی معرضِ وصول میں آیا۔ خاطرِ اقدس جمع ہے۔
(شنبہ ۵ نومبر سنہ ۱۸۵۹ء)

(۱۶)

حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعد بجا لانے آداب نیاز کے عرض کرتا ہوں۔ یہ میرا دردِ دل ہے۔ نامۂ تہنیت میں اس کا اندراج مناسب نہیں جانتا۔ میں انگریزی سرکار میں علاقہ ریاستِ دودمانی کا رکھتا ہوں۔ معاش اگرچہ قلیل ہے، مگر عزت زیادہ پاتا ہوں۔ گورمنٹ کے دربار میں داہنی صف میں دسواں نمبر اور رسالت پارچے اور جیغہ، سرپیچ، مالای مروارید، خلعت معزز ہے لارڈ ہارڈنگ صاحب کے عہد تک پایا۔ لاٹ لارڈ کلوئن یہاں آئے تھیں۔ اب یہ نواب معلی القاب آتے ہیں۔ زمانے کا رنگ اور، کونی حاکم، کونی سکرتر میرا آشنا نہیں۔ بڑے میرے مربی قدردان، جناب اڈمنسٹن صاحب وہ بھی چیف سکرتر ہے، لفنٹنٹ گورنر ہو گئے۔ وہ سکرتر رہتے تو مجھے کچھ غم نہ تھا۔ اب تک میں اپنے کو یہ بھی نہیں سمجھا کہ بے گناہ ہوں

یا گناہگار، مقبول ہوں، یا مردود۔ مانا کہ کوئی خیر خواہی نہیں کی، جو نئے انعام کا مستحق ہوں؛ لیکن کوئی بیوفائی بھی سرزد نہیں ہوئی، جو دستورِ قدیم کو برہم مارے! بہر حال اس تشویش میں ہوں۔ راہِ چارہ مسدود، اور دُکھ موجود۔ عرفیؔ خوب کہتا ہے ؎

مرا زمانۂ طنّاز دست بستہ و تیغ زند بفرقم و گوید کہ "ہان" سری مخار

فقط۔ مرقومۂ صبح یکشنبہ، نومبر سنہ ۱۸۵۹ء

(۱۷)

حضرت ولیِّ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعد بجا لانے آدابِ نیاز کے عرض کرتا ہوں۔ منشورِ عطوفت پہنچا۔ نوابِ عالی جناب کی ملازمت کا حال بسبیلِ اجمال مندرج تھا۔ میں از روی اخبار بتفصیل دریافت کر چکا ہوں۔ ہندوستان میں کسی رئیس کے واسطے یہ بات کاہے کو ہوئی ہے! مسند تکیہ کسی کو کب ملا ہے! یہ کمالِ عز و شان اور استحکامِ بنای ریاست کا نشان ہے۔ لطف یہ ہے کہ اب صاحبانِ کورٹ آف ڈرکٹر[۲] حائل نہیں رہے۔ نواب گورنر جنرل بہادر نائبِ سلطنت ہیں۔ اس صورت میں جو کچھ انھوں نے دیا ہے، وہ عطیہ حضرت فلک رفعت ملکۂ معظمہ کا ہے۔ ایسے شاہنشاہ کی سرکار سے وِسادۂ سروری کا عطا ہونا، بہت بڑی نوازش اور سزاوارِ صد گونہ نازش ہے۔ یہ چار بالشِ امارت اور کاشتی پور کا ضمیمۂ ملک موروثی ہونا، پہلے آپ کو اور پھر ولیعہد بہادر کو اور پھر آپ کے اولاد و اخوان و انصار کو اور سب کے بعد غالبِ دعاگوی گوشہ نشین کو مبارک ہو! زیادہ حدِّ ادب۔

مرقومۂ صبحِ یکشنبہ، ۲۷ نومبر، ۱۸۵۹ء

(۱۸)

حضرت ولیِّ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

آدابِ نیاز بجا لا کر عرض کرتا ہوں کہ سو روپیے کی ہنڈوی بابت
معارفِ ماہِ نومبر ۱۸۵۹ء پہنچی اور روپیہ وصول میں آیا اور صرف ہو گیا
اور میں بدستور بھوکا اور ننگا رہا۔ تم سے نہ کہوں تو کس سے کہوں؟ اس
مشاہرۂ مقرری سے علاوہ دو سو روپیہ اگر مجھ کو اور بھیج دیجے گا، تو چلا
لیجے گا؛ لیکن اس شرط سے کہ اس عطیۂ مقرری میں محسوب نہ ہو، اور بہت
جلد مرحمت ہو۔ زیادہ حدِ ادب۔ عرضداشتِ غالب۔ معروضۂ صبحِ پنجشنبہ
ہشتم دسمبر سنہ ۱۸۵۹ء، بمجردِ ورودِ عنایت نامۂ مرقومۂ ماہِ حال۔

(۱۹)

حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

آدابِ نیاز بجا لاتا ہوں، اور مزاجِ اقدس کی خبر پوچھتا ہوں، اور
بکمالِ ناچاری، بصد گونہ شرمساری، عرض کرتا ہوں کہ آج سہ شنبہ
۷ فروری کی ہے۔ جو لوگ کہ میرے ساتھ ہیں، گوش بر آواز ہیں؛ اور جو وظیفہ
خوار دلی میں ہیں، وہ چشم براہ ہوں گے۔ زیادہ حدِ ادب؟

خوشنودی کا طالب، غالب

صبحِ سہ شنبہ ۷ فروری سنہ ۱۸۶۰

(۲۰)

حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

تقدیمِ مراسمِ تسلیم مقدمہ اس گزارش کا ہے کہ عالم دو ہیں: ایک
عالمِ شہادت، ایک عالمِ غیب۔ جس طرح عالمِ شہادت میں آپ میری دستگیری
کر رہے ہیں، عالمِ غیب میں آپ کا اقبال مجھ کو مدد پہنچا رہا ہے۔ تفصیل اس اجمال
کی یہ کہ وہ نقشہ پنسنداروں کا، جو یہاں سے صدر کو گیا تھا، وہ اب صدر
سے بعدِ صدورِ حکم آ گیا۔ حکم بہ نسبت ہر واحد کے مختلف ہے۔ تقلیل بہت
ہے۔ سو روپیہ مہینے والے کو چھتر بھی ہیں اور پچیس بھی ہیں، اور دس بھی ہیں

اب فرمائیے، میرے واسطے کیا احتمال گزرتا ہے۔ یاس کُلّی ہے، لیکن واقع یہ ہوا ہے کہ سب سے پہلے میرا نام اور پورے پنشن کی واگزاشت کا حکم۔ طرفہ یہ کہ میرے نام کے ساتھ ایک انگریزی تحریر ہے کہ جس کے دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ گورمنٹ کا حکمِ منظوری اس تحریر پر متفرع ہے۔ حکام کے عملے میں اور وکلا اور اہلِ شہر میں یہ مشہور ہے کہ وہ تحریر ولایت سے آئی ہے۔ بہرحال دو امر ہنوز مبہم ہیں: ایک اس انگریزی تحریر کا حال، اور دوسرے میرے بھائی کے پنشن کی حقیقت۔ سو یہ دونوں امر چند روز میں معلوم ہو جائیں گے، اور جو معلوم ہوگا، وہ عرض کیا جائے گا[1]۔ غالب۔ ۲۲ اپریل ۱۸۶۰[2]

(۲۱)

حضور،

سنہ ۱۸۵۸ء میں، یہ قصیدہ کہ گویا نامۂ سطوم ہے، میں نے حضور میں بھیجا تھا اور بریلی کا[3] ملک ملنے کی تہنیت دی تھی۔ بعد اس کے حضرت کو دامنۂ کوہ کی محال، یعنی کاشی پور ملا۔ گویا یہ میری تحریر غلط ہوگئی۔ الحمدللہ انجامِ کار جو میں نے قصیدے میں قصد کیا تھا، وہی ہوا۔ اب ارشاد ہو کہ میں لسان الغیب ہوں یا نہیں[4]۔ فقط

چون نیست مرا شربتِ آبی ز تو حاصل — دانم کہ تو دریائی و[...] سبزۂ ساحل
در بادیۂ برگورِ غریبان، ز چہ سوزد؟ — آن شمع فروزان کہ بود در خورِ محفل
زان خسروِ خوبان چہ قدر چشمِ وفا بود؟ — صد حیف، کہ شد نقشِ امید[...] ہمہ باطل!
افسانۂ غم گر بسرایم، نبود عیب — یا دوست کہ پیوستہ ہمی بر دغم اندل
میگویم و ہمدم زندم طعنہ کہ ”تن زن — چون می ندہد داد، ز فریاد چہ حاصل؟“
از طعنہ شدم خستہ دل و از رہِ تیمار — دل گفت کہ ”ہان شیوۂ عشاق فروہل“
تا کس نبرد ظن کہ بشاہد بودم روی — حاشا، کہ حکایت کنم از لیلی و محمل!
شاہد بود آن دوست، کہ اندر غزل او را — خوانند ستمگارہ و خونخوارہ و قاتل

من نالم اتان ددست که درعالم انصاف — شایان بودش، گویم اگر خسروِ عادل
او خسروِ خوبان بود و بنده گدایش — او قلزم و عمان بود و من خسِ ساحل
گر خواجه، هما تست، دگر دوست، همانست — مائیم و یقینی که بوحدت شده کامل
خود هر چه سپردم، همه با اوست کزین پیش — امید کَهم بود بهر وادی و منزل
یارب! چه شدا ینک که نگیرد خبر از من؟ — بربسته بر دیم درِ ارسالِ رسائل
ای یوسفِ ثانی که بود در همه عالم — مشتاقِ جمالِ تو، چه دیوانه، چه عاقل
گر نامِ تو در بحر نگنجید، زیان نیست — شد نامِ نظیرِ تو و همنامِ تو داخل
تا نزدِ تو چون آیم و دور از تو چه سازم — ماندن ز تو دشوار، و رسیدن بتو مشکل
ای کاش، بکوی تو چنین روی نمودی — زینسان که فرو رفته مرا پای درین گل!
چه نسبت که گاهی نکنی ردی بدین سوی؟ — از حیست که هرگز ندهی دایه بسائل!
گر جان دهم از غصه، تو دانی که بگیتی — حرفی غلط از صفحهٔ هستی شده زائل
خواهی که مرا بنگری از دور، بغزهای — تا نزدِ تو آرند یکی طائرِ بسمل
از صنعتِ استادِ ازل دان که زهر سوی — چون قبله نما، سوی توام ساخته مائل
غالب بسخن نامِ من آمد از ازل آورد — دانی که درین شیوه نیم عامی و جاهل
در فنِ سخن دم مزن از عرفی و طالب — این آیه خاصست که بر من شده نازل
من گنجم و گردون به گل اندوده درم را — می بین، درِ گنج ارچه کشودن شده مشکل
خود در خورِ ویرانه بود گنجِ گران مند — غم نیست، گر آبادیٔ دهلی شده زائل
هاروت، فسونِ نفسِ گرم چه داند؟ — اعجاز ز دهلی بود و سحر ز بابل
آن را که صریرِ قلمم هوش رباید — دیگر نبرد ذوق ز آوازِ عنادل
توقیعِ بریلی، تبو فرخنده! که من نیز — لبتم بغزه مندیٔ خویش از کرمِ دل
حاشا که ستانم رقمِ قاضی و مفتی! — حاشا که پذیرم عملِ شحنه و عامل
بفرست خرد مند کسان را بجکوست — در جیبِ گدا ریز قلیلی ز مداخل
هر سال از ان شهر بمن دایه روان دار — کز بهرِ همین گشته در انقطاعِ تو شامل

اُمید کہ لب تشنگیٔ من نہ پسندی　　زان رُشحہ کہ بر صفحہ فشانی ز انامل
اُمید کہ بپذیری و بر من بکنی قہر　　نپذیرم اگر معذرتِ فرطِ مشاغل
اُمید کہ آن شیوہ نورزی کہ نگویم　　کز دردِ دلم فارغ و از من شدہ غافل
ای رای تو در روشنی از مہر فزون تر!　　ای روی تو در حُسن دو چند از مہِ کامل!
تا مہر بیک سال کند دائرہ را دور　　تا ماہ بیک ماہ کند قطعِ منازل
باشی بسپہرِ شرف آن ماہ کہ باشد　　در نور بہ خُرشیدِ جہانتاب مقابل!

(٢٢)

حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

شکرِ بندہ پروری بجا لا کر عرض کرتا ہوں کہ کل ١٢ جولائی کو نوازشنامہ مع باسم سو روپیے کی ہنڈوی کے پہنچا، اور روپیہ معرضِ وصول میں آیا۔ متوقع ہوں کہ یہ عطیۂ چوتھی پانچویں انگریزی کو، جیسا کہ ہمیشہ پہنچتا تھا، پہنچا کرے۔ دسویں بارھویں نہ ہوا کرے ۵ تم سلامت رہو قیامت تک

خوشنودی کا طالب، غالب

صبح جمعہ ٢٣ ذی الحجہ سنہ ١٢٧٦

مطابق ١٣ جولائی سنہ ١٨٦٠

(٢٣)

ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ عنایت نامے کے ورود سے میں نے عزت پائی۔ سو روپیے کی ہنڈوی بابت مصارف مارچ سنہ ١٨٦١ کے پہنچی۔ زرِ مندرجہ معرضِ وصول میں آیا۔ خاطرِ اقدس قرینِ جمعیت رہے۔ کلیاتِ فارسی کے پہنچنے سے اور اس نذر کے مقبول ہونے سے مجھ کو بہت خوشی حاصل ہوئی۔ تم سلامت رہو قیامت تک! عنایت کا طالب، غالب

صبح یکشنبہ ١٠ اپریل سنہ ١٨٦١ء

(۲۴)

ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعد تسلیم توڑے اور خلعت کے عطیے کا آداب بجالاتا ہوں۔ خدا آپ کو سلامت رکھے، اور اپنی اولاد کی اولاد کی شادیاں کرنی اور اُن شادیوں میں توڑے اور خلعت کی تقسیم نصیب ہو۔

یہ تحریر نہیں، مکالمہ ہے۔ گستاخی معاف کروا کے اور آپ سے اجازت لے کے بطریقِ انبساط عرض کرتا ہوں کہ یہ سوا سو روپیے، جو توڑہ و خلعت کے نام سے مرحمت ہوئے ہیں، میں کال کا مارا اگر یہ سب روپیہ کھا جاؤں گا، اور اس میں لباس نہ بناؤں گا، تو میرا خلعت حضور پر باقی رہے گا یا نہیں؟ ؎

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

داد کا طالب غالب۔ دوشنبہ بجواب تعزیہ داراں پانچیں، اور از روی دوج ۶ محرم الحرام سنہ ۱۲۸۰

(۲۵)

ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعد تسلیم معروض ہے۔ آٹھ سات برس سے معہدِ خدمت اور شریکِ دولت ہوں۔ لازم کرلیا ہے کہ بیہودہ گزارش نہ کروں اور کبھی کسی کی سپارش نہ کروں۔ بھائی حسن علی خاں کے بیٹوں کے باب میں جو علی بخش خاں صاحب کو لکھا، اس کو میں سپارش نہ سمجھا تھا۔ مخبر بنا، اور آپ کے اہل کاروں کو اس بات کی خبر دی کہ جس کا تدارک صاحبانِ ملک و مالکانِ عہد پر لازم ہے سو بمقتضای نصفت و عدالت وہ مقدمہ فیصل ہوگیا۔ میر سرفراز حسین اور میرن صاحب کو "واللہ باللہ" اگر میں نے بھیجا ہو! نوکری کی جستجو کو نکلے تھے۔ میر سرفراز حسین نوکری پیشہ، اور میرن مرثیہ خواں اور یہاں کے مرثیہ خوانوں میں ممتاز۔ خاں صاحب کو جو میں نے یکھا کہ

یہ ایسے ہیں اور ایسے ہیں، غرض اس سے یہ تھی کہ محرم ہیں جہاں دس پانچ مرثیہ خواں اور مقرر ہوتے ہیں، میرن بھی مقرر ہو جائیں۔ آخر جا بجا تھانیدار، کوتوال، تحصیلدار نوکر ہیں۔ میر سرفراز حسین ہوشیار اور کارگزار آدمی ہیں۔ کسی علاقے پر یہ بھی مقرر ہو جائیں۔ یہ دونوں امر یا ان دونوں میں سے ایک ہو جاتا بہتر تھا، نہوا بہتر۔ درحقیقت سپارش نہ تھی، صرف مُعرّف ہونا تھا۔ سپارش کرتا تو کیا میں آپ کو نہ لکھ سکتا تھا؟ میری طرف سے خاطر عاطر جمع رہے

زسینہ تا بلبم سالہا نیابد راہ ہر آن نفس کہ رضای تو اندر آن نبود!

داد کا طالب، غالب۔ دوشنبہ ۲۲ جولائی سنہ ۱۸۶۱

(۲۶)

ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعد تسلیم کے عرض کرتا ہوں، اور طلوعِ ستارۂ اقبال کی مبارک باد دیتا ہوں۔ یقین ہے کہ اس سفر فیض اثر میں "ریل گاڑی" کی سواری کی بھی سیر دیکھ لی ہوگی۔ یہ اُس میمنت و شکوہ و شوکت سے علاوہ ایک تماشا نیا دیکھا۔ حق تعالیٰ حضرت کو سلامت باکرامت رکھے!

دعاگو ایک مہینا بھر سے بیمار ہے۔ ابتدا وہی قولنج دَوری۔ بسبب استعمالِ ادویۂ حارّہ کہ اس مرض میں اُس سے گریز نہیں، تپ نے آگھیرا۔ کئی باریاں جُھگتیں۔ اب دو باریاں ٹل گئی ہیں، لیکن طاقت بالکل سلب ہوگئی ہے، اور ضعفِ دماغ نے قریب بہ ہلاکت پہنچا دیا ہے۔ بالفعل آبِ سیب کا استعمال ہے۔

طریقۂ دعاگوئی و ثناخوانی کی رعایت سے نوبتِ سلسبیل مثنوی، کہ جس میں حصولِ عطیۂ سلطانی کی ہجری و عیسوی تاریخ ہے، بہر حال لکھ لی ہیں۔ کل درود عنایت نامہ سے معزز ہو کر آج وہ اشعار نذر کرتا ہوں۔

زیادہ حدِ ادب۔ تم سلامت رہو قیامت تک! شفقت کا طالب، غالب

دوشنبہ ۱۱ نومبر سنہ ۱۸۶۱

(۲۷)

حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعد تسلیم معروض ہے۔ کل ایک شعر طور ہی مغفور کا اور ایک شعر غالبِ مرحوم کا ایک ورق پر لکھ کر، صبح کو ڈاک میں بھجوادیا۔ شام کو توقیع تیع ہرکارۂ ڈاک نے لادیا۔ اگست سنہ ۱۸۶۱ کی پرورش کی ہنڈوی پہنچی، اور سو روپیے وصول ہو گئے۔

فقیر کا شیوہ صدق و سداد کا ہے۔ چند روز سے تفقّد و التفاتِ قدیم میں، خدا نخواستہ باشد، کچھ کمی پاتا ہوں۔ اگر غلط ہے میرا گمان، تو بشرفِ اطلاع مشرف فرمایئے؛ اور اگر میرا دلِ دیوانہ سچ سمجھا ہے، تو متوقع ہوں کہ عتاب کے سبب سے آگہی پاؤں۔ زیادہ حدِ ادب ؎

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

معروضۂ صبح دوشنبہ ۱۵ ستمبر سنہ ۶۲ء [مہر: غالب ۱۲۷۰]

یہ عرضداشت جُدا ہے، البتہ اس کے جواب کا امیدوار ہوں؛ اور رسیدِ معمولی جُدا ہے۔

(۲۸)

حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعد تسلیم معروض ہے۔ نوازش نامہ مع سو روپیے کی ہنڈوی کے پہنچا۔ اگست سنہ ۱۸۶۱ کے مہینے کی پرورش کا روپیہ وصول ہوا۔

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

[مہر: غالب ۱۲۷۰] دوشنبہ ۱۵ ستمبر سنہ ۱۸۶۲۔

(۲۹)

حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ نوازشنامہ مع ہنڈوی سو روپے کے تشریف درود لایا۔ سو روپیہ مصارفِ ستمبر سنہ ۱۸۶۲ کا معرضِ وصول میں آیا۔ تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار۔

معروضۂ دوم اکتوبر سنہ ۱۸۶۲ء

خوشنودیٔ مزاج کا طالب غالب

(۳۰)

حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ نوازشنامۂ ربوبیت طراز، مورخہ ۱۱ مارچ سنہ ۱۸۶۳ء، ۱۴ ماہِ مذکور کو میں نے پایا۔ ڈیڑھ سو روپے کی ہنڈوی کا شکر بجا لایا۔ کہاں تک شکر بجالاؤں گا؟ کس کس عنایت کا سپاس ادا کروں گا!

"و شکرِ نعمتہا ہی تو چنداں کہ نعمت ہای تو"

اب سنیئے اپنے دعاگو کی داستان۔ منگل ۳ مارچ کو جناب لفٹنٹ گورنر بہادر نے "خلعت عطا کیا، اور فرمایا کہ "ہم تمھیں مژدہ دیتے ہیں کہ نواب گورنر جنرل بہادر نے" اپنے دفتر میں تمھارے دربار اور خلعت کے بدستور بحال رہنے کا حکم لکھوا دیا۔" میں نے عرض کیا کہ "میں انبالے جاؤں؟" فرمایا: "البتہ انبالے جانا ہوگا۔"

بعد جناب نواب صاحب کے جانے کے شہر میں شہرت ہوئی کہ دلّی کے لوگ انبالے جانے سے ممنوع ہیں۔ گھبرایا اور صاحب کمشنر کے پاس گیا۔ آپ خط انبالے سے آیا۔ زبانی پرسش کا جواب زبانی پایا۔ پھر خط کے جواب میں خطِ محررۂ ۹ مارچ آیا۔ چنانچہ لفافہ بلحاظِ گرانیٔ وزن رہنے دیتا ہوں اور خط بجنسہٖ حضرت کو بھیجتا ہوں۔

کل سے ایک اور خبر اڑی ہے کہ نصیبِ اعدا لارڈ صاحب کی طبیعت ناساز ہو گئی ہے؛ انبالے میں دربار نہ کریں گے اور شملے کو چلے

جائیں نے۔ اب میں دو وجہ سے بَینَ السَّفرِ والسّکون متردد ہوں: پہلی وجہ خاص، دوسری وجہ عام۔

دو سو میں سے سوکے کرسازوسامان درست کیا ہے، اور سو مہاجن کے ہاں ڈاک اور خرچ راہ کے واسطے رہنے دیے ہیں۔ تار برقی میں جناب نواب صاحب سے حکم منگواؤں گا۔ جو حکم آئے گا، آپ سے عرض کر کے اُس کی تعمیل کروں گا ؎

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

معروضۂ ۱۲ مارچ سنہ ۱۸۶۳ء (مہرِ غالب ۸-۱۲)

(میرزا صاحب نے ایک پیڈ مزوری عریضہ سہ شنبہ ۲۸ جولائی سنہ ۱۸۶۳ء کو لکھا تھا، جس میں اُس کا صرف لفافہ موجود ہے، اور اُس پر میرمنشی صاحب دارالانشا نے تحریر کیا ہے: "عرضی در حضور رسانند")

(۳۱)

حضرتِ ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعد تسلیم معروض ہے۔ جب ابنائے میرا جانا نہ ہوا، تو میں نے قصیدۂ مدح، جو دربار کی نذر کے واسطے لکھا تھا، بطریقِ ڈاک جناب چیف سکرتر بہادر کو اس مراد سے بھیجا کہ آپ اس کو جناب نوابِ معلّی القاب کی نظر سے گزرانیں۔ اور یہ دستورِ قدیم تھا کہ جب میں قصیدہ مدحیہ بھیجتا تو صاحب سکرتر بہادر کا خط بے واسطۂ حکام ماتحت مجھ کو آجاتا۔ اب جو میں نے موافقِ معمول قصیدہ بھیجا، یقین ہے کہ مارچ یا اپریل کے مہینے میں وہ لفافہ یہاں سے لشکر کو گیا۔ صدائی برنخاست۔ ناامید ہو کر بیٹھ رہا، بلکہ یہ خیال گزرا کہ جب رسمِ تحریرِ خطوط نہ رہی، تو دربار اور خلعت کہاں؟ ناگاہ کل شام کو صاحب سکرتر بہادر کا خط ڈاک میں آیا۔ وہی افشانی کاغذ، وہی القاب۔ جی چاہتا تھا کہ اصلِ خط مع سرنامہ بھیج دوں، تاکہ حضور ملاحظہ فرمائیں؛ مگر

برسات کا اندیشہ مانع آیا۔ نقل سرنامے اور خط کی بھیجتا ہوں ؎
تم سلامت رہو قیامت تک! دولت و عزّ و جاہ روز افزوں!
حضور کی خوشنودی کا طالب، غالب
صبح سہ شنبہ ۴ ماہ اگست سنہ ۱۸۶۳

(۳۲)

حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!
بعد تسلیم کے معروض ہے۔ نوازش نامہ اور اُس کے ساتھ دو ہنگیلے دو سو آموں کی پہنچیں ؎ شکر نعمتہای تو چندانکہ نعمتہای تو! زیادہ حدِ ادب۔
تم سلامت رہو قیامت تک! دولت و عزّ و جاہ روز افزوں!
نجات کا طالب، غالب
سہ شنبہ پنجم جولائی سہ ۶۴

(۳۳)

حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!
بعد تسلیم معروض ہے۔ منشورِ عطوفت مع قطعۂ ہنڈوی شرفِ ورود لایا۔ سو روپیہ بابت تنخواہ جولائی سنہ ۱۸۶۴ کی معرض وصول میں آیا۔ فقط
تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!
ترحم کا طالب، غالب
۱۱ اگست سنہ ۱۸۶۴

(۳۴)

حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!
بعد تسلیم معروض ہے۔ نوازش نامہ مع ہنڈوی عزّ ورود لایا۔ سو روپیہ بابت تنخواہ ماہ اگست سنہ ۱۸۶۴ معرضِ وصول میں آیا۔ زیادہ حدِ ادب

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!
نجات کا طالب، غالب
جمعہ نہم ستمبر سنہ ۱۸۶۴

(۳۵)

حضرت ولیٔ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعد تسلیم معروض ہے۔ صدور والا نامہ سے میں نے عزت پائی۔ بنڈی ہنڈوی سو روپے بابت تنخواہ ستمبر سنہ ۱۸۶۴ وصول ہوئے۔ زیادہ حد ادب۔

ترحم کا مستحق اور تفقد کا طالب، غالب
دو شنبہ دہم اکتوبر ۱۸۶۴ عیسوی

(۳۶)

حضرت ولیٔ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعد تسلیم و نیاز معروض ہے۔ جب سے حضرت کی ناسازیٔ مزاج مبارک کا حال خارج سے مسموع ہوا ہے، عالم الغیب گواہ ہے کہ مجھ پر اور میری بی بی پر اور میرے فرزند حسین علی خاں پر کیا گزر رہی ہے۔ ایک دن رات میرے گھر میں روٹی نہیں پکی، ہم سب نے فاقہ کیا۔ بارے وہ خبر وحشت اثر غلط نکلی، حواس ٹھکانے ہوئے۔ بالکل اطمینان جب ہوگا کہ آپ کے غسلِ صحت کی نوید سُنوں گا، اور قطعۂ تاریخ غسلِ صحت لکھ کر بھیجوں گا۔ فی الحال اتنا چاہتا ہوں کہ اس خط کا جواب پاؤں۔ اور حقیقتِ مرض سے آگہی حاصل ہو۔ زیادہ حد ادب

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!
تمھاری سلامتی کا طالب، غالب
۸ نومبر سنہ ۱۸۶۴

(۳۷)

حضرت ولیِّ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ ابتدای یکم نومبر سے ۱۱ تک، عرض نہیں کرسکتا کہ لیل و نہار مجھ پر کیسے گزرے ہیں۔ راہ دُور، میں رنجور، معذا بیقدور۔ اگر دلّی سے رامپور تک ننکرم کی ڈاک جاتی ہوتی، تو میں یہاں ایک دم نہ ٹھرتا[1] اور خدمت میں حاضر ہوتا۔ تار برقی بھی نہیں، جو صحت و عافیت کی خبر جلد حاصل ہو۔ ناچار از راہِ اضطرار، ماہِ حال، یعنی نومبر کو عریضہ روانہ کیا۔ خدا کی عنایت اور مرشدِ کامل، یعنی حضرت کی ہدایت نے اُس خط کے[2] جواب آنے کی مدّت سے پہلے مجھے گرداب اضطراب سے نکالا۔ کل ۱۲ نومبر کو نوازشنامہ آگیا۔ گویا میری جان بچ گئی، بلکہ ایک اور نئی جان میرے بدن میں آگئی۔ اب استدعا یہ ہے کہ حالِ ناسازیٔ مزاجِ اقدس مفصل معلوم ہو۔ زیادہ حدِّ ادب[3]

تم سلامت رہو ہزار برس ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

عافیت کا طالب، [مہر: غالب ۱۲۷۰]

یکشنبہ ۱۳ نومبر سنہ ۱۸۶۴

(۳۸)

حضرت ولیِّ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ عنایت نامہ مع ہنڈوی شرفِ ورود لایا۔ سو روپیہ بابتِ اکتوبر سنہ ۱۸۶۴ معرضِ وصول میں آیا۔ زیادہ حدِّ ادب۔

تم سلامت رہو قیامت تک! و دولت و عزّ و جاہ روز افزوں!

عافیت کا طالب، غالب

۱۳ نومبر سنہ ۱۸۶۴

(۳۹)

حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ کس زبان سے کہوں، اور کس قلم سے لکھوں کہ یہ ہفتہ عشرہ کس تردد و تشویش سے بسر ہوا ہے! ہر روز شام تک جانبِ دروازہ نگراں رہتا کہ ڈاک کا ہرکارہ آئے، اور حضرت کا نوازش نامہ لائے بارے، خدا کی مہربانی ہوئی، از سرِ نو میری زندگانی ہوئی کہ کل چار گھڑی رات گئے ڈاک کے ہرکارے نے وہ عطوفت نامۂ عالی دیا، جس کو پڑھ کر روح تازہ رگ و پے میں دوڑ گئی۔ نیند کس کی، سونا کس کا! روشنی کے سامنے بیٹھا اور اشعارِ تہنیت لکھنے لگا۔ ساٹھ شعر مع مادہ حصولِ صحت جب لکھ لیے، تب سویا۔ اب اس وقت وہ مسودہ صاف کرکے ارسال کرتا ہوں۔

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

خیر و عافیت کا طالب، غالب

۲۷ نومبر سنہ ۱۸۶۴

(۴۰)

حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ نوازش نامہ عزّ ورود لایا۔ اڑدوی ہنڈوی سو روپیہ بابتِ تنخواہِ ماہِ نومبر سنہ ۱۸۶۴ معرضِ وصول میں آیا۔ زیادہ حدِ ادب۔

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

تمھاری سلامتی کا طالب، غالب

۱۳ رجب و دسمبر سنہ ۱۸۶۴

(۴۱)

حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ حضرت کے قدموں کی قسم! جب چینی کے

ارسال کا حکم ڈاک سے میں نے نہیں پایا۔ ۲۲ دسمبر کو ہرکارہ آیا۔ نوازش نامہ شرف افزا لایا۔ دِلّی اب شہر نہیں، چھاؤنی ہے، کیمپ ہے۔ نہ قلعہ، نہ شہر کے امرا، نہ اطرافِ شہر کے رؤسا۔ بہر حال تین چار دن میں ہر ایک جگہ سے منگوا کر رنگین و سنگین دیے گرہ یا کم گرہ خود چن کر، پانچ سیر قطعاتِ چوبِ چینی ایک تھیلیا میں رکھ کر، آٹے سے منھ بند کیا، پھر کپڑا لپیٹا، ڈوری سے خوب مضبوط باندھ کر، دو جگہ اپنی مہر کی اور وہ تھیلیا کہار کو سونپی ۵
تم سلامت رہو قیامت تک ! دولت و عزّ و جاہ روز افزوں !
روزِ دوشنبہ ۲۶ دسمبر سنہ ۱۸۶۴ء، وقتِ صبح حوالۂ کہارِ سرکار۔ [مہر: غالب ۱۲۷۸ء]

(۴۲)

حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت !

بعد تسلیم معروض ہے۔ نوازشنامے کے ورود سے عزت اور اداراکِ صحت و عافیتِ مزاجِ اقدس سے مسرت حاصل ہوئی۔ پرچۂ ہنڈوی کس توقیع میں ملفوف پایا۔ سو روپیہ بابتِ تنخواہِ دسمبر سنہ ۱۸۶۴ معرضِ وصول میں آیا۔ زیادہ حدِّ ادب
تم سلامت رہو قیامت تک ! دولت و عزّ و جاہ روز افزوں !
حضور کی سلامتی کا طالب، غالب
۱۴ جنوری سنہ ۱۸۶۵ عیسوی

(۴۳)

حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت !

بعد تسلیم معروض ہے۔ منشورِ کرمت ظہور کے ورود و مسعود نے میری عزت بڑھائی، اور اس میں تنخواہِ فروری سنہ ۱۸۶۵ء کی ہنڈوی پائی۔ زرِ مندرجۂ ہنڈوی معرضِ وصول میں آیا۔ سو روپیہ حضرت کا تصدق پایا

الٰہی، وہ دن جلد ہو کہ جو میں سنوں کہ حضرت نے غسلِ صحت فرمایا!

تم سلامت رہو قیامت تک!
دولت و عزّ و جاہ روز افزوں!

نجات کا طالب، غالب
۱۱ مارچ سنہ ۱۸۶۵ء

(۴۴)

بحضرتِ فلک رفعت، نواب معلی القاب، انجم گروہ، آفتاب شکوہ، بخشش و بخشائشِ بینوایان را[1] توانگرکن و ناتوان را توانا ساز، در عزّ و جاہ با تاجداران ہمسر و در ملک و سپاہ با شہریاران انباز، کہ بفرزانگی حلقہ در گوش افگنندۂ دانش گستران، و بمردانگی غاشیہ بردوش نہندۂ دلاوران، ہرچہ از نیایش و ستایش بتقدیم ہمی رسد، مرز بازدی ہمت است[4] تا بدان نیرو در سخن دلیری تواند کرد۔

ہمانا از رازِ سپہر و ستارہ سخن ہمی رود[1] و خجستگی و فرخندگی[2] چند گفتہ می شود این تا فِ ہفتہ کہ راستان در باستان این را "بہرام روز" میگفتند و اکنون "سہ شنبہ" نام دارد، روزِ بیست فیروز، دیژہ و درین سالِ فرخ فال کہ دو ہمین روز است از فروردین، در روزِ بیست[2] و یکم از مارچ، و روزِ بیست و دوم از شوال۔ باری، نخست بر آن سرورِ شاہ نشان کہ امروز بشستنِ اندام آبروی گرمابہ افزود، مبارک، و سپس بر غالبِ سخندان کہ عافیت جوی و دعاگوی این درگاہ ست، ہمایون!

ہمانا درین روزگار، خسرو ستارگان کہ مہرِ منیرش دانی، در برّہ، و از سوی فرازنختین سیارگان کہ زحلش خوانی، در ترازو، سعدِ اکبر بہ قوس و سعدِ اصغر بہ ثور، آن دو نیّر بہ بیت الشرف خوشنود و شاد، و این دو اختر بکاشانہ ہای خویشتن آباد۔ گمان ندارم کہ از خسروانِ پارس و سلاطینِ عرب

ہیچ کس را چنین طالعی بہرِ جلوس اتفاق نیفتادہ باشد، کہ حضرتِ ولیِ نعمت
را برای غسلِ صحت دست بہم دادہ است۔ خرد تا گفتارِ مرا شنود، چشمک زد
و بہ پیغارہ سرود کہ "ای در درخشانیِ[۱] انجم آفتاب، چون کودکان در بال
افشانیِ کرمکہای شب تاب، نگران! از حلقۂ[۲] اختر شماران بدر آی، و
بدبستانِ حکمای روحانی رمزی از حکمتِ ایمانی بشنو، تا بدانی کہ بدین
امیرِ مسند سریر، سلطان نظیر، عمرِ جاودانی و دوامِ لذتہای روحانی بخشیدہ
اند" گفتم: "تا برہان نباشد" کالبدِ سخن را جان نباشد۔ مرا بے خیر مپندار، و
اگر حجتی داری، بیار" گفت: "برہانی ازین ارجمند تر و حجتی ازین خرد
پسند تر چہ خواہد بود کہ چون آفریدگان را در آن جہان عمرِ دوبارہ دہند،
دیگر بیمِ مرگ برخیزد و بہ بانگِ صور از خوابِ فنا جستگان در آن گیتی
جاوید پایند۔ مگر صحتِ خداوند ازین رنجوریِ ہولناک[۳] بدان نماند کہ
پنداری عمرِ دوبارہ یافت؟ پس اقتضای دوبارہ زیستن تغیر چرا پذیرد؟
و چون ہستی یافتگانِ آن جہان در آن جہان جاودان زندہ مانند،
آنکہ درین گیتی حیاتِ ثانی پذیرفتہ باشد، ہم درین گیتی ہمیشہ زندگانی چون
نکند؟ این عمرِ عزیز کہ بخدایگان دادہ اند، عمرِ خضر و الیاس نباشد،
کہ یکی را بشمردنِ ریگِ صحرا، و دیگری را بہ پیمودنِ آبِ دریا گزرد۔
انشاء اللہ العظیم، جنابِ عالی، تا جہانست، پرویز بزم، تہمتن رزم
دشمن گداز، دوست نواز، بلبل در سخن اختر فشان، و بکف در کرم
گوہر فشان خواہند زیست۔

قطعۂ تاریخ غسلِ صحت، و قصیدۂ تہنیت کہ پیش ازین فرستادہ
ام[۴]، نظمی است شاعرانہ، و این نگارش نثریست عارفانہ، قانونِ حکمت
و شریعت را جامع، ہم از روی نقلِ حق، و ہم از روی عقلِ راست
بقای خداوند عمرِ تازہ جاودانی، و نشاطِ بی اندازہ پیشکارِ این حیاتِ

ثانی باد! چارشنبہ ۲۳ شوال سنہ ۱۲۸۱ھ و ۲۲ مارچ سنہ ۱۸۶۵ء -
(مہرِ غالب ۱۲۷۰ھ)

"بحضورِ نواب صاحبِ والامناقبِ عالی شان، قلزمِ فیض و عمانِ احسان، امیر المسلمین نواب کلبِ علی خاں بہادر دام اقبالہٗ مقبول باد"

[نواب سید محمد کلبِ علی خاں بہادر خلدِ آشیاں، نواب فردوس مکاں کے فرزندِ اکبر تھے۔ آپ جنابِ عالیہ فیروز النسا بیگم صاحبہ، ملقب بہ نواب بہو بیگم، دختر سید عبدالعلی خاں بہادر، خلفِ نواب سید غلام محمد خاں بہادر کے بطن سے ۲۰ ذی الحجہ سنہ ۱۲۵۰ھ (۱۹ اپریل سنہ ۱۸۳۵ء) کو اتوار کے دن صبح کے وقت متولد ہوئے۔ سنہ ۱۸۶۴ء میں گورنر جنرل کی منظوری سے ولیعہدِ ریاست اور ۲۴ ذیقعدہ سنہ ۱۲۸۱ (۲۱ اپریل سنہ ۱۸۶۵ء) کو جمعے کے دن ۳۰ سال کی عمر میں مسند نشین ہوئے۔ ۱۵ محرم سنہ ۱۲۸۲ھ (۱۰ جون سنہ ۱۸۶۵ء) کو مسٹر جان انگلس، ایجنٹِ ریاست و کمشنر روہیلکھنڈ نے رامپور آکر ضابطہ رسم مسند نشینی ادا کی۔ ماہِ رجب سنہ ۸۲ھ (دسمبر سنہ ۶۵ء) میں ملکۂ معظمہ کی جانب سے خلعت آیا، اور اسی مہینے میں جشنِ جلوس منایا گیا۔ آپ بڑے حاتم دل، پابندِ شرع، بامروت اور خلیق تھے۔ باقاعدہ زکوٰۃ ادا کرتے، اور غیر شرعی آمدنی سے خزانے کی دولت کو پاک رکھتے تھے۔ خود صاحبِ علم تھے، فارسی خلیفہ غیاث الدین عزت، صاحبِ غیاث اللغات، سے حاصل کی، اور علومِ حکمیہ مولوی فضلِ حق خیرآبادی اور مولوی عبدالحق خیرآبادی سے پڑھے۔ ان کا دربار اہلِ کمال سے بھرا رہتا تھا۔ مشرقی علوم و صنائع کا شاید ہی کوئی ایسا ماہر ہو جو ان کے خوانِ جود و کرم کی زلہ ربائی نہ کرتا ہو۔ ان میں علما، شعرا، ادبا، خطاط، صحاف، طباخ، اور دیگر تمام ہنروں کے ماہرین شامل تھے۔ علمی مباحثوں کا بہت شوق تھا۔ روزانہ دربار میں کسی نہ کسی علمی یا ادبی مسئلے پر اہلِ دربار طبع آزمائی کیا کرتے تھے۔ آپ خود برابر کا حصہ لیتے، اور اس طرح اپنے معلومات کے دائرے کو وسیع سے وسیع تر بناتے

رہتے تھے۔ کتابیں جمع کرنے اور اُنھیں پڑھنے کا بھی بے حد شوق تھا۔ اُس عہد میں جس قدر نایاب اور نادر کتابیں مہیا کی گئی ہیں، وہ اپنی اہمیت اور قیمت کے لحاظ سے مستقل کتاب خانے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ فارسی ادبیات سے زیادہ دلچسپی تھی۔ جب کوئی نئی فارسی کتاب خرید فرماتے، اُس کے سرورق پر اپنے قلم سے تاریخ آمد وغیرہ لکھتے۔ اُردو فارسی، دونوں زبانوں میں شعر کہتے، اور نوابؔ تخلص فرماتے تھے۔ فارسی کلام مرزا محمد تقی خاں سپہرؔ، مؤلف ناسخ التواریخ، کی نظر سے گزرا تھا۔ اُردو کلام امیرؔ مینائی لکھنوی دیکھا کرتے تھے۔ ایک فارسی نثر مرزا غالبؔ کو بھی اصلاح کے واسطے بھیجی تھی، مرزا صاحب ان کی طرز نگارش کے بیحد مدّاح تھے۔ تصنیفات میں چار اُردو کے دیوان، دیوان فارسی، تاریخ شاہانِ سلف، انتخاب بوستانِ خیال اور متعدد نثریں ہیں۔ اخبار بینی کا بھی شوق تھا۔ دبدبۂ سکندری، جو رامپور کا پہلا اخبار ہے، اُنھیں کے ایما سے ۱۱ جمادی الآخرہ ۱۲۸۳ ہجری (۱۵ اکتوبر سنہ ۱۸۶۶ء) سے ہفتہ وار شائع ہونا شروع ہوا۔ آپ نے ۲۲ سال ۷ ماہ کی حکومت کے بعد ۵۳ سال ۷ ماہ ۷ روز کی عمر میں بدھ کے دن ۳ بجے کے وقت، ۲ جمادی الآخرہ ۱۳۰۴ھ (۲۳ مارچ سنہ ۱۸۸۷ء) کو انتقال کیا۔ امیرؔ مینائی نے ”خوابگاہِ حامیٔ اسلام امیر المؤمنین“ سے تاریخ وفات نکالی ہے۔]

(۴۵/۱)

حضرت ولیٔ نعمت آیۂ رحمت سلامت

بعد تسلیم معروض باد۔ نوازش نامہ مع ہنڈوی صد روپیہ عز ورود لایا اپریل سنہ ۱۸۶۵ء کی تنخواہ کا روپیہ معرض وصول میں آیا۔ زیادہ حدِّ ادب

۵

تم سلامت رہو ہزار برس ؛ ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

عنایت کا طالب، غالب

۶ مئی سنہ ۱۸۶۵ عیسوی

(رباعی)

سرتا سرِ دہر عشرتستانِ تو باد! صد رنگ گُلِ طرب بدامانِ تو باد!

عیداست و بہار خرمی باد ارد جانِ من و صد چو من بقربانِ تو باد!

عنایت کا طالب غالب شنبۂ صبح روزِ عید ذی الحجہ سنہ ۱۲۸۱ ہجری نبوی ؐ

(۳۶/۲)

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعد تسلیم معروض ہے تہنیت نامہ ارسال کر چکا ہوں، جواب پا چکا ہوں۔ قصیدے کا لفافہ ارسال کیا ہے۔ یقین ہے کہ پہنچ گیا ہوگا۔

حضرت فردوس مکان بہرآستاں کا معمول تھا کہ محرم سے دو تین مہینے پہلے سلام پانچ سات لکھتے تھے، اور فرداً فرداً میرے پاس بھیجا کرتے تھے۔ جب وہ فراہم ہو چکتے، تو محرم سے دو چار دن پہلے میں اصلاح دیکر بھیج دیا کرتا تھا اب کے برس ایک ہی سلام بھیجنے پائے بس۔ آج وہ سلام اِس مراد سے حضور میں بھیجتا ہوں کہ حضور کے حکم سے حضرت کے دیوان میں شامل ہو جائے۔ زیادہ حدِ ادب ۵

تم سلامت رہو ہزار برس؛ دولت و عزّ و جاہ روز افزوں!

عنایت کا طالب، غالب

شنبہ یکم محرم الحرام سنہ ۱۲۸۲ؐ

(۳۷/۳)

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعد تسلیم معروض ہے۔ حق تعالیٰ، جلّ جلالہٗ، عمّ نوالہٗ جس حرروپر

مہربان ہوتا ہے، وہاں حاکم عادل رحیم بھیجتا ہے، کہ وہ تقویت عادل کفر و بدعت کی جڑ اکھاڑ ڈالے، اور بعنفت رحم رعایا کو پالے۔ مصداق اس کا ذات قدسی صفات جناب عالی ہے، کہ قمار خانے کی بنا ہٹا ڈالی ہے۔ زہے قانون سیاست! غلّے کا محصول معاف کر دیا ہے، روپیہ رعیت پر نثار کیا ہے۔ زہے آئین ریاست! ۵

رباعی

نوّاب کہ شد ز شوکتِ اقبالش بخشیدن باجِ غلّہ از افضالش
فارغ شد ہر کسی و رود آد فراغ ہم فایہ رغ" وہم" فراغ بالش باش

پیر و مرشد، حضرت فردوس مکاں کا دستور تھا کہ جب میں قصیدہ بھیجتا، اُس کی رسید میں خطِ تحسین و آفرین کا، شرم آتی ہے کہتے ہوئے مگر کہے بغیر بنتی نہیں، ۱۰۰ کی ہنڈوی اُس خط میں ملفوف عطا ہوا کرتی تھی۔ وہ قصیدے مدحیہ میرے دیوانِ فارسی میں مرقوم، اور وہ دیوان حضرت کے کتاب خانے میں موجود ہے۔ خطوں کی تصدیق از روی دفتر ہو سکتی ہے یہ رسم مجری نہیں ہے۔ اگر جاری رہے، تو بہتر ہے۔ زیادہ حدِ ادب۔

التفات کا طالب، غالب پنجشنبہ ۱۹ محرم سنہ ۱۲۸۱

(۴۸/۴)

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعد تسلیم معروض ہے۔ نوازشنامہ مع سَو روپے کی ہنڈوی کے عزِ ورود لایا۔ مئی سنہ ۱۸۶۵ کا مشاہرہ معرض وصول میں آیا۔ زیادہ حدِ ادب۔

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

التفات کا طالب، غالب

۱۵ جون سنہ ۱۸۶۵ عیسوی

(۴۹/۵)

حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ روزِ پنجشنبہ ۱۵ جون کو ایک عرضداشت روانہ کرچکا ہوں۔ یقین ہے کہ وہ آج پہنچے گی۔ کل ۱۷ جون کو فرح بخش و روح افزا نوازشنامہ پہنچا! قصیدے کا پہنچنا اور اُس کا مقبول و منظور ہونا دریافت کرکے اپنی بخت و قسمت پر میں نازاں ہوا! اب عرض یہ ہے کہ حسب الحکم حضور کے یہ قصیدہ میرے دیوانِ فارسی میں، جو کتاب خانے میں موجود ہے، درج کیا جائے اور سلام حضرت فردوس مکاں کا اُن کے دیوان اُردو میں لکھ دیا جائے۔

حضرت کی خدمت میں نہ آؤں گا، تو اور کہاں جاؤں گا؟ وہ آگ برس رہی ہے کہ طیور کے پر جل رہے ہیں۔ بعد آگ کے پانی برسے گا۔ سفر خصوصاً بوڑھے رنجور آدمی کو دونوں صورت میں متعذر۔ آفتاب میزان میں آیا، اور ہنگامۂ آتش و آب رفع ہوا، اور میں نے احرام بیت المعمور رامپور باندھا، اِنْشَاءَ اللہُ الْعَلِیُّ الْعَظِیْم۔

پیر و مرشد، از راہِ خیر خواہی ایک امر عرض کرتا ہوں۔ محمد علی خاں ابن وزیر محمد خاں رئیسِ ٹونک، نے بعدِ مسند نشینی گورمنٹ کو "یمین الدولہ" اور دو جزو "ملک و جنگ" لکھ کر دیے، اور وہاں سے وہ اُن کو عطا ہوئے۔ حضور کے اجداد امجاد نے سلاطینِ بابریہ کا خطاب نہ قبول کیا۔ مگر حضرت کے جدِ امجد کو احمد شاہِ دُرانی نے مخاطب بہ "مخلص الدولہ" فرمایا۔ حضرت اگر مناسب جانیں، تو اُس خطاب کو مع دو جزو "شمس الملک و بہرام جنگ" جنابِ ملکۂ معظمہ سے بذریعۂ گورمنٹ اپنے واسطے لیں؟ ؎

تم سلامت رہو قیامت تک! دولت و عز و جاہ روز افزوں!

ترقیِ دولت کا طالب، غالب۔ یکشنبہ ۱۸ جون سنہ ۱۸۶۵ء

(۵۰/۶)

حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ منشورِ عطوفت کے ورود نے معزز فرمایا۔ جون سنہ ۱۸۶۵ء کی تنخواہ کا سو روپیہ از روی ہنڈوی معرفتِ وصول میں آیا۔ زیادہ حدِ ادب ہے

تم سلامت رہو قیامت تک! دولت و عزّ و جاہ روز افزوں!

عنایت کا طالب، غالب

معروضۂ دہم جولائی سنہ ۱۸۶۵ء

(۵۱/۷)

حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ میری عرضداشت کا جواب آ چکا ہے، بلکہ ہنڈوی کی رسید بھجوا چکا ہے۔ یہاں خلق کو مینہ درکار ہے، اور ہوا شرارہ بار ہے۔ دھوپ کی تیزی سے آدمی کے تیور، اور پہاڑ کے پتھر چلے جاتے ہیں۔ پانی جگر گداز، ہوا جانستاں، امراضِ مختلفہ کا ہجوم جہاں تہاں۔ جزا عضای انسان کے، کہ وہ پسینے میں تر ہیں، طراوت و رطوبت کا کہیں پتا نہیں۔ پانْو چلتی ہے۔ یا مطلق ہوا نہیں ان سطور کی تحریر سے مدعا یہ ہے کہ مجھے ہر وقت یہی خیال رہتا ہے کہ حضرت کا مزاج کیسا ہے۔ اِس خط کا جواب جس قدر جلد عطا ہو گا، دعاگو پر احسان آپ کا ہو گا۔ زیادہ حدِ ادب ہے

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

آپ کی سلامتِ ذات اور اپنی نجات کا طالب، غالب

۲۳ جولائی سنہ ۱۸۶۵

(۵۲/۸)

حضرتِ ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض آں کہ منشورِ عطوفت عزِ ورود لایا۔ تنخواہِ جولائی سنہ ۱۸۶۵ء حال کا مامہ روپیہ از روی ہنڈوی ملفوفہ معرضِ وصول میں آیا۔ فقط اگرچہ یہاں مینہہ اس قدر برسا ہے کہ جس کے پانی سے زمیندار حاصلِ فصلِ ربیع سے ہاتھ دھولیں، مگر چونکہ بفرمانِ ازلی میرے رزق کی برات آپ پر ہے، اور آپ کے ملک میں بارش خوب ہوتی ہے، ابرِ رحمت کے شکریے میں ایک قطعہ ملفوف اس عرضی کے بھیجتا ہوں، بنظرِ اصلاحِ نظم و اصلاحِ حال ملاحظہ ہو۔ زیادہ حدِ ادب

تم سلامت رہو ہزار برس ! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

نجات کا طالب، غالب

جمعہ ۱۱ ماہِ اگست سنہ ۱۸۶۵ء

۱ مقامِ شکر ہے، اے ساکنانِ خطۂ خاک
رہا ہے زور سے ابرِ ستارہ بار، برس

۲ کہاں ہے ساقیٔ مہوش؟ کہاں ہے ابرِ مطیر؟
بیار، لائیِ گلنار گوں؛ ببار، برس

۳ خدا نے تجھ کو عطا کی ہے گوہر افشانی
درِ حضور پر، اے ابرِ بار بار برس

۴ ہر ایک قطرے کے ساتھ آئے جو ملک وہ کہے
"امیر کلبِ علی خاں جییں ہزار برس"

۵ فقط ہزار برس پر کچھ انحصار نہیں
کئی ہزار برس، بلکہ بے شمار برس

۶ جنابِ قبلۂ حاجات، اس بلاکش نے

بڑے عذاب سے کاٹے ہیں پانچ چار برس
شفا ہو آپ کو، غالب کو بندِ غم سے نجات
خدا کرے کہ یہ ایسا ہو سازگار برس!

(۵۳/۹)

حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعد تسلیم معروض ہے۔ کل برخوردار نواب مرزا خاں داغ کی تحریر سے معلوم ہوا کہ حضرت کا مزاجِ اقدس ناساز ہو گیا تھا، اب خدا کے فضل و کرم سے افاقت ہے۔ نواب مرزا نے مجھ پر ستم کیا، کہ پہلے سے یہ حال نہ رقم کیا۔ جو واجب کرتا، اب بھی وردِ شب و روز ہے۔ مگر یہ خیال کہ حضور کو خیال گزرے گا کہ غالب رسمِ عیادت بجا نہ لایا، سخت جگر سوز ہے۔ اب اس خط کے جواب میں نویدِ عافیت کا امیدوار، اور یہ سوچ کر کہ آج کے آٹھویں دن جواب آئے گا، بیقرار ہوں۔

ایک عبارت کا ایک جزو بطریقِ خط ایک انصاف دشمن کو لکھ کر چھپوا دیا ہے۔ پارسل اُس کا نواب مرزا کو ارسال کیا ہے۔ پانچ رسالے وہ میری طرف سے نذر گزرانیں گے۔ حضرت قبولِ نذر کو میرا عزّ و شرف جانیں گے؟۔ ے

تم سلامت رہو ہزار برس! دولت و عزّ و جاہ روز افزوں!

دعاگو، غالب۔ ۱۴ ماہِ اگست سنہ ۱۸۶۵

(۵۴/۱۰)

حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعد تسلیم معروض ہے۔ داستانِ حمزہ قصّہ موضوعی ہے۔ شاہ عباس ثانی کے عہد میں ایران کے صاحب طبعوں نے اس کو تالیف کیا ہے۔ ہندوستان میں امیر حمزہ کی داستان [illegible] کہتے ہیں، اور ایران میں رموز

حمزہ" اس کا نام ہے۔ دو سو کئی برس اس کی تالیف کو ہوئے۔ اب تک مشہور ہے، اور ہمیشہ مشہور رہے گا۔

آپ کے اس تکیہ دار، روزینہ خوار فقیر نے آپ کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا ہے مشتمل اس التزام پر کہ تشبیب کی ابیات اور مدح کے اشعار میں حمزہ و اولادِ حمزہ و زمرد شاہ وغیرہ یا ان کے معاملات و حالات کا ذکر درمیان آئے۔ سو وہ قصیدہ آج اس خط کے ساتھ ارسال کرتا ہوں۔ امید ہے کہ حضرت اس کو پڑھ کر محظوظ ہوں۔ خدا آپ کو قیامت تک سلامت رکھے! مگر جب تک امیر حمزہ کا قصہ مشہور رہے گا، یہ قصیدہ بھی شہرت پزیر رہے گا ۵

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

نجات کا طالب، غالب۔ ۱۸ ماہ اگست ۱۸۶۵ء

یاد ہا ب!

زہی دو چشمِ تو در معرضِ سیہ کاری چو بختیارک و بختک، بمردم آزاری
زہی نبرد بدیع الزمانِ کشتی گیر کہ کوہسار، چو نارنج تر بیفشاری
زہی خیالِ تو آدم ربا، چو تُندک دیو دماغِ اہلِ نظر قافِ اوست، پنداری
زغمزۂ تو چگویم؟ کہ آن بود زعمر[۲] دلیر و چُست و ہنرمند تر بعیاری
اگر تو نیستی از ساحرانِ انتریا چرا، بلہو، ہمی آتش از ہوا باری
بدین جمال کہ داری عیب مدار، اگر کند چکیدۂ قدرت ترا پرستاری
بپہر روی تو گر دیدم آفتاب پرست نہ ایرجم کہ عبث تن دہم بدین خواری
بسیں بمذہبِ تو رج کہ بودہ ماہ پرست ترا پرستم ازین رو کہ ماہ رخساری
تو نیٔ بمعنیٔ اصلی و بود نور الدہر ہمیں بنام کہ معنی نداشت، پنداری
چکد ز زلفِ تو خونِ دلم بدا نگو نہ کہ ریزد از لبِ زنگی در آدمی خواری
فغان ز بارِ غم دہر، کان بسنجیدن عمودِ خسر و ہند است در گرانباری

به پیشِ چرخِ مشعبد، چه هوشیار و چه مست؟ — که این لعب بده، همچون عُمر، ز طراری
زر وی ریش تراشد همی به بیهوشی — ز فرقِ تاج رباید همی بهشیاری
خصومتی بمن افتاده زالِ دنیا را — که دُم خبیثه بود در فنونِ مکاری
بجلیشِ عشق منم سر برهنهٔ تیشی — که موی سر بسرم کرده است دستاری
بهیبِ فتنه بالچوب شش گزی مانَد — که بود هر لگد کشش را جراحتِ کاری
شدست لاغریٔ من گلیمِ غیبیٔ من — که با غمم و توام از جامزانِ نه انگاری
منم که فکرِ من اندر زمینِ شعر و سخن — ق — همین گذشت ز اشقر به تیز رفتاری
چه اوفتاده؟ که یارب، کنون چوار تامی — بخاک و خون تپیدم تن همی بناچاری
چنان بخوردنِ غم عادیم که چون عادی — نبوده هیچگهی سیر هم ز پُرخواری
نهاده هم‌نفسان نامِ من ملک قاسم — ز خونِ دیده بود بسکه جامه گلناری
رسیده بخلِ لعینکرِ من از عُمر میراث — ق — که هیچگه ندهد در سخن مرا یاری
دروغ گفته ام، آن فکرِ تیز زنبیل است — که گم شود ز عُمر در دمِ گرفتاری
چو حمزه رابجهان، بعدِ مرگِ مهر نگار — ز تیغ و تاج و نگین بردی وادبیزاری
نماند در نظرِ دزدِ کهنه اسلوبی — بجز آن که باز کشاید دکانِ عطاری
دل است حمزه و لب از فسونگری عمرست — بدا کسی که ز دل نبودش مددگاری
شد آن که بود کلامم طلسمِ گوهربار — هماره نهر ز آبِ گهر روان جاری
چو حمزه، رکش بعقابین در کشید فلک — به دامِ دام، نفس میکشم بدشواری
نقاست قرض و منم حمزه و ز بهرِ منند — جبلِ خلیفه، تقاضائیانِ بازاری
چو ساحران، همه را شعلهای آتش افشانی — چو اژدها، همه را ذوقِ آدم اوباری
نه زهر مهره نشد نه زهر حمزه به، آن به — که نوشداروی نیروانِ جنگ آری
مگر بفضلِ وی آیم برون ز بندِ بلا — چنانکه حمزه، به نیروی پیرِ فرخاری
امیرِ کلبِ علیخان بهادر، آن که بود — عدیلِ حمزه در اسپهبدی و سالاری
درش نوازشِ طبلِ سکندری دارد — خهی بلندیٔ آوازهٔ جهانداری

بود بلارکِ افراسیابیش در کف — کہ ہیچگہ نشود، چون ہلال، زنگاری
چگویم از نمطِ لشکرِ ظفر پیکر! — ق کہ در شمار نیاید ہمی نہ بسیاری
ہمہ مقابلِ مُقبل، بہ ناوک اندازی — ہمہ مساہم خسرو، بہ طاقت اظہاری
بیا، بہ بین کہ در اردوی این امیرِ کبیر — سپردہ اند علمشاہ را علم داری
چو قندر، آن کہ حلو دارِ حمزہ بود، اینک — رسیدہ است بخاقانِ چین، حلو داری
سزد کہ فخر بر اقبالِ خود کند کندور — ازین کہ یافتہ توقیعِ گرز برداری
مپرس بر درش از ہستیٔ زمردِ شاہ — مگر یکی بود از کافرانِ زنہاری
شنیدۂ کہ خداوندِ باختر چون بود؟ — کنون بہ بندگیٔ خواجہ گشت اقراری
گزشت آن کہ "چہ تقدیر کردہ ام" می گفت — بمقتضای غلط فہمی و غلط کاری
کنون بعجز "چہ تقصیر کردہ ام" گوید — ز بندگانِ خدا چون بوی رسد خواری
رموزِ حمزہ فرو ہل! خمش نشین غالب — چرا مرا السخنہای ہرزہ آزاری؟
زتست رونقِ گیتی بہ دانشں آرائی — زتست زینتِ معنی بہ نغز گفتاری
قصیدۂ تو، ولی، کاسۂ گدائی تست — ستودہ آمدہ باشی زرنجِ ناداری
غمین مباش کہ از گنج خانۂ نواب — خود آن قدر کہ بدل داشتی بدست آری
بوقتِ گدیہ، گدا را دعاست دستِ آویز — برآر دست بدرگاہِ حضرتِ باری
چراغِ دودۂ سرور، علی محمد خان — گزین نہالِ تمرّ در فنِ سپہداری
زردی کلب علیخان ہمیشہ روشن بادا — چنانکہ تابشِ مہر از سپہرِ زنگاری

(۵۵/۱۱)

حضرت ولیٔ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم عرض یہ ہے۔ فقیرِ تکیہ دار، روزینہ خوار، غالبِ خاکسار حیران ہے کہ شکر بجالاے آپ کی عنایت کا، یا ذکر کرے آپ کی کرامت اور ولایت کا۔ آپ بے شبہہ رونقِ مسندِ علم و یقین ہیں! تکلف برطرف، امیر المسلمین ہیں۔ یہ نہ فقط از روی ارادت ہے، بلکہ یہاں مشاہدۂ خرقِ عادت ہے

ان دنوں میں متفرقات کے قرضدار سرگرم تقاضا، بلکہ آمادۂ شور و غوغا تھے۔ دو سَو روپیے کی ہنڈوی صراحیِ آبِ حیات ہوگئی، دامِ مرگ سے نجات ہوگئی۔ لطف یہ کہ آج بروز دوشنبہ ۲۱ اگست کو نو بجے اوّل روز ایک قصیدے کا لفافہ بھیجا گیا۔ اُسی دن بارہ پر تین بجے یہ کرشمۂ کرامت دیکھا گیا۔ قصیدے کے لفافے میں ایک عرضداشت ہے۔ اُس سے قصیدے کی حقیقت اور خود اُس نظم سے طرزِ نگارش کی جدّت ظاہر ہو جاے گی۔ حضرت کے انبساطِ خاطر کے واسطے یہ ایجاد ہے مجھے ہر طرح کی نظم و نثر سے آپ کی خوشی اور خوشنودی مراد ہے۔ انجامِ قصیدہ ہیں جو قرض کے گلے باے جائیں اُس مجموع میں سے اہلِ بازار مہاجن کئے جائیں، کوٹھی والے ساہوکار رحیل خلیفہ گنے جائیں سے

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

ترقیِ عمر و دولت خدا وند کا طالب، غالب

نگاشتۂ دوشنبہ ۲۱، اور رواں داشتۂ

سہ شنبہ ۲۲ اگست سنہ ۱۸۶۵ء

(۵۶/۱۳)

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعد تسلیم معروض ہے۔ میں طبیب نہیں، مگر تجربہ کار ہوں۔ ستر برس کا آدمی ہوشیار ہوں۔ اور سے یہ کہا نہیں جاتا۔ حضرت پر بغیر ظاہر کئے رہا نہیں جاتا۔ خدا جانے، اور طبیب کیا سمجھے ہوں گے کہ کیا تھا میرے نزدیک باختر اکِ معدہ و قلب یہ مرض طاری ہوا تھا۔ اب آپ کو حفظِ صحت کے واسطے گاہ گاہ نارجیل دریائی وجدوار کا استعمال ضرور ہے۔ اور معجون طلائی عنبری تقویتِ قلب میں مجوزۂ حکیم میر علی خاں مغفور ہے: ورقِ طلا، عنبر، اشہب عرقِ کیوڑہ، قند، کثرتِ اجزا اس ترکیب خاص میں ناپسند۔ کثیر الاجزا اور

معجونیں ہیں: مفرحِ بوعلی سینا، خمیرۂ مروارید، خمیرۂ گاؤزبانِ عنبری، ماءاللحم غیر مُنَشّی، جس میں طیور کے گوشت اور ادویۂ مفرح و مقوی حرارت و برودت میں معتدل۔ گاہ گاہ سکنجبین و گلاب پی لیا کیجیے۔ غذا میں گوشتِ طیور اکثر، بیضۂ نیم برشت اکثر، لیکن یہ خیال رہے کہ بیضۂ مرغ و لحمِ طیور ایک جلسہ میں تناول نہ فرمائیے۔ بکری کے گوشت کے ساتھ بیضۂ مرغ جائز اور لذیذ اور مرغوب۔ پودینے کا عرق، چھوٹی الائچی کا عرق ہمیشہ دوا خانے میں موجود رہے۔ عطریات کے استعمال میں مبالغہ، بعدِ غذا مباشرت سے پرہیز۔ شوربای پاچۂ گوسفند مائدۂ خاص پر موجود رہے۔ بحسبِ رغبتِ طبیعت نوشجان فرماتے رہیے۔

تم سلامت رہو قیامت تک! دولت و عزّ و جاہ روز افزوں!

(۵۷/۱۳)

حضرت ولیٔ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ شرف افزا عطوفت نامہ عزّ ورود لایا۔ اگست ۱۸۶۵ء کی تنخواہ کا سو روپیہ از روی ہنڈوی ملفوفہ معرضِ وصول میں آیا۔ زیادہ حدِّ ادب۔

[illegible] رہو قیامت تک! دولت و عزّ و جاہ روز افزوں!

نجات کا طالب، غالب

دوشنبہ ۱۱ ستمبر سنہ ۱۸۶۵

(۵۸/۱۴)

حضرت ولیٔ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ چاہتا ہوں کہ کچھ لکھوں، مگر نہیں جانتا کہ کیا لکھوں۔ لازم تھا کہ تعزیت نامہ بزبانِ فارسی و عبارتِ بلیغ لکھوں۔ آپ کے قدموں کی قسم! دل نے قبول نہ کیا۔ آرایشِ گفتار، نظماً او نثراً، واسطے تہنیت کے ہے کہ دل کثرتِ نشاط سے گل کی طرح کھل رہا ہے، طبیعت راہ دیتی ہے،

الفاظ ڈھونڈھے جاتے ہیں، معنی پیدا کیے جاتے ہیں۔ اب میں نیم مردہ، دل پژمردہ، خاطر افسردہ، جس باب میں لفظ و معنی فراہم کیا چاہوں، مدعا کہ طبع کے خلاف جس بات کا تصور ناگوار ہو، اس کے تذکرے جی کیوں نہ بیزار ہو؟ یہ میری قسمت کی خوبی ہے کہ ہنوز تہنیت اور مدح کا حق ادا نہ ہوا تھا کہ مرثیہ لکھنا پڑا۔ اگر ایک بات میرے خیال میں نہ آتی ہوتی، تو مجھے زندگی دشوار تھی۔ یعنی حضور کو ابتدائی جلوس میں وہ رنج پہنچا کہ اس سے زیادہ تصور میں نہیں آتا۔ پس وہ سادہ نشینی کی بدایت اور غمگینی کی نہایت ہے چاہیے ہے کہ اب مدۃ العمر ابداً مؤبداً، حضرت کو کوئی غم نہ ہو۔ ہمیشہ جہاندار و جہانستان و شاد و شادماں رہیں۔

تم سلامت رہو ہزار برس ! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

آپ کے قدمبوس کا طالب، غالب۔ ۱۸ ستمبر سنہ ۱۸۶۵

دریغا کہ مانده تهی قصر دولت ز خاتون نامی، سکندر زمانی

چو "سیار رو صنہ" بود سال فوتش سپس اسم وی باد "جنت مکانی"!

۱۲۸۲

(۵۹/۱۵)

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعد تسلیم معروض ہے۔ ہر چند آب و دانہ خانے کے ساتھ ہونے سے پانی کی طرف سے خاطر جمع ہے، کہ حضور جو پانی ہمیشہ پیتے تھے، وہی پیتے ہوں گے، مگر ہر بیع سفر اور اختلاف ہوا کا خیال ہے۔ توقع رکھتا ہوں کہ نوید صحت اعتدالِ مزاجِ اقدس سے عزّ اطلاع پاؤں۔ بُعد اگرچہ بہت نہیں لیکن طبع پر گراں ہے چشمِ شوق ورودِ موکبِ عالی کی نگراں ہے۔ بقول کنا بہ تغیر لفظ "جو تم پھر آؤ، تو حضرت، پھریں ہمارے دن"۔ زیادہ حد ادب۔

تم سلامت رہو ہزار برس! | ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

دوامِ بقائے حضور کا طالب فقیر غالب
چہار شنبہ ۸ نومبر سنہ ۱۸۶۵ء[۱]

(۶۰/۱۶)

حضرت ولیٔ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ مراد آباد پہنچنا، بعد پالکی کے اتر آنے کے پل کا ٹوٹ جانا، گاڑیٔ اسباب، یہاں تک کہ رختِ خواب کا مع آدمیوں کے اُسی زمہریر کے میدان میں رہنا، بغیر جاڑے تے کچھ نہ کھانا، خیر جو ان پر گزری، وہ جانیں؛ میں مراد آباد کی سرا میں ایک چھوٹی سی حویلی میں ٹھہرا[۲] بھوکا، پیاسا، کمل اوڑھ کر پڑ رہا۔ یہ شعر اپنا پڑھ پڑھ کر صبح کی ؂

گرمِ فریاد رکھا شکلِ نہالی نے مجھے
تب اماں ہجر میں دی بردِ لیالی نے مجھے

صبح کو خستہ و رنجور اٹھا۔ صاحبزادہ ممتاز علی خاں بہادر کے بھیجے ہوئے دو دفتر[۳] آئے۔ مجھے اٹھا کر سعید الدین خاں صاحب کے ہاں لے گئے۔ صاحبزادہ صاحب نے وہ تعظیم و تکریم اور سعید الدین خاں صاحب نے وہ تکریم و تعظیم کی، کہ میری ارزش سے زیادہ تھی۔ ناگاہ مولوی محمد حسن خاں بہادر صدر الصدور[۴] آئے، اور مجھے اپنے گھر لے گئے۔ پانچ دن وہاں رہا۔ بھائی نواب مصطفیٰ خاں بہادر وہیں مجھ سے آ کر ملے۔ دوسرے دن وہ رہگرائے دار السرورِ رامپور[۵] اور میں جادہ نوردِ ستم آبادِ دہلی ہوا۔ دوشنبہ ۲۰ شعبان ۱۲۸۲ھ، ۸ جنوری ۱۸۶۶ء درِ غمکدہ پر پہنچا۔ حضور کے اقبال کی تائید تھی، ورنہ میں اور جیتا دلّی پہنچتا![۶]

؂

مغلوبِ غلبۂ غمِ دل، غالبِ حزیں
"کاندر تنش ز ضعف" توان گفت "جان نبود"

از رامپور زنده بدہلی رسیده است
"مارا بدین گیاہِ ضعیف این گمان نبود"

تم سلامت رہو قیامت تک! دولت و عزّ و جاہ روز افزوں!

نجات کا طالب، غالب

سہ شنبہ ۲۲ شعبان و ۱۰ جنوری سالِ
جشنِ حضور ؟

(۶۱/۱۷)

حضرت ولیٔ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ عنایت نامۂ والا کے مشاہدے نے مجھ کو میری حیات پر یقین عنایت کیا۔ اس سفر کا حال کیا عرض کروں؟ دِلّی سے رامپور تک، ذوقِ قدمبوس میں جاتا نہ گیا۔ اختلافاتِ آب و ہوا و تفرقۂ اوقات غذا کو ہرگز نہ مانا، اور رنجِ راہ کو ہرگز خیال میں نہ لایا۔ وقتِ معاودت، اندوہِ فراق نے وہ فشار دیا، کہ جوہرِ روح گداز پاکر ہر بُنِ مو سے ٹپک گیا۔ اگر آپ کے اقبال کی تائید نہ ہوتی، تو دلّی تک میرا زندہ پہنچنا محال تھا۔ جاڑا، مینہ، قبض و انقباض، فقدانِ جوع، فاقہ ہای متواتر، منزلہای نامانوس، ہاپوڑ تک آفتاب کا نظر نہ آنا، شب و روز ہوای زمہریر کا جانگزا رہنا۔ بارے ہاپوڑ سے چل کر نیّرِ اعظم کی صورت دکھائی دی۔ دھوپ کھاتا ہوا دلّی پہنچا۔ ایک ہفتہ کوفتہ و رنجور رہا۔ اب ویسا پیر و ناتواں ہوں، جیسا کہ اِس سفر سے پہلے تھا۔ خدا وہ دن کرے کہ پھر اُس در پر پہنچوں! سہ

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

نجات کا طالب، غالب

۲۱ جنوری سنہ ۶۶ ۱۸

(۶۲/۱۸)

حضرت ولیِّ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ توقیعِ وقیع مع سو روپے کی ہنڈوی کے عزِّ ورود لایا۔ جنوری سنہ ۱۸۶۶ کی تنخواہ کا روپیہ معرضِ وصول میں آیا۔ آپ کے غلامِ زر خرید[۱] نے اپنی تنخواہ کا حال پوچھا۔ میں نے حضور کا خط اُسے دکھا دیا۔ نا امیدانہ چُپ ہو رہا۔ اب اس درویشِ دلریش کا حال سُنیے۔ سامعہ مدت سے کھو بیٹھا[۲]۔ اب آنکھوں کو بھی رو بیٹھا[۳]۔ دور سے صرف قد و قامت آدمی کا دیکھا جاتا ہے۔ چہرہ اچھی طرح نظر نہیں آتا ہے[۴]۔ فقدانِ طاقت، سقوطِ اشتہا، ضعفِ بصر، ضعفِ بخت۔ میرا حال بعینہٖ میرے اس شعر کے موافق ہے ؎

درکشاکشِ ضعفم، نگسلد روان از تن　　　اینکہ من نمی میرم، ہم ز ناتوانیہاست

زیادہ حدِّ ادب ؎

تم سلامت رہو ہزار برس!　　　ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

نجات کا طالب، غالب

۱۵ فروری سنہ ۱۸۶۶

(۶۳/۱۹)

حضرت ولیِّ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ توقیعِ وقیع کے ورود نے میری آبرو بڑھائی اُس میں سے میں نے سو روپے کی ہنڈوی پائی۔ زرِ مندرجۂ ہنڈوی معرضِ وصول میں آیا۔ فروری سنہ ۱۸۶۶ کی تنخواہ کا روپیہ میں نے پایا۔

زیادہ حدِّ ادب ؎

تم سلامت رہو قیامت تک!

دولت و عزّ و جاہ روز افزوں! فقط

معروضۂ ۱۵ مارچ سنہ ۱۸۶۶　　　عنایت کا طالب، غالب

(۶۴ / ۲۰)

حضرت ولیِّ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ اپنا حال اس سے زیادہ کیا لکھوں کہ آگے ناتوان تھا، اور اب نیم جان ہوں۔ برخوردار نواب مرزا خاں اپنے مشاہدے کے مطابق جو میری حقیقت عرض کرے، وہ مسموع و مقبول ہو۔[۵]

حضور اس مطلع کے لفظ و معنی کی حدّت و جدّت کی داد چاہتا ہوں:

ہم ز افیام زندہ نیم، کز برای خویش　　آن وقت لای نافیۂ ام از دو پای خویش

ایک غزل نئی طرز کی، نئی بحر میں عرض کرتا ہوں۔[۲] یہ جشنِ حال کی نذر ہے۔ خدا کرے، مقبول ہو! زیادہ حدِّ ادب

تم سلامت رہو ہزار برس!　　ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

نجات کا طالب، غالب

۲۹ مارچ سنہ ۱۸۶۶

بحر　ہزج　مثمّن　سالم[۳]

فعِلاتُن　فعِلاتُن　فعِلاتُن　فعِلاتُن

ای خداوندِ خردمند و جہان داورِ دانا!
دی، بہ نیروی خرد، بر ہمہ کردار توانا!
ای بہ رفتار و بہ دیدار، بہ زیبائی و خوبی!
سروِ نو خاستہ آسا، مہِ ناکاستہ مانا!
بہ ادا پایہ فزایا، بہ نظر عقدہ کشایا!
بکرم ابر عطایا، بغضب برق ستانا!
بہ نگہ خستہ نوازا، بسخن بذلہ طرازا!
بہ قلم غالیہ سایا، بہ نفس عطر فشانا!
شہ نشان، کلب علیخان کہ توئی یوسفِ ثانی

نبود ثانی وہمتای تو در دہر، ہمانا!
دانم، از حال و آلم خبری داشتہ باشی
سرنوشتِ ازلی، گرچہ ندارد خطِ توانا!
دشمنم چرخ و تو بینی و نسوزی بعتابش
بہ عدو صاعقہ ریزا، بہ محب فیض رسانا!
جانشینِ تو کند نام ترا زندہ بگیتی
یاد فردوسِ برین جای تو، فردوس مکانا!
غالب، از غم چہ خروشی؟ نتو زیباست خموشی
باکریم ہمہ دان ہیچ مگو، ہیچ مدانا!

(۶۵/۲۱)

حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعد تسلیم معروض ہے۔ منشورِ کرامت ظہور مع ہنڈوی عزِ ورود لایا سو روپیہ تنخواہِ اپریل سنہ ۱۸۶۶ کا معرض وصول میں آیا۔ زیادہ حدِّ ادب۔
تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

عنایت کا طالب، غالب
۱۴ مئی سنہ ۱۸۶۶ عیسوی

(۶۶/۲۲)

حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعد تسلیم معروض ہے۔ جب بادشاہِ دہلی نے مجھ کو نوکر رکھا، اور خطاب دیا، اور خدمتِ تاریخ نگاریِ سلاطینِ تیموریہ مجھ کو تفویض کی تو میں نے ایک غزل طرزِ تازہ پر لکھی۔ مقطع اُس کا یہ ہے ؎

غالب، وظیفہ خوار ہو، دو شاہ کو دُعا!
وہ دن گئے جو کہتے تھے: "نوکر نہیں ہوں میں"

اب مقطع کی صورت بدل کر حضور کی نذر کرتا ہوں۔ خدا کرے کہ حضرت کے پسند آئے! زیادہ حدِ ادب ہے

تم سلامت رہو ہزار برس!
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

عرضداشتِ اسد اللہ بیدستگاہ

۹ جون سنہ ۶۶

دائم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں
خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں

کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دل؟
انسان ہوں، پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

یا رب! زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لیے؟
لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں

حد چاہیے سزا میں عقوبت کے واسطے
آخر گناہگار ہوں، کافر نہیں ہوں میں

کس واسطے عزیز نہیں جانتے مجھے؟
لعل و زمرد و زر و گوہر نہیں ہوں میں

رکھتے ہو تم قدم مری آنکھوں سے کیوں دریغ؟
رتبے میں مہر و ماہ سے کمتر نہیں ہوں میں

کرتے ہو مجھ کو منعِ قدمبوس کس لیے
کیا آسمان کے بھی برابر نہیں ہوں میں

قطعہ

در پر امیرِ کلبِ علیخاں کے ہوں مقیم
شایستۂ گدائیٔ ہر در نہیں ہوں میں

بوڑھا ہوا ہوں، قابلِ خدمت نہیں اسدؔ
خیرات خوارِ محض ہوں، نوکر نہیں ہوں میں

(٦٧/٦٣)

حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعد تسلیم معروض ہے۔ کل ایک عرضداشت مع ایک غزل کے ڈاک میں بھیجی گئی۔ شام کو منشورِ عطوفت مع ہنڈوی تنخواہ مئی سنہ ۱۸۶۶ء عز ورود لایا۔ سو روپیہ معرضِ وصول میں آیا۔ آج صبحدم وقتِ تحریر اس عرضی کے حضرت فردوس مکاں کا دیوان پیشِ نظر تھا۔ اُس میں یہ شعر نظر پڑا۔ اُس کے مضمونِ حکیمانہ و عارفانہ نے بڑا مزا دیا۔ یقین ہے کہ اُس کو

پڑھ کر حضرت بھی خط اُٹھائیں گے ؎

وہ جس طرح سے جسے چاہے، اُس طرح پالے
کسی کا کچھ نہیں پروردگار پر لینا

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

عرضۂ اسداللہ ترقی خواہ
معروضۂ دہم جون سنہ ۱۸۶۶ء

(۶۸/۲۴)

حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ توقیعِ وقیعِ عزّ ورود لایا۔ غزل کے پسند آنے نے میری حنوزری کا رُتبہ بڑھایا۔ فلک نہیں چاہتا کہ میرا کلام مقبولِ طبائعِ اہلِ کمال ہو۔ حضرت کو خالقِ اکبر نے وہ قوت اور طاقت عطا کی ہے کہ آپ علی الرّغم فلک کام کر سکتے ہیں ؎

قسمت بُری سہی، پہ طبیعت بُری نہیں
ہے شکر کی جگہ کہ شکایت نہیں مجھے

فلک نے مجھ پر بڑے بڑے اُبھار غم و فکر کے ڈالے، مگر میری طبیعت بدل نہ سکا۔ میں نے بجنابِ باری بہت تضرع و زاری کی، مگر اپنی قسمت بدل نہ سکا۔ زیادہ حدِ ادب ؎

تم سلامت رہو قیامت تک! دولت و عزّ و جاہ روز افزوں!
تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

عرضداشتِ اسداللہِ بیدستگاہ ۲۸ جون سنہ ۱۸۶۶ء

[میرزا صاحب نے آغا احمد علی احمد، صاحبِ موید بُرہان، کے جواب میں ایک قطعہ لکھ کر مطبع اکمل المطابع دہلی میں ایک رقعہ چھپوایا تھا، اور دس چھپی ہوئی کاپیاں نواب خلد آشیاں کو لفافے میں بند کر کے

۳۱ جولائی سنہ ۱۸۶۶ء کو روانہ کی تھیں، جو آج تک دارالانشا میں محفوظ ہیں۔ مکاتیب کے پہلے ایڈیشن میں مستقل خط کی طرح اُس قطعے کی نقل چھاپی گئی تھی۔ بعد ازاں اس نحول کو بیجا خیال کر کے نکال دیا گیا۔]

(۶۹ / ۲۵)

حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ آج شنبہ ۱۰ ماہِ اگست سنہ ۱۸۶۶ کی ہے۔ فقیر چشم براہ تھا کہ اب ڈاک کا ہرکارہ آتا ہے، اور ہنڈوی ملفوفۂ نوازشنامہ لاتا ہے۔ ناگاہ اس وقت ڈاک کا آدمی ایک خط برخوردار منشی سیلچند کا لایا۔ اُس میں مندرج تھا کہ تو نے جون سنۂ حال کی تنخواہ کی رسید کیوں نہ بھیجی۔ اور بعد اس کے یہ لکھا تھا کہ جولائی کی تنخواہ کی چٹھیاں ہوتی جاتی ہیں۔ اب دو ایک دن میں تیری تنخواہ بھی بھیجی جائے گی۔ متحیر کہ یا رب، میں حسبِ معمول تنخواہِ جون کی رسید ارسال کر چکا ہوں۔ اب دوبارہ رسید کیوں مانگی جاتی ہے! پھر یہ تو گویا پیامِ مرگ تھا کہ جولائی کی تنخواہ اب روانہ ہوگی۔ یا رب! ۱۰ کو وعدہ، ۱۳، ۱۴ کو چلے گی، بیسویں تک مجھے پہنچے گی، اور میرا حال یہ کہ انگریزی تنخواہ گھر میں اور کچھ قرض کی قسط میں جاتی ہے۔ حضور کے عطیے پر میرا اور بشاگرد پیشہ کا اور حسین علی کا گزرا ہے۔ عالم الغیب جانتا ہے، جس طرح گزرتی ہے۔ چار سو ساڑھے چار سو کا قرض باقی ہے۔ اب کوئی قرض بھی نہیں دیتا۔

خلاصہ دو عرضیں ہیں: ایک تو یہ کہ میں جون کی تنخواہ کی۔ سید بھیج چکا ہوں۔ اگر ڈاک میں تلف ہو گئی ہو، تو اور لکھ بھیجوں؛ دوسری یہ کہ اس مہینے کی یعنی جولائی کی، تو تنخواہ خیر، ۲۰ ماہِ اگست تک پہنچ جائے گی۔ آیندہ کو حکم ہو جائے کہ ہر مہینے کی پہلی دوسری کو فقیر کی تنخواہ کہ وہ محض صیغۂ خیرات ہے، بھیجی جایا کرے۔

تم سلامت رہو قیامت تک! دولت و عزّ و جاہ روز افزوں!
نجات کا طالب، غالب فقط

(۶۰/۲۶)

حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ پہلے اپنا حال عرض کر لوں، تب کچھ اور مدعا لکھوں۔ غم نے بشمولِ بڑھاپے کے پست و مضمحل کر دیا ہے۔ حضرت کے قدموں کی قسم! نہ حواس درست، نہ رای صحیح۔ برسوں سے مکرّہات میں مبتلا رہتے اب طاقت تحمّل کی نہ رہی۔ خدا جانے، کیا ہوتا ہے، کیا سمجھتا ہوں، کیا کرنا چاہیے، کیا کرتا ہوں۔

کل آخرِ روز میر منشیٔ حضور کا خط آیا۔ جون کی تنخواہ کی رسید کے نہ پہنچنے کی اطلاع پائی۔ تہیدستی و قرض کے رنج میں خستہ و آزردہ بیٹھا تھا۔ اُسی وقت عرضی لکھی۔ اگرچہ ڈاک کا وقت نہ تھا، مگر بھیج دی۔ آج آخرِ روز توقیعِ رفیع مع جولائی کی تنخواہ کی ہنڈوی کے پہنچا۔ ہنڈوی مختارکار کو دی، اور یہ عرضی لکھنے بیٹھا۔ لکھ کر لفافہ کر رکھتا ہوں۔ کل صبحدم ڈاک میں بھیج دوں گا۔

اگر عرضیٔ سابق میں کوئی بات گستاخی و دیوانگی و بدحواسی کی ہو، تو فقیر کی خطا معاف ہو۔ میر منشی صاحب کے اگر مخالفِ طبع کوئی لفظ ہو، تو وہ بھی درگزر کریں۔

جون کی تنخواہ کی رسید کا لفافہ ڈاک میں گم ہو گیا ہوگا۔ اگر میں بھی بھول گیا ہوں، تو بعید نہیں، بلکہ اغلب ہے کہ غالب کو سہو ہوا ہو۔ ملازمانِ درِ دولت پر ظاہر ہو کہ جون کی تنخواہ جولائی میں، اور جولائی کی اگست میں، میں نے پائی۔ آیندہ ہر انگریزی مہینے کی دوسری تیسری کو روانگیٔ ہنڈوی کا متوقع ہوں۔ زیادہ حدِّ ادب۔ ۵

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!
۱۳ اگست سنہ ۱۸۶۶ عفو و رحم کا طالب، غالب

(۷۱/۲۷)

حضرت ولیِّ نعمت آیۂ رحمت مَدَّ ظِلُّہٗ العالی!

بعد تسلیم معروض ہے۔ توقیع وقیع مع دیباچۂ شرح اشعار بدرِ چاچ عزّ ورود لایا۔ کیا عرض کروں کہ کیا عالم نظر آیا! واقعی افتتاح کلام بطرز میرزا طاہر وحید اور پھر نگارش مطالب بشیوۂ میرزا جلالا ئی طباطبائی ہے۔ لیکن دونوں صورتوں میں دیباچۂ اعجازِ خسروی کا رنگ جلوہ گر ہے پس نا قدِ بصیر کے نزدیک یہ نگارش، طاہر وحید اور جلالا کی عبارت سے بہتر ہے۔ یہ عرضداشت جلد بھیجتا ہوں، تاکہ حضرت پر پہنچنا اس دیباچے یا تقریظ کا ظاہر ہو جائے۔

برسات ایسی ہوئی ہے کہ میں باؤن، ترپّن برس سے یہاں رہتا ہوں، عرش آرامگاہ اکبر شاہ کے عہد میں ایک بار ایسی برسات دیکھی تھی! امسال نظر آئی ہے۔ اوراقِ مرسلۂ حضور موم جامے میں لپیٹ کر بسبیل پارسل ارسال کروں گا، یا پرسوں دو شنبے کو، یا سہ شنبے کو ۵

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!
روز شنبہ یکم ستمبر سنہ ۱۸۶۶ نجات کا طالب، غالب

(۷۲/۲۸)

حضرت ولیِّ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعد تسلیم معروض ہے۔ منشورِ مکرمت ظہور عزّ ورود لایا۔ سو روپیہ بابت تنخواہِ ماہِ اگست سنہ ۱۸۶۶ معرض وصول میں آیا۔

نثر نثرہ نثار کے اوراق ۳ ستمبر، ماہِ حال، کو ارسال ہوئے ہیں نظرِ انور سے گزرے ہوں گے۔ فقط

اُردو کا دیوان ایک شخص کو دیا ہے۔ فارسی دیوان کا شیرازہ کھول کر چند شخصوں کے حوالے کیا ہے۔ بعد اتمام تحریر نذر کیا جائے گا!

بھائی ضیاء الدین خاں کا مجموعۂ نثر و نظم فارسی و اُردو، سراسر دیکھا ہوا میرا، جو اُن کے کتاب خانے میں تھا، غدر میں لُٹ گیا۔ بعد غدر ذوق شعر باطل اور دل افسردہ ہوگیا۔ دو تین غزلیں، فارسی، ہندی، جو لکھی ہیں، اُن کا انتخاب بھی پہنچے گا ؎

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

اسداللہ بیدستگاہ

دوشنبہ ۱۰ ستمبر سنہ ۱۸۶۶

(۴۳/۲۹)

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعد تسلیم معروض ہے۔ خاطرِ اقدس میں نہ گزرے کہ غالب تعمیل احکام میں کاہل ہے۔ بصارت میں فتور، ہاتھ میں رعشہ، حواس مختل۔ ناچار کاتب کی تلاش کی۔ شہر سراسر ویران ہے، کاتب کہاں! بارے ایک دوست نے کاتب کا نشان دیا۔ اردو کا دیوان، اشعار پر صاد کر کے، اُس کو حوالے کیا۔ کل وہ اجزائی منقولہ آئے۔ آج بطریق پارسل مع عرضی کے ارسال کیے۔

خط کاتب کا مجھ کو پسند نہیں آیا۔ حضرت کو کیونکر پسند آئے گا! اغلاط اتنے تھے کہ مجھ کو تحریر کے برابر محنت پڑی۔

فارسی کے کلیات کا شیرازہ کھول کر، اجزا اُس کے احباب پر تقسیم کر دیے ہیں۔ جابجا اشعار پر صاد کر دیے ہیں۔ وہ بھی میرے انتخاب کے مطابق نقل ہو رہے ہیں۔ بعد اتمام وہ بھی پیشکش کروں گا زیادہ حدِّ ادب۔ ؎

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

ترحم کا طالب، غالب

سہ شنبہ ۱۸ ستمبر سنہ ۱۸۶۶

[میرزا صاحب نے تقریظِ شرح بدرچاچی کی اصلاح کے سلسلے میں چہار شنبہ ۱۹ ستمبر سنہ ۱۸۶۶ء کو ایک عریضہ روانہ کیا تھا۔ مثل میں اُس کا صرف لفافہ موجود ہے۔ اس کی لپشت پر میرمنشی صاحب لکھتے ہیں: "اصلِ خط درحضورِ پُرنور، کہ بمقدمۂ تقریظ شرحِ بدرچاچی بود، ماند۔ ۲۳ ستمبر سنہ ۱۸۶۶ء"][1]

(۷۴/۱۳۰)

حضرت ولیِّ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ اردو دیوان کا انتخاب بھیج چکا ہوں یقین ہے کہ حضرت کی نظرِ انور سے گزر گیا ہو۔ آج فارسی دیوان کا انتخاب بطریق پارسل اِس عرضی کے ساتھ بھیجتا ہوں۔ اور بھائی ضیاء الدین خاں بہادر نے جو اوراق میرے پاس بھیجے ہیں، وہ بھی اسی پارسل میں رکھدیے ہیں[2]۔ حضرت! اس غریب کا مجموعۂ نظم و نثر غدر میں لُٹ گیا[3]۔ بعدِ غدر جو کچھ کہا ہے، وہ یہی ہے جو پہنچتا ہے۔

اِس درویش نے صرف غزلوں[2] اور رباعیوں کا انتخاب بھیجا ہے۔ قصائد و قطعات و مثنویات کا انتخاب ابھی نہیں بھیجا۔ اگر حکم ہو، تو وہ بھی بھیجوں۔ زیادہ حدِ ادب۔

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

عنایت کا طالب، غالب

۲۴ ستمبر سنہ ۱۸۶۶

(۷۵/۳۱)

حضرت ولیِّ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ منشورِ مکرمت ظہور عزِّ ورود لایا۔ سو روپیہ بابت تنخواہِ ماہِ ستمبر سنہ ۱۸۶۶ معرضِ وصول میں آیا۔ اشعارِ فارسی و اُردو پہنچے۔ خدا کرے، پسند آئیں! افسوس کہ برخوردار نواب مرزا خاں نے میرا حال سامعۂ اقدس پر عرض نہ کیا! حضور ملک و مال جس کو جس قدر چاہیں عطا کر سکتے ہیں۔ میں آپ سے صرف راحت مانگتا ہوں، اور راحت منحصر اس میں ہے کہ قرضِ باقی ماندہ ادا ہو جائے، اور آیندہ قرض لینے کی حاجت نہ پڑے فقط ؎

تم سلامت رہو قیامت تک! دولت و عزّ و جاہ روز افزوں!

اسداللہ بید ستگاہ بششم اکتوبر سنہ ۱۸۶۶

(۷۶/۳۲)

حضرت ولیِّ نعمت آیۂ رحمت سلامت! بعدِ تسلیم معروض ہے۔
اِس عنایت نامے میں ایک فقرہ نظر پڑا کہ جس سے میں کانپ اُٹھا، "مرا از آن مشفق واسطۂ تلمذ بودہ است"! بہ ذلیل کو عزت دینی اور دُکانِ بے رونق کی خریداری کرنی ہے۔ میں تو حضرت کو اپنا اُستاد اور اپنا مرشد اور اپنا آقا جانتا ہوں۔

بدوِ فطرت سے میری طبیعت کو زبانِ فارسی سے ایک لگاؤ تھا، چاہتا تھا کہ فرہنگوں سے بڑھ کر کوئی ماخذ مجھ کو ملے، بارے مراد بر آئی، اور اکابرِ پارس میں سے ایک بزرگ یہاں وارد ہوا، اور اکبر آباد میں فقیر کے مکان پر دو برس رہا، اور میں نے اُس سے حقائق و دقائق زبان پارسی کے معلوم کیے۔ اب مجھے اِس امرِ خاص میں نفسِ مطمئنّہ حاصل ہے۔ مگر دعویٰ اجتہاد نہیں ہے، بحث کا طریق یاد نہیں۔

میاں اِنجو، جامعِ فرہنگِ جہانگیری[۱]، شیخ رشید، راقمِ فرہنگِ رشیدی[۲] عظمای عجم میں سے نہیں۔ ہندان کا مولد، ماخذان کا اشعارِ قدما؛ ہادی اِن کا اِن کا قیاس؛ ٹیک چند[۳] اور سیالکوٹی مل[۴] ان کے پیرو۔ سبحان اللہ! ہندی بھی اور ہندو بھی۔ نورٌ علیٰ نور!

فقیر اشعارِ قدما کا معتقد، اُن لوگوں کے کلام کا عاشق۔ مگر جو لغات اُن کے کلام میں ہیں، اُن کے معنی تو اہلِ ہند نے اپنے قیاس سے نکالے ہیں۔ میں ان کے قیاس پر کیونکر تکیہ کر دوں؟ اب جو پیر و مرشد نے لکھا کہ "ارتنگ وارژنگ" متحد المعنی اور "آشیان ساختن و بستن و چیدن" گھونسلا بنانے کے معنی پر ہے، تو میں نے بے تکلف مان لیا؛ لیکن نہ اُن صاحبوں کے قیاس کے بموجب، بلکہ اپنے خداوندِ نعمت (کے) حکم کے مطابق ؎

تم سلامت رہو ہزار برس! دولت و عزّ و جاہ روز افزوں!

انصاف کا طالب، غالب۔ ۱۷ اکتوبر سنہ ۱۸۶۶ء

(۶۶/۳۳)

حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ آج سہ شنبہ، ۱۶ ماہِ اکتوبر کی، دن کو بارہ بجے کھانا کھا کر بیٹھا تھا کہ توقیعِ وقیع آیا۔ پڑھتے ہی کانپ اُٹھا، اور عالم نظر میں تیرہ و تار ہو گیا۔ اگر حضور کے ارشادات کو بحث تعبیر کیا ہو تو مجھے جنابِ الٰہی اور حضرتِ رسالت پناہی کی قسم! اگرچہ فاسق و فاجر ہوں، مگر وحدانیتِ خدا اور نبوتِ خاتم الانبیا کا بدل معتقد اور بزبان معترف ہوں۔ خدا و رسول کی قسم جھوٹی نہ کھاؤں گا۔ انکارِ بحث سے مراد یہ تھی کہ شعرای ہند کے کلام میں جو غلطیاں نظر آتی ہیں، یا ہندی فرہنگ لکھنے والوں کے بیان میں جو نادرستی، اور باہم جو اُن کی عقول میں اختلاف ہیں، اُن میں کلام نہیں کرتا۔ اپنی تحقیق کو مانے ہوئے ہوں، اور دل سے

مجھے بحث نہیں۔ باہمہ ضعفِ حافظہ یاد ہے کہ آخر میں یہ بھی لکھدیا تھا کہ ان دونوں باتوں کو میں نے مانا، لیکن نہ فرہنگ لکھنے والوں کی راے کے بموجب، بلکہ اپنے خداوند کے حکم کے مطابق۔ یہ کلمہ موجبِ عتاب نہیں ہو سکتا۔ اور اگر اس کو گناہ سمجھا جائے تو آخر گناہگار ہوں کافر نہیں ہوں میرے گناہ معاف کیجیے، اور نویدِ عفو سے مجھ کو تقویت دیجیے ۔

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

عفو کا طالب غالب

(۴۷)

حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ حضور کے لشکرِ نصرت اثر کا سپہ سالارِ نوابِ معلیٰ القاب، جناب مہدی علی خاں بہادر[۲] اکبرآباد پہنچا، اور خیامِ فلک احتشام کا وہاں نصب ہونا، اور رامپور سے اکبرآباد تک گھوڑوں کی ڈاک کا بیٹھنا اور حضرت کا سنبھل تک بسبیلِ ڈاک تشریف لے جانا، اور وہاں مزاجِ اقدس کا ناساز ہونا اور دارالسلطنت کو معاودت فرمانا، یوماً فیوماً مسموع ہوا۔ غرض اس عرضداشت کی تحریر سے یہ ہے کہ حصولِ جواب سے آبرو اور خیریت و عافیتِ مزاجِ مبارک سے عزِ اطلاع پاؤں[۳]۔ فقط

اخبار میں مسطور اور شہر میں مشہور ہے کہ حضرت اجلاسِ کونسل کے واسطے حسب الحکم گورنمنٹ کلکتے کو تشریف لے جائیں گے۔ نمک خوار دعاگوئی و مدح گستری میں بہانہ طلب رہتا ہے۔ اس تقریب کا ایک قطعۂ تاریخ سنہ ۱۸۶۶ عیسوی رقم کیا ہے۔ عرض کرتا ہوں۔ اگر پسند آئے، تو اجازت ملجائے کہ اس کو کسی اخبار میں چھپوا دوں[۴]۔ فقط

قطعہ

چو نواب، از پئے اجلاسِ کونسل به کلکته از رامپور آورد رُخ

عدو را بگیر و بکش ز دودِ دی را — بجو سالِ اجلاس از "بخت فرخ"

چو گویند کز کشتنِ دی چہ خواہی — بگو: حذفِ اعدادِ "دی" اینت پاسخ!

"اینت" لغتِ پارسی ہے، مرادفِ خہی و زہی؛ اور قتل کا مشارالیہ لفظِ "دی" ہے، جس کے ۱۴ عدد ہیں، اور "دی" کا مشارالیہٗ عدد ہے "بختِ فرخ" کے ۱۸۸۲ جب اس میں سے ۱۴ کم کیے، تو ۱۸۶۶ رہے۔ زیادہ حدِ ادب۔

تم سلامت رہو ہزار برس! — ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

(۱۸ نومبر سنہ ۱۸۶۶ء)۔

(۷۹ / ۳۵)

حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ توقیعِ وقیع مع ہنڈوی تنخواہِ نومبر سنہ ۱۸۶۶ عیسوی عزِ ورود لایا۔ سو روپیہ معرضِ وصول میں آیا۔

قطعۂ تاریخ کے باب میں التماس یہ ہے کہ اب قوتِ ناطمہ پر تصرف اور معنی آفرینی کا زور مطلق باقی نہیں۔ مگر از راہِ فرطِ ارادت و محبت شاد دعا کے واسطے تقریب ڈھونڈھتا ہوں۔ جب موقع پاتا ہوں کچھ عرض کرتا ہوں۔ تحفۂ لطیف ہاتھ آگیا۔ اُسی پر مدعا کی بنا رکھی۔

پیر و مرشد، اگر غازی آباد سے حضور ریل پر سوار ہوں، تو فقیر کو تاریخ ورودِ غازی آباد سے آگہی ہو جائے، تاکہ میں وہاں حاضر ہو کر قدمبوسی کی سعادت حاصل کروں۔ زیادہ حدِ ادب۔

تم سلامت رہو ہزار برس! — ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

عرضہ نگار اسد اللہ

۸ دسمبر سنہ ۱۸۶۶ عیسوی

(۸۰/۳۶)

حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعد تسلیم معروض ہے۔ ایک عرضداشت بھیج چکا ہوں۔ اُس کا جواب نہیں پایا۔ امید دار ہوں کہ اس عرضداشت کے جواب سے محروم نہ رہوں فقط

کل دن کو دس بجے سنا کہ عالی جناب نواب مہدی علی خاں بہادر بسواری ریل آئے، اور اہلی کے محلّے میں ٹھہرے ہیں۔ کھانا کھا کر فوراً سوار ہوا۔ وہاں جا کے سُنا کہ نواب صاحب ریل کے اسٹیشن پر گئے ہیں۔ گھنٹا بھر بیٹھا رہا کہ حضرت آئے۔ آگے غازی آباد کے اسٹیشن پر سے سواری ہوتی تھی۔ اب ولی محمد سوداگر کی کوٹھی کے پاس سے، جو بیگم کے باغ کے عقب ہے، نیا اسٹیشن قرار پایا ہے۔ سو صاحبزادہ صاحب نے آپ کے حضور میں اطلاع کی ہے۔ دیکھیے حضرت غازی آباد سے سوار ہوتے ہیں یا شہر سے۔

واسطے خدا کے! مجھ کو اپنے روز ورود و وقتِ ورود سے اطلاع بخشیں اور اس عرضی کا جواب ایسا جلد عنایت ہو کہ فقیر بے سروسامان اپنا سامان درست کر رکھے۔

حضرت کی توجہ باطنی، جو ہمیشہ میری مصلح حال اور افزائشِ عزّ و وقار کی کفیل ہے، بعد ادائے شکرِ الٰہی اُس کا سپاس بجا لاتا ہوں۔

پیش از غدر گورمنٹ کے دربار میں، ۷ پارچے، اور جیغہ، سرپیچ، مالائے مروارید، تین رقمیں جواہر کی مجھ کو ملتی تھیں۔ بعد غدر اگر چہ پنشن اور دربار بحال رہا، لیکن خلعت موقوف ہو گیا۔ نواب لفٹنٹ گورنر بہادر پنجاب کا کل ۱۱ پر چار بجے دربار تھا۔ حکم سب درباروں کو پہنچ گیا تھا۔ میں تو نواب مہدی علی خاں صاحب کو رخصت کر کے گھر آیا۔ دو گھنٹے کے بعد دربار میں گیا۔ خیال یہی کہ ملاقات ہوگی، ایک رباعی کا غذ مُذہّب پر لکھی ہوئی نذر کروں گا، کلماتِ عنایت سُن کر چلا آؤں گا۔ نہ مجھے کچھ احتمال نہ صاحب کمشنر

بہادر شہر کو علم۔ بارے بروقت ملاقات، تعظیم معمولی اور مصافحہ کر کے لاٹ صاحب نے کھڑے کھڑے جیغہ، سرپیچ میری ٹوپی پر باندھا، اور فرمایا کہ "یہ ہم نے آپ کے واسطے رکھا تھا۔" مالائی مروارید میرمنشی نے گلے میں ڈال دی۔ یہ پارچے سات مرحمت ہوئے۔

دو شالا ۱، کمخواب کا تھان ۱، بنارسی تھان سنہری بوٹے ۱، بنارسی سیلا ۱، الوان کی چادر کنارہ کلابتون ۱، کناویز کا تھان ۱، الوان کی چادر بے کنارہ ۱۔

میں اس عطیے کو آپ کی بخشش معنوی سمجھتا ہوں، اور دوسری بخشش یعنی اس خط کے جواب کے جلد حاصل ہونے کا متوقع ہوں۔ زیادہ حد ادب

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

عرضداشت کے جواب کا طالب غالب

روز سہ شنبہ ۱۸ دسمبر سنہ ۱۸۶۶

(۸۱/۳۷)

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعد تسلیم معروض ہے۔ نوازش نامہ مع ہنڈوی صدر روپیہ بزدرود لایا۔ دسمبر ۱۸۶۶ کی تنخواہ کا روپیہ معرض وصول میں آیا۔

اللہ اللہ! یہ فرط عنایت، یہ ظہور کرامت کہ حضرت ڈاک میں سوار ہونے کو ہیں اور میرے نام خط کا حکم ہو، اور وہ خط دستخط سے مزین ہو، دسمبر کی تنخواہ دسمبر ہی میں جاری ہو، اور جنوری کی تیسری تاریخ میرے پاس پہنچ جائے! ظہور آثار ربوبیت بوجہ احسن واکمل ہے۔

(۸۲/۳۸)

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعد تسلیم معروض ہے۔ حضرت کا رونق افزائے کلکتہ ہونا از روئے شمار

رفتار ریل یقینی ہے۔ مگر وہاں کی آب و ہوا کا موافق آنا، اور جناب لارڈ صاحب بہادر سے ملاقات کا ہونا، اور اجلاس کونسل کا وقوع میں آنا، یہ امور تب تک حضرت رقم نہ فرمائیں گے، دعاگو کے خیال میں کیوں کر آئیں گے؟ ناچار جرأت بہم پہنچا کر اس عرضداشت کے جواب میں ان حالات کے انکشاف کا امیدوار ہوں۔" فقط

پیر و مرشد، حضرت کے تصدق سے قرض ادا ہو گیا۔ تنخواہ نے قسط سے اور میں نے رنج سے رہائی پائی۔ ہم بدل و ہم بزبان ثنا خوانِ جود و نوال؛ دعاگوی دوامِ دولت و اقبال ہوں۔ آدھا قرضِ عطیۂ سابق میں، اور آدھا قرضِ عطیۂ حالی میں ادا ہو گیا۔ کہہ نہیں سکتا، اور رہن کے مَنتی نہیں اگر دونوں لڑکوں کا پچاس روپے مہینا جنوری سنہ ۶۷ ۱۸ء یعنی ماہِ حال و سالِ حال سے جاری ہو جائے گا، اور ماہ بماہ فقیر کے روزینے کے ساتھ پہنچا کرے گا، تو آپ کا نمک خوار پھر کبھی قرضدار نہ ہوگا۔ زیادہ حدِّ ادب۔

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

فیض کا طالب، غالب

معروضۂ ۸ جنوری سنہ ۱۸۶۷

(۸۳/۳۹)

حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعد تسلیم معروض ہے۔ بہت دن تک متردد رہا کہ حضور کلکتے ہیں یا رامپور۔ چنانچہ ایک عرضداشت اُسی تردد میں بھیجی بھی ہے۔ ہنوز جواب کے آنے کی مدت منقضی نہیں ہوئی۔ خیر! اُس کے جواب پر کیا موقوف ہے؛ یہ تو جان لیا کہ حضرت رونق افزای رامپور ہیں، مگر یہ کیونکر جانوں کہ اب یہ خجستگی و فرخندگی یہیں رونق افزا رہیں گے، یا پھر کلکتے تشریف لے جائیں گے۔ خیر! اس بے علمی کو سہل سمجھ لیا کہ جو کچھ ہوگا، معلوم ہو جائے گا، مگر یہ کیونکر جانوں کہ

مزاجِ اقدس کیسا ہے، اور جب تک یہ نہ جانوں تو آرام کیونکر آئے؟ یہاں سے رامپور تک برابر تارِ برقی بھی نہیں، جو خبر منگواؤں۔ آج ۱۴ فروری کی ہے۔ یہ خط بھیجتا ہوں۔ اگر جواب آئے، تو ۹ دن میں۔ مجھ کو اتنے دن صبر کیونکر آئے گا؟ الٰہی، آج یا کل کوئی نوازش نامہ خداوند کا آجائے! زیادہ حدِّ ادب۔

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

خیر کا طالب، غالب

۱۴ فروری ۱۸۶۷

(۸۴/۹۰)

حضرت ولیِّ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ کل صبح کو میں نے خط ڈاک میں بھجوا دیا۔ وہ امروں کے تردد کے رفع کی التماس تھی۔ ایک یہ کہ پھر کلکتے کو تشریف لے جائیے گا یا نہیں؛ دوسرے یہ کہ مزاجِ اقدس کیسا ہے۔ حسنِ اتفاق یہ کہ کل ہی وہ پہر کو اخبار میں دیکھا کہ حضور نے بوجہ ناسازیٔ آب و ہوائی کلکتہ شمولِ کونسل سے انکار کیا۔ بارے اس سے خاطر جمع ہوئی۔ رہی مزاجِ مبارک کی حقیقت، اُس سے بھی فی الجملہ طمانیت ہوگئی۔ یعنی عنایت نامے میں خیرخواہ کے خلافِ مدعا کوئی بات مندرج نہ تھی۔ اسی عرضی میں یہ بھی عرض کر دیتا ہوں کہ سو روپیے بابتِ تنخواہِ جنوری سنہ ۱۸۶۷ حال میں نے پائے اور شکرِ درویش پروری بجا لایا ہے

تم سلامت رہو قیامت تک! دولت و عزّ و جاہ روز افزوں! فقط

عنایت کا طالب، غالب

۱۵ فروری ۱۸۶۷

(٨٥/٤١)

حضرت ولیِّ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ توقیعِ عطوفت عزّ ورود لایا (سو روپیہ تنخواہ) فروری سنہ ۱۸۶۷ حال کا معروضِ وصول میں آیا۔

اس درویش کا حال اب قابلِ گزارش نہیں۔ امراضِ قدیم بڑھ گئے دورانِ سر، اور رعشہ، اور ضعفِ بصر، تین بیماریاں نئی پیدا ہوئی ہیں۔ قلم نہیں بنا سکتا، لڑکوں سے بنوا لیتا ہوں۔ برسوں کی بات نہیں رہی۔ ہفتوں کی یا مہینوں کی زندگی رہ گئی ہے

تم سلامت رہو قیامت تک! دولت و عزّ و جاہ روز افزوں!

زیادہ حدِّ ادب۔

نجات کا طالب، غالب

۱۳ مارچ سنہ ۱۸۶۷

(٨٦/٤٢)

حضرت ولیِّ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ کل صبح کو دو گھڑی دن چڑھے نوروز ہے۔ آج یہ قطعہ ہاتھ تھام کر لکھ کر حضور کی نذر بھیجتا ہوں ہے

نوروز و دو عید از دو جانب امسال خوب ست ز روئے طبع و نیک ست بفال
امید کہ این سہ عید، نذرِ نواب آرند دوامِ عمر و عزّ و اقبال

تم سلامت رہو قیامت تک!

دولت و عزّ و جاہ روز افزوں!

نجات کا طالب، غالب

چہارشنبہ ۲۰ مارچ سنہ ۱۸۶۷

(۸۴/۴۳)

حضرت ولیٔ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم وتعظیم معروض ہے۔ ہنڈوی ملفوفۂ نوازش نامہ کے ذریعے سے سو روپے مارچ کی تنخواہ کے وصول ہوئے۔

ایک رباعی بھیجتا ہوں، اور یہ چاہتا ہوں کہ دیدبۂ سکندری کے آغاز میں اس کے چھاپنے کا التزام رہے[1]۔

آن کیست کہ جسم ملک راجان باشد؛ آن کیست کہ ہمسرِ سلیمان باشد؛
آن کیست کہ انجمش بفرمان باشد؛ کس نیست، مگر کلب علی خاں باشد

تم سلامت رہو ہزار برس!
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

نجات کا طالب، غالب

۱۶ اپریل سنہ ۱۸۶۷ء

(۸۵/۴۴)

حضرت ولیٔ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ نمائشگاہ سراسر سرور رامپور کا ذکر اخبار میں دیکھتا ہوں، اور خونِ جگر کھاتا ہوں کہ ہائے میں وہاں نہیں! بالاخانے پر رہتا ہوں، اُتر نہیں سکتا۔ ماناکہ آدمیوں نے گود میں لے کر اتارا اور پالکی میں بٹھادیا۔ کہار چلے۔ راہ میں نہ مرا، اور رامپور پہنچ گیا۔ کہاروں نے جاکر بینظیر میں میری پالکی رکھدی۔ پالکی قفس، اور میں طائرِ اسیر، وہ بھی بے پروبال۔ نہ چل سکوں، نہ پھر سکوں۔ جو کچھ اوپر لکھ آیا ہوں، یہ سب بطریقِ فرضِ محال ہے؛ ورنہ ان امور کے وقوع کی کہاں مجال ہے!؟ آیک تین بیت کا قطعۂ تاریخ بھیجتا ہوں۔ اگر پسند آئے، تو میں خوشنودیٔ مزاج مبارک سے اطلاع پاؤں[2]۔

نمایشگہی در خور بہ شایان خویش   برآراست نواب عالی جناب
بہ بین، چون طرب را نہایت نماند   بود سال آن "بخشش بیحساب"
خدایا! بپسند دخسدا وندگار   کہ از طبع غالب رود زیج و تاب

"بخشش بیحساب" کے بارہ سو پچاسی ہوتے ہیں۔ "طرب" کی نہایت باء موحدہ ہے۔ جب وہ نہ رہی، تو وہ عدد گھٹے، اور ۱۲۸۳ رہ گئے۔ فھوالمقصود۔ اگر حضرت کی مرضی ہو، تو دبدبۂ سکندری میں یہ تاریخ چھاپی جائے۔

تم سلامت رہو ہزار برس!   ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

داد کا طالب، غالب

۱۴ ماہ اپریل سنہ ۱۸۶۷ عیسوی

(۸۹/۴۵)

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعد تسلیم معروض ہے۔ توقیع رفیع عزّ ورود لایا۔ اپریل سنہ ۱۸۶۷ کی تنخواہ کا سو روپیہ معرض وصول میں آیا۔ زیادہ حدِ ادب

تم سلامت رہو قیامت تک!   دولت و عزّ و جاہ روز افزوں!

نجات کا طالب، غالب

۱۴ مئی سنہ ۱۸۶۷ء

(۹۰/۴۶)

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعد ادای مدارج تسلیم سوچتا ہوں کہ کیا لکھوں۔ ہے، ہے! میں کیوں جیتا رہا، جو صاحبزادہ محمد حسن خاں کے مرنے کی خبر سنوں، اور خداوند نعمت کو تعزیت کے کلمات لکھوں؟ میں نیم جاں نہ مروں، اور وہ نوجوان مر جائے۔ ع

سرو چمن سروری افتاد زپا، ہای!

حضرت کے رنج واندوہ کا تصور اور مارے ڈالتا ہے۔ دوسری محرم کو علی بخش خاں خانہ ماں مرے؛ تیسری کو یہ واقعۂ ہوش ربا پیش آیا۔ یہ تو آپ کا فرزندِ دلبند تھا۔ جو اس کا غم ہو، وہ بجا ہے۔ پر فقیر جانتا ہے کہ علی بخش خاں کے مرنے کا بھی حضرت کو بڑا رنج ہوا ہوگا۔ ایسے کارگزار، دیانتدار، ہوشمند، مزاج داں کہاں پیدا ہوتے ہیں؟ بہرحال "رضینا برضاء اللہ"۔ حضرت کے سامنے صبر و ثبات و تسلیم و رضا میں کلام کرنا اور لیس کو حکمت پڑھانی اور خضر کو راہ بتانی ہے ؎

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

غالب ۱۴ مئی سنہ ۱۸۶۷

(۹۱/۴۷)

حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ ورودِ توقیعِ وقیع سے فیض پایا۔ سو روپیہ مئی سنہ ۱۸۶۷ کی تنخواہ کا معرضِ وصول میں آیا۔ فقط

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

اسد اللہ بیدِ سنگاہ

۱۱ جون سنہ ۱۸۶۷

(۹۲/۴۸)

حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے کہ توقیعِ وقیع عزّ ورود لایا۔ اُس کی ملفوفہ ہنڈوی سے تنخواہِ جون سنہ ۱۸۶۷ کا سو روپیہ میں نے پایا۔ فقط

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

ہوا خواہ، اسد اللہ

۱۵ جولائی سنہ ۱۸۶۷

(۹۳/۴۹)

حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ بموجب تحریر مرزا رحیم الدین بہادر حیا[۱] کے، فاضل شطرنج باز[۲] کو خرچ دے کر روانہ کیا ہے

تم سلامت رہو قیامت تک! دولت و عزّ و جاہ روز افزوں!

اسد اللہ بید سنگاہ - ۲۲ جولائی سنہ ۱۸۶۷

(۹۴/۵۰)

حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تقدیم مدارجِ تسلیم نواز شنامے کے ورود کا شکر اور جولائی مہینے کے سو روپیے کے وصول کا سپاس بجا لاتا ہوں ہ

تم سلامت رہو قیامت تک!

دولت و عزّ و جاہ روز افزوں! فقط

نجات کا طالب، غالب

۱۳ اگست سنہ ۱۸۶۷

(۹۵/۵۱)

حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ آپ کے غلامِ زرخرید، یعنی حسین علی خاں کی منگنی ہو گئی، اور اپنے کنبے میں ہوئی، یعنی نواب احمد بخش خاں مرحوم کے حقیقی بھائی کی پوتی سے[۳]، اور رجب کا مہینا قرار پایا۔ اب میرے بڑھاپے اور مفلسی کی شرم آپ کے ہاتھ[۴] ہے ہ

نہ کہوں آپ سے تو کس سے کہوں؟ مدعای ضروری الاظہار

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

نجات کا طالب، غالب

۱۹ اگست سنہ ۱۸۶۷ء

(۹۶/۵۲)

آن کیست کہ حسبِ ملک راجاں باشد؟ آن کیست کہ ہمسرِ سلیمان باشد؟
آن کیست کہ انجمش لعبہ ماں باشد؟ کس نیست، مگر کلب علی خان باشد

حضرت ولیِّ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ عنایت نامہ عزّ ورود لایا۔ اُس میں یہ حکم مندرج پایا کہ حسین علی خاں کی شادی کے باب میں "خلاصۂ مکنونِ خاطر" عرض کروں۔ حکم بجا لاتا ہوں، اور عرض کرتا ہوں۔ مجملاً یہ کہ میں درِ دولت کا گدای خاک نشیں، اور وہ آپ کا غلام۔ تفصیل یہ کہ میرے پاس نقد، جنس، اسباب، املاک اور میرے گھر میں زیورِ زرینہ و سیمینہ کا نام و نشان نہیں۔ ہمت اُدھار قرض کوئی دیتا نہیں۔ آپ روپیہ عنایت فرمائیں، تا یہ کام سرانجام پائے، اور بوڑھے فقیر کی برادری میں شرم رہ جائے۔ دوسری بات یہ کہ سو رو پیے ماہ آپ کی سرکار سے بطریقِ خیرات اور ۶۲ مہینا انگریزی سرکار سے بعوضِ جاگیر پاتا ہوں۔ عالم الغیب جانتا ہے کہ اس میں میرا بڑی مشکل سے گزارا ہوتا ہے۔ بہو کو کہاں سے کِھلاؤں گا؟ حسین علی خاں کی کچھ تنخواہ مقرر ہو جائے۔ لیکن توقیعِ تنخواہ اُس کے نام جاری نہ ہو، بلکہ اُس کی زوجہ، حسن جہاں بیگم بنتِ اکبر علی خاں، کے نام وہ تنخواہ مقرر ہو، اور اُس کی مہری رسید سے ملا کرے۔ زرِ مصرفِ شادی کی مقدار اور تنخواہ کی مقدار، جو خداوند کی ہمت اور اس کنگال اپاہج کی قسمت۔ زیادہ حدِّ ادب

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

نجات کا طالب، غالب ۵ ستمبر سنہ ۱۸۶۷ء

(۹۷/۵۳)

حضرت ولیِّ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ عنایت نامہ عزِّ ورود لایا۔ اللہ اکبر! حضرت نے غمخواری و تفقّد و درویش نوازی کو اُس پایے پر پہنچایا کہ شاہانِ عجم میں سلطان سنجر نے اور شاہانِ ہند میں شاہجہاں[2] نے ملازموں کی اتنی پرسش اور نوازش کی ہوگی۔ باقر علی خاں[3] کی شادی نواب ضیاء الدین خاں کے ہاں ہوئی۔ اُنھوں نے کھانے جوڑے کے دو ہزار روپیے دیے، اور میری زوجہ نے پانسو روپیے کا زیور لگا کر پچیس سو روپیے صرف کیے۔ حسین علی خاں کا خسرا، یعنی اکبر علی خاں، اپنے خاندان کا ہے، لیکن امیر نہیں، نوکری پیشہ ہے۔ اب یہ میں کیونکر عرض کروں کہ مجھے کیا دو؟ سائل ہوں۔ یہ رسم نہیں کہ سائل مقدارِ سوال عرض کرے۔ حالِ مصارفِ شادیِ خاندان لکھ دیا ہے۔ دو ڈھائی ہزار میں شادی اچھی ہو جائے گی لیکن یہ بھی سچ عرض کرتا ہوں کہ میرا حقِ خدمت اتنا نہیں کہ اس قدر مانگ سکوں۔ جو کچھ دو گے، اُس میں شادی کر دوں گا۔ زیادہ حدِّ ادب ٥

تم سلامت رہو قیامت تک! دولت و عزّ و جاہ روز افزوں!

نجات کا طالب، غالب۔ معروضۂ ۲۴ جمادی الاول سنہ ۱۲۸۴، مطابق ۲۴ ستمبر سنہ ۱۸۶۷، فردای ورودِ ہمایوں منشور ۔

(۹۸/۵۴)

حضرت ولیِّ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ فرمانِ والا مع ہنڈوی تنخواہ ستمبر سنہ ۱۸۶۷ عزِّ ورود لایا۔ ہنڈوی بہ معرضِ وصول میں آیا۔ زیادہ حدِّ ادب ٥

تم سلامت رہو قیامت تک! دولت و عزّ و جاہ روز افزوں!

ترحّم کا طالب، غالب
۱۰ اکتوبر سنہ ۱۸۶۷

(۹۹/۵۵)

حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ دبدبۂ سکندری میں حضرت کے مزاج کی ناسازی کا ذکر دیکھ کر جو مجھ پر گزری، میرا خدا جانتا ہے۔ مگر یہ بڑی بات ہے کہ اسی ذکر کے ساتھ افاقت و رفعِ مرض کی بھی نوید مندرج تھی۔ توقع ہے کہ حضرت مفصل حال مرض کے پیدا ہونے کا اور فی الحال مزاجِ اقدس کیسا ہے، میر منشی کو حکم ہو جائے کہ حضور کی زبانی خط میں مجھے لکھ بھیجیں۔

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

غالب

۱۸ اکتوبر سنہ ۱۸۶۷

(۱۰۰/۵۶)

حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ ایک قطعہ ۱۵ شعر کا بھیجتا ہوں۔ حضور ملاحظہ فرمائیں۔ مضامین کی طرز نئی، مدح کا انداز نیا، دعا کا اسلوب نیا۔ زیادہ حدِ ادب۔

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

نجات کا طالب، غالب

۵ رجب سنہ ۱۲۸۴ ہجری

ہند میں اہلِ تسنن کی ہیں دو سلطنتیں
حیدر آبادِ دکن، رشکِ گلستانِ ارم
رامپور، اہلِ نظر کی ہے نظر میں وہ شہر
کہ جہاں ہشت بہشت آ کے ہوئے ہیں باہم
حیدر آباد بہت دور ہے، اس ملک کے لوگ

اُس طرف کو نہیں جاتے ہیں، جو جاتے ہیں توکم
رامپور، آج ہے وہ القصہ معمور، کہ ہے
مرجع و مجمع اشرافِ نژادِ آدم ،،
رامپور، ایک بڑا باغ ہے ازروی مثال
دلکش و تازہ و شاداب و وسیع و خورم
جس طرح باغ میں ساون کی گھٹائیں برسیں
ہے اُسی طور پہ یہاں دجلہ فشاں دستِ کرم
ابر دستِ کرم کلبِ علی خاں سے مدام
درِ شہوار ہیں، جو گرتے ہیں قطرے پیہم
صبحدم باغ میں آجاے، جسے ہو نہ یقیں
سبزہ و برگِ گل و لالہ پہ دیکھے شبنم
حبّذا باغ ہمایوں تقدس آثار!
کہ جہاں چرنے کو آتے ہیں غزالانِ حرم
مسلکِ شرع کے ہیں راہ رو و راہ شناس
خضر بھی یہاں اگر آجاے، توے ان کے قدم
مدح کے بعد دعا چاہیے، اور اہلِ سخن
اس کو کرتے ہیں بہت بڑھ کے باغراق رقم
حق سے کیا مانگیے؟ ان کے لیے جب ہو موجود
ملک و گنجینہ و خیل و سپہ و کوس و علم
ہم نہ تبلیغ کے مائل، نہ غلو کے قائل
دو دعائیں ہیں کہ وہ دیتے ہیں تو آپ کو ہم
یا خدا، غالبِ عاصی کے خداوند کو دے
وہ دو چیزیں کہ طلبگار ہے جن کا عالم

اوّلاً عمرِ طبیعی بہ دوامِ اقبال
ثانیاً دولتِ دیدارِ شہنشاہِ اُمم

(۱۰۱/۵۷)

حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

آج روزِ جمعہ ۱۷ رجب ۱۲۸۴ اور ۱۵ نومبر ۱۸۶۷، والا نامہ مع ہنڈوی تنخواہِ اکتوبر سنہ ۱۸۶۷ آیا۔ سو روپیے کل آئیں گے۔ بستے شاگرد پیشہ اور ماہ مے قرض متفرقہ میں بانٹ کر لڈو پیے بچیں گے۔ اللہ اللہ!

پیر و مرشد

رجب کا مہینا چلا۔ حسین علی خاں کی سُسرال سے شادی کا تقاضا ہے۔ ادھر سے جز سکوت جواب نہیں!

کئی دن ہوئے کہ ۱۵ شعر کا قطعہ ارسال ہوا ہے۔ اُس کی رسید اِس خط میں مندرج نہ تھی۔ خاتمے کے تین شعر دعائیہ یہاں لکھتا ہوں۔

دعا کا نیا طور ہے۔

ہم نہ تبلیغ کے مائل نہ غلو کے قائل
دو دعائیں ہیں کہ وہ دیتے ہیں نواب کو ہم
یا خدا! غالبِ عاصی کے خداوند کو دے
دو وہ چیزیں کہ طلبگار ہے جن کا عالم
اوّلاً عمرِ طبیعی بہ دوامِ اقبال
ثانیاً دولتِ دیدارِ شہنشاہِ اُمم!

نجات کا طالب غالب

(۱۰۲/۵۸)

حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعد تسلیم معروض ہے۔ کل ۱۲ دسمبر کو نومبر کی تنخواہ کی ہنڈوی پہنچی وہ بھی سعادت مند منشی سیلچند کے خط میں ملفوف۔ دیر میں ہنڈوی کا پہنچنا ایک طرف

حضرت کے توقیعِ وقیع کے مشاہدے سے آنکھوں کا روشن نہ ہونا میری سیاہ بختی کی دلیل ہے۔ زیادہ حدِ ادب۔

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

نجات کا طالب، غالب

۱۷ دسمبر سنہ ۱۸۶۷

(۱۰۳/۵۹)

حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ آج روزِ شنبہ، یکم ماہِ رمضان المبارک سنہ ۱۲۸۴ ہے، بہ اتفاقِ حسابِ درجِ نگارشِ جنتری ہے

روزِ روزہ است و روز ناپیداست غلظتِ ابر و شدتِ سرماست

چونکہ دھوپ تو نظر ہی نہیں آتی، ناچار دن رات آگ تاپتا ہوں، اور ہر وقت کانپتا ہوں۔

ماہِ صیام میں سلاطین و امرا خیرات کرتے ہیں۔ اگر حسین علی خاں یتیم کی شادی اسی مہینے میں ہو جائے، اور اس بوڑھے اپاہج فقیر کو روپیہ مل جائے تو اس مہینے میں تیاری ہو رہے، اور شوال میں رسمِ نکاح عمل میں آئے۔ اور چونکہ اس ماہِ مبارک میں درِ فیض باز، اور سالِ انگریزی کا بھی آغاز ہے، وہ پچیس روپیے مہینا جو زبانِ مبارک سے نکلا ہے، جنوری سنہ ۱۸۶۸ سے بنامِ حسین علی خانِ مذکور جاری ہو جائے، تو مجھے گویا دونوں جہان مل گئے

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

لکھا ہوا یکمِ رمضان اور بھیجا ہوا دومِ رمضان کا۔ عطا کا طالب، غالب،

(۱۰۴/۶۰)

حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ منشورِ رافت عز ورود لایا۔ ہنڈوی ملفوفہ سے

سو روپیہ بابتِ تنخواہِ دسمبر سنہ ۱۸۶۷ معرضِ وصول میں آیا۔

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

توجہ کا طالب، غالب

۱۴ جنوری سنہ ۱۸۶۸ عیسوی

(۱۰۵/۶۱)

داد و دہشِ تو روز افزون بادا! بر دولتِ تو زمانہ مفتون بادا!

این عید و دو صد ہزار عیدِ دیگر بر ذاتِ تو فرخ و ہمایون بادا!

نجات کا طالب، غالب

جمعہ ۲۸ رمضان المبارک سنہ ۱۲۸۴ ہجری

(۱۰۶/۶۲)

حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ منشورِ عطوفت ظہورِ عزّ ورود لایا، اور اُس کی لفوفہ ہنڈوی سے جنوری سنہ ۱۸۶۸ حال کا سو روپیہ معرضِ وصول میں آیا۔ فقط

تم سلامت رہو قیامت تک! دولت و عزّ و جاہ روز افزوں!

نجات کا طالب، غالب

۱۳ فروری سنہ ۱۸۶۸

(۱۰۷/۶۳)

حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

عرضِ مدارجِ عجز و نیاز کے بعد نوازشنامے کے پہنچنے کا اور تنخواہِ فروری سنہ ۱۸۶۸ کے پانے کا شکر بجالاتا ہوں۔ سبحان اللہ! کیا برکت ہے اس سو روپیے میں کہ سو آدمی روٹی کھاتے ہیں، اور اس فقیر کے بھی سو کام نکل جاتے ہیں۔ مرزا حسین علی خاں کی شادی رجب کے مہینے میں قرار پائی تھی۔ عبث حضور کے نہ پہنچنے کے سبب ملتوی رہی۔ آج ذیقعدہ کی ۱۵ ہے، ۱۵ دن یہ اور مہینا ذی الحجہ کا۔ اگر اسی ذیقعدہ کے مہینے میں کچھ حضرت عطا فرمائیں گے تو

آخرِ ذی الحجہ تک نکاح ہو جائے گا۔ خدا کرے، خداوند کے ضمیر میں یہ بھی گزرے کہ غالب جب بہو بیاہ لائے گا، تو اُس کو روٹی کہاں سے کھلائے گا! غرض اس سے یہ کہ حسین علی خاں کی تنخواہ جاری ہو جائے۔ حضرت، کوئی ایسا نہیں کہ جو میرے مطالب حضور میں عرض کرتا رہے، اور مجھے بار بار لکھتے ہوئے شرم آتی ہے ع

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

نجات کا طالب، غالب

۹ مارچ سنہ ۱۸۶۸[1]

(۱۰۸/۶۴)

حضرتِ ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ منشورِ عطوفت ظہور عزِّ ورود لایا۔ سورتیہ کا کاغذ[2] خط کے لفافے میں سے پایا۔ اپریل سنہ ۱۸۶۸ کی تنخواہ کا روپیہ معرضِ وصول میں آیا۔

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

(دوشنبہ ۱۱ ماہِ مئی سنہ ۱۸۶۸)[3]

(۱۰۹/۶۵)

حضرتِ ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ شوقِ قدمبوس نے تنگ کیا۔ جب یہ جانا کہ کسی طرح جا نہیں سکتا، ناچار اپنا نقشا اُتروایا، اور خدمتِ عالی میں روانہ کیا۔ جب تک کہیں جیتا ہوں، تب تک اس صورت سے حاضر رہوں گا۔ زیادہ حدِّ ادب ع

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

عنایت کا طالب، غالب

۲۷ مئی سنہ ۱۸۶۸[4]

(۱۱۰/۹۹)

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعد تسلیم معروض ہے۔ آج جو تقادن ہے کہ توقیعِ وقیع عز ورود لایا ہے۔ ہنڈوئی ملفوفہ کی رو سے تنخواہ مئی سنہ ۱۸۶۶ کا سو روپیہ معرض وصول میں آیا ہے۔ جواب کے جلد نہ لکھنے کی وجہ یہ ہے کہ میں گرمی کی شدت کے سبب سے اور احتباس ہوا سے کہ جو لازمۂ موسم برسات ہے، بیکار محض ہو گیا ہوں مطلق کچھ لکھ نہیں سکتا، اور کوئی ایسا شخص کہ جس سے کچھ لکھواؤں، اس چار روز میں میرے پاس نہیں آیا۔ آج اس وقت ایک صاحب آ گئے۔ اُن سے میں نے یہ عریضہ لکھوا لیا۔

پیر و مرشد، سابق کے عریضے کے ساتھ میں نے اپنی تصویر حضور میں بھیجی ہے۔ اُس کی رسید اس نوازشنامے میں مرقوم نہ تھی۔ مجھ کو یہ اندیشہ ہے کہ کہیں وہ لفافہ ڈاک میں تلف نہ ہو گیا ہو۔ اگر اُس کی رسید سے شرف اطلاع پاؤں، تو دلجمعی ہو جائے۔

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

۱۵ جون سنہ ۱۸۶۶ء، نجات کا طالب، غالبؔ

(۱۱۱/۱۰۰)

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعد تسلیم معروض ہے۔ کل منشورِ عطوفت عزّ صدور لایا۔ جولائی سنہ ۱۸۶۶ کا سو روپیہ بذریعۂ ہنڈوی وصول پایا۔

تین التماس سابق پیش ہوئی تھیں۔ سو آپ پہلے برخوردار نواب مرزا خاں کی تحریر سے، اور پھر جناب مظفر حسین خاں بہادر کے خط سے اُن خواہشوں کے منظور و مقبول ہونے کی نوید پائی۔ ان شاء اللہ الکریم حسب ارشاد حضور اسی برس ۶۶ میں آدھ زمستان یعنی نومبر و دسمبر میں میرا قرض بھی ادا ہو جائے گا، اور حسین علی خاں

کی شادی بھی ہو جائے گی، اور اُس کے واسطے اُس کی زندگی تک تنخواہ جداگانہ مقرر ہو جائے گی ؎

با کریمان کارہا دشوار نیست! فقط

عرضداشت ہوا خواہ، اسد اللہ۔ معروضۂ ۱۳ ماہِ اگست سنہ ۱۸۶۸

تم سلامت رہو قیامت تک! دولت و عزّ و جاہ روز افزوں!

(۱۱۲/۶۸)

حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تقدیم مدارجِ تسلیم معروض ہے۔ توقیعِ رافت عزّ ورود لایا۔ ہنڈوی ملفوفہ کے ذریعے سے بابتِ تنخواہ اگست ۱۸۶۸ سو روپیہ وصول پایا ؎

لکھوں آپ سے تو کس سے کہوں! مدعای ضروری الاظہار

پیر و مرشد، حسین علی خاں کے سسرال والوں کا بڑا تقاضا ہے۔ زندگی مشکل ہو گئی ہے۔ بطریقِ "شیئاً للّٰہ" سوالِ مختصر یہ ہے کہ جو حضرت کے مزاج میں آوے، وہ عطا کیجیے، اور حسین علی خاں کے نام جداگانہ تنخواہ مقرر کر دیجیے؛ لیکن یہ دونوں امر جلد صورت پکڑ جائیں ؎

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

عرضداشت دو تنخواہ، اسد اللہ

زیادہ حدِّ ادب۔

معروضۂ ستمبر سنہ ۱۸۶۸

(۱۱۳/۶۹)

حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعد تسلیم معروض ہے۔ عنایت نامہ مع سو روپے کی ہنڈوی کے عزّ ورود لایا۔ تنخواہ ستمبر ۱۸۶۸ کا سو روپیہ میں نے پایا ؎

تم سلامت رہو قیامت تک! دولت و عزّ و جاہ روز افزوں!

مشتاقِ مرگِ ناگاہ، اسد اللہ

۱۳ ماہِ اکتوبر ۱۸۶۸

(۱۱۴/۷۰)

حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ توقیعِ رافت شرفِ ورود لایا۔ ماعہ روپیہ بابتِ تنخواہ اکتوبر سنہ ۱۸۶۸ از روی ہنڈوی ملفوفۂ خطِ معرضِ وصول میں آیا۔ خدا حضرت کو سلامت رکھے! مجھ سے اپاہج نکمّے کو بعوضِ خدمت تنخواہ دیتے ہو

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

عرضداشتِ اسد اللہ، مرقومۂ ۱۱ نومبر سنہ ۱۸۶۸

(۱۱۵/۷۱)

حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ کل عریضۂ مشعرِ رسیدِ تنخواہ نومبر سنہ ۱۸۶۸ حال ارسال کر چکا ہوں۔ آج ناچار از روی اضطرار و افتقار پھر یہ عرضی لکھتا ہوں۔ حال میرا تباہ ہوتے ہوتے اب یہ نوبت پہنچی کہ اب کے تنخواہ میں سے للعہ روپیے بچے۔ مدعہ روپیے کا چھتا ماہوار کا۔ سود تہ ماہہ دینا۔ مجملاً آٹھ سو روپیے ہوں، تو میری آبرو بچتی ہے۔ ناچار حسین علی خاں کی شادی اور اُس کے نام کی تنخواہ سے قطعِ نظر کی۔ اب اس باب میں عرض کروں کیا مجال! کبھی نہ کہوں گا آٹھ سو روپیے مجھ کو اور دیجے۔ شادی کیسی! میری آبرو بچ جائے تو غنیمت ہے برخوردار نواب مرزا خاں کے خط میں یہ حال مفصل لکھا ہے۔ وہ عرض کرے گا مختصر یہ کہ اب میری جان اور آبرو آپ کے ہاتھ ہے۔ گر حضور، جو عطا فرمانا ہے، جلد ارشاد ہو۔ زیادہ حدِ ادب

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

عرضداشتِ گدای یک درہ اسد اللہ خطر

۱۲ نومبر سنہ ۱۸۶۸

(۱۱۶/۶۲)

حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ بہت دن ہوئے کہ برخوردار نواب مرزا خاں نے مجھ کو مبارکباد لکھی تھی کہ حضور نے تیرے قرض کے ادا کرنے کی نوید دی ہے اور مقدارِ قرض پوچھی ہے۔ سو میں نے اُن کو لکھ بھیجا تھا کہ آٹھ سو روپے میں میرا قرض تمام ادا ہو جائے گا۔ اس تحریر سے یاددہی منظور ہے۔ زیادہ حدِ ادب۔

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

آرام کا طالب، غالب

صبحِ پنجشنبہ ۱۷ دسمبر سنہ ۱۸۶۸

(۱۱۷/۶۳)

حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ عنایت نامہ اور اُس میں تنخواہِ دسمبر سنہ ۱۸۶۸ کی ہنڈوی ملفوف پہنچی۔ جلد یاد آوری کا شکر بجا لایا۔

حضور، قرضخواہوں نے بہت عاجز کر رکھا ہے۔ بس میرا یہی کام ہے کہ یاد دلا دوں۔ آگے حضرت مالک ہیں۔ فقط

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

عرضداشتِ غالبِ گدیہ خواہ مرقومۂ روزِ یکشنبہ

اواخرِ تاریخ رمضان المقدس سنہ ۱۲۸۵

.:(※):.

"بخدمتِ نواب صاحب مشفق و مکرم، مظہرِ لطف و کرم، نواب زین العابدین خاں صاحب بہادر عرف کلن میاں، سلمہ اللہ تعالےٰ، مقبول باد"[۱]

[صاحبزادہ سید زین العابدین خاں بہادر عرف کلن میاں ولد صاحبزادہ سید صغر علی خاں بہادر ولد نواب سید عبداللہ خاں بہادر ابنِ نواب سید غلام محمد خاں بہادر، نواب فردوس مکاں کے ہمجد اور رشتے میں حقیقی چچا زاد بھائی کے بیٹے تھے تقریبًا ۱۲۴۳ھ میں دلّی میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما پائی۔ اپنے دادا نواب سید عبداللہ خاں بہادر کی صدر الصدوری میرٹھ کے زمانے میں اُن کے ساتھ رہے۔ نواب فردوس مکاں کے عہد میں رامپور آئے۔ ان کے بڑے بھائی صاحبزادہ سید محمد رضا خاں بہادر کو نواب فردوس مکاں کی صاحبزادی منسوب تھیں۔ سوءِ اتفاق سے اُن کا انتقال ہوگیا۔ صاحبزادہ کلن میاں نے سرکار کی اجازت کے بغیر ۱۲۸۳ھ میں بھاوج سے عقد کرلیا اور رامپور سے ترکِ وطن کرکے جیپور چلے گئے اور وہیں توطن اختیار کرلیا۔ امیر مینائی نے لکھا ہے:

"عابدؔ۔ صاحبزادہ محمد زین العابدین خاں عرف کلن خاں ولد صاحبزادہ محمد اصغر علی خاں اصغر...... بیالیس برس کا سن ہے۔ تلمذ کسی سے نہیں بطور خود کہتے ہیں۔ یہ اُن کا کلام ہے:

تھا جو اُڑنا ہی ہوش کو میرے — بوئ گیسوئے عنبریں ہوتا
تھا نہ کھلنا جو عقدۂ دل کو — کاش، ابرو کی تیرے چیں ہوتا

ان کے دادا میرزا صاحب کے مخلص دوست تھے، اس لیے یہ میرزا صاحب کے

اپنا بزرگ اور وہ انھیں اپنا فرزند خیال کرتے تھے۔ لیکن نواب فردوس مکان ان سے ناخوش ہو گئے، تو میرزا صاحب نے ان کے کلام پر اصلاح دینے سے انکار کر دیا۔ صاحبزادہ سید زین العابدین خاں بہادر نے جیپور میں دسمبر ۱۹۰۲ء میں انتقال کیا۔ انتخابِ یادگار: ۲۱۲؛ ملخص تسلیم: ۹۶؛ خمخانۂ جاوید: ۵، ۲۹۹]

(۱۱۸/۱)

بندہ پرور! مہربانی نامہ پہنچا۔ میں تو سمجھا تھا، آپ مجھ کو بھول گئے۔ بارے یاد کیا۔ جناب نواب صاحب میرے محسن اور میرے قدردان اور میرے اُمید گاہ ہیں۔ میں اگر رامپور نہ آؤں گا، تو کہاں جاؤں گا۔ یہ جو آپ کہتے ہیں کہ تجھ کو آنے میں تردد کیا ہے، تردد کچھ نہیں، توقف ہے۔ وجہ توقف کی یہ کہ میں نے اپنے پنشن کے باب میں چیف کمشنر بہادر کو درخواست دی تھی۔ وہاں سے صاحب کمشنر شہر کے وہ درخواست حوالے ہوئی۔ صاحبِ کمشنر دہلی نے صاحب کلکٹر شہر سے کیفیت طلب کی ہے۔ پس اگر وہ کیفیت پنشن کی ہے، تو یہاں کی کلکٹری کا دفتر اگر نہیں رہا نہ رہے، ریونیو بورڈ کے دفتر، اور لفٹنٹ گورنری آگرہ، اور نواب گورنر جنرل کلکتہ کے دفتر اس پنشن کی کیفیت سے خالی نہیں ہیں۔ اور اگر میری کیفیت مطلوب ہے، تو میرا بے جرم اور بری اور الگ ہونا فساد سے از روی دفتر قلعہ و اظہارِ مخبرین ظاہر ہے۔ بہرحال صاحب کمشنر شہر، کیفیت صاحب کلکٹر سے طلب کر کر، چیف کمشنر کے ساتھ پنجاب کو گئے ہیں۔ دیکھیے کب آویں، اور بعدِ ملاحظۂ کیفیت کیا حکم دیں؟ مگر تا صدورِ حکم میں یہاں سے کہیں جا نہیں سکتا۔ ہاں، بعد ملنے حکم کے، خواہی دلخواہ ہو خواہی مخالفِ مدعا، دونوں صورت میں رامپور آؤں گا۔ مگر حیران ہوں کہ جب تک یہاں رہوں، کھاؤں کیا، اور جب چلنے کا قصد ہو، تو رامپور کس طرح پہنچوں! کیا خوب ہو کہ تم یہ رقعہ اپنے نام کا حضور کو، یعنی حضرتِ نواب صاحب کو، پڑھوا کر اس مدعای خاص کا جواب جو وہ فرمائیں، مجھ کو لکھ بھیجو! لیکن تم سے یہ توقع

کیونکر پڑے؟ کس واسطے کہ تم نے اُردو دیوان کے پہنچنے نہ پہنچنے کا حال جنابِ عالی سے دریافت کرکر کیب لکھا ہے، جو اس بات کا جواب لکھو گے زیادہ اس سے کیا لکھوں۔ از غالب نگاشتہ و رواں داشتہ پنجشنبہ ۲۵ مارچ ۱۸۵۸ء۔ ضروری جواب طلب[۱]۔

(۱۱۹/۲)

نواب صاحبِ والا قدرِ عظیم الشان، سلّمکم اللہ تعالیٰ!

بعدِ سلام مشہودِ خاطرِ عاطر ہو۔ سابق آپ کا خط متضمن اُردو کے استفتای روزمرہ کا آیا تھا۔ اُس کا جواب جو مجھے معلوم تھا لکھ بھیجا۔ اب جو دوسرا خط آیا، اُس میں آپ نے اپنے اشعار بتوقعِ اصلاح بھیجے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ میں خاص خدمتِ اصلاحِ اشعار پر جناب نواب صاحب قبلہ کا نوکر ہوں، اور آپ حضور کے عزیزوں میں اور فرزندوں میں ہیں، پس میں بے حکم حضور کے آپ کی خدمت بجا نہیں لا سکتا۔ ناچار کاغذِ اشعار مسترد بھیجتا ہوں۔ یہ امر یقین ہے کہ موجبِ ملالِ اقدس نہ ہوگا۔ بندگی بیچارگی۔ زیادہ اس سے کیا لکھوں، کہ مدعای ضروری الاظہار اسی قدر تھا۔ والسلام۔

راقم اسداللہ خاں غالب ۱۴ مارچ سنہ ۱۸۶۵ء[۲]

بنامِ صاحبزادہ سیّد محمد عبّاس علی خاں صاحب بہادر

[صاحبزادہ سید محمد عباس علی خاں بہادر ابن سید محمد عبد العلی خاں بہادر، ابن نواب سید غلام محمد خاں بہادر، نواب فردوس مکاں کے حقیقی چچا زاد بھائی اور نواب خلد آشیاں کے حقیقی ماموں تھے۔ تقریباً ۱۲۴۴ھ (ء) میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۳۰ء تک دہلی میں قیام رہا۔ نہایت پاکیزہ سرشت، خوش مقال اور کمالاتِ ظاہری و باطنی سے پیراستہ تھے۔ مومن خاں صاحب دہلوی کے شاگردوں میں ممتاز، اور ہمچشموں میں خوش فکری کی بدولت سرفراز تھے۔ عاشقانہ اور معاملے کے شعر خوب کہتے تھے۔ سنہ ۱۸۶۶ء میں میرزا صاحب کے شاگرد ہوئے اور بذریعۂ مراسلت اصلاح لیتے رہے۔ غدر سنہ ۱۸۵۷ء کے بعد حاکم صدر بنائے گئے اور فروری ۱۸۸۳ء تک اسی عہدے پر فائز رہے۔ محکمۂ صدر میں عدالتی خط و کتابت اور کاروبارِ ریاست انجام پاتا تھا۔ انھیں اس زمرے کے کام کا بڑا تجربہ حاصل ہو گیا تھا۔

بیتاب ۲۹ رجب سنہ ۱۳۰۰ھ (۶ جون سنہ ۱۸۸۳ء) کو دوپہر کے وقت فوت ہوئے۔ دیوان گلدستۂ باغِ جناں کے نام سے شعبان ۱۳۰۱ھ میں چھپ چکا ہے۔ کتاب خانے میں متعدد قلمی نسخے بھی محفوظ ہیں۔ انھیں میں وہ نسخہ بھی ہے جس پر میرزا غالب کے قلم کی اصلاحیں ثبت ہیں۔ انتخابِ یادگار: ۲۷۶، اخبار الصنادید: ۱۷۳، خم خانہ]

(۱۳۰/۱)

قبلہ، جس شعر پر صاد ہے، وہ بہت خوب ہے؛ اور جس کو کاٹ دیا، وہ معیوب ہے؛ اور جس پر صاد نہیں، وہ بے عیب اور ہموار؛ اور جس کے معنی میں مجھے تامل ہے، اُس پر نظر، علامت اُس کی نقطہ۔ باقی جابجا منشاءِ اصلاح اور حقیقتِ الفاظ لکھ دی ہے۔
تین جزو، جس میں سات ورق سادے ہیں، پہنچتے ہیں۔ اور اجزا بھیجیے!

مے دل کی ذرا سی پھانس کیا ہی رو برو کیے — اکھاڑا ایک ہی جلے میں ہاتھ در جس نے خیبر کا
تھا

ہوا یوں دین اصحاب رسول اللہ سے شائع — کہ نکلے چوک میں سے جس طرح بازار چوسر کا
ہوا دینِ نبی اصحاب سے دنیا میں یوں شائع

میں تو اس کے بیہودہ بکنے پہ مہر دستار کے — ناصح ناداں یہ سمجھے کچھ پشیمان ہو گیا
بیہودہ

اُف رے گرمیِ تپِ عشق کہ جل کر نکلا — رگ سے جب سوختہ جاں کے ترے خنجر نکلا
دل

یہ بخت کی اذا دہے، یا یاد کی تاثیر؟ — بھولے سے بھی داں ذکر ہمارا نہیں ہوتا
تمہارا

پھر مجھ کو کچھ خبر نہیں، آگاہ ہے خدا — پی لی تھی ایک بار جو ہاں جان کر شراب
تو

نہیں آتا ہے شرارت کا گماں بھی اُن پر — دیکھنے میں تو ہے اس طرح کی بھولی صورت
طور

شکر کی جا ہے ... اک خلق کو مارے ڈالو — کیا قیامت ہوئی، گر ہو گئی اچھی صورت
خلق کے قتل سے کیا فائدہ؟ بس شکر کرو

شب صبح تک ... گردش میں لٹ گیا — ساقی نے کس قدر مئے گلگوں پلائی رات
باقی رہی نہ بوتلہ صبح ہی کے واسطے

بیچو ہیں اور وہ مجھ تمہالِ رقیب تھے — تھی وصل میں بھی وہ ہی جدائی تمام رات
ہیں جو دو

قاتل بنا ہے تیری ہی تلوار کے لیے — تھی ورنہ عاشقوں کو نہ کچھ سر کی احتیاج
قاتل لگا رکھا ہے تری تیغ — مقطع بیتاب کو اگرچہ نہ تھی

کیا رحم کھا گئے میری سفارش کچھ اس نے کی — برہم جو ہے رقیب سے بھی یار کا مزاج
ہے جو

درماں نے تیرے گور میں پہنچا دیا مجھے! اب چارہ گر، بتا میں کروں کیا ترا علاج

کہ

عادل ہے تو تو، شک نہیں کچھ اس میں اے خدا ڈالی ہے کس مراد پہ تو نے بناے چرخ

لیکن

آپ چل کر کہوا حوالِ دلِ مُضطر، بیتاب ~~کس کی دوات، قلم کیسی، کہاں کا کاغذ؟~~

کیا قلم، کیسی دوات، اور کہاں کا کاغذ؟

اُس سے

ہونی ہے جو خلق پر بس اب یہیں ہو جائے گی فتنۂ محشر ہوا قرباں تری رفتار پر

صدقے

دشمنوں کا اور فلک کا بھی میں اب شکور ہوں خوش اگر ہوتا ہے وہ ظالم مرے آزار پر

ممنون

آتشِ فرقت سے اک شعلہ ہو وہ دل ہی نہیں ہاتھ رکھتا اب مرے سینے پہ، دلبر دیکھ کر

کا

لکھ یا لکھنے تو، لیکن پھر جو کچھ رحم آ گیا رد دیا اللہ نے میرا مقدر دیکھ کر

آپ سے پہلے میری سرنوشت پر بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ غالب

طبعِ رسا نے اپنی دو بالا کیا اُسے پہنچا تھا مرتبے کو نہ اپنے سخن ہنوز

میری

بیتاب کو کسی نے جو پوچھا تو بولے ڈ ہاں خاک پہ پڑا تو ہے اک خستہ تن ہنوز

پوچھا

سخت جانی، تجھے اللہ کی مار، او ظالم پھر گیا، زندہ مجھے دیکھ کے دلبر یوں ہی

چھوڑ

خدا کرے! ترے پیکانِ تیر کو تو، صنم پسند آسے دلِ بیقرار کی آغوش

ظالم

ہے مرے دوست کا بھی دشمنِ جاں وہ ظالم میں نے اس واسطے دشمن سے نکالا اخلاص

دوست یعنی معشوق۔ دشمن یعنی رقیب۔ رقیب معشوق کا عاشق ہوتا ہے، دشمن جان نہیں ہوتا۔ مانا کہ وہ رقیب معشوق کا در پردہ دشمن ہے۔ پھر اس ملحق نے اپنے معشوق کے عدو سے اخلاص کیوں نکالا؟ خدا جانے اس شعر کی فکر کے وقت حضرت کا خیال کدھر تھا۔ غالب

دوستی اپنی، خدا کے لیے کہہ کر نہ دکھیے ۔۔۔ نہیں بھاتا ہے مجھے ناصحو اتنا اخلاص

ح

~~قاصد کی تنابت کیا ہی کہ بتوں کی کیا مجال؟ ۔۔۔ پہنچا دے یار تک تو ہی پروردگار خط~~

یہ گستاخی بے مزہ ہے

دے دادِ دل، وگرنہ یہ دونوں ہیں بدبلا ۔۔۔ کرتے ہیں آہ و نالہ ترا، اے خدا، لحاظ

ہاں اس میں نمک ہے

دیوانہ ہے وہ کون؟ جو دن کو جلائے شمع ۔۔۔ خورشید رو کے سامنے کیا کوئی لائے شمع

اُس مہر وش

~~پروانہ ساں نہ کیجیے، مجھے شرم آتی ہے~~ ۔۔۔ میں مبتلا ہوں آپ کا، وہ مبتلائے شمع

پروانہ مجھ کو کہتے ہو، تم کو حیا نہیں؟

دیکھو یہ چھیڑ، ہم سے وہ غیروں کے سامنے ۔۔۔ انجان بن کے پوچھتے ہیں ماجرائے داغ

کہ

درماں کرے گا، دیکھ تو، کس کس کا، چارہ گر ۔۔۔ ہیں زخم آبلے بھی تو دل پر سوائے داغ

ہے زخم اور آبلہ

وہ بھی تو بھاگ نکلے، یقیں ہے مجھے، اگر ۔۔۔ دوڑے مرا گلا تری شمشیر کی طرف

آئی وہ

اب پوچھتے ہیں آپ کہ ہے تجھ کو کیا قلق؟ ۔۔۔ جب قابلِ بیان نہ اپنا رہا قلق

تجھ کو

اتنا کسی نے وصل میں ہوگا نہ عیش بھی ۔۔۔ جتنا کہ تیرے ہجر میں ہم نے سہا قلق

کو

دل کو، جگر کو پھنکری دیتا ہی ہائے عشق!	آگ آگ، کاش سینے میں جلتی بجائے عشق ہوتی
~~کیا سختیوں سے جان وہی بیتاب نے مگر~~ وہ جان کس عذاب سے بیتاب نے، مگر	نکلا نہ شکوہ منہ سے کبھی خرشناسِ عشق
تا چیز اُس کو جان کے یہ نالۂ سحر	اُٹھا پھرا کہ جا کے لگا آسمان تلک ادھر، نہ گیا
پھوڑا ہوا جو پکنے، تو وہ ہنس کے کہتے ہیں پک کے	ہاں، اب ذرا ستانے کے قابل ہوا ہے دل
کیا بہہ گئی تو ہی بتا دے، محتسب ہے کدھر	ڈھونڈتے پھرتے ہیں میخانے کو ہم
قیس و فرہاد کا گو عشق میں کچھ نام ہوا	لیک بیتاب کی مانند تو مشہور نہیں وہ
جھنجلا کے بولے جان بھی تیری اب نہیں عزیز جان نہیں کیا	کہ بیٹھے اُن کو جان جو ایک روز پیار میں
بیتاب کا بھی رند و، معلوم ہے پتا کچھ؟	اُس کو بھی دیکھتے تھے اکثر اس انجمن میں ہم اُس کو
شکوہ ہے کیا، قبول گر اپنی دعا نہیں!	اس درد کی خدا کے یہاں بھی دوا نہیں بھی مگر ہیں
کیا بزمِ رفتگاں میں خموشی کا رسم ہوا کی	ہیں جمع کس قدر، پہ کسی کی صدا نہیں
پھر بیٹھے بیٹھے چھیڑ لگائی؟ خدا سے ڈر نکالی	ظالم، ابھی تو آنکھ کا آنسو تھما نہیں
لکھنے نہ نامے میں اسے کیونکر شوقِ حسرت وصل کیوں شوقِ سجدۂ درِ دوست	ہم اپنے سر کو تو ہر دم قلم سمجھتے ہیں

انھیں تو وصل کا اک دم بھی ہزار برس — ہزار سال کو ہم ایک دم سمجھتے ہیں
ہے ایک دم ہزار برس

الماس تک نہیں تیرے مرہم میں چارہ گر — پھر کیوں میں زخم دل کو عبث مزا کروں
ہر گز نمک

ہوا شق حب لاشہ جاناں سے وہ بھی — کیا گر ماہ نے ٹکڑے کتاں کو
وہ بھی انگشت نبی سے

مسیحائی نہ دیکھی ہو تو میرے — جنازے پہ لے آؤ دل ربا کو
گر اس کی — مری تربت پہ لاؤ

بھا گیا اپنے زلیس قتل کا ایسا ہم کو — بعد مردن بھی تھی مرنے کی تمنا ہم کو
ہے

عشق سے دم ہی پہ بیتاب بنا دی آخر — کسی صورت سے بھی کافر نے نہ چھوڑا ہم کو
ستمگر

ننگ عریانی ہو کیوں قطع نظر سوئے سے — جبکہ اللہ نے پیدا کیا عریاں مجھ کو
وحشت

مقتضائے بشری صبر بھی تھا اے اللہ — یہ بھی دینا تھا، بنایا تھا جو انساں مجھ کو
مقتضیات بشر میں سے نہ تھا صبر، مگر؟

جو دیکھا جس بت کو لگے پڑھنے اسی کا کلمہ — ملا بلاشبہ لقب یہی ایماں مجھ کو
میرے خالق نے دیا ہے عجیب

ہزار صبر کرو، لاکھ بے قرار رہو — مگر وہ چیز ہے الفت کہ آشکار نہ ہو
نہیں — محبت

بڑے ادب سے جیسے قیس نے کیا سجدہ — کسی سے پوچھو تو کہا یہی وہ مزار نہ ہو
کہیں یہ حضرت بیتاب کا

بہاتے ہیں تو دو دریا بہائیں چشم تر دونوں — فغان و نالہ میں تو ہو اگر ہیں اثر دو نوں
"دونوں" میں نون ضرور ہونا چاہئے - اس غزل کو نون کی ردیف میں لکھئے

کیونکر مُنہ رکھے وہ میرے سینۂ پُر داغ پر — بوسے گل سے ہے خاطرِ نازک پہ جس کی بار ہو
بھی

حق تو یہ ہے خوب ہی دی غیر کو تو نے مگر — یا وفا کیونکر بناتے اُس کو تم لاچار ہو
لاچار غلطِ محض ہے۔ ناچار بہ نون جیم ہے۔

نکلی دل و جگر کو مگر آہ توڑ کے — سینہ سے شب جُدا جو ہوا خوں میں بھر رہا تو
بیٹھے

آواز اُس نگارِ حسن کے شبِ وصل مر گئے — گویا ہماری موت تھی مرغِ سحر کے ساتھ
کی

خانۂ آئینہ میں ہوتی ہے کیسی چاندنی — دیکھ رکھ دیتا ہے جب وہ مہ شمائل آئینہ
کر رکھتا

بوسہ ملا، تو اب یہ ہوس ہے کہ عمر بھر — یوں ہی ملا رکھے دہن کو دہن کے ساتھ
یونہی

مجموعے کا سا عطر ہے اُس کا شیشۂ یار — بو ہی بدن ملی ہے جو بو ہی بدن کے ساتھ
سے گلے کا

جاں کنی ہی ہو سے، اب تک اس تو کوئی نہیں — حشر ہیں ہو دے گی اُس سے ایک صحبت اور بھی
بڑا

گریہ و زاری کو جو روکا، تو سودا ہو گیا — ہو گئے ہم ضبط کرنے سے فضیحت اور بھی

میں نے اس شعر کو نامش کا "نا" "جو روکا" یہ لفظ مکروہ تھا۔ جو کی جگہ جب
لکھ دیجے۔ شعر صاف اور بے عیب ہو جائے گا۔ غالب

گریہ و زاری کو جب روکا، تو سودا ہو گیا — ہو گئے ہم ضبط کرنے سے فضیحت اور بھی

قتل میں اپنے خدا، اب کونسی تاخیر ہے؟ — خم یہاں گردن، علم واں ہاتھ میں شمشیر ہے
کس لیے

ہے غزل خواں مثلِ بلبل کہتے ہیں وہ برگِ گل — پڑھ جائے سامنے تو غنچۂ تصویر ہے نقش

باغ میں ہو فصلِ گل، زنداں میں ہے یہ گل کھلا
ہے گریباں ہاتھ میں اور پانو بھی زنجیر ہیں
میں

اک ذرا سی اور بھی تاخیر کرنا، اے اجل
سنتے ہیں کچھ وہاں اپنے قتل کی تدبیر ہے
ہمارے

م قتل کرتے ہیں گمانِ داد خواہی پر ہمیں
دیکھ تو تقصیر سے پہلے یہاں تعذیر ہے
ہمنشیں

گزری اپنی عمر تو کس چین سے، شکرِ خدا
دیکھیے بیتاب، اب کیا خواہشِ تقدیر ہے
گزری ابتک عمر اپنی

(۱۲۱ / ۲)

قبلہ، قصائد و غزلیات و رباعیات کو بقدر اپنی فہم و فراست کے درست کر کے خدمت میں گزرانتا ہوں۔ چونکہ جانتا ہوں کہ آپ اکبرآباد نہیں گئے، اس لفافے کو آپ کے پاس رامپور کے پتے سے بھیجتا ہوں۔ توقع یہ کہ مجھ کو اپنا خادم سمجھیے اور جو خدمت میرے لائق ہو، بے تکلف ارشاد کیجیے۔ راقم اسداللہ خاں۔ مرقومہ ۱۵ نومبر سنہ ۱۸۶۶ء

فرماتے ہیں بالیں پہ وہ بیمار کی اپنے
"کیا درد ہے؟ کیوں اس کا مداوا نہیں کرتے"
آکر

ہمیں کرنا تھا جو وہ کر بیٹھے
~~اے ستم گر اٹھاؤ~~ گھر بیٹھے
آپ باتیں بنائیں

اپنے ہاتھوں سے کر کے کام تمام
نوحے کرنے کو چارہ گر بیٹھے
نوحہ

حال بیتاب کا نہ پوچھو کچھ،
ہم تو اب آتے صبر کر بیٹھے
چھو
اُس سے

وفادار ناصح، مبارک ہوں تم کو
ہمیں تو وہی بے وفا چاہیے
تمھیں

مقابل میں تیرے تو لے چند غلط — تجھی سا کوئی بے وفا چاہیے
تجھ

خدا نے دیا ہے عجب دل ہم کو — اب ایسا ہی اِک دلربا چاہیے
ہمیں

تصور تری زلف کا کیوں نہ ہو — شبِ غم نزدلِ بلا چاہیے
بجا ہیں تمہارے سب ارشاد لیکن — ذرا اور کی بھی سُنا چاہیے

پر
دیاں پر نام اُس کا دمیدم ناصح لو آتا ہے — خدا کے واسطے چپ رہ کلیجا منہ کو آتا ہے

سے
نیاز و ناز میں ہو ربط گر منظر ہی تو ظاہر میں — میں پڑھتا ہوں درود اور وہ صلواتیں سناتا ہے
درود اُس پر پڑھوں میں، اور

خوشی سے مری اللہ کیا اور ہو دل میں — کہ جب نامِ ناصح نادان، مجھے یہ ذکر بھاتا ہے
مشفق

مطلع غنیمت ہے کہ نام اُس کا زباں پر تیری آتا ہے
کہے جا، ناصحِ مشفق! مجھے یہ ذکر بھاتا ہے

کشادہ زلف کا دستِ عدو سے وہم آفت ہے — عرق آیا جب ہوئے نکہتِ گلِ شکِ تتار آئی
بکھرنا

تسلی بخش ہوگی سادگی حوروں کی اے واعظ — ہمیں جب یاد یہ آرائشِ روی نگار آئی
کیا ہو

مل گئے خاک میں، لڑتے ہی ترے — بن گئی جی پہ، بگڑتے ہی ترے
ہم سے

خدا کو تو پاتے ہیں عشقِ بتاں سے — میں وصلِ صنم مانگتا ہوں خدا سے
یہ میں ہوں کہ محبت

اگر چشم بد ہے، تو کچھ زلف کم ہے؟ یہ پیچ ہے بچائے خدا ہر بلا سے

کیا

پاس رکھنے کا جو بیتاب وہ وعدہ کرلے صحبتِ غیر بھی واللہ گوارا ہو جائے

کریں وہ وعدہ ناچار

کیا کہے جاتے ہو، کچھ وصل کی تدبیر بتاد کچھ تم عقبیٰ ہیں تو، ناصح ہے کام آتے نے

آپ

کرتیں کیا جان سے تنگ آکر دعا کی بتو، منت ہی کروائی خدا کی

کریں مرگ کی آخر

ڈرا نا تھا کہ اُس کا دل دکھانا! خدنگِ آہ نے بہ ہے ہے اِخطا کی

نہ

گئے وہ تو ہوا ہم کو بتا سکے خوشامد ہے یہاں کیا کیا صبا کی

کر

۲ عیادت سے بڑھی خواہش مرض کی ہمارے درد کی اچھی دوا کی

مرض کا ہو گیا شوق

~~نہ ہنسیے قیس کی دیوانگی پر~~ ~~خبر تو لیجیے اپنے مبتلا کی~~

نہ دو لیلیٰ کو تم مجنوں کا طعنہ ج دیکھو صورت اپنے مبتلا کی

~~زلف بکھری جو رُخِ یار پہ یہاں دل بکھرا~~ ~~خود پریشان ہوئے ہم اُس کو پریشاں کرکے~~

زلف خود بخود بکھرتی ہے۔ ہم نے کب پریشان کیا، جواب کہیں

اضطرابِ دلِ بیتاب، بُرا ہو تیرا بد دماغ اُس کو کیا نالہ و افغاں کرکے

ب

آہ، جِس طرح موے سب عاشق[۳] وہی اپنی بھی حقیقت ہو گی

جس طرح آہ۔ طَرَح اور ہے اور طرح اور ہے۔ فقیر "طَرَح" بہ حرکت کے معنے میں طرح بسکون نہیں لکھنا۔

دیکھ ایمان سے کہدے واعظ   ایسی ہی حوروں کی صورت ہوگی

(اس غزل میں مقطع سے پہلے یہ شعر اضافہ کیا ہے)

بوسہ لیتے ہی پھر آجائے گی   جان، کیا بوسے کی قیمت ہوگی!

بیقراری سے موا، ہے ہے، کوئی اللہ کے   مانگ لائے ایک ذرا سا صبر اپنے نام سے[2]

حضرتِ ایوب گر جیتے ہوں، تو اے ہمدمو   تُو   میرے

حشر میں اللہ کے آگے یونہی لے جاؤں گا   کام لینا ہے مجھے اپنے دلِ ناکام سے

مجھ سے یہ مصرع پڑھا نہیں گیا؟

تو دیے جا گالیاں، دے لیں گے ہم بھی کچھ جواب

ہوش میں آئے کبھی گر لذتِ دشنام سے

آجائیں گے جب

تھا نہ بس شوقِ طپیدن، پر ادب مانع ہوا[4]

بہت

بچ گئے ہم ذبح کے بھی وقت اس الزام سے

دیر دیکھا، میکدہ دیکھا، حرم بھی دیکھ لیں

آج آنکلے ہیں یہاں بھی گردشِ ایام سے

ہم

ذکر اُسی کا ہے کچھ بھی نہ ماتے   کاش، ناصح ہی دل کو بہلائے

ہو

پھر بلا میں پھنسلو یا کس نے؟   دی صدا نعش پر کہ وہ آئے

خوابِ خوش سے جگا دیا

جاب اُن کا ہوا گلہ اُلٹا   کر کے شکوہ بھی اُن سے پچھتائے

اور   پچھتا

مارے خدا کہ چھوڑے، یہ ایمان کی تو یہ ہے

~~الفت بتوں سے اپنے تئیں~~ لا کلام ہے

"کو" کی جگہ "تئیں" نہ لکھا کرو

~~جبروت یہ نہیں ہے، نہ لاہوت~~ ز ابہا

یہ عشق ہے، کچھ اور ہی اس کا مقام ہے

لاہوت ہے نہ یہ جبروت ۱۲ اے خدا پرست = جبروت بحرکتِ موحدہ اور ملکوت

بحرکتِ لام صحیح ہے

پاکر نجات نزع سے ~~آرام کرتے ہیں~~

سوتے ہیں بے خبر

ہم رہروِ فنا ہیں، یہ غربت کی شام ہے

م معمور ہے خدا کی عنایت سے میکدہ ص

م ساقی اگر نہیں تو نہو، مے سے کام ہے

م بیتاب پی، خدا نے دیے ہیں تجھے بھی ہاتھ م

م یہ خم ہے، یہ سبو ہے، یہ شیشہ، یہ جام ہے

(ان دونوں شعروں کے ہر مصرع پر صاد بنا کے دائیں گوشے میں لکھا ہے) واللہ! کیا ذوق انگیز قطعہ ہے۔ غالب (پھر بائیں گوشے میں لکھتے ہیں) خم سے بھر سبو میں، سبو سے شیشے میں، شیشے سے جام میں، اس تقدیم و تاخیر کا مزا میں ہی جانتا ہوں۔ غالب۔

ہر روز اگر وہ ستم ایجاد کریں گے ~~آزار تو میں~~ کو کبھی یاد کریں گے

ہر روز کئی بار مجھے

پرواز کی ہے ~~گر یہ ہوس دل میں~~ تو ہم آزردہ نہ ~~خاطر~~ تیری صیاد کریں گے

طاقت ابھی موجود ہے لیکن ہم خاطر

آسانی سے کیوں قتل کیا؟ حشر کو یہ تو اللہ رے ہاں، شکوۂ جلاد کریں گے

ہم

اس طرح مرینگے کہ ہو ہر ایک کو عبرت معدوم ہم الفت ہی کی بنیاد کریں گے

دکھ سے

ستم کی حشر میں بھی باز پُرس کیا ہو گی؟ کسے مجالِ سخن ہم سے، ایجدا، ہو گی؟

اُس سے

~~خدا کے آگے ہیں پوچھے جائیں گے پہلے میری و نورِ ضلالت ہی رہنما ہو گی~~

"پوچھنا" اور ہے۔ پُرسیدن کا ترجمہ پوچھنا بے نون ہے۔ یہ آگہی کے

واسطے لکھا ہے۔ شعر غلطیٔ املا کے واسطے نہیں کٹا، بلکہ ناقص تھا۔

~~فلک بہائیگا آنکھوں کی راہ اُس کو بھی جو خونِ دل ترے غم میں میری غذا ہوگی~~

خون مذکر۔ غذا البتہ مونث ہے۔ مگر زرا غور کیجیے، خون غذا ہوگا

یا خون غذا ہو گی!

نہیں ٹھہرا ہے اینک عرشِ اعظم دعا کی ہتی یہ کس نے بلبلا کے

ہے

مِیں اُس کے خونِ جگر ہم پئیں، یہ مے، ساقی!

خدا کرے، تیرے ساغر میں بھلا لہو ہو جائے!

کہ جام

(اس شعر پر صاد بنا کے حاشیے پر لکھا ہے) شعر اچھا، مگر بھی کا لفظ بے موقع

اور بے محل ہے۔

ہوئے ہیں گرچہ تائب، پر ہواۓ ابر و باراں میں

ی

رہے ہے، ساقیا، میخانے میں تیار تھوڑی سی

میں سب سمجھے ہوئے ہوں، بات کا جو ڈھب تمھارا ہے

نہ چاہوں، ناصحا، میں اُس کو، یہ مطلب تمھارا ہے

ناصحو

کہاں ہیں قیس اور فرہاد اب یہ عہد ہے اپنا

دور

کہاں ہیں لیلیٰ و شیریں، زمانہ اب تمہارا ہے

مژگاں کا تیری صید نہ کس طرح سے ہو دل

ہو کس طرح سے

اس تیر کے لیے یہی نخچیر چاہیے

نیکوں کے بھی جھکے رہیں سر کچھ تو، دیر کی

یہ مصرع مجھ سے پڑھا نہیں گیا!

مسجد کی چوب و خشت سے تعمیر چاہیے

بلا میں آپ پڑتا ہے تو ناصح ترے اوپر تو کچھ آفت نہیں ہے

تو

خدا کیونکر ملائے دل رہا ہے: نہ کھندو کہ یہ قدرت نہیں ہے

معاذ اللہ، مگر

یہی کہہ کہکے ملک حق شناسو! کرے جو چاہے، پر عادت نہیں ہے

بہلاتا ہوں دل کو

ذرا بیتاب کو باہر تو دیکھو تمہارے آگے گو غیرت نہیں ہے

عزت

آج پیغامبر نہ کچھ کہتا ہیں بہت ہم پہ وہ خفا بیٹھے

"وہ ہم پر بہت" جہاں پورا لفظ آسکے، یعنی پر، وہاں ادھورا لفظ کیوں لکھیے۔ البتہ جہاں گنجایش نہ ہو، وہاں قاعدے کے موافق جائز ہے۔ اور اس قاعدے کا نام تخفیف ہے۔

یہ بھی قدرت خدا کی اے جینا تم بھی اب بن کے پارسا بیٹھے

آپ

تیغ کھینچے ہوئے جس وقت وہ قاتل آئے — کوئی ہے میرے سوا، جو کہ مقابل آئے

کون

کیوں یک بیک زمانے کا نقشہ بدل گیا — یہ رنگ تو ہوا تھا نہ دنیا میں آشکار

ناگاہ کیوں

تزئین کچھ آج کل ہے وہ اس خاکدان کی — خلدِ بریں بھی رو برو ہے جس کے شرمسار

یہ مصرع مجھ سے پڑھا نہیں گیا! — ہو

گل نے کیا ہے شاخ کے ہر جز سے سر پرے — اب کونسی جگہ ہے کہ نکلے جہاں سے خار!

جزو ظہور

بیٹھے ہیں مطمئن سبھی بزمِ نشاط میں ، — ہاں اک صبا تو پھرتی ہے گلشن میں بیقرار

نسیم

کثرت سے بسکہ جمع ہوئے شاہدانِ گل — کس کس مزے سے ہوتے ہیں آپس میں ہمکنار!

ہوتے ہیں

دن عید ہے زمانے میں اور رات شبِ برات — ہر سمت راگ و رنگ ہے قانون اور ستار

شب

وہ دن ہی آج، جس پہ کروں جان تک نثار — ہے جشنِ غسلِ صحتِ نوابِ نامدار

فقد- اگر یہ مطلع ہے تو چاہیے اس سے پہلے ایک شعر میں اطلاع دیجائے

بیشک طمانچہ ملک الموت گرز ہے — ہے تیغ اس کی قہرِ خدا وقتِ کارزار

تپانچہ

ممکن نہیں جو کر سکے ممدوح کی صفت — بیتاب، اب دعا ہی پہ بہتر ہے اختصار

ثنا

عالم کے حق میں آیتِ رحمت بنا دیا — رکھے سلامت اس کو زمانے میں کردگار

آیہ

بات یہ ہے وقت پر خوب سجھائی مجھے — فکرِ رسا کا بڑا مجھ پہ یہ احسان ہوا

[illegible] — [illegible]

دھوم ہے سرکار میں جشن کا ساماں ہوا — عرش سے تے فرش تک عیش کا طغیاں ہوا

ہے — ہے آج

رنگ محل کا سماں ہو نہیں سکتا بیاں — جس کی نظر پڑ گئی ششدر و حیراں ہوا

دالہ

کثرتِ نقش سے مثلِ جبینِ عروس — روی زمیں پر عجب طرح کا افشاں ہوا

طرز

بزم منور ہوئی مقدمِ نوّاب سے — جیب کو وہ رونق فزا جیب مہِ کنعاں ہوا

جب سے کہ — وہ

جوں معنی مثل و مانند اب متروک ہے، اور جوں لفظِ فارسی الاصل تو آگے بھی متروک رہا ہے۔

دور میں اس کے بجز ابر نہ رویا کوئی — اور جز اس کے سوا کوئی نہ نالاں ہوا

بجز رعد کے

مسندِ اقبال پر یوں وہ نمایاں ہوا — صفحۂ گردوں پہ جوں مہر درخشاں ہوا

(میرزا صاحب نے اسے قلم زد کر کے یہ مطلع لکھا تھا)

دودۂ چنگیز میں جیسا کہ قاآں ہوا — ویسا ہی اس قوم میں کلبِ علیخاں ہوا

(اس پر بیتاب نے لکھ دیا ہے" قصیدۂ ہذا در شانِ یوسف علی خان بہادر مرحوم بود، ازیں سبب شعر ہذا نوشتنی نیست)

ہو رہی ہے عجب آراستگی کہنہ سرا — سب فرشتے اسی خدمت پہ ہوئے ہیں مامور

دنیا کی

تہ کھڑے کرتے ہیں سجادۂ طاعت جبرئیل — ایک طرف ہاتھ میں رکھتے ہیں سرافیل بھی صور

سے

قبضِ ارواح سے معذور ہوے عزرائیل — موت کا غم ہی کسی کو نہیں، سب ہیں مسرور

کی فکر

زیبِ زینت کا اب اس دہر میں کیا کہنا ہے — صانعِ گل کی بجو تعلیم، ملائک کا شعور
کی — تو

چاندنی رات کا تو ذکر ہی کیا صلِّ علیٰ — لیلۃ القدر پہ فائق ہے شبِ تار کا نور
کیا ذکر ہے! اللہ اللہ

کو بکو ڈھونڈتے پھرتے ہیں کہ دیں کس کو زکات — تھے جو محتاج جہاں میں وہی ہیں فی مقدور
وہ ایسے ہوئے

کوئی دعوت سے مسافر بھی نہ محروم رہا — بادشاہوں کے یہاں بھی تو نہ تھا یہ دستور
ہاں جہاں کا بھی

اِس قدر کھانے کی افراط ہے اور پانی کا قحط — دیکھو جس جاہ کو، شربت سے ہے منہ تک معمور
ہے قند سے

کس سلیقے سے ہے آراستگی ہر کشتی کی — مہتمم بزم کے آج اپنا دکھاتے ہیں شعور
تھاپ طبلوں کی بجتی ہے فلک پر پیہم — پھر سارنگیوں کے سُن کے ملک ہیں مسرور
ہے

حشر تک کان سے نکلے گی نہ نغمے کی صدا — یہ خیال آئے گا اک تان ہے شور نشور
ئے — بس[3]

تھاپ طبلوں پہ پڑی، آئے پریوں کے جھگٹ — شادیانے کی صدا پہنچی فلک سے بھی دور
پریوں کے آئے جھگٹ

گھونگرو کے وہ جھماکے، وہ صدا نغمے کی — اہلِ محفل کو کیا عشوہ گر دوں نے مسحور
گھونگروں[4]

چل اس طرح سواری کہ نہ دیکھی نہ سنی — مشک کھانے لگے مقدر میں اسیر طیور

یہ لفظ "طوی" سے نہیں، "ت" سے ہے۔ اور پھر تیور بوزنِ طنبور نہیں، در اصل، تمرُ بوزنِ سہ دُر ہے۔ لکھتے ہیں تیمور اور پڑھتے ہیں تمرُ اور تمر ترکی میں فولاد کو کہتے ہیں۔

شتری و فیلی دمامے ہیں، نفیر و نوبت — دف، دنے، تاشہ، دہل، جھانجھ، نرم ہے طنبور
لنگیں تاش تمامی کی ہیں باندھے سقے — ہیں ہزارے چڑھے اور عطر سے مشکیں معمور
لنگیاں

کرد ایں فخر قصائد چو رقم خامۂ من
وجد کردند چہ خاقانی و عرفی در گور

حاشا قصیدۂ ہندی بشعر فارسی، خصوصاً "وقتے" کہ لفظ کور رقافیہ باشد
مناسب نیست

للہ الحمد کہ اب چرخ ہو اینک خصال — نزرک بس سنے گئے وصلپنے ذکی افعال
ایسے وہ
راہ میں ٹھوکریں کھاتے ہیں پڑے لعل و گہر — خذف و سنگ سے بے قدر ہیں دینار و ریال
خزف بمعنی ٹھیکری کے لغت فارسی اور املا اسکی ز سے ہے۔
ناچ گانے ہی کی ہر سمت سے آتی ہے صدا — منعطفی یادِ نبی اب پرچ ہے اگر کیجے خیال
بھی
ہے کسی جا پہ جگت، رس کہیں سانگ کہیں — کہیں ایمن کہیں کھنک ہیں کہیں ہیں تو لا
رس
کوئی باعث بھی تو ایسا ہی قوی ہے ورنہ — اس کی عادت سے تو یہ بات تھی بس کی محال
البتہ
اپنے اسرار سے واقف ہے تو ہی اے پرفن — بھید تیرے کوئی پہچانے یہ ہے کس کی مجال؟
یہ کس کی
آگاہ
من پڑے صانع قدرت سے کچھ کو وایک نقشہ — کھینچتا اور بھی ایک سکیں گر ایسی اشکال
کچھ
یہی نقشے
دیکھ کر اس کی عبارت کو ظہوری کا ہے ڈھنگ — لکھے ایسا، نہیں یا قوت رقم حاں کی مجال
بھی

ادر شجاعت کا یہ عالم ہے کہ زہرہ ہو آب — دیکھ لیں حضرت رستم اگر اس کی تمثال

اے رستم دستاں

ہو بہ حیرت میں ابھی تھا کہ زمیں پر ملتٔ — عرش کی سیر کا راکب کو گر آجائے خیال

کہ میں یہاں — یارب

~~وہ ہمکیں نحوہ وقا ایک جو لا ینفک ہے — عہد کا نقض ہو عہد میں اس کے محال~~

جو لا ینفک غلط۔ جزو لاینفک صحیح۔

بھوکے پیاسوں کے خورد و نوش کے کیوں تنے نہ دن
یہ مسلم ہے کہ بعد رمضاں ہے شوال

از

فلک پر کوئی اڑ جائے، پہ یہ رہی — نصیبوں میں سواد دگر زمیں ہے

پر آخر

یہ سچ تحسین کے قابل ہیں معشوق — مگر عشاق بھی آفریں ہے

کر

جناب غالب دہ ولی کا بیتاب — خلوص طبع سے اب خوشہ چیں ہے

کلام حضرت غالب دوراں فقط نامانوس ہے

اے دل تو اس کو دیکھ کے ایسا پھسل گیا — حیراں ہوں میں کہ پہلو سے کیونکر نکل گیا

سینے

دل پر بنی جو تھی اجل کے نہ آنے سے — اب جاں پہ آبنی تو ذرا دل سنبھل گیا

جو

کیسا مزا دکھاتے ہیں ہم بھی، تو ٹھہر جا — تقریریں کر کے روز یہ ناصح، تو ہل گیا

ٹھہر تو

بھالے ہے وہ تیزاب کا، کیوں ہوتے ہو برہم؟ — ہم نے دل پر داغ پہ رکھا ہے جو مرہم

نہیں

وہ بات کر دیجئے نہوں نالۂ وافغاں   بیچین ادھر رہتے ہو تم اور ادھر ہم

جس سے

کہوں کیا؟ یوں بتانے کی نہیں ہے   رقیبوں کے سنانے کی نہیں ہے

وہ بات ایسی چھپانے   یہ غیروں!

تمہیں سچ یاد آنے کی نہیں ہے   یہ الفت بھی دکھانے کی نہیں ہے

نہ کر مجھ سے کرے میری بلائیں   مری

وہاں رقیبوں سے گرم صحبت، یہاں امید وفای وعدہ

ہے ایک طرفہ ہی یہ تماشا، تم اپنے گھر خوش ہم اپنے گھر خوش

یہ طرفہ تر

محبت تری، اسکی نفرت بڑھی   یہ کیسا پڑا اب دل زار پیچ

ملے

مسرور ہوں اغیار، خدا کی قدرت!   آن سے ہو ترا پیار، خدا کی قدرت

اور بیٹھے رہیں بزم میں تیری ظالم   ہم نکلیں گنہ گار، خدا کی قدرت

چکے   مثل

غافل نہ کر اپنی زندگی کو تو خراب   دنیا کا یہ کارخانہ ہے مثل سراب

زندگانی

یا الٰہی! یونہی وہ بر سر بیداد رہے   مر چکے ہم تو، نہ غیروں کی بھی بنیاد رہے

مٹ گئے

گو یونہی ٹھہری کہ گلزار نہ آباد رہے   بلبلو، کوچ کریں، باغ میں صیاد رہے

بلبلیں

ضعف میں رگ تو کہاں، ہاتھ نہیں ہاتھ آیا   کیوں تری فصد سے حیرت میں یہ فصاد رہے

فصد   فصاد

اسکی مظلومیں پہ رحم آئے نہ کیونکر بیتاب — قتل کے بعد بھی خوش جسے جلاد رہے

کے مقتولوں — جس سے

نہیں تلوار کے تنے کی بھی اب کچھ حاجت — تیرے ابرو کے اشارے نے مارا قاتل

سے ہی

دیکھنے کو جو ہم عشاق کی محفل آئے — سب پکار اٹھے کہ لو مرشد کامل آئے

ہم جو کل دیکھنے "جو ہم عشاق" میں عین تقطیع سے گر جاتا ہے۔

ہوں وہ میکش جو کہیں ہوش ہلا دو عزم کروں — میکدہ لینے کو میرے کئی منزل آئے

کبھی

بدنصیبوں کی نصیب وصل کی خوبی دیکھو — کہ وہ آئے بھی تو اغیار کے شامل آئے

شب

یہ ملی تیرے سوا ~~کہتے~~ وہ فریاد کرے — جب کہ بیتاب پہ مولا کوئی مشکل آئے

کس سے

"بمطالعۂ منشی صاحب سعادت و اقبال نشان منشی سیلچند صاحب میر منشی سلمہٗ اللہ تعالےٰ مفتوح باد"

[منشی سیلچند راجہ کنورسین کی اولاد ہیں۔ کنورسین قوم کے کایستھ اور نواب سید علی محمد خاں بہادر فاتح روہیلکھنڈ کے معتمد سردار تھے۔ قلعہ سرہند کی فتح میں اپنے ولی نعمت کے ہمرکاب خدمات شائستہ انجام دے کر بادشاہ دہلی کے دربار سے راجہ کا خطاب حاصل کیا۔ روہیلہ سلطنت کے ٹکڑے ہوئے، اور نواب سید فیض اللہ خاں بہادر ریاست رامپور کے والی بنکر اس خطے میں تشریف لائے تو ان کے ہمرکاب تمام وفادار سرداران روہیلہ کے ساتھ منشی صاحب کا خاندان بھی تھا۔ منشی سیلچند کی تاریخ ولادت اور جائے پیدائش کا صحیح حال معلوم نہ ہو سکا۔ البتہ ۲۹ر دسمبر سنہ ۱۸۹۰ء کو ان کی عمر اکیاسی سال کی تھی۔ اس حساب سے سال ولادت ۱۸۱۰ء قرار پاتا ہے۔ ان کا ابتدائی تقرر نواب سید احمد علی خاں بہادر کے عہد حکومت میں بعہدہ ناظر نظامت ہوا، بعد ازاں عامل (تحصیلدار) مقرر ہوئے ۱۸۴۴ء میں ان کے والد نے وفات پائی، تو ان کی اسامی پر محکمہ دار الانشاء میں بدل دیئے گئے۔ غدر سنہ ۱۸۵۷ء میں ریاست کی طرف سے خبر رسانی و فراہمی رسد وغیرہ کا کام انجام دیا، اور نواب گورنر جنرل بہادر سے بصلۂ خدمات دربار فتح گڑھ میں دوشالہ انعام میں پایا۔ نواب فردوس مکان نے بھی ان کی خدمات کی تعریف میں روبکار جاری فرمایا اور تلوار عطا کی نواب صاحب کی وفات کے بعد خلد آشیاں اور نواب عرش آشیاں نے بھی ان کی بہت قدر و منزلت فرمائی۔ بالآخر پانچ والیان ریاست کی خدمت کرکے ۲۹ر دسمبر سنہ ۱۸۹۰ء کو ۸۱ سال کی عمر میں رامپور میں انتقال کیا۔

منشی سیلچند کو فارسی میں دستگاہ کامل حاصل تھی اور ملا غیاث الدین رامپوری مولف غیاث اللغات سے شرف تلمذ تھا۔ شعر بھی کہتے اور منشی تخلص کرتے تھے]

١٢٢

منشی صاحب سعادت و اقبال نشاں منشی سیلچند صاحب میر منشی سلمہ اللہ تعالیٰ

بعد دعای دوام حیات و ترقی درجات معلوم فرمائیں۔ اگرچہ از روی خط بہ حضور صحت و عافیت حضور معلوم ہوئی ہے، لیکن یہ کہیں سے نہیں سنا کہ غسل صحت کیا، یا کس دن کریں گے؟ آپ سے یہ فقیر کا سوال ہے کہ مجھ کو لکھیے کہ حضرت غسل کس دن فرمائیں گے۔ اور اگر موافق میری آرزو کے نہا چکے ہوں، تو غسل کی تاریخ سے اطلاع دیجیے۔

خیر و عافیت کا طالب، غالب ٢٥ دسمبر ٦٤ ١٨ء

١٢٣

منشی صاحب سعادت و اقبال نشاں[1]، منشی سیلچند صاحب میر منشی کو خدا سلامت رکھے۔!

مادۂ تاریخ غسل صحت کو تم نے غور نہیں کیا ١٨٦٦ عدد ہوتے ہیں پھر کیا حضور سال آئندہ غسل صحت فرمائیں گے؟ یہ تو جنوری سال ١٨٦٥ ہیں۔ اس تاریخ کا قطعہ کیونکر لکھوں؟

یہ جو میں نے قصیدۂ تہنیت[2] لکھ کر بھیجا ہے، منشا اس کا یہ ہے کہ شاہ کبیر الدین صاحب[3] رامپور سے گئے، اور انہوں نے کہا کہ نواب صاحب جمعے کے دن ساتویں تاریخ شعبان کو نہائیں گے۔ اب تمہاری تحریر سے معلوم ہوا کہ ماہِ آیندہ یعنی رجب، میں نہائیں گے۔ خیر وہ کاغذ تو حضور کی نظر سے گزرے گا۔ اگر موقع پاؤ، تو حضور میں یہ ماجرا عرض کر دینا کہ میں نے بموجب روایت شاہ کبیر الدین کے اس کے ارسال میں جلدی کی ہے۔ غالب

١٩ جنوری سنہ ١٠٦٥

١٢٤
٣

منشی صاحب، عجب اتفاق ہے کہ حضور اپنے خط میں اپنے مزاج مبارک کا

حال کچھ نہیں لکھتے، اور میرا دھیان لگا ہوا ہے۔ خدا کے واسطے تم مفصل حال لکھو کہ کیا عارضہ باقی ہے، اور صورت کیا ہے؛ در بار بدستور ہوتا ہے یا نہیں؟ سوار ہوتے ہیں یا نہیں؟

زین العابدین خاں نے جیپور سے اپنے اشعار اصلاح کے واسطے میرے پاس بھیجے۔ میں نے اصلاح دینے سے انکار کیا، اور اشعار مسترد کردیے۔ ان کا خط اور اس کی پشت پر اس کے جواب کا مسودہ اس خط میں لپیٹ کے تم کو بھیجتا ہوں۔ پڑھ لو، بلکہ اگر موقع اور محل پاؤ تو حضور کو بھی پڑھوا دو۔ والدعا

اسد اللہ خاں غالب ۱۴ مارچ سنہ ۱۸۶۵

۱۲۵

منشی صاحب سعادت و اقبال نشان، منشی سیلچند صاحب میر منشی کو فقیر غالب کی دعا پہنچے۔ یہ خط[۱] میں نے ایک سنار دوز کی فکر میں حضور کو لکھا ہے مگر مسودہ جو ہر بار کچھ کا کچھ ہوتا رہا، اس سبب سے میرے پاس نہیں رہا اور خدا کی قسم، کہ میں اب بہت ناتواں ہو گیا ہوں؛ یہ خط لیٹے لیٹے صاف کیا ہے اور اس تحریر کو مجموعۂ نثر میں رکھا چاہتا ہوں۔ آپ اس کی نقل کر کے مکرر[۲] مجھ کو بھیج دیجئے گا۔ بڑا احسان مجھ پر ہوگا۔ اسد اللہ۔ فقط

۱۲۶

منشی صاحب سعادت و اقبال نشان، منشی سیلچند صاحب، طال عمرہٗ!

تین صاحبوں نے اطراف و جوانب سے تین قصیدے میرے پاس بھیجے ہیں حیران ہوں کہ کیا کروں؛ اگر حضور میں نہ گزرانوں اور ان کو لکھوں کہ میں نے گزران دیے، تو جھوٹ بولنا ہوتا ہے اور میں جھوٹ سے بیزار ہوں۔ گزرانتے ہوئے مجھے شرم آتی ہے، ادب رخصت نہیں دیتا۔ ناچار وہ تینوں قصیدے تمہارے پاس بھیجتا ہوں۔ یہی ان صاحبوں کو لکھوں گا کہ میں نے میر منشی کو حوالے کر دیے۔ فقط

سید فرزند احمد بلگرامی صفیر تخلص۔ یہ سید نور الحسن خاں بلگرامی کا پوتا اور صاحب عالم، پیر زادۂ مارہرہ، کا نواسا ہے[۱]

حالی تخلص، مولوی الطاف حسین، پانی پت کے رئیس، عالم، شاعر نواب مصطفیٰ خاں کے رفیق۔ قصیدہ عربی[۲]

تیسرے قصیدے کے خاتمے پر شاعر کا نام و نشان مرقوم[۳]

۱۲۷

منشی صاحب سعادت و اقبال نشان، عزیز تر از جان، منشی سیلچند کو فقیر غالب کی دعا پہنچے![۴] کیوں صاحب، ہم تو تم کو اپنا فرزند سمجھیں، اور تمہارا یہ حال کہ مراسم فرزندی بجا نہیں لاتے؛ خط لکھنا تم نے یکم قلم موقوف کر دیا۔ اور بھائی بے تکلف لکھتا ہوں کہ مجھ میں اب دم نہیں ہے، نہ طاقت باقی ہے، نہ حواس درست ہیں آج کے نواب صاحب کے خط میں دو جگہ غلطیاں ہوئیں مجھ سے: لکھنا کچھ چاہتا ہوں لکھ کچھ جاتا ہوں۔ بس اب تو یہ نوبت پہنچی ہے کہ آج بچا کل مرا، کل بچا پرسوں مرا۔

اس خط کا جواب[۵]، مجھ کو جلد لکھو، اور اس میں یہ لکھو کہ احسان حسین خاں اور ان کے بھائی مظفر حسین خاں جو لکھنؤ گئے ہیں[۶] نواب صاحب کی سرکار سے ان کا کیا درماہہ مقرر ہوا ہے، اور تعظیم و توقیر کا کیا رنگ ہے، دربار میں جو آتے ہیں، تو بیٹھتے کہاں ہیں[۷]؟

اس خط کے جواب کا طالب' غالب۔ ۱۱ جون[۸]

۱۲۸

برخوردار، نور چشم، منشی سیلچند میر منشی کو بعد دعا کے یہ معلوم ہو کہ اگلے مہینے یعنی اگست سنہ ۱۸۶۸ء کی[۹]، تنخواہ کی ہنڈوی جو تم نے بھیجی تھی، اس کا روپیہ ابتک نہیں پایا ہے۔ جس دن ہنڈوی آتی ہے،

اُسی دن یا دوسرے دن اپنے مختارکار کے ہاتھ، کہ وہ بھی مہاجن ہے، بیچ ڈالتا ہوں۔ مگر اُس مختارکار کو، جس کے ہاں ہنڈوی آئی ہے، اُس نے روپیہ ابتک نہیں دیا۔ ۸ ستمبر کو وہ ہنڈوی بیچ کر روپیہ میں نے لے لیا تھا، اور آج ۱۸ ہے۔ مختارکار کو روپیہ اُس نے ابتک نہیں دیا۔ جس سے تم نے ہنڈوی لکھوائی ہے، اُس کو تم تاکید کرو کہ یہاں کے مہاجن کو روپیہ دینے کی تاکید لکھے، تاکہ مختارکار کا روپیہ پٹ جاوے۔

(مہر: غالب ۱۲۷۰)[۲]

بنام خلیفہ احمد علی صاحب احمد رامپوری

[خلیفہ شیخ احمد علی صاحب احمد تخلص ولد شیخ نادر علی، تقریباً سنہ ۱۲۱۹ھ (۱۸۰۵ء) میں پیدا ہوے۔ فارسی کتابیں مولوی عنبر شاہ خاں عنبر اور کبیر خاں تسلیم سے پڑھیں اور عربی علوم و فنون دیگر علما سے شہر سے حاصل کیے۔ ادبیاتِ فارسی کے ذوق نے خلیفہ صاحب کو عربی علوم کے لطائف کی طرف متوجہ ہو نے دیا، اور ان کی ساری عمر شیراز و شروان ہی کے مرغزاروں کی سیر میں گزر گئی۔ رامپور کے اکثر فارسی ادب کے علما کا سلسلہ ان تک منتہی ہوتا ہے۔ نواب خلد آشیاں اور نواب عرش آشیاں طاب ثراہما کی اُستادی کا بھی شرف حاصل تھا۔ خلیفہ صاحب نے جمعرات کے دن ۲۹ رمضان ۱۳۰۹ ہجری (۲۰ اپریل سنہ ۱۸۹۲ء) کو ۹۰ سال کی عمر میں اپنے مکان واقع محلہ بنگلہ آزاد خاں (رامپور) میں انتقال کیا۔ ان کی فارسی نظم و نثر کا ایک چھوٹا سا مجموعہ کتاب خانۂ عالیہ رامپور میں محفوظ ہے۔

مرزا صاحب رامپور تشریف لاے، اور خلیفہ صاحب سے ملاقات ہوئی، تو مؤخر الذکر نے اثناے گفتگو میں عرفی کے کلام پر نکتہ چینی کی اور مثالاً یہ دو شعر پیش کیے:

ساکتم، این نغمہ تا در نیم شب   ہر دو مرغِ سحر خوان می زنم

شاہدی کو کہ یک نفس گوشی   بدلِ درد پرورد اندازد

میرزا صاحب نے عرفی کی حمایت کی۔ لیکن اُس وقت بحث ناتمام رہی اور یہ طے پایا کہ خلیفہ صاحب شب کو آ کر گفتگو کریں گے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ اُس رات کو تشریف نہ لیجا سکے، اِس لیے میرزا صاحب نے اپنے دلائل لکھ کر اُن کی خدمت میں بھیجے ہیے۔

تذکرۂ کاملانِ رامپور (ص ۲۴) میں اختلافی شعر یہ لکھاہے:

من کہ باشم عقلِ کل را نا وکِ ناز ادب　　مرغِ توصیفِ تو از اوجِ بیان انداختہ

گرمیرزا صاحب کی آیندہ تحریر کی روشنی میں اس کی صرف یہ تاویل کی جاسکتی ہے کہ مذکورۂ بالا دو شعروں کے ساتھ یہ بھی معرضِ بحث میں آیا ہوگا، ورنہ میرزا صاحب خط میں اسی کا ذکر کرتے]

(۱۲۹/۱)

جناب مولوی صاحب مخدوم احمد علی صاحب کی خدمت میں بعدِ سلام مسنون الاسلام عرض یہ ہے کہ فقیر شب کو آپ کا منتظر رہا، آپ تشریف نہ لائے، ناچار تقریر کو تحریر کا پیرایہ دے کر آپ کی جناب میں بھیجتا ہوں۔ بسنینِ فارسیہ کا حال بسبیلِ اجمال ایک دو ورقے پر مندرج ہے۔ بنظرِ اصلاح مشاہدہ ہو۔ بعد اُس کے میری یہ عرض ہے کہ ہرچند "سحر" اور "صبح" مرادف بلیغے ہیں، اور وہ انجامِ لیل اور آغازِ نہار ہے، مگر بخلافِ صبح، "سحر" بطریقِ مجاز بعدِ نصفِ شب سے صبح تک مستعمل ہے۔ طعامِ آخرِ شب کو "سحری" اور "سحرگہی" کہتے ہیں، اور مرغانِ خوش آواز، کہ بلبل بھی اُن میں ہے، اکثر پہر سوا پہر رات سے بولتے ہیں۔ نصفِ شب کو مرغِ سحر خواں کا ہم آواز ہونا محلِ اعتراض نہیں ہے "گوش" کا استعمال "انداختن" کے ساتھ، اگر شعرائے ہند کے کلام میں آیا ہوتا، تو ہم اُس کی سند اہلِ زبان کے کلام سے ڈھونڈتے۔ جب وہ خود عرفیؔ نے لکھا ہے، تو ہم سند اور کہاں سے لائیں؟ قواعدِ زبانِ فارسی کا ماخذ تو ان حضرات کا کلام ہے۔ جب ہم انھیں کے قول پر اعتراض کریں گے، تو اُس اعتراض کے واسطے قاعدہ کہاں سے لائیں گے؟ اِن سب باتوں کو جانے دیجیے اس کو ملاحظہ کیجیے کہ عرفیؔ اکبر شاہؔ کے عہد میں تھا اور اُس عہد میں قطعِ نظر اور اہلِ کمال سے ابوالفضلؔ اور فیضیؔ یہ دونوں شخص کیسے فاضل تھے۔ اور پھر عرفیؔ کا ممدوح حکیم ابوالفتحؔ اس کا وہ پایہ علم میں تھا کہ فیضی اور ابوالفضل کو بھی خیال میں نہ لاتا تھا۔ اگر یہ دونوں شعر عرفیؔ کے غلط ہوتے، تو

یہ تینوں آدمی اُس کی دھجیاں اُڑا ڈالتے، حال آنکہ فیضی و ابوالفضل اُس کے دشمن تھے۔ پس جب ان دونوں نے باوجودِ عداوت اعتراض نہ کیا، تو اب عرفیؔ پر کون اعتراض کر سکتا ہے؟ عرفیؔ کی زبان سے جو نکل جائے، وہ سند ہے۔ ہمارے واسطے وہ ایک قاعدۂ محکم ہے۔ وہ مطاع ہے، اور ہم اُس کے مقلد اور مطیع ہیں۔ غالب

بنامِ مولوی محمد حسین حسان مالکِ مطبع

[مولوی محمد حسین خاں، ابنِ مولوی محمد حسن خاں، ابنِ شاہ محمد خاں مہمند افغان رامپور کے ایک شریف و باعزت خاندان کے فرد تھے۔ ان کے پردادا، نواب سید محمد فیض اللہ خاں بہادر کے ہمراہ افغانستان سے تشریف لائے اور فوج میں بعہدۂ جمعداری مقرر ہوئے۔ مولوی محمد حسن خاں نے تیغ نیاگاں کو قلم سے تبدیل کرلیا، اور اُس زمانے کی مروج تعلیم حاصل کرکے نواب فردوس مکاں کے حسبِ ایما سنہ ۱۸۵۶ء میں مطبعِ حسنی قائم کیا۔ بعدازاں نواب خلد آشیاں کے حسب الحکم ۱۲ جمادی الآخرہ سنہ ۱۲۸۳ھ (۱۵ اکتوبر سنہ ۱۸۶۶ء) کو اخبارِ دبدبۂ سکندری کا پہلا پرچہ شائع کیا۔ مولوی محمد حسن خاں نے مولوی محمد حسین خاں کو اپنی زندگی ہی میں مطبع کا مہتم اور اخبارِ دبدبۂ سکندری کا مدیر بنا دیا تھا۔ منگل کے دن ۲۹ شعبان ۱۳۲۲ھ / ۱۹۰۴ء کو ان کا انتقال ہوگیا، تو چند سال تک ان کے چھوٹے بھائی مولانا شاہ فاروق حسن خاں صاحب صابری، رحمۃ اللہ نے اپنے مشاغل طریقت کے ساتھ دبدبۂ سکندری کو بھی مرتب کیا کچھ مدت بعد سے فرائض ادارت اُن کے فرزند اکبر مولانا فضلِ حسن خاں صابری انجام دے رہے ہیں۔ مؤخرالذکر بزرگ نے اپنے گرامی نامۂ موسومۂ عرشی میں تحریر فرمایا ہے: "اخبار دبدبۂ سکندری کی ہندوستان بھر کے اخبارات میں یہ نمایاں خصوصیت ہے کہ ۷۴ سال کی مدتِ مدید میں برٹش گورنمنٹ اور لوکل گورنمنٹ نے کبھی اس کے ایک حرف پر نہ کوئی اعتراض کیا، نہ اس سے کبھی ضمانت طلب ہوئی، نہ اس پر کسی نے آجتک کوئی مقدمہ چلایا۔" دبدبۂ سکندری، ج ۷۴، نمبر ۳۵، ص ۱، مورخہ ۱۴ نومبر ۱۹۰۴ء]

(۱۳۰/۱)

مشفق اور مکرمی محمد حسین خاں صاحب کو غالبِ آزردہ دل کا سلام پہنچے۔ آج بھی آپ کا ایک خط آیا۔ کئی اخبار آپ کے پھرے، کئی خط آپ کے پھیرے اور آپ اخبار بھیجے جاتے ہیں۔ الٰہی! آپ کا خط خط تھا، یا کوئی جھوٹ کی پوٹ۔ بیشتر مجذوبوں کی سی بڑ، اور جو کچھ سمجھ میں آیا، وہ غلط اور دروغ اور جھوٹ۔ یہ غلطِ محض ہے کہ مطبع[1] حضور کا ہے اور تم مہتمم ہو حضور کی طرف سے۔ اللہ۔ اللہ! ڈبجے سنگھ[2] کی تعریف میں کہیں سارا ایک صفحہ کہیں سارا ایک ورق سیاہ کرتے ہو، اور اپنے والیٔ ملک اور اپنے پادشاہ، یعنی امیر المسلمین نواب کلب علی خاں بہادر کے نام (کے)[3] آگے یا نام سے پہلے کوئی دو تین لفظ تعظیم کے لکھتے ہو بس، اور اس قباحت کو نہیں سمجھتے کہ اگر یہ اخبار حضور کی طرف سے ہے، تو گویا ڈبجے سنگھ[2] کی تعریف بھی حضور کی طرف سے ہوگی۔ ہندوستانی عملداری[4] میں وہ ایک زمیندار اور مالگذار تھا۔ اب گورنمنٹ ہند نے اُس کو جاگیردار مستقل کر دیا۔ اور نواب محمد علی خاں، رئیسِ ٹونک کا ہر اخبار میں ایک مرثیہ لکھتے ہو[5]۔ اس سے معلوم ہوا کہ تم طرح طرح سے اطراف و جوانب کے رئیسوں سے بھیک مانگتے ہو۔ بھائی، "یک در گیر و محکم گیر"۔ اگر حضور کے نوکر بھی نہیں ہو تم، تو آخر رعیت تو ہو۔ یہ کیا ہے کہ اپنے پادشاہ کا ذکر سب سے پیچھے لکھتے ہو، کبھی صفحے پر کبھی حاشیے پر؟ ہم نے ان باتوں سے بیزار ہو کر تمہارا اخبار موقوف کیا ہے، اور اب پھر تمہیں لکھتے ہیں کہ دوہائی خدا کی، میں یکم جنوری سنہ ۱۸۶۸ع سے دبدبۂ سکندری کا خریدار نہیں ہوں! نہ بھیجا کرو، واسطے خدا کے، نہ بھیجا کرو! اس سے زیادہ کیا لکھوں!

(مہر: غالب، ۱۲۷۸)[6] (۲۵ فروری سنہ ۱۸۶۸ع)

تمّ بالخیر۔ والحمد للہ اوّلاً و آخراً

حواشی

صفحہ ۱

(۱) یہ عبارت میرزا صاحب عرائض کے لفافوں پر لکھا کرتے تھے۔

صفحہ ۳

(۱) میرزا صاحب کے اس قطعۂ تاریخ کا پتا نہیں چلا۔
(۲) مولانا فضلِ حق، مولانا فضلِ امام صاحب کے صاحبزادے اور خیرآباد کے رہنے والے تھے
سنہ ۱۲۱۲ھ (۱۷۹۷ء) میں پیدا ہوئے اور ۲ صفرہ ۱۲۷۸ھ (۱۸۶۱ء) کو انڈمان میں
وفات پائی۔ موصوف نے علوم عقلیہ و نقلیہ اپنے والدِ ماجد سے اور حدیث مولانا شاہ
عبدالقادر دہلوی سے پڑھی تھی۔ امیر مینائی لکھتے ہیں:
"فنونِ حکمیہ میں مرتبۂ اجتہاد، بڑے ادیب، بڑے منطقی، نہایت ذہین، نہایت ذکی،
خلیق و ذلیق، انتہا کے صاحبِ تدقیق و تحقیق،... جس شہر میں آپ رونق افروز ہوئے
صدہا آدمی بہرہ اندوز ہوئے۔ شاہجہاں آباد میں اگرچہ عدالتین کے سررشتہ دار تھے، مگر بڑے
ذی اقتدار و صاحبِ اختیار تھے۔ جھجر میں مشاہرۂ جلیلہ پر نوکر رہے۔ الور اور سہارنپور اور
ٹونک سب جگہ معزز و موقر رہے۔ لکھنؤ میں صدرالصدور تھے، اور اس دارالریاست
(رامپور) میں پہلے محکمۂ نظامت اور پھر مرافعۂ عدالتین پر مامور تھے۔ جناب نظام
نواب فردوس مکاں کو بھی آپ سے تلمذ رہا ہے، اور بندگانِ حضور (نواب خلدآشیاں)
نے بھی کچھ پڑھا ہے۔ آٹھ برس بہت اعزاز و اکرام کے ساتھ رہے۔ پھر یہاں سے
تشریف لے گئے۔" (انتخاب یادگار: ۲۹۱)
مولانا کی تصانیف یہ ہیں: (۱) مجموعۂ قصائدِ عربی (۲) رسالۂ غدریہ (۳) رسالہ
امتناع النظیر (۴) ہدیہ سعدیہ۔ آخری کتاب نواب سید محمد سعید خاں بہادر کے نام پر نواب فردوس
کے لیے لکھی گئی تھی۔ میرزا غالب ان کے مخلص دوست اور معتقدِ خاص تھے۔ مولانا نے سررشتہ
داری عدالتِ دہلی سے استعفا دیا اور نواب فیض محمد خاں کی دعوت پر جھجر تشریف لے
جانے لگے، تو اہلِ دہلی کو بےحد قلق ہوا۔ میرزا صاحب مولوی سراج الدین احمد کے نام خط میں
مولانا کی علمی منزلت کے متعلق تحریر کرتے ہیں: "نغفتہ مباد کہ بے تمیزی و قدرناشناسی حکام
رنگِ آں ریخت کہ فاضلِ بےنظیر دانش یگانہ، مولوی حافظ محمد فضلِ حق، از سررشتہ داری

عدالتِ دہلی استعفا کردہ خود را از ننگ و عار وا رہانند۔ حقا کہ اگر پایۂ علم و فضل و دانش و کنش مولوی فضلِ حق آں مایہ بجا ہند کہ از صد یک ادا مانند و باز آں پایہ را بسر رشتہ داری عدالتِ دیوانی سنجند، ہنوز این عہدہ دونِ مرتبۂ وی خواہد بود۔" (کلیاتِ نثر: ۱۴۷)

(۳) اس عریضے میں میرزا صاحب نے جس سابق تعلق کی طرف اشارہ کیا ہے وہ رشتۂ استادی تھا۔ نواب فردوس مکاں اپنے والد ماجد کی تخت نشینی سے پہلے دہلی میں قیام پذیر ہوئے تھے۔ ان کے چچا نواب سید عبداللہ خاں بہادر، صدر الصدور میرٹھ، اور نواب سید عبدالرحمن خاں بہادر میرزا صاحب کے محبِ خاص تھے۔ غالباً انھیں دونوں کے حسبِ تجویز، نواب صاحب نے میرزا صاحب سے فارسی کی تعلیم پائی۔

اس عریضے کے جواب میں نواب صاحب نے ۵ فروری سنہ ۵۷ء کو ارقام فرمایا: "منیقۂ انیقۂ بلاغت آگین مشعرِ رسیدِ خطِ مولوی صاحب مخدوم مولوی محمد فضل حق صاحب با دیگر مراتب محبت و اشتیاق بعبارتِ رنگین و دقیق در عینِ انتظار سرمہ کشِ عیونِ وصولِ نشاط شمول گردیدہ باطلاع خیریتِ مزاج سرورِ ما محصور افزودہ، از مزیدِ شفقت و التفاتِ قلبی منصور شد۔ مشفقا! ہر چند کہ کاتب را اتفاقِ موزونیتِ یک مصرعہ ہم نشدہ بود، لیکن محض بجہتِ سامعیٔ کلام سامی زبانی مولوی صاحب صدر الوصف دلم خواست کہ طریقۂ رسل و رسائل جاری شود۔ چوں سبیلِ بازیں نظم نرسیدہ لہذا چند ابیات و اہیات موزون نمودہ، بہر صدا اصلاح پیش آں یگانۂ آفاق مرسل گشت چشم داشت کہ بعد اصلاح، غزلہای مذکور مع کلام طرحِ جدید لطف فرمودہ شوند۔ از انجا کہ اتحاف شیرینی ہم درین خصوص از دستورات است، لہذا ہنڈوی مبلغ دو صد پنجاہ روپیہ بتقریبِ شیرینی لفافِ رقیمۂ الودادِ ہذا میرسد۔ بمقتضای الطاف منظور فرمودہ، از رسیدِ آں مطلع فرمایند۔ دخلص مالیل و نہار ہمتی اخبار اخبار تصور فرمودہ، اکثر بایصالِ نامۂ انامۂ خیریت و ثائق بعبارتِ سلیس، کہ در خواندنش تاملی بر قوم نیاید، مسرور و خرم مبقر مودہ باشند۔"

صفحہ ۵

(۱) اس قصیدے کے لفافے پر میر منشی صاحب لکھتے ہیں: "قصیدۂ ہانا اگرچہ ہر جان فرستم بتاریخ ۱۹ شعبان سنہ ۱۲۷۳ھ بمواجہۂ میرزا نوشہ صاحب بحضور پرنور گزرانیدہ شد۔" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میرزا صاحب کے قیام رامپور کے زمانے میں نواب صاحب نے قصیدہ دار الانشا سے منگا کر اپنے پاس رکھ لیا تھا۔ چونکہ اس کا شاملِ مثل ہونا تحقیق تھا، اس لیے کلیاتِ فارسی (ص ۳۲۵) سے یہاں نقل کر دیا گیا ہے۔ قصیدے کے متعلق نواب صاحب کی رائے چوتھے عریضے کے حاشیے میں درج ہوگی۔ پتے کے نیچے میرزا صاحب نے لکھا ہے:

"از غالب نگرنگ، بیرنگ (ازرو) احتیاط، چارشنبہ، یازدہم فروری سنہ ۱۸۵۷ء" روانگی قصیدہ کی یہی تاریخ تیسرے عریضے میں بھی مذکور ہے۔

(۲) مولانا فضل حق خیر آبادی مراد ہیں۔

(۳) ڈاک خانے کے اس نئے بندوبست سے میرزا صاحب کا مطلب وہ نیا انتظام ہے جو لارڈ ڈلہوزی کے عہد میں عمل میں آیا تھا۔ ہر نئے انتظام کے وقت کچھ دشواریاں ضرور پیدا ہوتی ہیں، بعید نہیں کہ اس نظم سے بھی لوگوں کو شروع شروع میں پریشانی وقت اٹھانا پڑی ہو۔

(۴) اس سے وہ قصیدہ مراد ہے، جو ابھی نمبر ۲ پر گزر چکا ہے۔

(۵) سفنچہ ہنڈی کو کہتے ہیں۔ اصل میں یہ فارسی کا لفظ سفتہ ہے، اس کے آخر میں تصغیر کے لیے چہ بڑھائی گئی ہے۔ عربی میں سفتہ کو سفتج کہتے ہیں۔

صفحہ ۶

(۱) یہ پرانا محاورہ خود میرزا صاحب کے صرف چند خطوں میں نظر آتا ہے۔ جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ان کی زندگی ہی میں فصحائے دہلی اس سے بچنے لگے تھے۔

(۲) یہاں پر "اس" کی جگہ "ان" ہونا چاہیے، اس لیے کہ اوپر مسودوں کا ذکر ہے۔ غالباً میرزا صاحب کے ذہن میں لفافہ آگیا جس کا ابھی ذکر ہوا ہے۔ اس کے خیال سے جمع کی جگہ واحد ضمیر استعمال کر گئے۔

(۳) ڈ فقط کی طغرائی شکل ہے۔ اکثر پیراگراف کے خاتمے یا پورے مضمون کے خاتمے پر بنائی جاتی تھی۔ میرزا صاحب نے بھی جگہ جگہ اسے استعمال کیا ہے۔ ہم نے سہولتِ قرأت کے خیال سے ہر جگہ سے نقطہ لکھ دیا ہے۔

(۴) تیسرے اور چوتھے عریضے کے جواب میں نواب فردوس مکاں نے ۳ رجب سنہ ۷۳، ۱۲ ہجری (یکم مارچ سنہ ۵۷ء) کو تحریر فرمایا: "۔ ۔ ۔ ۔ و قطعۂ صحیفۂ نغز بکی مشعر ترسیل قصیدۂ مضمون التفاتِ دہم در جوابِ رقیمۂ اوداد در سیواشعار و سفتجۂ مرسلۂ اینجا، و ثانی مع اشعارِ مذکور بعد نظرِ اصلاح و تجویزِ چند الفاظ جہتِ تخلص مخلص بایمای پسند از آنجملہ بمضامینِ برجستہ و عبارات دلپسند متواتر بسبیلِ ڈاک گلگونہ آرای چہرۂ وصولِ فرحت شمول گردیدہ ۔ و مطالعہ قصیدہ نادرۂ فصاحت تضمین کہ اگر ہر شعر نغزش را گنجینۂ معانی و معدنِ لآلیٔ سخندانی خوانند بجا، و یا گلدستۂ برجستۂ چمنستانِ علوم و کمالی نامند زیبا، غواصِ فکر در بحرِ زخارِ استعارات و نکات مبنش مستغرقِ گردابِ نارسائی، و اوہامِ عقلای زمان بدریافتِ خوبی و بلاغتِ آں خزینۂ اسرارِ معرفت بہ کوتاہی، فصاحتِ عرفی و خاقانی بمقابلۂ متانت و برجستگیِ مضامینِ نزہت آگنش ہیچ، و معانیِ جیش قرین و الفاظِ نادرش چون زلفِ ماہرویاں پیچ در پیچ، ابوابِ افادہ و انشراحِ بی اندازہ بر روی دلِ معنا منزل کشود و زنگِ کتافتِ طبعی از تجلیِ خواطرِ سخنداں زدود۔ و غزلیات کہ بنظرِ اصلاح آمدن کہ بپارس آشنا شد۔ فی الفور بصورتِ طلا شد۔ فائز گشتہ لطف نمودند، مخلص ہمیم مشکورِ الطاف و بذلِ توجہاتِ بیحایانِ آں مستغنی الصفات گردید۔ الحمد للہ! تغیر و تبدیلِ الفاظِ نادرہ در اشعار مذکور چوں نقشِ رنگیں زینبِ تازہ گرفت و طلای طبعِ خام برمحک فیضِ عام جلوہ پذیرفت ۔ ۔ ۔ ۔ و مخبر الفاظِ تخلص لفظ "ناظم" مطبوعِ طبعِ نیاز گشت۔"

(۵) اس عریضے کے جواب میں نواب صاحب نے ۲۵ رجب سنہ ۷۳ (۲۳ مارچ سنہ ۵۷ء) کو تحریر فرمایا: "صحیفۂ مسرت آگیں ۔ ۔ ۔ مشیر رسیدِ رقیمۂ الوداد و ابنگہ مکالفِ شرالعفِ عبادت اردو بعدِ ملاحظہ چاک شدہ باشند۔ ۔ ۔ و وصولِ نشاط شمول گردیدہ ۔ حسبِ الارقامِ سامی صحیفۂ موصوف بعد استفادۂ مضمونش چاک نمودہ شد۔ و آئندہ ہم در بارۂ ہمچو مکاتیب تعمیلِ ایمای سامی ملحوظ خواہد ماند۔" اس سے یہی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ میرزا صاحب کی یہ خط و کتابت بصیغۂ راز تھی۔ ورنہ ۱۵ فروری سنہ ۵۷ء کا خط بھی اردو ہی میں تھا۔ اس کے

چاک کرنے کی ہدایت کیوں نہ کی؟ اور کی تھی تو یہاں تعمیل کیوں نہ ہوئی! واللہ اعلم

صفحہ ۷

(۱) یہاں بھی "اس" کی جگہ "ان" ہونا چاہیے، کیونکہ غزلوں کے بھیجنے کا ذکر ہو رہا ہے، غزل کا نہیں۔ شاید لکھتے وقت میرزا صاحب کے خیال میں غزلوں کی جگہ خط آ گیا تھا۔

(۲) نواب فردوس مکاں نے اس عریضے کے جواب میں ۲۸ رمضان سنہ ۱۲۷۳ھ (۲۹ مئی سنہ ۱۸۵۷ء) کو تحریر فرمایا "...... مشفقا: ایں مرتبہ کہ توقف در تسطیر رقیمۃ الاخلاص بظہور آمدہ، باعث آں عدم فرصتی تصور تواں فرمود۔ حالانکہ فرصت دست داد، بہ ترقیم مافی الضمیر اتفاق افتادہ"

(۳) اصل میں "نمود" لکھا ہے لیکن یہ سہو قلم معلوم ہوتا ہے، کیونکہ اسی سطر میں یہ لفظ میرزا صاحب نے درست لکھا ہے۔

(۴) میرزا صاحب تلفظ کے اتباع میں "مجکو" بحذف ہائے مخلوط لکھا کرتے ہیں۔ ان کے دیوان اردو کے اس نسخے میں بھی جو نواب فخر الدین خاں مرحوم کا نوشتہ ہے، "مجکو" اور "مجے" تحریر ہے۔ مگر میں نے صحیح املے کو ترجیح دیتے ہوئے ہر جگہ "مجھ" کو بنا دیا ہے۔

(۵) میرزا صاحب کے دیوان اردو کا یہ نسخہ کتاب خانے میں موجود ہے تاپ ۱۱ × ۷ ۸ اور ۱۰۶ ورق ہیں اور فی صفحہ ۱۵ سطریں ہیں۔ خط صاف اور روشن نستعلیق اور ابتدائی دو صفحے طلاکار ہیں۔ ہر غزل کے خانہ پر رنگین بیل بوٹے اور تمام صفحات کی جدولیں رنگ آمیز ہیں۔ آخر میں مہر کی نقش بنا ہے۔ اس نسخہ دیوان کے متعلق میرزا صاحب نے منشی شیو نرائن کو لکھا ہے: "اب تم سنو۔ دیوان ریختہ اتم و اکمل کہاں تھا؟ مگر ہاں، میں نے غدر سے پہلے لکھوا کر نواب یوسف علی خاں بہادر کو رامپور بھیج دیا تھا۔ اب جو میں دلی سے رامپور جانے لگا، تو بھائی ضیاء الدین خاں صاحب نے مجھکو تاکید کر دی تھی کہ تم نواب صاحب کی سرکار سے دیوان اردو لیکر کسی کاتب سے لکھوا کر مجھ کو بھیج دینا۔ میں نے رامپور میں کاتب سے لکھوا کر بسبیل ڈاک ضیاء الدین خاں کو دلی بھیج دیا تھا۔" (اردوی، ۳۰۸) بعد ازاں ۲ جولائی سنہ ۶۰ء کو اس کے مکمل ہونے کے بارے میں لکھا ہے: "میاں تمہاری باتوں پر ہنسی آتی ہے۔ یہ دیوان جو میں نے تم کو بھیجا ہے اتم و اکمل ہے۔ وہ اور کونسی دو چار غزلیں ہیں جو میرزا یوسف علی خاں عزیز کے پاس ہیں، اور اس دیوان میں نہیں؟ اس طرف سے آپ اپنی خاطر جمع رکھیں کہ کوئی مصرع میرا اس دیوان سے باہر نہیں ہے۔ معہذا ان سے کبھی کہوں گا، اور وہ غزلیں ان سے منگا کر بھجواؤں گا۔" (ایضاً: ۳۰۸) اس نقل سے منشی شیو نرائن نے اپنے مطبع واقع شہر آگرہ میں دیوان کی طباعت کا انتظام کیا تو اس کے متعلق میرزا صاحب نے علائی کو لکھا: "اردو کا دیوان رامپور سے لایا ہوں، اور وہ آگرہ گیا ہے۔ وہاں منطبع ہوگا۔ ایک نسخہ تمہارے پاس بھی پہنچ جائے گا۔" (ایضاً، ۲۲۲) لیکن شیو نرائن نے طباعت میں تاخیر کی، تو میرزا صاحب نے آغاز سنہ ۱۸۶۱ء (جولائی ۱۸۶۱ء) میں تیزی کے نسخے سے مطبع احمدی، دہلی میں دیوان طبع کرا لیا۔ بعد ازاں آخر سنہ مذکور (مئی سنہ ۱۸۶۲ء) میں چند اشعار کے اضافے کے ساتھ اس کی مصحح نقل مطبع نظامی کانپور بھیج کر چھپوا کر شائع کی۔ بشیو نرائن کا نسخہ سرورق کی تاریخ کے مطابق سنہ ۱۸۶۳ء میں لکھا جانا شروع ہوا، اور غالباً اسی سال میں چھپ بھی گیا، اگر وہ دیر نہ کرتے، تو نسخہ رامپور کو

دیوان غالب مطبوعہ کی اصل بننے کا شرف حاصل ہوتا۔ تاہم دیوان غالب کے جس قدر ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں، وہ سب کے سب، اپنی تکمیل میں نسخۂ رامپور کے رہین منت ہیں۔

(۶) یہاں معناً لفظ "رکے" ساقط معلوم ہوتا تھا، اس لئے اضافہ کردیا گیا ہے۔

صفحہ ۸

(۱) میرزا صاحب نے اس جگہ اِس لکھا ہے۔ چونکہ اسی جملے کے بعد رامپوری ساہوکار کے لئے اشارۂ بعید استعمال کیا ہے، اس سے یقین ہوتا ہے کہ اس جگہ از راہ سہو "وس" کی بجائے اِس لکھ دیا ہے۔

(۲) یہاں سے آگے کے الفاظ حاشیے پر ہیں، اور حوالے کے لئے (۱۵) کا ہندسہ متن کی عبارت کے خاتمے اور حاشیہ کی عبارت کے آغاز میں لکھا ہے۔

(۳) فردوس مکاں کے محولۂ بالا فرمان کی نقل مثل میں شامل ہے۔ اس میں سے قابل مطالعہ حصہ یہ ہے: «مکرر آنکہ خط مولوی وجیہ الزماں خان صاحب منصف بریلی سرکار بنام منشی شہاب الدین کہ ہمراہی ایشان در آنجا رفتہ اند، ملفوف میرسد۔ براہ نوازش نزد مکتوب الیہ فرستادہ جواب طلب فرمودہ بدست قاصد روانۂ رامپور باید فرمود۔ وقاصد مذکور اجرت از سرکار خواہد یافت و چون درین ایام شورش سبیل ترسیل مبالغ بجز ہنڈوی بہ نہج سلوک مسدود احتمال در وصول نیز متخیل؛ لہذا در صورت وصول و عدم وصول زرش مطلع ما باید فرمود۔» میرزا صاحب کے اس خط کے جواب میں سرکار نے ۱۵ ذی الحجہ سنہ ۱۲۷۴ھ کو ہنڈوی کا یہ اور پہلے خط کی نقل روانہ فرمادی تھی۔

(۴) نصر اللہ بیگ خاں کے لئے دیباچہ "خاندان نسبی" ملاحظہ ہو۔

(۵) میرزا صاحب نے اس لفظ کا املا ہر جگہ "لاڈ" لکھا ہے، حالانکہ صحیح تلفظ لارڈ ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں دلی والے اس لفظ کو ڈ اور ر کے ساتھ بولتے تھے۔

(۶) لارڈ لیک سنہ ۱۷۴۴ء میں پیدا ہوئے سنہ ۱۷۵۸ء میں پیدل فوج میں نام لکھایا اور مختلف عہدوں پر فائز ہو کر سنہ ۱۸۰۲ء میں جنرل مقرر ہوئے۔ سنہ ۱۸۰۱ء سے سنہ ۱۸۰۵ء تک ہندوستانی افواج کے کمانڈر انچیف اور کونسل کے ممبر رہے۔ انھوں نے مرہٹوں سے جنگ کرکے ۱۸۰۳ء میں آگرہ اور ۱۸۰۵ء میں دہلی فتح کی۔ بعد فتح شاہ عالم ثانی کے حضور میں باریاب ہوئے تو بادشاہ نے صمصام الدولہ اشجع الملک خان دوراں خان بہادر فتح جنگ کا خطاب عطا کیا۔ (تاریخ ہندوستان: ج ۳ ج ۳: ۲۱۷) لیک نے انگلستان واپس جا کر ۲۰ فروری سنہ ۱۸۰۸ء کو انتقال کیا۔

(۷) گزیٹیر آف انڈیا (ج ۲۳: ۲۲۰) میں سونکھ نام کے ایک قصبہ کا ذکر ہے جو شہر متھرا سے ۱۲ میل دور کمبھیر جانے والی سڑک پر واقع، اور تحصیل و ضلع متھرا میں شامل ہے۔ سنہ ۱۸۸۱ء میں اس کی آبادی ۲۹۰۲ نفوس پر مشتمل تھی۔ باشندے کھاتے پیتے اور صاحب حیثیت تھے۔ پختہ بازار اور تعمیر کی رُو کا روں کے مکانات جگہ جگہ نظر آتے تھے۔ پیر اور منگل کو بازار بھی لگتا تھا۔ تھانہ اور ڈاکخانہ دونوں قصبے کے اندر تھے۔

اگر یہ وہی سونکھ ہے جس کا میرزا صاحب نے ذکر کیا ہے تو تسلیم کرنا پڑیگا کہ سونکھ نامی

کوئی برابر کا گاؤں تھا جو اس زمانے میں سونکھ کے نام کے ساتھ بولا جاتا تھا۔

(۸) نواب احمد بخش خاں کے لئے دیباچہ، خاندانِ بھی ملاحظہ ہو۔

(۹) احمد بخش خاں کے جانشین سے نواب شمس الدین احمد خاں بہادر والیٔ فیروزپور، مراد ہیں۔ دیگر اہل خاندان کی طرح میرزا غالب بھی ان سے ناراض تھے، اسی لئے ان کا نام نہیں لیا ہے محمد علاء الدین خطیب فرحت تخلص ساکن بمبئی کی ایک قلمی بیاض جامع مسجد بمبئی کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ: "یکے از نوابانِ دہلی کمشنر دہلی را کشت در عوض آں نواب را پھانسی دادند۔ کسی شاعر در تاریخ او گفتہ است۔ خوب گفت در صنعت منقلب: کیا چرخ نے نوابی سہراب کو اُلٹا" نوابی سہراب" را منقلب کنند" بارہ سے بادن" می شوند" میں نے کمشنر دہلی کے قاتل نواب سے، میرزا شمس الدین احمد خاں بہادر کی طرف اشارہ خیال کیا تھا۔ مگر اس صورت میں ایک عدد کی بیشی ہوتی ہے، اس لئے کہ نواب صاحب کو جمعرات کے دن ۸ اکتوبر ۱۸۳۵ء کو پھانسی دی گئی تھی، جو ۱۲ جمادی الآخرہ سنہ ۱۲۵۱ھ کے مطابق ہے۔ میرے والد کے مخلص دوست اور بچپن کے رفیق پروفیسر فدا علی خاں ایم اے مرحوم نے اپنی قواعد اردو (نسخۂ خطیۂ مصنف، ص۱۶) میں اپنے دادا محمد مظفر خاں گرم رامپوری شاگردِ ذوقؔ (متوفی ۱۲۸۰ھ = ۱۸۶۲ء) کے متعلق لکھا ہے کہ سنہ ۱۲۵۲ھ میں مضافات دہلی کے رؤسا میں سے نواب سہراب جنگ نامی ایک رئیس کو بجرم بغاوت پھانسی دی گئی تھی۔ اس سانحۂ روح فرسا کی تاریخ ذیل کے قطعے میں جودتِ طبع نے بالکل جدید پیرائے میں یوں رقم کی ہے۔

بہ دستِ درازیٔ ستم کس نے بیاں ہو	بے جرم دگر مسندِ نواب کو اُلٹا
تدبیر سے میں نئی طرز سے لکھو گر گرمؔ	کیا چرخ نے نوابیٔ سہراب کو اُلٹا

میں نے تاریخ کی کتابوں میں مضافات دہلی کے کسی اور نواب کی بغاوت اور سزا کے متعلق تلاش کی مگر ناکام رہا۔ اس صورت میں یہ تاویل کی جاسکتی ہے کہ گرمؔ مرحوم نے حسب عادت شعرا اس بے نظیر تاریخ میں ایک عدد کی بیشی گوارا کرلی اور پروفیسر صاحب نے نوابی سہراب سے۔ نواب سہراب جنگ نام سمجھ کر بجائے نواب شمس الدین خاں کے اُن سے قطعے کو متعلق کردیا

یہ بات اور ظاہر کرنے کی ہے کہ ہجری تاریخ کا تعین انڈیا آفس کی ایک بیاض سے ہوتا ہے، جس میں نواب شمس الدین احمد خاں کی پھانسی کے متعلق لکھا ہے: "بتاریخ ۱۲ یوم پنجشنبہ سنہ ۱۲۵۱ھ جمادی الثانی نواب شمس الدین جنت رسید شد۔ یعنی بہ تہمت خونِ فرزند انگریز آں را سولی داد ند و بردار کشید ند" (مکتوب جناب مختار الدین احمد صاحب آرزو بنام عرشی)؛ اس اقتباس سے آرزو صاحب نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ نواب صاحب کے معاصرین میں ایسے لوگ بھی تھے، جو انہیں بے گناہ اور بے قصور جانتے تھے

(۱۰) چونکہ ت فارسی میں نہیں ہے، اور میرزا صاحب نے اس انگریزی لفظ کو مضاف کیا تھا، اس لئے قواعد اضافت کی غلطی سے بچنے کی خاطر اسے مؤنث کر لیا ہے۔

صفحہ ۹

(۱) بہادر شاہ، ہندوستان کے مغل فرمانرواؤں کے آخری چشم و چراغ تھے۔ سنہ ۱۸۳۷ء میں لال قلعہ کے بادشاہ بنے سنہ ۱۸۵۷ء میں قوم پرستوں نے پوری دلی کا بادشاہ بنایا۔ بعدِ فتح دہلی الزام بغاوت میں رنگون کو جلاوطن کیے گئے۔ اور وہیں، ۷ نومبر سنہ ۱۸۶۲ء کو فوت ہوئے۔ میرزا صاحب نے ایک خط میں مجروح کو لکھا ہے: "۷ نومبر ۱۴ جمادی الاولیٰ سال حال جمعے کے دن۔ ابو ظفر سراج الدین بہادر شاہ قیدِ فرنگ و قیدِ جسم سے رہا ہوئے۔"
(اردوی: ۱۶۳)

(۲) میرزا صاحب کے عہد میں دلی والے اسی طرح بولتے تھے۔ اب صحیح تلفظ جنبش رواج پا گیا ہے

(۳) حکیم غلام نجف خاں کو دوشنبہ ۴ جمادی الاولیٰ سنہ ۱۲۷۴ھ کو لکھتے ہیں: "میاں حقیقتِ حال اس سے زیادہ نہیں ہے کہ اب تک جیتا ہوں۔ بھاگ نہیں گیا، نکالا نہیں گیا، لٹا نہیں، کسی محکمے میں ابھی تک بلایا نہیں گیا، معرضِ باز پرس میں نہیں آیا۔ آئندہ دیکھیے کیا ہوتا ہے۔"
(اردوی، طبع لاہور: ۱۲۴)
تفتہ کو تحریر کیا ہے: "میں حکیم محمد حسن خاں مرحوم کے مکان میں دس برس سے کرائے کو رہتا ہوں، اور یہاں قریب کیا دیوار بدیوار ہیں گھر حکیموں کے، اور نوکر ہیں راجہ نرندر سنگھ بہادر والیِ پٹیالہ کے۔ راجہ صاحب نے صاحبان عالی شان سے عہد لیا تھا کہ بروقتِ غارتِ دہلی یہ لوگ بچ رہیں۔ چنانچہ بعد فتح راجہ کے سپاہی یہاں آ بیٹھے اور یہ کوچہ محفوظ رہا۔ ورنہ میں کہاں اور یہ شہر کہاں۔ مبالغہ نہ جاننا، امیر غریب سب نکل گئے جو رہ گئے تھے، وہ نکالے گئے۔ جاگیردار، پنشن دار، دولت مند، اہلِ حرفہ کوئی بھی نہیں ہے۔ مفصل حالات لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں، ملازمانِ قلعہ پر شدت ہے، اور باز پرس اور دار و گیر میں مبتلا ہیں۔ مگر وہ نوکر جو اس ہنگام میں نوکر ہوئے ہیں اور ہنگامے میں شریک رہے ہیں۔
میں غریب شاعر دس برس سے تاریخ لکھنے اور شعر کی اصلاح دینے پر متعین ہوا ہوں۔ خواہی اس کو نوکری سمجھو خواہی مزدوری جانو۔ اس فتنہ و آشوب میں کسی مصلحت سے میں نے دخل نہیں دیا۔ صرف اشعار کی خدمت بجا لاتا رہا اور نظر اپنی بیگناہی پر شہر سے نکل نہیں گیا۔ میرا شہر میں ہونا حکام کو معلوم ہے۔ مگر چونکہ میری طرف بادشاہی دفتر میں سے یا مخبروں کے بیان سے کوئی بات نہیں پائی گئی، لہٰذا طلبی نہیں ہوئی، ورنہ جہاں بڑے بڑے جاگیردار بلائے ہوئے یا پکڑے ہوئے آئے ہیں۔ میری کیا حقیقت تھی: غرضکہ اپنے مکان میں بیٹھا ہوں۔ دروازے سے باہر نہیں نکل سکتا۔ سوار ہونا اور کہیں جانا تو بہت بڑی بات ہے۔ رہا یہ کہ کوئی پاس آوے، شہر میں ہے کون۔ گھر کے گھر بے چراغ پڑے ہیں۔ مجرم سیاست پاتے جاتے ہیں۔ جرنیلی بندوبست یازدہم مئی سے آج تک یعنی شنبہ پنجم دسمبر سنہ ۱۸۵۷ء تک بدستور ہے۔ کچھ نیک و بد کا حال مجھ کو نہیں معلوم۔ بلکہ ہنوز ایسے امور کی طرف حکام کو توجہ بھی نہیں۔ دیکھیے انجام کار کیا ہوتا ہے۔" (ایضاً: ۹۵)
نیز ۳۰ جنوری ۱۸۵۸ء کو لکھا ہے: "بھائی میرا حال یہ ہے کہ دفتر شاہی میں میرا نام مندرج نہیں نکلا۔ کسی مخبر نے بہ نسبت میرے کوئی خبر بد خواہی کی نہیں دی۔ حکام وقت میرا شہر میں

ہونا جانتے ہیں۔ فراری نہیں ہوں۔ روپوش ہوں۔ بلایا نہیں گیا۔ دار و گیر سے محفوظ ہوں کسی طرح کی باز پرس ہو تو بلایا جاؤں۔ مگر ہاں جیسا کہ بلایا نہیں گیا، خود بھی بروئے کار نہیں آیا۔ کسی حاکم سے نہیں ملا اور خط کسی کو نہیں لکھا۔ کسی سے درخواست نہیں کی۔ مئی سے پنسن نہیں پایا۔ کہو یہ دس مہینے کیوں کر گزرے ہوں گے۔ انجام کچھ نظر نہیں آتا کہ کیا ہوگا زندہ ہوں۔ مگر زندگی وبال ہے۔" (ایضاً: ۹۰)

جمعہ ۵ مارچ سنہ ۵۹ء کو لکھا ہے: "حاکم اکبر نے آکر کوئی بندوبست ساری نہیں کیا یہ صاحب میرے آشنائے قدیم ہیں۔ مگر میں مل نہیں سکتا۔ خط بھیجا ہے۔ ہنوز کچھ جواب نہیں آیا۔" (ایضاً: ۶۳)

(۱۲ اپریل سنہ ۱۸۵۸ء) میں حکیم غلام نجف خاں کو لکھتے ہیں: "پنسن کی درخواست دے رکھی ہے۔ بشرطِ اجرا بھی میرا کیا گزر ہوگا؟ ہاں دو باتیں ہیں ایک تو یہ کہ میری صفائی اور بے گناہی کی دلیل ہے۔ دوسرے یہ کہ موافق قولِ عوام۔ جو ملے وہ لذت نہ ہوگا۔" (خطوط: ۲۲۱)

شنبہ ۵ نومبر سنہ ۱۸۵۹ء کو حکیم احسن اللہ خاں کے اپنے مکان میں آجانے کا تذکرہ کر کے خود اپنے متعلق تفتہ کو لکھتے ہیں: "رہا میں سو تو بیکسی و غریبی، تراکری پرسو۔ نہ جزا نہ سزا، نہ نفریں نہ آفریں، نہ عدل نہ ظلم، نہ لطف نہ قہر۔" (اردوی، طبع لاہور، ۱۰)

(۴) تفتہ کے نام کے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ مارچ ۱۸۵۸ء سے قبل میرزا صاحب نے تحریری راہ و رسم پیدا کرنے کی سعی شروع کر دی تھی۔" (اردوی، طبع لاہور، ۲۰)

(۵) مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو اردوی: ۵

(۶) زین العابدین خاں بہادر کے لئے وہ نوٹ ملاحظہ ہو، جو ان کے نام کے خطوط سے قبل مندرج ہے۔

(۷) نواب سید عبداللہ خاں بہادر ابن نواب سید غلام محمد خاں بہادر، نواب فردوس مکاں کے چچا تھے۔ اپنے والد ماجد کی شکست پر رامپور چھوڑنے پر مجبور ہوئے۔ بچپن لکھنؤ میں گزارا۔ جوان ہو کر گورنمنٹ کی ملازمت کی، اور اپنی لیاقت کی بدولت صدر الصدور کے عہدے تک پہنچے۔ مرشد زادۂ آفاق میرزا محمد شاہرخ بہادر کی زوجہ ان کی قرابت دار تھیں۔ اس وجہ سے لال قلعے سے بھی تعلقات تھے۔ (بہادر شاہ کا روزنامچہ: ۸۲) عرصے تک میرٹھ کے صدر الصدور رہے تھے۔ جنگ کے بعد وہیں توطن اختیار کر لیا۔ ستر برس کی عمر میں بعارضۂ تپ سنہ ۱۲۷۴ھ کو رحلت فرمائی، اور درگاہ چشتی پہلوان میں مدفون ہوئے۔ شعر و سخن سے بھی دلچسپی تھی۔ میرزا غالب، مفتی صدر الدین خاں آزردہ اور حکیم مومن خاں وغیرہ جیسے ذی علم اور صاحبانِ ذوق سے پرخلوص تعلقات تھے۔ میرزا غالب کا ان کے نام جو خط پنج آہنگ میں چھپ چکا ہے، اس سے باہمی تعلقات پر خاصی روشنی پڑتی ہے۔ انتخاب یادگار (ص ۲۱۱) میں ان کا یہ شعر مندرج ہے:

مختصر تجھ پر شفاعت ہے، بھلا جائیں کہاں: اے شفیع عاصیاں، ہم نیز دامان چھوڑ کر

(۸) سید اصغر علی خاں مرحوم نواب سید عبداللہ خاں بہادر کے صاحبزادے اور نواب فردوس مکاں کے چچا زاد بھائی تھے۔ انتخاب یادگار (ص ۲۵) میں لکھا ہے: "شاعر خوش مذاق ہیں آفرینش مضامینِ عاشقانہ میں طاق ہیں۔ مومن خاں صاحب دہلوی کے شاگرد رشید ہیں کلام ان کا لائق د...

قابلِ شنید۔ ۷۰ برس کی عمر پائی۔ بارھویں رجب کو بارہ سو تہتر ہجری تھے کہ عارضہ خناق میں مبتلا ہو کر میرٹھ میں رحلت پائی۔ وہاں سے جنازہ اُن کا دہلی کو لایا گیا، اور درگاہ حضرت خواجہ باقی باللہ میں دفن ہوئے۔ یہی سنہ خمخانۂ جاوید (ج اص ۲۲۴) میں مندرج ہے۔ لیکن دارالانشاء کی مراسلت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُنہوں نے سنہ ۱۲۷۲ھ میں انتقال کیا تھا۔ اُن کا دیوان شائع ہو چکا ہے۔

(۹) نواب سید عبدالرحمٰن خاں بہادر، نواب سید غلام محمد خاں بہادر کے صاحبزادے اور نواب فردوس مکاں کے چچا تھے۔ جنگ دوجوڑہ کے بعد اپنے بھائیوں کے ساتھ یہ بھی رامپور چھوڑنے پر مجبور ہوئے اور نواب سید محمد سعید خاں بہادر کی تخت نشینی تک دہلی اور میرٹھ وغیرہ مقامات پر رہے۔ بعد ازاں نواب صاحب کے ساتھ رامپور آئے اور قدیم تنخواہ میں معقول اضافہ پا کر یہیں مقیم ہو گئے۔ ۱۰ اگست سنہ ۱۸۵۷ء تاریخ انتقال اور مدفن رامپور رہے۔ (پروانہ بنام جانکی پرشاد مکتوبہ ۲۰ اگست ۱۸۵۷ء نمبری ۱۸۸)

صفحہ ۱۰

(۱) میرزا صاحب نے "بلی ماں" لکھا ہے۔ چونکہ خود انہوں نے متعدد خطوں میں اس محلے کا نام بلی ماران لکھا ہے اور آج تک ہر دہلوی و غیر دہلوی نے اسے بلی ماران ہی کہا اور لکھا ہے اس لیے سہو قلم متعین کرتے ہوئے متن میں تصحیح کر دی گئی ہے۔

(۲) یہ عربی کا ایک مرکب ہے جس کے معنی ہیں "اس کا"۔ کسی کی نظم و نثر کا کوئی ٹکڑا نقل کرنے کے بعد پھر اسی کی کچھ عبارت نقل کرتے ہیں تو اس کے شروع میں "لہ" لکھ دیتے ہیں، تاکہ معلوم ہو جائے کہ یہ بھی سابق الذکر ہی سے تعلق رکھتی ہے۔

(۳) اگر میرزا صاحب کے تخمینے کو صحیح مانا جائے تو انہیں سنہ ۱۸۴۹ء یا ۱۸۵۰ء سے محلہ بلی ماران میں مقیم ہونا چاہیے۔ مجروح کے نام کے خط میں سنہ ۱۸۵۰ء کی تصریح موجود ہے: اس لیے بظاہر یہی سنہ درست معلوم ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں: "... یہ کہ اسد اللہ خاں بخشند ۱۸۵۰ء سے حکیم پٹیالے والے کے بھائی کی حویلی میں رہتا ہے" (عود: ۸۳؛ اردوی: ۱۲۱) لیکن تفتہ کو ۲ مارچ سنہ ۱۸۵۲ء کو لکھا ہے کہ "میں کالے صاحب کے مکان سے اٹھ آیا ہوں اور بلی ماران میں ایک حویلی کرایہ پر لے کر اس میں رہتا ہوں" (غالب: ۸۳)۔ تفتہ سے اُن کی مراسلت برابر رہتی تھی۔ اس لیے انتقالِ مکان کے چند دن بعد ہی یہ اطلاع دینا چاہیے۔ میرزا صاحب نے شاہ نصیرالدین عرف کالے صاحب کے سنہ ۱۲۶۸ھ میں انتقال کے بعد اُن کا مکان چھوڑا تھا۔ (باغ و دودر: ۹۱، الف)، شاہ صاحب نے سہ شنبہ ۹ دسمبر ۱۸۵۱ء مطابق ۱۵ صفر ۱۲۶۸ھ کو انتقال کیا ہے (دہلی اردو اخبار شمارہ ۵۰ ج ۱۳ مورخہ ۱۴ دسمبر و ۲۰ صفر)، لہٰذا میرزا صاحب کو ۹ دسمبر سنہ ۱۸۵۱ء اور ۲ مارچ سنہ ۱۸۵۲ء کے درمیان مذکورہ مکان کی سکونت ترک کرنا چاہیے۔

(۴) اس خط میں القاب کے ختم ہوتے ہی اگلی سطر سے مطالب شروع کر دیے ہیں۔

(۵) اس چار جزو کے رسالے سے "دستنبو" مراد ہے، جیسا کہ عریضے کے آخر میں اس کے نام کی تصریح سے ظاہر ہوتا ہے۔ کتاب خانے میں یہ نسخہ اب تک محفوظ ہے کہ اور اسی کا کاتب کا نوشتہ

ہے جس نے دیوان اُردو کا وہ خوش خط نسخہ نقل کیا ہے جو میرزا صاحب کی طرف سے سنہ ۱۸۵۷ء کی کسی ابتدائی تاریخ میں پیش کیا گیا تھا۔ اس کے حاشیوں پر میرزا صاحب نے اپنے قلم سے مشکل لفظوں کے معانی لکھے ہیں۔

کتاب خانے میں ایک مطبوعہ نسخہ بھی ہے جو سنہ ۱۸۶۲ء میں لٹریری سوسائٹی بریلی کے مطبع میں چھپا تھا۔ اس کے صفحات ۲۴، ۲۵، ۳۳، ۴۸، ۴۹، ۵۱، اور ۵۵ کے حواشی پر بھی میرزا صاحب کے قلم کے معانی درج ہیں۔

صفحہ ۱۱

(۱) یہ شاہی اعلان واقعات دارالحکومت دہلی: ۱/ ۴۳۸ میں مندرج ہے۔

(۲) دراصل میرزا صاحب حکام انگریزی کی نظر میں شاہِ ظفر کے سکّے کے لئے شعر کہہ کر دینے کے ملزم تھے خود میرزا صاحب کے متعدد خطوں سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ سرور مارہروی کو لکھتے ہیں "سکّے کا وار تو مجھ پر ایسا چلا جیسے کوئی چھرا یا گراب۔ کس سے کہوں؟ کس کو گواہ لاؤں؟۔ ذوق نے یہ دو سکّے کہہ کر گزرانے بادشاہ نے پسند کئے۔ مولوی محمد باقر... نے دلی اردو اخبار میں یہ دونوں سکّے چھاپے۔ اس سے علاوہ لوگ موجود ہیں، جنھوں نے اس زمانے میں مرشد آباد اور کلکتے میں یہ سکّے سنے ہیں اور ان کو یاد ہیں۔ اب یہ دونوں سرکار کے نزدیک میرے کہے ہوئے اور گزرانے ہوئے ثابت ہوئے۔ ہم نے ہر چند قلمرو ہند میں دلی اردو اخبار کا پرچہ ڈھونڈھا۔ کہیں ہاتھ نہ آیا۔ یہ دھبہ مجھ پر رہا۔ پنشن بھی گیا اور وہ ریاست کا نام و نشان خلعت و دربار بھی گیا۔" اردوی: ۱۰۷/ ۱۰۸

یوسف میرزا کو تحریر کیا ہے: "ہم نے سکّہ نہیں کہا۔ اگر کہا، تو اپنی جان اور حرمت بچانے کو کہا۔ یہ گناہ نہیں ہے۔ اور اگر گناہ بھی ہے، تو کیا ایسا سنگین ہے کہ ملکۂ معظمہ کا اشتہار بھی اسے نہ مٹا سکے؟ سبحان اللہ! گولہ انداز کا بارود بنانا، اور توپیں لگانا اور بنک گھر اور میگزین کا لوٹنا معاف ہو جائے اور شاعر کے دو مصرعے معاف نہ ہوں" اردوی ۱۰

(۳) میرزا صاحب نے لفظ سارٹیفکٹ میں پہلی "ٹ" کو "ت" تحریر کیا ہے۔ یہ ملحوظ رہے کہ ساری فکروں سے میرزا صاحب کی مراد وہ دو خط ہیں، جو قصیدے اور عرض داشت کی رسید اور ان کی وفاداری کے اعتراف میں دو گورنر جنرلوں نے انھیں بھیجے تھے۔

(۴) اصل میں القاب کے بعد اسی سطر سے مطالب شروع کر دیئے گئے ہیں۔

(۵) نواب فردوس مکان نے عرائض مورخہ، نومبر و ۱۷ نومبر کے جواب میں تحریر فرمایا: "... دو خط صحیفۂ لطف طراز، اولیں حادی حالات نہ ملنے زرِ پنشن آپ کے، اور دوسرا مورخہ اٹھارویں ماہ نومبر سنہ حال مشعر نوید خیریت مزاج وہاج کے متواتر رنگ افروز چہرۂ وصول نشاط شمول کا ہوا۔ اور اوپر مراتب مندرجہ کے مسرور اور مطلع فرمایا۔ منتقا جو کہ مخلص کو اشتیاق حصول معانقہ اور مکالمہ آپ کا بدرجہ کمال ہے، اور اب تشریف آوری آپ کی اس جگہ مناسب ہے، اس واسطے حوالہ خامۂ محبت نگار کے ہوتا ہے کہ آپ دیدار فائض الانوار اپنے سے مخلص کو مسرور فرمایئے، اور نقطۂ ہنڈوی مبلغ دو سو پچاس روپے کا واسطے مصارف خدام آپ کے بلفعہ رقیمۃ الوداد ہذا کے مرسل ہے۔ قبول فرمایئے۔ مکرر آنکہ چند غزل نیز برائے اصلاح مرسل ہیں۔ بعد ملاحظہ کے واپس ہوں فقط

۱۰ ربیع الثانی سنہ ۱۲۷۵ھ مطابق ۲۵ نومبر سنہ ۱۸۵۸ء کا عریضہ نمبر ۱ ہنڈوی کی رسید اور رامپور نہ آنے کے عذر پر مشتمل ہے۔

(۶) اصل: روبیہ۔ میرزا صاحب سے یہ سہو اور جگہوں پر بھی ہوا ہے۔ ہم نے جہاں کہیں مفرد کا قرینہ نہیں پایا، وہاں بعینہٖ جمع لکھ کر حواشی میں بار بار حوالہ دینا مناسب نہیں جانا۔ اہلِ تحقیق پہلے ایڈیشنوں سے مقابلہ کر کے اُن تمام مقامات کا تعین کر سکتے ہیں۔

(۷) یہاں میرزا صاحب نے ۱۰ کا ہندسہ لکھا ہے، جو لفظ صد کا عدد ہے اور فل اسٹاپ کی جگہ مستقل تخمّس کے استعمال کی جو توجیہ انھوں نے کی ہے، وہ بحث املا، علامات اوقاف، میں مندرج ہے۔ آج کل متروک ہونے کی وجہ سے یہاں اور دوسرے مقامات پر اسے حذف کر دیا گیا ہے۔

صفحہ ۱۲

(۱) نواب فردوس مکاں کے مسودۂ فرمان میں یہ مضمون تحریر نہیں۔ ممکن ہے کہ بھیجنے میں اپنے قلم سے اضافہ کر دیا ہو یا کوئی اور تحریر اس کے علاوہ بھیجی گئی ہو۔

(۲) نواب مرزا خاں داغ تخلص خلف نواب شمس الدین احمد خاں بہادر والی فیروز پور جھرکہ مراد ہیں۔ نواب فردوس مکاں کے عہد میں اپنی پھوپی عمدہ خانم کے توسط سے ابتداءً بطور انعام و عنایات اور بعد ازاں ملازم سرکار ہوئے۔ نواب خلد آشیاں کے عہد میں سو روپے ماہوار پر اصطبل اور فراش خانے کے داروغہ بنائے گئے۔ نواب صاحب کے انتقال کے بعد رامپور کی بزم علم و ادب منتشر ہوئی تو حیدر آباد جا کر حضورِ نظام مرحوم کے استاد مقرر ہوئے اور وہیں سنہ ۱۳۲۲ھ (۱۹۰۵ء) میں انتقال کیا۔ مرزا داغ کو شعر و سخن سے فطری لگاؤ تھا۔ شیخ ابراہیم ذوق دہلوی سے کلام پر اصلاح لی تھی۔ اور رامپور میں شعرائے دہلی کے کامیاب نمائندے شمار ہوتے تھے۔

(۳) اس بزم آرائی کا حال معلوم نہ ہو سکا۔ بعید نہیں کہ آتشِ فتنہ و فساد کے سرد پڑ جانے کی خوشی منائی گئی ہو۔

(۴) آمدہ کی جگہ آمد کا استعمال سہوِ قلم معلوم ہوتا ہے۔

(۵) جناب عالیہ، نواب فردوس مکاں کی والدہ محترمہ فتح النسا بیگم کا لقب تھا، جو نواب سید فیض اللہ خاں بہادر کے بھتیجے محمد نور خاں ولد محمد شاہ خاں بڑیچ کی صاحبزادی تھیں (گلشن فتوت قلمی) ذکر نواب فردوس مکاں ۔ اخبار الصنادید: ۲۷۲/۲

(۶) دیکھو حاشیہ ۹ صفحہ ۸

صفحہ ۱۳

(۱) یہ عریضہ ۱۷ جنوری سنہ ۱۸۵۹ء سے قبل لکھا گیا ہوگا، کیونکہ اس تاریخ کے فرمان میں سرکار نے لکھا ہے: "تلطف صحیفہ آپ کا حاوی ... نہ ہونے حکم نسبت مقدمۂ پنشن کے پیشگاہ حکام سے ... میں انتظار میں اسر ہر کشش حیون وصول فرحت شمول کا ہوا۔"

(۲) یہاں میرزا صاحب نے روانا الف کے ساتھ لکھا ہے چونکہ مکتوب نمبر ۵ وغیرہ میں انھوں نے روانہ لکھا ہے اور صحیح بھی یہی ہے، اس لیے ہر جگہ ہ کے ساتھ لکھ دیا گیا ہے۔

(۳) لفافے پر ۱۷ اپریل ۱۸۵۹ء تحریر ہے۔

(۴) نواب فردوس مکاں کا محولۂ بالا خط حسب ذیل ہے: ". . . حال تشریف آوری آپ کا اس طرف کو ابھی تک سامعہ نواز نہیں ہوا تھا اور دلِ صف منزل مشتاق اور منتظر دریافت سرور ملاقات کا ہے۔ اس واسطے حوالہ خامہ اتحاد نگار کے ہوتا ہے کہ آپ براہ عنایت کے نوید تشریف فرمائی اس وقت سے، کہ کب تک ممکن الوقوع ہے، مطلع اور مطمئن فرمایئے. . . .
۹ رمضان سنہ ۱۲۷۵ھ، ۱۳ اپریل سنہ ۱۸۵۹ء"

(۵) لارڈ کیننگ بہادر سنہ ۱۸۱۲ء میں پیدا ہوئے۔ سنہ ۱۸۵۶ء میں ہندوستان کے گورنر جنرل اور سنہ ۱۸۵۸ء میں پہلے وائسرائے بنائے گئے۔ غدر انہیں کے عہدِ حکومت میں رونما ہوا۔ حکومت اودھ کی مکمل ضبطی بھی اسی عہد کا واقعہ ہے۔ مارچ سنہ ۱۸۶۲ء میں انگلستان واپس گئے، اور ۱۷ جون سنہ ۱۸۶۲ء کو وہیں فوت ہوئے۔ اپنے عزم، استقلال، تدبر، اور خوبیٔ انتظام کی بدولت انہوں نے بڑی شہرت حاصل کی ہے۔

صفحہ ۱۴

(۱) اس عریضے کے جواب میں نواب فردوس مکاں نے تحریر فرمایا۔ "سابق اس سے دو قطعہ، تلطف صحیفہ طمانیت افزا آپ کے، اول مشعر مراتب تعزیت رحلت جناب والدہ صاحبہ مغفورہ کے اس جہان فانی سے، اور دوسرا بانتظار جواب اور قطعۂ تاریخ رحلت جناب ممدوحہ کے متواتر وصول ہوئے. . . . سبحان اللہ! کیا عمدہ تاریخ آپ نے تصنیف فرمائی ہے کہ الفاظ جامع مختصر ہیں اور تعمیہ بطرز نادر اور بے تکلف ہے۔"

صفحہ ۱۵

(۱) فردوس مکاں کے ۲۹ صفر سنہ ۱۲۷۶ھ، ۲۸ ستمبر سنہ ۱۸۵۹ء، کے فرمان سے معلوم ہوتا ہے کہ میرزا صاحب نے ان کے سفرِ انگلستان کے متعلق استفسار کیا تھا۔ نواب صاحب نے جواب میں لکھا کہ: "مشفقا، جو آپ نے نسبت عزیمت مخلص کے سمت انگلستان استفسار فرمایا ہے، حال یہ ہے کہ فی الحقیقت ارادہ مخلص کا جانے انگلستان کو مصمم ہے۔ لیکن ابھی تک کوئی زمانہ جانے کا مقرر نہیں ہوا ہے۔ اس واسطے حوالہ خامۂ اتحاد نگار کے ہوتا ہے کہ جس وقت زمانہ جانے ولایت کا قرار پاویگا، آپ کو پیشتر سے اس خصوص میں اطلاع دہی عمل میں آویگی۔" میرزا صاحب کا چودہواں عریضہ اسی فرمان کا جواب ہے۔ نواب صاحب کا یہ سفر ملکۂ وکٹوریہ سے صلۂ خدماتِ غدر پانے کے سلسلے میں ہونے والا تھا، جو اس وجہ سے ملتوی ہو گیا کہ گورنمنٹ نے خود گورنر جنرل کے ہاتھوں خلعت وغیرہ دینا مناسب خیال کیا؛ چنانچہ فتح گڑھ میں یہ دربار منعقد ہوا، جس میں فردوس مکاں بھی شریک ہوئے دربار کی تفصیل عریضۂ ۳۰ کے حاشیے میں ملاحظہ ہو۔

(۲) میرزا صاحب کے اس عریضے کا آخری حصہ پھٹ گیا ہے۔ اس لئے لفافے سے تاریخ نقل کیجاتی ہے۔

(۳) لمبر دی انگریزی لفظ نمبر ہے۔ پرانے لوگ نون کی جگہ لام بولتے تھے۔ میرزا صاحب بھی انہیں میں سے ہیں، چنانچہ آپنے شاہزادہ جواں بخت کے سہرے میں بھی لکھا ہے کہ:
مجھ کو ڈر ہے کہ نہ چھینے ترا لمبر سہرا۔

(۴) سات پارچوں کی تفصیل عریضہ نمبر ۰ میں ملاحظہ ہو۔ جیغہ، جو ترکی لفظ ہے، ایک مرصع زیور کا نام ہے جسے پگڑی پر باندھتے ہیں۔ یہ مخمل کی ۲ انچ لانبی اور ۲ انچ چوڑی پٹی ہوتی ہے۔ اس پر ریشم کا نہایت عمدہ کام بنا ہوتا ہے، اور سونے کی ایک پتری جس پر جواہر جڑے ہوتے ہیں اس پر لگی ہوتی ہے۔ سرپیچ، جسے سرپیش بھی کہتے ہیں، سونے، چاندی یا ہیرے موتی کا ایک زیور ہوتا ہے جسے پگڑی میں سامنے کے رخ پر باندھتے ہیں۔
بعض اوقات اس میں سونے کی چوکور پتریاں ہوتی ہیں، جو آپس میں بندھی ہوتی ہیں، اور ہر ایک میں قیمتی پتھر جڑے ہوتے ہیں۔

(۵) لارڈ ہارڈنگ صاحب ہندوستان کے گورنر جنرل تھے۔ سنہ ۱۷۸۵ء میں پیدا ہوئے۔ جولائی سنہ ۱۸۴۴ء سے جنوری سنہ ۱۸۴۸ء تک گورنر جنرل اور سنہ ۱۸۵۲ء سے سنہ ۱۸۵۶ء تک کمانڈر انچیف رہ کر اسی سال کے ستمبر میں فوت ہو گئے۔ سکھوں کی لڑائی میں انھوں نے نمایاں خدمات انجام دیں۔ انتظام مملکت میں مفید اصلاحات نافذ کیں۔ جگہ جگہ اسکول قائم کئے۔ ریلوے اور آبپاشی کے محکموں میں اضافہ کیا، اور تواریخ عام تشکیل مقررہ کی۔ جس دربار میں میرزا صاحب نے خلعت ہفت پارچہ اور رقم جواہر کی پائی تھیں، وہ جشن الاخبار بمبئی مورخہ ۱۹ ذی الحجہ ۱۲۶۱ھ مطابق ۱۹ دسمبر ۱۸۴۵ء شمارہ ۱۵ جلد ۲، اور بہادر شاہ کے روزنامچہ اص ۲۰ کے مطابق ۱۷ دسمبر سنہ ۱۸۴۵ء کو دہلی میں منعقد ہوا تھا۔ ان دونوں حوالوں میں سترکا کی فہرست بھی شائع ہوئی ہے اگر اس کے اعداد ترتیب کو ظاہر کرتے ہیں۔ تو میرزا صاحب کا نمبر تیرھواں ہونے کے سبب ان کا یہ بیان محل نظر رہے گا کہ وہ داہنی صف میں دسواں نمبر مقرر ہے۔

(۶) لارڈ ڈلہوزی سنہ ۱۸۱۲ء میں پیدا ہوئے۔ سنہ ۱۸۴۷ء میں ہندوستان کے گورنر جنرل مقرر کئے گئے، اور ۱۲ جنوری سنہ ۱۸۴۸ء کو اس عہدے کا جائزہ لیا۔ انھوں نے سکھوں کو زیر کر کے سنہ ۱۸۴۹ء میں پنجاب کا الحاق کیا۔ ریل کے محکمے میں نئے معاہدے نافذ کئے اور صوبوں کے درمیان تار برقی کا سلسلہ قائم کیا۔ شاہی ڈاکخانے کا نظم بھی انھیں کا رہین منت ہے۔ محکمۂ امور عامۂ پبلک، جنگلات، پیمائش، اور محکمۂ تعلیمات قائم کیا۔ مجلس قانون ساز کا از سر نو انتظام کر کے اسے وسعت دی۔ برما پر حملہ کیا، اور خان قلات اور امیر افغانستان سے معاہدے مرتب کئے۔ صوبہ برار فوجی مصارف کے عوض میں حاصل کیا۔ ان کے ہاتھوں بہت سی دیسی ریاستوں کا خاتمہ ہوا ہے۔ حادثۂ غدر کی ذمہ داری بھی انھیں کے کاندھوں پر رکھی جاتی ہے۔ ان کے سوانح کا خلاصہ فتح، استحکام اور ترقی ہے۔ ڈلہوزی لندن واپس جا کر سنہ ۱۸۶۰ء میں مر گئے اور وہیں دفن ہوئے۔ میرزا صاحب کا یہ کہنا سہو پر مبنی ہے کہ لارڈ ڈلہوزی یہاں نہیں آئے۔ وجہ یہ ہے کہ اخبار فوائد الناظرین شمارہ ۲۲، ج ۲، مورخہ ۲۹ اکتوبر سنہ ۱۸۴۸ء میں یہ اطلاع شائع ہوئی کہ لارڈ ڈلہوزی ۲۰ ویں نومبر کو دہلی آئیں گے۔ بعد ازاں ۲۳ نومبر کے پرچے میں، جس کا شمارہ مسلسل ہے، اخبار دہلی کے ماتحت لکھا گیا کہ "کل کے دن ۲۱ ویں تاریخ ماہ نومبر کو گورنر جنرل لارڈ ڈلہوزی صاحب بکمال اقبال، قریب ۱۱ بجے کے دہلی داخل ہوئے اور سلامی ہوئی۔"

اور کوٹھی سر طامس منٹگمری صاحب بہادر میں اترے۔ خبر ہے کہ لارڈ صاحب موصوف ۲۲ ویں تاریخ ماہ حال کو، یعنی آج وقت شام کے دہلی سے روانہ ہوں گے۔" اس شہادت کے بعد صرف دہلی میں دربار کا انعقاد زیر بحث آسکتا ہے۔ بظاہر یہ واقعہ ہے کہ ڈلہوزی نے دہلی میں دربار نہیں کیا ورنہ اس کی اطلاع بھی اخباروں میں شائع ہوتی۔ اور جب انھوں نے دربار نہیں کیا، تو اُن کی آمد ایک معمولی واقعہ رہ گئی جسے یاد رکھنے کی میرزا صاحب کو کیا ضرورت تھی۔ اسی سبب سے انھیں یہ خیال گزرا کہ لارڈ ڈلہوزی دہلی نہیں آئے۔

(۷) لارڈ کیننگ بہادر وائسرائے مراد ہیں۔

(۸) سکرتر، انگریزی لفظ سکریٹری کا مخفف ہے۔ آگے چل کر بول چال میں پہلی "ر" بھی "ت" میں تبدیل ہو گئی اور لوگ "سکتر" کہنے لگے۔

(۹) ایڈمنسٹن صاحب ۱۸۱۲ء میں پیدا ہوئے۔ سنہ ۱۸۳۱ء میں اضلاع شمال و مغرب میں تقرر ہوا۔ ستلج کی فتح کے بعد وہاں کی ریاستوں کے کمشنر بنا دیئے گئے۔ سنہ ۱۸۵۳ء میں پنجاب کے کمشنر مالیات ہوئے۔ بعد ۱۸۵۵ء سے ۱۸۵۹ء تک حکومت ہند کے فارن سکریٹری اور جنوری سنہ ۱۸۵۹ء سے فروری سنہ ۱۸۶۳ء تک ممالک مغربی و شمالی کے گورنر رہے۔ انھوں نے ۲۴ ستمبر سنہ ۱۸۶۴ء کو انتقال کیا۔

صفحہ ۱۶

(۱) یہ فارسی کے محاورہ "برہم زدن" کا ترجمہ ہے

(۲) عرفی کا نام جمال الدین محمد اور وطن شیراز ہے۔ ہندوستان آکر حکیم ابوالفتح شیرازی اور عبدالرحیم خان خاناں سے وابستہ رہا۔ خانخاناں نے دربار اکبری میں تقریب کرکے شاہزادہ سلیم کا اتالیق مقرر کرا دیا۔ ۹۹۹ء میں خانخاناں کے ساتھ مہم سندھ پر روانہ ہوا تھا کہ شوال میں بمقام لاہور ۳۶ سال کی عمر میں فوت ہو گیا۔ اس کے کلام میں شوکت اور جوش بہت ہے۔

(۳) نواب فردوس مکاں نے جواباً تحریر فرمایا: "مشفقا! بہنگام ملاقات کے اکثر بعضے صاحبان بہادر ذیشان سے تذکار محامد اوصاف ذاتی اور صفاتی آپ کا عمل میں آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل اور قدر دانی سرکار دولتمدار سے یقینِ واثق ہے کہ جو مدارج منزلت آپ کے قدیم سے ہیں، چنانچہ گورنمنٹ بہادر سے بھی اسی کے مطابق ظہور میں آوے گا، کس واسطے کہ اہالیٔ سرکار ابد قرار قدردان و قدرشناس ہیں۔"

(۴) کورٹ آف ڈائرکٹرز مراد ہے۔ سنہ ۱۷۰۰ء میں بمقام انگلینڈ ایک کچہری مالکوں کی واسطے نگرانی کاروبار ہندوستان کے مقرر ہوئی۔ لقب اس کا کورٹ آف پروپرائٹرس مقرر ہوا اس لئے کہ ہند کی کچہری کے کاروبار کے لئے اچھے شخص منتخب کریں اور ترکیب اور ترتیب قوانین کی کریں۔ دوسری ایک کچہری ایسی مقرر ہوئی جو ہند کے جملہ کاروبار کے واسطے رہنمائی کرتی تھی۔ جس میں ۲۴ آدمی تھے ان کا لقب کورٹ آف ڈائرکٹرز ہوا۔ اس زمانے تک بادشاہ انگلستان کو کاروبار ہند میں مداخلت نہ تھی۔ صاحبان کمپنی مطابق حکم اور حقوق مندرجہ فرمان بادشاہی کے کام کرتے تھے۔ (تاریخ سلطنت انگلشیہ: ۵، مطبع خورشید ہند، مراد آباد ۱۸۶۷ء) کمپنی کی جماعت میں بہت لوگ ہیں۔ لیکن ان میں ۲۴ ناظم مناظم امورات ہیں۔ اُن کی منظوری کے بدون کسی امر کی تجویز قطعی نہیں ہوتی، اور انہیں کو کورٹ آف ڈائرکٹرز بولتے ہیں۔ بسبب کام اصیل کے

حضور سے مقرر ہوتے ہیں۔ مگر گورنر یعنی مدار المہام اور کمانڈر انچیف یعنی سپہ سالار کے نصب کرنے میں پسند و منظوری تخت نشین سلطنت کی لازم ہے۔" (تاریخ ہند، سداسکھ لال ۱،۹، مطبع نور الابصار ۱۸۵۲ء) یکم نومبر سنہ ۱۸۵۸ء کے ملکۂ معظمہ وکٹوریہ کے اعلان کے ذریعے گورنر جنرل کو وائسرائے یعنی نائب سلطنت کے لقب سے موسوم کیا گیا۔ اور کمپنی سے عنانِ حکومت لے کر براہِ راست تاجِ برطانیہ سے مملکتِ ہندوستان کا تعلق کر دیا گیا چنانچہ لارڈ کیننگ ایسٹ انڈیا کمپنی کے آخر گورنر جنرل اور ملکہ کے اول وائسرائے تھے (تاریخ سلطنتِ انگلشیہ، ذکار اللہ، ج ۳، ۱، ۲)۔

(۵) نواب سید محمد کلب علی خاں بہادر خلد آشیاں مراد ہیں۔

(۶) میرزا صاحب نے اس عریضے میں جس واقعے کی طرف اشارہ کیا ہے، وہ اخبار الصنادید (۲، ۹۰-۱۰) کے مطابق حسبِ ذیل ہے۔

"لارڈ کیننگ صاحب بہادر گورنر جنرل نے ۵ نومبر سنہ ۱۸۵۵ء مطابق ۲۳ ربیع الثانی سنہ ۱۲۷۶ھ کو مقام فتح گڑھ میں ایک عالیشان دربار منعقد فرمایا۔ . . . اس دربار میں بہت سے دیسی رؤسا اور بہت سے یورپین معزز حکام خصوصاً کمانڈر انچیف صاحب شریک تھے . . . دربار عام میں گورنر جنرل نے نواب فردوس مکاں سے مخاطب ہو کر کہا: "مجھکو بڑی خوشی اس بات کی ہے کہ اُن خدمات کے عوض جو آپ نے ملکۂ معظمہ کی کیں مجھ آپ کا شکریہ ادا کرنے کا موقع ملا۔ آپ اپنی ذاتِ خاص سے زمانۂ غدر میں نہایت مستعد اور صادق رہے ہیں اور آپ نے باوجود خوفِ جان در یاست کے گرد و نواح میں نہایت شفقت اور مستعدی سے حکومت برقرار رکھی اور ملکہ معظمہ کے افسروں کی مدد بقدرِ امکان بخوبی کی۔ سب سے بڑھ کر یہ ہے کہ آپ نے ایک مجمع کثیر ہم قوم ملکۂ معظمہ کی جانیں بچائیں۔ اُن کو سب آفتوں سے محفوظ رکھا، اور اُن کو ہر طرح کی آرائش دی، حالانکہ وہ زمانہ چاروں طرف خوف سے گھرا ہوا تھا۔ میں بڑی خوشی سے روبرو سپہ سالارِ افواج ہند ملکۂ معظمہ اور بہت سے معزز افسر اور حاکمان ملکی کے۔ جو گرد و نواح اور دیگر مقامات ہندوستان میں عہدہ ہائے جلیلہ پر منصوب ہیں۔ آپ کے حسن خدمات کا اقرار کرتا ہوں مجھکو یقین ہے کہ آپ کی کارگزاریوں کو لوگ ہرگز نہ بھول لیں گے۔"

اس دربار میں گورنر جنرل نے نواب فردوس مکاں کو تین ہزار روپے کا خلعت عطا کیا۔ اور سلامی کے بجائے گیارہ کے بجائے تیرہ مقرر ہوئے۔ علاوہ اس کے فرزند دلپذیر کا خطاب عنایت ہوا۔ القاب و آداب ان الفاظ کے ساتھ قرار پایا:

"نواب صاحب مشفقِ بسیار مہربان کرم فرمائی مخلصان سلامت۔"

بعد ازاں ۲۵ نومبر ۱۸۵۹ء کو گورنر جنرل بہادر کے سکریٹری نے گورنمنٹ ممالک مغربی و شمالی کے سکریٹری کے نام حسب ارشاد گورنر جنرل بہادر ایک خط لکھا اس خط کی دفعہ ۵ میں تحریر تھا۔ "گورنر جنرل نے . . . . نواب صاحب کو مطلع کیا کہ اُن کی مستحکم وفاداری اور عملی درجے کی امداد کے سبب، جو انھوں نے گورنمنٹ کو دی ہے، اُن کو پرگنہ کاشی پور

ضلع مرادآباد، جس کی جمع ایک لاکھ چار ہزار چار سو روپے سالانہ ہے، معافی میں بخشا ہے جس کو وہ اور ان کے وارث اپنی جاگیر کے ایک ٹکڑے کے طور پر اپنے قبضے میں رکھیں۔"

بعد ازاں ضلع بریلی کے شمال سے جنوب کی جانب ایک پتلی دھجی کی طرح کا لمبا علاقہ، جو ۱۲۹۶ مواضعات، جمعی ایک لاکھ ۲۸ ہزار ۵ سو روپے ۱۳ آنے پر مشتمل ہے، ۲۳ جون ۱۸۶۰ء کے مورخہ عہد نامے کی رو سے ہمیشہ کے لئے عطا ہوا (عہد نامجات: ۲/ ۱۰۰)۔

اس عطیے کی تہنیت میں میرزا صاحب نے نواب فردوس مکاں کو لکھا

ای آنکہ خود بہرہ ای بر دری مرا ... از غیب، مزدِ کارِ تو اجرِ عظیم باد

رای تو در زمانہ بامضای کارہا ... با اہتمام سہم سعادت سہیم باد

در صبح دولت تو، ز گلہای رنگ رنگ ... دائم مشام دہر رہینِ شمیم باد

آں دم کہ مرده را بانفس زنده ساختی ... در باغ طالع تو بجای نسیم باد

مانند آب، گر، بہ رہت بہر دفع گرد ... ہر قطرہ زان، نمونۂ درِّ یتیم باد

ہر صیغہ کہ وضع وی از بہر امر تست ... فارغ ز ننگ زحمتِ تقدیم میم باد

گر بہر خویش نیز دعائی کنم چہ باک! ... این نغمہ ہم گزیدۂ طبع سلیم باد

آزاده ام، خلوص و وفا شیوۂ من ست ... راہم ورای مسلکِ امید و بیم باد

چوں رہروی کہ بر نمط جاده ره رود ... پیوستہ سیر من بخطِ مستقیم باد

مانند فکر من، رخ بخت تو دلفروز ... مانند کلک من، دل دشمن دو نیم باد

وابستۂ زمان و مکاں نیست در سخن ... گر خود رود و کعبہ بریں در مقیم باد

شادم و لیک این دگویم کہ بنده را ... خشتی ز زر خالص و خشتی ز سیم باد

مقصود از لباس ہماں پوشش تنیست ... پوشش گر از حریر نباشد، گلیم باد

بالجملہ ایں سہ بیت کہ سر جوش فکرتست ... درخورد لطفِ خاص و عطای عمیم باد

نواب دہر فیض منوچہر چہر را ... حاصل کلام یوسف و قرب کلیم باد

چوں غنچہ کز ہبوی گل بشگفد بباغ ... ملکِ جدید، شاملِ ملکِ قدیم باد

ہر دم ترا بخلوتِ راز و ببزم انس ... روح الامین مصاحب و غالب ندیم باد

(کلیات غالب فارسی: ۵۶)

اس قطعے کی تاریخ نظم کا پتا نہیں چلتا، لیکن ۲۷ نومبر کے مکتوب میں اس کا مذکور نہ ہونے کے باعث خیال ہے کہ اس تاریخ کے بعد لکھا گیا، اور اسی مہینے کی کسی آخری تاریخ کو یا ماہ دسمبر کے شروع میں نواب فردوس مکاں کی خدمت میں ارسال ہوا۔ نواب صاحب کی تاریخ روانگی و آمد صاحب اخبار الصناديد نے ذکر نہیں کی۔ خود نواب صاحب نے ۱۰ ربیع الثانی سنہ ۱۲۷۶ھ ۶ نومبر سنہ ۱۸۵۹ء کو لکھا ہے: "یہ مخلص بتاریخ ۱۲ اس مہینے کے طرف فرخ آباد کے روانہ ہوگا اور بتاریخ ۱۸ اس مہینے کے معاودت کر کے رامپور پہنچے گا" (مثل نمبر ۵۷)۔ بعد ازاں ۲۰ ربیع الثانی مطابق ۱۶ نومبر کو تحریر فرمایا ہے کہ "بتاریخ ۱۵ نومبر سنہ ۱۸۵۹ء مخلص بخیریت تمام فائز اینجا گردید" (مثل نمبر ۸۲)۔

صفحہ ۱۷

(۱) میرزا صاحب نے اس لفظ کو سہواً "کچھول" لکھ دیا ہے۔

(۲) یہاں میرزا صاحب کو اصولاً روپے بصیغۂ جمع لکھنا چاہیے تھا، لیکن محاورے میں کبھی "دو ہزار روپیہ آیا" بصیغۂ واحد بھی بولتے ہیں، اسی سبب سے میں نے یہاں محسوب نہ ہو، اور مرحمت ہو، کے پیشِ نظر "روپیہ" مفرد ہی رہنے دیا ہے۔

(۳) اس عریضے کے جواب میں نواب فردوس مکاں نے ۲۰ جمادی الاولیٰ ۱۲۷۶ھ (۱۵ دسمبر ۱۸۵۹ء) کو تحریر فرمایا: "مشفقا! بپاس ارقام سابق کے کہ مخلص کو آپ کی ذات ستودہ صفات سے محبت اور موانست قلبی ہے، ہنڈوی مبلغ دو سو روپے کی سوائے مشاہرہ معینہ معطوف رقیمۂ اوداد ہٰذا کے مرسل ہے، اور چنداں شنت آپ کی لطف فرمائی سے یہ ہے کہ رسید ہنڈوی مذکورہ سے مطلع اور مطمئن فرمائیں۔ اور سابق میں چند مرتبہ درباب تشریف فرمائی یہاں کے متکلف ہوا ہوں، لیکن اب تک آپ نے مسرور ملاقات بہجت آیات سے مسرور نہیں فرمایا۔ اب لازم اشفاق کا یہ ہے کہ آپ تشریف شریف باسرع ازمنہ ارزانی فرماویں اور مخلص کو مشکور الطاف کا کریں۔"
اس ارشاد کی تعمیل میں میرزا صاحب صبح پنجشنبہ ۱۹ جنوری سنہ ۱۸۶۰ء کو دلی سے روانہ ہو کر جمعے کے دن ۲۷ جنوری کو وارد رامپور ہوئے۔ سفر کی تفصیل کے لیے دیباچہ ملاحظہ ہو۔

(۴) لفافے سے معلوم ہوتا ہے کہ میرزا صاحب نے دورانِ قیامِ رامپور میں یہ عریضہ لکھ کر فتح محمد خاں صاحب کے توسط سے کیمپ میں پیش کیا تھا۔ مقام کا نام لفافے پر درج نہیں ہے لیکن جوابی فرمان کے مسودے میں "از مقام کمرپا" تحریر ہے۔ جو تحصیل سوار کا ایک

صفحہ ۱۸

(۱) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میرزا صاحب نے اپنے بھائی میرزا یوسف خاں کی پنشن کے اجرا کی کوشش کی۔ یوسف خاں ایامِ غدر میں بڑی بیکسی اور تنہائی کی حالت میں فوت ہوئے تھے اور میرزا صاحب ان کی تجہیز و تکفین میں بھی شرکت نہ کر سکے تھے۔ امن قائم ہو جانے پر میرزا صاحب نے ان کی پنشن کے لیے کس طرح سلسلہ جنبانی کی اور آیا اپنی بیوہ بھاوج اور بھتیجی کے لیے یہ سعی تھی یا اپنے لیے، اس کا حال معلوم نہ ہو سکا، اس لیے کہ آئندہ کسی خط میں میرزا صاحب نے ان کی پنشن کے متعلق نہیں لکھا۔

(۲) اس کے جواب میں نواب فردوس مکاں نے ۲۰ رمضان سنہ ۱۲۷۶ھ (۱۲ اپریل ۱۸۶۰ء) کو القاب و آداب کے بعد تحریر فرمایا: "مشفقا، جب کوئی مسرت پیش آنے والی ہوتی ہے تو آغاز ہی سے مقدمات سرور پیدا ہوتے ہیں۔ ایسے سامان نظر آتے ہیں کہ بے اختیار دل کو انبساط، طبیعت کو نشاط ہو۔ حسنِ اتفاق دیکھیے کہ ۱۰ تاریخ اپریل سنہ حال پہلے تو ایک لاکھ بیس ہزار یا ۲۰ ہزار ہی کی جاگیر پر دخلہ یابی کا خریطہ آیا۔ میں اسے پڑھ ہی رہا تھا کہ آپ کا نامہ سرور افزا آیا۔ اس سے آپ کی پنشن کی بحالی کا مژدہ پایا

نشۂ سرور دوبالا ہوگیا اور اس قدر بالیدگی اور خوشی حاصل ہوئی کہ زبان سے بیان اس کا مجال زبان و قلم نہیں۔ بار خدایا مبارک ہو: سپاس منعم حقیقی ادا نہیں ہوسکتا۔ اس وقت میں بلا نقصان پنشن کا جاری ہونا محض شان قدرت باری ہے۔ شکر اس کے احسانات کا کہاں تک ادا کیجیے! عجب قدرت نمائی فرمائی ہے۔ دل کو طرفہ مسرت ہاتھ آئی ہے" نغنہ کے نام کے ۶ مئی سنہ ۱۸۶۰ء کے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ ۴ مئی سنہ ۱۸۶۰ء کو زر پنشن وصول کیا گیا (اردوی: ۹۰)، وصول شدہ رقم (دو ہزار دو سو پچاس روپے کے خرچ کی پوری تفصیل کے لئے اردوی: ۲۰۲، خط بنام مجروح ملاحظہ ہو۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب میرزا صاحب کے خط میں ماہ اپریل کی ۲۲ تاریخ درج ہے، تو اس صورت میں سرکار کا ۱۹ تاریخ کا خط اس کا جواب کس طرح ہوسکتا ہے۔ اس کے متعلق میری رائے یہ ہے کہ میرزا صاحب کی تاریخ میں سہو ہوا ہے۔ دراصل انھوں نے ۱۲ تاریخ کو خط لکھا ہوگا جس کا ۲۲ بنانا بہت آسان ہے۔ چونکہ مثل میں اور کوئی خط ایسا نہیں ہے، جس میں پوری پنشن کی بحالی کا تذکرہ کیا گیا ہو۔ اس لئے مذکورہ قیاس کو مزید تقویت بہم پہنچتی ہے۔

(۳) اصل خط میں "بریلی کے ملک" ہے۔ حالانکہ "بریلی کا ملک"، یا "بریلی کے ملک" کے لفظ کی ہونا چاہیے۔ چونکہ خط میرزا کے قلم کا نہیں ہے، اس لئے میں نے سہو ناقل پر محمول کرکے اصلاح کردی ہے۔

(۴) یہ خط جو بعد میں خرید اگیا ہے، اصل مکتوب کی بغیر تاریخ کی نقل ہے، اس لئے تاریخ تحریر کا صحیح علم نہیں ہوسکا۔ البتہ اس میں بریلی کا علاقہ ملنے کا ذکر ہے، جو اپریل سنہ ۶۰ء میں فردوس مکاں کو ملا تھا۔ اس لئے قیاس یہ ہے کہ سرکار کے مکتوب مورخہ ۲۰ اپریل سنہ ۶۰ء کے جواب میں میرزا صاحب نے اپریل یا مئی سنہ ۶۰ء کی کسی تاریخ کو لکھا ہوگا۔ سنہ ۵۸ء میں میرزا صاحب نے بریلی کا علاقہ ملنے کی مبارکباد جس بنا پر دی تھی اس کے بارے میں ابھی تک یقینی علم حاصل نہیں ہوسکا۔ بظاہر یہ خیال ہے کہ میرزا صاحب نے دہلی میں یہ افواہ سنی اور اسے باور کرکے قصیدے میں ذکر کردیا۔ بعد ازاں گورنمنٹ کی تحریر سے معلوم ہوا کہ کاشی پور کا علاقہ ملا ہے، جس سے میرزا صاحب کے علم کی تغلیط ہوگئی آخر میں بریلی ہی کے علاقہ میں سے گانو دیئے گئے۔ اس کی اطلاع پاکر میرزا صاحب نے یہ خط لکھا اور اپنی پچھلی اطلاع کی صداقت کھل جانے پر اپنے آپ کو لسان الغیب کا خطاب دیا۔

صفحہ ۲۰

(۱) کلیات غالب: ۷ ۳ ۳۔ ۲ میں یہ قصیدہ چھپ چکا ہے۔

(۲) ۷ محرم سنہ ۱۲۷۷ھ (۲۶ جولائی سنہ ۶۰ء) کو سرکار نے تحریر فرمایا ہے کہ میر منشی کو ہدایت کردی گئی ہے کہ آئندہ سے آپ کے حسب ایما ہنڈوی روانا کی جایا کرے (مثل نمبر ۱، صیغہ احباب عہد فردوس مکان)

(۳) عریضہ نمبر ۲۵ تا ۷۶ میں خلاف معمول لفظ "حضرت" ساقط ہے۔

(۴) میرزا صاحب کا یہ نسخہ کلیات فارسی حسب تصریح فرمان مورخہ ۱۸ رمضان سنہ ۱۲۷۷ھ (۳۰ مارچ سنہ ۱۸۶۱ء) ڈاک کے ذریعہ حضور میں پیش ہوا۔ نواب صاحب نے اس کو مذکورہ

فرمان میں "آئینۂ جہاں نمابل مخزن نکات مسرت افزا" اور فرمان مورخہ ۲۱ رمضان و ۱۵ اپریل میں "ایک دریائے مواج ہے کہ لو ہزاراں لآلی معنی سے" تحریر کیا ہے۔ یہ نسخہ کتب خانۂ سرکاری میں محفوظ ہے خط نہایت صاف کاغذ نیلا اور متعدد مقامات پر میرزا صاحب کی تحریر سے مزین ہے۔ اس کے کاتب کے بارے میں میرزا صاحب نے نواب ضیاء الدین خاں بہادر کو لکھا تھا: "آپ کو دیوان کے دینے میں تامل کیوں ہے؟ روز آپ کے مطالعہ میں نہیں رہتا۔ بغیر اس کے دیکھے آپ کو کھانا ہضم ہوتا ہو، یہ بھی نہیں پھر آپ کیوں نہیں دیتے؟ رہا کتاب کے تلف ہونے کا اندیشہ یہ خفقان ہے کتاب کیوں تلف ہوگی؟ اچھا اگر ایسا ہوا اور دلی لکھنؤ کے عرض راہ میں ڈاک لٹ گئی تو میں فوراً بسبیل ڈاک رامپور جاؤں گا، اور نواب فخر الدین خاں مرحوم کے ہاتھ کا لکھا ہوا دیوان تم کو لا دوں گا۔" (اردوی: ۲۸۹)

صفحہ ۲۱

(۱) تورہ: مختلف اقسام کے لذیذ کھانے جو کم از کم ۲۱ اور زیادہ سے زیادہ ۲۰ خوانوں میں لگا کر بڑے تکلف کے ساتھ تقریبات میں تقسیم ہوتے ہیں۔ نور اللغات: ۲/۲۲۲

(۲) اس عریضے میں نواب فردوس مکاں کے منجھلے صاحبزادے سید حیدر علی خاں بہادر کی شادی کا حوالہ ہے۔ یہ شادی نواب سید احمد علی خاں بہادر ابن نواب سید محمد علی خاں بہادر ابن نواب سید فیض اللہ خاں بہادر کی نواسی کے ساتھ ۱۷ ذی الحجہ سنہ ۱۲۷۷ھ (۲۶ جون سنہ ۱۸۶۱ء) کو قرار پائی تھی مہینوں سے تیاریاں ہو رہی تھیں۔ ملازمان ریاست کو خلعت اور عام باشندگان شہر کو کھانا تقسیم ہوا تھا۔ سارے شہر میں جابجا رقص و سرود کی محفلیں آراستہ کی گئی تھیں۔ ریاست کے بیرونی متوسلین اور احباب کے نام دعوت نامے جاری ہوئے تھے۔ میرزا صاحب نے علائی کو ۵ ستمبر سنہ ۱۸۶۱ء کو لکھا "والی رامپور نے بھی تو فرزند زادے کی شادی میں بلایا تھا۔ یہی لکھا گیا کہ میں معذور محض ہو گیا ہوں۔ تمہارا اقبال تمہارے کلام کو اصلاح دیتا ہے۔ اس سے بڑھ کر مجھ سے خدمت نہ چاہو"۔ (اردوی: ۳۰۵ و ۳۰۲) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں شرکت کی دعوت دی گئی، مگر ضعف طبع سفر سے مانع رہا۔

میرزا صاحب نے آگے بھیجے ایک تہنیت نامہ اور دو قطعات مبارکباد نواب صاحب کی خدمت میں روانہ کیے۔ قطعات مثل میں تو نہیں ہیں لیکن کلیات فارسی نولکشوری ایڈیشن: (۳۱) میں شائع ہو چکے ہیں۔ فرماتے ہیں۔

دید در یوسف علی خاں کز فروغ رای او — مہر تاباں بر در قسط فیض دین ہم یافتم
از دلبعہدش سخن رانم کہ چوں ماہ منیر — طلعتش را دیدہ روشن ساز عالم یافتم
واں دگر فرزانہ فرزند فرہندش کہ ہست — کوکبی کش در دل افروزی اسلم یافتم
خواست تا سازد بآئین بہینش کہ خدا — شاد گشتم، چوں خبر زیں جشن اعظم یافتم
بہرہ بردم در تصور زاں ہمایوں انجمن — بسکہ در خود طاقت رنج سفر کم یافتم
بزم طوی فرخ حیدر علی خاں را بدہر — خوشتر و خرم تر از بزم کی و جم یافتم

سال این دولت فزا شادی با معانِ نظر — "مشتری" "با زہرہ" "در" "طالع" "فراہم یافتم"

اس قطعے میں مصرع آخر کے الفاظ (زہرہ، مشتری، طالع) سے سال جشن کے اعداد ۱۲۷۷ نکلتے ہیں نواب فردوس مکاں کے فرمان مورخہ ۵ رمضان سنہ ۱۲۷۷ھ (۱۷ مارچ ۱۸۶۱ء) میں اس کا ذکر ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ میرزا صاحب نے آغاز مارچ سنہ ۱۸۶۱ء میں لکھ کر یہاں بھیجا۔

دوسرا قطعہ برسات میں بھیجا گیا تھا اس میں فرماتے ہیں

بہار رسید کہ تا مقدم برشکال آں را — پس از دو سال بر اہل جہاں مبارکباد
بباغ و کشت و بیابان و کوہ، سرتاسر — سحاب و سبزہ و آب روان مبارکباد
گزشت عہد سموم و دزید باد خنک — زجان بہ تن، دگر از تن بجاں مبارکباد
اگرچہ رحمت عامست، لیک باشمیم — برا نبود گراں تاگراں مبارکباد
زبرگ برگ غبستاں کہ گرد آں شہر است — رسد بگوش چناں کز زباں مبارکباد
زامنبساط ہوا است آں چناں کہ از رگ ابر — بجای قطرہ تراود ہماں مبارکباد

سپس بداد گرآیم کہ اہل دانش را — شود ہر آئینہ خاطر نشاں مبارکباد
خود ابر و باد بجستی ز دیبا ز نبود... — عطیہ ایست کہ بر ہمگناں مبارکباد
معاف باشم، اگر خود ز خویشتن پرسم — برا نبود خصوصاً چناں مبارکباد
چو را نبود بود وجہ تازہ رو دی دہر — زہر چہ این ہمہ گل کردآں مبارکباد
ز فیض ہمت فرمانروای آں شہر است — کہ در دخلق بود ہر زماں مبارکباد
ظہور میمنت کہ خدای نسر زند — بر آں رجبس سپہر آستاں مبارکباد
کہ میہمان حق است آن و بکفیلی او — نزدل مائدہ بر میہماں مبارکباد
بجیب و دامن مردم ز بخشش نواب — ستارۂ خاصہ دریا دکاں مبارکباد
کشاکشی در گنجینہ دانگہ از در گنج — بہ رستاخیز پاسباں مبارکباد
مبطلبان زر و سیم، سیم و زر فسرخ — لباگلان ہی کاسہ ناں مبارکباد
چمن کہ تشنہ لب بادہ ہای پر زور ہم — از آں میان و دو سہ رطل گراں مبارکباد
گو زخادیِ اہل زمین کہ می گویند — فرشتگان بلند آسماں مبارکباد
بدیں ترانہ کہ ہاں ای امیر شاہ نشاں — لوید فرخی جاوداں مبارکباد
بشہریار و ولیعہد و شاہزادۂ عہد — خوشی و خوبی و دامن داماں مبارکباد
ازاں جہت کہ ستائش نگار نوابی — تر اہم، ای اسداللہ خاں مبارکباد

نواب فردوس مکاں نے غرہ محرم الحرام سنہ ۱۲۷۸ھ (۱۱ جولائی سنہ ۱۸۶۱ء) کو تحریر فرمایا:... "قطعات مبارکباد اور تہنیت نامۂ شادی کتخدائی برخوردار کامگار محمد حیدر علی خاں بہادر ایام فرحت التیام میں سرور افزائی خاطر نیاز ہوئے، اور مرتبہ ہزاراں مسرت و دلشادمانی کا ارزانی کیا۔ سبحان اللہ! ہر ایک شعر قطعوں اور تہنیت نامے کا مضامین رنگین اور معانی الطافت تضمین سے ایسا مملو تھا کہ حصول اس کا احاطۂ تحریر و تقریر سے خارج ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ابدالدہر سلامت باجمعیت رکھے۔" (مثل نمبر ۲، صیغۂ احباب فردوس مکاں)

اس فرمان سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ مذکورۂ بالا قطعۂ مبارکباد موسم برشکال میں ۱۲جولائی سے قبل سرکار کے حضور میں پیش ہو گیا تھا اب صرف تہنیت نامہ باقی رہ جاتا ہے۔ بظاہر عریضہ ۱۴ کو تہنیت نامہ معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اس کو مذکورۂ فرمان تہنیت نامہ قرار نہیں دے سکتے۔ بھیجی کہ فرمان سے مترشح ہے کہ تہنیت نامہ بھی منظوم تھا، اور یہ عریضہ منثور ہے۔ علاوہ بریں اس کو تہنیت قرار دینا اس لئے ناممکن ہے کہ یہ لفافے کی انگریزی تاریخ کے مطابق ۱۵ جولائی کو لکھا گیا تھا، اور تہنیت نامہ کا ذکر نواب صاحب کے ۱۲ جولائی کے فرمان میں آچکا ہے۔

خزانے کے اوراج سے پتہ چلتا ہے کہ تورہ اور خلعت کے روپے جس کا میرزا صاحب کے مکتوب میں شکریہ ادا کیا گیا ہے، پہلی محرم سنہ ۱۲۷۸ھ (۱۱ جولائی ۱۸۶۱ء) کو یہاں سے بھیجے گئے تھے۔ یہی تاریخ سرکار کے اس فرمان کی ہے جس میں میرزا صاحب کے قطعات مبارکباد اور تہنیت نامے کا ذکر ہے۔ تو گویا فرمان سرکار کے ساتھ ہی ہنڈوی بھی روانہ ہو گئی تھی۔

(۳) میرزا صاحب کے اس حسن طلب پر سرکار نے انھیں کچھ سمجھایا نہیں، اس کے متعلق تمام کاغذات خاموش ہیں۔ غالباً سرکار نے اسے میرزا صاحب کی ظرافت پر محمول کیا اور دفتر رپیہ ارسال فرماتے۔

(۴) حسن علی خاں کے متعلق معلوم نہ ہو سکا کہ یہ کون صاحب تھے۔

(۵) علی بخش خاں شیخ محبوب بخش ابن شیخ امان اللہ کے بیٹے تھے۔ یہ ۱۴ شوال ۱۲۲۸ھ (۱۸۱۳ء) کو نجیب آباد میں پیدا ہوئے۔ ان کے دادا اور نانا ریاست کے بڑے اسنے ذکر اور خدمت گزار تھے۔ انھوں نے بھی ایام غدر میں بڑی جانفشانی اور خیر خواہی سے کام کیا؛ اور صلے میں گورنمنٹ سے پانچ ہزار روپے کا خلعت، تلوار طلائی، گھڑی اور تین ہزار چودہ روپے سالانہ کی جاگیر ضلع مرادآباد میں انعام پائی۔ نواب خلد آشیاں نے تخت نشینی کے ایک سال بعد انھیں چالیس ہزار روپے نقد یکمشت عطا کیے۔ اور جب یہ بیمار ہوئے تو دو بار بہ نفس نفیس ان کی عیادت کو تشریف لے گئے۔ انھوں نے ۲ محرم سنہ ۱۲۹۴ھ (۱۸۷۷ء) کو رامپور میں انتقال کیا اور مولانا جمال الدین کے احاطۂ مزار میں دفن ہوئے۔ آل محمد مارہروی نے (دیوان تواریخ: ۶۹) یہ قطعۂ تاریخ لکھا ہے:

علی بخش خاں مرد نامی گذشت ۔۔۔ بہ امر دو من فضل رب غفور

بتاریخش آل محمد نوشت ۔۔۔ شدہ جنتی نایب رامپور

ان کی اولاد میں مولانا محمد علی مرحوم جیسے اسلامی شہرت کے قومی رہنما ہوئے ہیں۔ (اخبار الصنادید: ۱۰۲۱/۱؛ و تذکرۂ کاملان رامپور: ۲۷۶)

(۶) میر سرفراز حسین میر مہدی مجروح کے بھائی اور میر افضل علی عرف میرن صاحب اُن کے دوست تھے۔ میرزا صاحب سے بھی ان دونوں کے خروانہ تعلقات تھے۔ اردوئے معلی اور عود ہندی میں اُن کے نام متعدد خطوط درج ہیں۔ میرزا صاحب نے اُن کی پریشان روزگاری کا حال دیکھا تو خانساماں صاحب کے نام تعارفی خط دے کر رامپور بھیجا

شومئ بخت سے اس وقت یہاں ملازمت نہ مل سکی، اور یہ دونوں سو روپے کی
زیرباری کے بعد واپس چلے گئے۔ اس سلسلے میں میرزا صاحب نے ۲۶ جولائی
۱۸۶۱ء کو میر مہدی کو لکھا ہے: "سید صاحب، کل پیر دن رہے تمہارا خط پہنچا۔
یقین ہے کہ اسی وقت یا شام کو میر سرفراز حسین تمہارے پاس پہنچ گئے ہوں۔ حال سفر کا جو
کچھ ہے ان کی زبانی سن لو گے۔ میں کیا لکھوں! میں نے بھی جو کچھ سنا ہے انھیں سے
سنا ہے۔ اُن کا اس طرح ناکام پھرنا میری تمنا اور میرے مقصود کے خلاف ہے۔
لیکن میرے عقیدے اور میرے تصور کے مطابق ہے۔ میں جانتا ہوں کہ وہاں کچھ نہ ہوگا
سو روپے کی ناحق زیرباری ہوئی۔ چونکہ یہ زیرباری میرے بھروسے پر ہوئی تو مجھے
شرمساری ہوئی۔ لیکن میں نے اس چھیاسٹھ برس میں اس طرح کی شرمساریاں اور
روسیاہیاں بہت اٹھائی ہیں جہاں ہزار داغ ہیں، ایک ہزار ایک سہی۔ میر
سرفراز حسین کی زیرباری سے دل کڑھتا ہے۔" (اردوی: ۱۸۵) بعد ازاں ۱۸ اگست
سنہ ۱۸۶۱ء کو پھر لکھتے ہیں: "بھائی تم سچ کہتے ہو۔ ع بر سر اولادِ آدم ہرچہ آید بگذرد۔ لیکن
مجھے افسوس اس بات کا ہے کہ یہ زیرباری میری تحریر کے بھروسے پر ہوئی اور خلاف
میری مرضی کے ہوئی۔ جس طرح سے یہ آئے ہیں۔ اگرچہ میری طبیعت اور میری
خواہش کے منافی ہے، لیکن واللہ میرے عقیدے اور تصور اور قیاس کے مطابق ہے
یعنی میں یہی سمجھا تھا کہ البتہ یونہی ہوگا۔" (ایضاً: ۱۵۴)
نواب فردوس مکاں کے ایک فرمان مورخہ ۱۶ اگست سے پتہ چلتا ہے کہ میرزا صاحب
کی ہدایت کے مطابق اُن کی جولائی کی تنخواہ میں سے پچیس روپے نقد میر سرفراز حسین صاحب
کو غالباً زادِ راہ کے لیے منشی سیل چند کی معرفت دیے گئے تھے۔ (مثل نمبر ۱۹، صیغہ جات
عہدِ فردوس مکاں)

(۷) اس لفظ کو میرزا صاحب نے "باالہ" لکھا ہے۔

صفحہ ۲۲

(۱) نواب صاحب کے مذکورہ سفر کی تفصیل یہ ہے کہ: ". . . جنابِ ملکہ معظمہ وکٹوریہ آنجہانی
کا ایک فرمان ۲۰ جولائی سنہ ۱۸۶۱ء کو صادر ہوا۔ جس کا خلاصہ یہ ہے۔
ما بدولت نے اپنی مرضی خاص اور علم کامل اور عزم مبارک سے ایک رتبہ جدید بنایا
جو آج سے دوام کے لیے خطاب، موسٹ اگزالٹڈ آرڈر آف دی اسٹار آف انڈیا
سے موسوم ہو کر مشہور ہوگا، تجویز اور ایجاد کیا ہے؛ اور ما بدولت کا ارشاد ہوتا ہے
کہ رتبہ مذکور میں ایک شخص ساورن (سردار اعلیٰ)، ایک گرانڈ ماسٹر، سردار
اور پچیس نائٹ، (بہادر: ستر یک رہیں اور والیانِ ہند اور سرداران
ہندوستانی اور ہماری رعایا میں سے ۲۵ اشخاص، جو اس قسم کی لیاقت رکھتے ہوں
اس رتبہ عالی سے محروم نہ کیے جائیں۔ ما بدولت کی تجویز اقدس سے ما بدولت کا عزیز
مشیر اکبر چارلس جان ارل کیننگ، گورنر جنرل ہندوستان، اس . . . رتبے کے
اول سردار مقرر ہوئے اور یہ مقتضائے دانشمندی اور مصلحت ہے کہ رتبہ مذکور کا طرّہ ایسے

اشخاص کو جو وقتاً فوقتاً ماجدولت کی تجویز اقدس سے نامزد ہو کر اس رتبے کے بہادر مقرر کیے جائیں، عہدۂ موسومۂ نائٹ جلیلہ عطا کرنے کا مجاز ہے" . . . . .

اس کام کے واسطے لارڈ کیننگ صاحب نے ایک دربار الٰہ آباد میں مقرر کرنے کی تجویز کی اور نواب سید یوسف علی خاں بہادر کو بھی بلایا۔ نواب صاحب مع خدم و حشم، الٰہ آباد گئے۔ یکم نومبر سنہ ۱۸۶۱ء کو ایک شاہانہ دربار منعقد ہوا . . . . . جب تمام اہالی جلسہ اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھ گئے، تو نواب صاحب بہادر تخت شاہی کے محاذی تشریف لے گئے۔ اور گورنر جنرل نے اپنے ہاتھ سے اس رتبے کے نشان عطا فرمائے اور کھڑے ہو کر بیان کیا: . . . . چونکہ یہ رتبہ سب سے پہلے آپ صاحبوں کو عطا ہوا ہے امید ہے کہ آپ ہند کے باشندوں میں ایسا طریقہ اختیار کریں گے کہ آپ کا طرز عمل دیکھنے سے ہند کے سرداروں یا باج گزاروں کو ملکۂ معظمہ کے ساتھ محبت دلی اور اتحاد قلبی پیدا ہو۔ بعد اس تقریر کے دربار برخاست ہوا، اور نواب صاحب گورنر جنرل سے رخصت ہو کر اپنے دارالریاست کو واپس تشریف لائے" (اخبار الصنادید ۲، ۱۱۳-۱۱۵)

نواب صاحب کے فرمان بنام غالب مورخہ ۱۲ ربیع الاول سنہ ۱۲۷۸ھ (۱۸ اکتوبر سنہ ۱۸۶۱ء) سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۳ اکتوبر سنہ ۱۸۶۱ء کو الٰہ آباد روانہ ہونے کا ارادہ اور تقریباً ایک ماہ رامپور سے باہر رہنے کا خیال تھا (مثل نمبر ۴۴)۔ لیکن میرزا صاحب کے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ نومبر کے پہلے ہفتے میں تشریف لے گئے تھے۔

(۲) میرزا صاحب کو قولنج کا پہلا دورہ ۲۴ مئی سنہ ۱۸۵۸ء کو ہوا تھا۔ تفتہ کو لکھتے ہیں: "بھائی وہ خط پہلا تم کو بھیج چکا تھا کہ بیمار ہو گیا۔ بیمار کیا ہوا، توقع زیست کی نہ رہی۔ قولنج اور پھر کیسا شدید کہ پانچ پہر مرغ نیم بسمل کی طرح تڑپا کیا . . . . . . کل سے خوف مرگ گیا ہے اور صورت زیست کی نظر آئی ہے" (خطوط: ۱، ۲۵)۔ اس کے بعد ۲۹ ستمبر ۱۸۶۱ء کو لکھتے ہیں: "نہ تندرست ہوں، نہ رنجور ہوں، نہ بدستور ہوں" (ایضاً: ۱۴۰)۔ ۱۱ نومبر ۱۸۶۱ء کو سرکار کے خط میں یہ لکھا ہے کہ ایک مہینے سے بیمار ہوں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی طبیعت ستمبر کے آخر ہی میں جادۂ اعتدال سے ہٹ گئی تھی، اور تقریباً ۱۱ یا ۱۲ اکتوبر کو قولنج کا جو دورہ ہوا، اسی کا یہ پیش خیمہ تھا۔ سنہ ۱۸۶۲ء کے آخری مہینوں میں یہ دورہ جلد جلد ہونے لگا تھا۔ ۴ نومبر سنہ مذکورہ کو نواب میر غلام بابا خاں کی دعوت قدوم سورت پر لکھتے ہیں: "ایک ہفتہ، دو ہفتہ کے بعد ناغہ و قولنج دوری کی شدت ہوئی ہے" (اردوی ۹)۔

(۳) میرزا صاحب نے اس لفظ کو بتشدید یا لکھا ہے۔

(۴) ان دونوں لفظوں کو میرزا صاحب نے ایک الف زائد کے ساتھ، بالفعل اور بالکل۔ لکھا ہے۔

(۵) اس مثنوی کے متعلق لفافے کی پشت پر نوشتہ ہے: "تاریخ نزد منشی سیلچند ماندہ" سرکار نے اس کی تعریف میں، ۱ نومبر کو تحریر فرمایا: "سبحان اللہ ہر تاریخے بے بدل الفاظ

نادر اور تحفہ جو بے مثل ہے۔"

صفحہ ۲۳

(۱) نورالدین ظہوری، ترشیز (ایران) کا باشندہ تھا۔ سنہ ۹۸۸ھ (۱۵۸۰ء) میں دکن آیا اور ابراہیم عادل شاہ کے دربار میں تقرب حاصل کیا، اور سنہ ۱۰۲۵ھ (۱۶۱۶ء) میں فوت ہوگیا۔ اس کی سہ نثر اور کلیات مشہور ہے۔

(۲) میرزا صاحب نے "فرمائیے"، بتشدید یا لکھا ہے۔

(۳) خدا جانے کس بات سے میرزا صاحب کو شک گزرا کہ سرکار کچھ کشیدہ ہیں۔ ورنہ مثلوں میں تو سرکار کے سنہ ۶۲ء کے لکھے ہوئے خیریت جوئی کے فرمان خاصی تعداد میں موجود ہیں۔

(۴) یہ عبارت عریضے کے آخر میں مہر کے بعد تحریر ہے۔

صفحہ ۲۴

(۱) لفافے پر "یوم جمعہ ۱۰ اکتوبر سنہ ۱۸۶۲ء" لکھا ہے۔

(۲) سر رابرٹ منٹگمری صاحب مراد ہیں۔ یہ فروری سنہ ۱۸۵۹ء سے جنوری سنہ ۱۸۶۵ء تک پنجاب کے لفٹننٹ گورنر رہے تھے۔ قدر بلگرامی کے نام کے مکتوب سے معلوم ہوتا ہے کہ میرزا صاحب ان کے دربار میں شریک نہیں ہوئے۔ دربار کے بعد منٹگمری صاحب نے بلا کر اپنی طرف سے خلعت عطا کیا، اور وہیں دربار انبالہ کے متعلق گفتگو ہوئی۔ فرماتے ہیں: "..... رابرٹ منٹگمری صاحب لفٹننٹ بہادر قلمرو پنجاب یہاں (دلی) آئے، دربار کیا۔ میں نہ گیا۔ دربار کے بعد ایک دن بارہ بجے چپراسی آکر مجھ کو بلا لے گیا۔ بہت عنایت فرمائی، اور اپنی طرف سے خلعت عطا کیا۔" (اردوی: ۶۰۳، لاہور ایڈیشن سنہ ۱۹۲۶ء) شیو نرائن کے نام کے خط میں فرماتے ہیں: "..... بڑے لارڈ صاحب کے ورود کے زمانے میں نواب لفٹننٹ گورنر بہادر پنجاب بھی دلی میں آئے۔ دربار کیا، حیز کرد، مجھ کو کیا؟ ناگاہ دربار کے تیسرے دن بارہ بجے چپراسی آیا، اور کہا کہ نواب لفٹننٹ گورنر نے یاد کیا ہے۔ بھائی، یہ آخر فروری ہے، اور میرا حال یہ ہے کہ علاوہ اس دا ہنے ہاتھ کے زخم کے سیدھی ران میں اور بائیں ہاتھ میں ایک ایک پھوڑا جدا ہے۔ حاجتی میں پیشاب کرتا ہوں، اٹھنا دشوار ہے۔ بہرحال سوار ہوا، گیا۔ پہلے صاحب سکرتر بہادر سے ملا، پھر نواب صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ تصور میں کہاں بلکہ تمنا میں بھی جو بات نہ تھی وہ حاصل ہوئی، یعنی عنایت سی عنایت، اخلاق سے اخلاق، وقت رخصت خلعت دیا، اور فرمایا کہ یہ ہم تجھ کو اپنی طرف سے از راہ محبت دیتے ہیں، اور مژدہ دیتے ہیں کہ لارڈ صاحب کے دربار میں بھی تیرا نمبر اور خلعت کھل گیا انبالے جا، دربار میں شریک ہو، خلعت پہن۔ حال عرض کیا گیا۔ فرمایا: "خیر اور کبھی کے دربار میں شریک ہونا۔" اس پھوڑے کا برا ہو انبالے نہ جا سکا۔" (اردوی: ۳۸۳ ـ ۳۸۲)

(۳) لارڈ ایلگن بہادر مراد ہیں۔ یہ لارڈ کیننگ کے بعد ہندوستان کے وائسرائے ہوئے۔ جنوری سنہ ۱۸۶۲ء میں جائزہ لیا اور ۲۰ نومبر سنہ ۱۸۶۳ء کو فوت ہوگئے۔ میرزا صاحب ایک مکتوب کے آخر میں لکھتے ہیں: "جمادی الثانی سال غرہ مطابق ۱۸۶۵ء اپریل گیا

غضب ہے ہے، یہ گویا تاریخ وفات جناب نواب گورنر جنرل لارڈ الگن صاحب بہادر کی ہے۔" (اردوئ: ۴۰۵)

صفحہ ۲۵

(۱) میرزا صاحب نے ۱۲ رمضان (۱۴ مارچ سنہ ۱۸۶۳ء) کو تفتہ کے نام حسب ذیل خط لکھا ہے: "...... ہمیشہ نواب گورنر جنرل کی سرکار سے دربار میں مجھ کو سات پارچے اور تین رقم جواہر خلعت ملتا تھا۔ لارڈ کیننگ صاحب میرا دربار اور خلعت بند کر گئے ہیں۔ ناامید ہو کر بیٹھ رہا، اور مدۃ العمر کو مایوس ہو رہا۔ اب جو یہاں لفٹنٹ گورنر پنجاب آئے ہیں جانتا تھا کہ یہ بھی مجھ سے نہ ملیں گے۔ کل انہوں نے مجھ کو بلا بھیجا۔ بہت سی عنایت فرمائی اور فرمایا کہ لارڈ صاحب دلی میں دربار نہ کریں گے۔ میرٹھ ہوتے ہوئے اور میرٹھ میں ان اضلاع کے علاقہ داروں اور مالگزاروں کا دربار کرتے ہوئے انبالے جائیں گے۔ دلی کے لوگوں کا دربار وہاں ہوگا۔ تم بھی انبالے جا کر شریک دربار ہو کر خلعت معمولی لے آؤ۔ بھائی، کیا کہوں کہ کیا میرے دل پر گزری گویا مردہ جی اٹھا۔ مگر ساتھ اس مسرت کے یہ بھی سنا کہ گزرا کہ سامان سفر انبالہ و مصارف بے انتہا کہاں سے لاؤں؟ اور طرہ یہ کہ نذر معمولی میری قصیدہ ہے۔ ادھر قصیدے کی فکر، ادھر روپے کی تدبیر۔ حواس ٹھکانے نہیں۔ شعر کام دل و دماغ کا ہے، وہ روپے کی فکر میں پریشان۔ میرا خدا یہ مشکل بھی آسان کر یگا۔ لیکن ان دنوں میں نہ دن کو چین ہے، نہ رات کو نیند ہے۔ یہ کئی سطریں تمہیں اور ایسی ہی کئی سطریں جناب نواب صاحب کو لکھ کر بھیجدی ہیں۔ جیتا رہا تو انبالے سے آ کر خط لکھوں گا۔" (اردوئ: ۱۱)

اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ میرزا صاحب نے محولۂ بالا سطریں، چار پانچ کو یا اس سے ایک دو دن قبل نواب صاحب کی خدمت میں ارسال کی تھیں۔ سوء اتفاق سے ان سطور والا عریضہ مثل میں موجود نہیں۔ البتہ نواب صاحب کا جواب شامل ہے۔ القاب و آداب کے بعد ارشاد فرمایا ہے: "...... شفقتا! ہنڈوی مبلغ دو صد روپیہ برائے مصارف تشریف فرمائی سامی برائے ملازمت جناب مستطاب معلٰی القاب ایہم معطوف رقیمۂ الوداد ہذا مرسل خدمت شریف است۔" یہ فرمان ۱۸ مارچ سنہ ۱۸۶۳ء کو تحریر کیا گیا تھا۔ میرزا صاحب کے عریضے میں اسی کا حوالہ ہے۔ اصل عریضے کے جواب میں۔ نواب فردوس مکاں نے ۱۹ مارچ کو تحریر فرمایا: "...جو کہ خط نواب صاحب کمشنر بہادر سے عدم حصول شرف ملازمت جناب مستطاب معلٰی القاب نواب گورنر جنرل بہادر دام اقبالہم کا بمقام انبالے مستنبط ہے، اس واسطے تشریف لیجانا آپکا بے نیل و بلا استجازت ضرور معلوم نہیں ہوتا۔ آئندہ جو رائے زریں آپ کی اس خصوص میں مقتضی ہو، اور خط مسطور بجنسہٖ واپس بھیجا جاتا ہے......"

(۲) قصیدۂ مذکور کے لیے مثنوی ابر گہر بار ص ۲۵-۳۰ (اکمل المطابع، دہلی، سنہ ۱۲۸۰ھ) ملاحظہ ہو

(۳) میرزا صاحب کا یہ جملہ غمازی کرتا ہے کہ انھیں لفٹنٹ گورنر (گورنر جنرل) کے میر منشی دونوں سے بحالی دربار کی اطلاع سُن لینے کے بعد بھی یقین نہیں ہوا تھا، جس کی ظاہری وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ انھیں بحالی کی تحریری اطلاع نہیں دی گئی تھی، ورنہ ذرا ذرا سی بات پر ناامید نہ ہوتے۔

صفحہ ۲۶

(۱) صاحب سکرتر بہادر کے محولۂ بالا خط کی نقل حسب ذیل ہے:

نقل خط جناب صاحب سکرتر بہادر

سرنامہ

درشہر دہلی

خانصاحب بسیار مہربان دوستان، مرزا اسد اللہ خاں، سلمہ اللہ تعالیٰ:

خطابر کاغذ افشاں:

خانصاحب بسیار مہربان دوستان سلامت

قصیدہ باآب و تاب در مدحت بندگان نواب مستطاب معلّی القاب وائسرای و گورنر جنرل بہادر، دام اقبالہ، وصول گردیدہ، بر رخ ارادت آں مہربان آبی، و بر جبین عقیدت ایشاں تابی افزود، واز گرانمایہ گوہرہای بحر فکر یکتا سخنور معنی پرور، کہ گنج بر گنج نہادہ بود، از نظر قبولی بندگان نواب صاحب ممدوح گزشتہ، طرب پیرای خاطر ہمایون ایشاں گشت۔ زیادہ چہ نگاشتہ آید [دستخط انگریزی] مرقوم ۳۰ جولائی سنہ ۱۸۶۳ء۔

یہاں یہ امر قابل اظہار ہے کہ میرزا صاحب کے اس روحانی سرور کے حصول میں اُن کے ایک جسمانی عارضے نے خلل اندازی کی۔ ۲ مارچ سنہ ۱۸۶۳ء کو میر سرفراز حسین کو لکھتے ہیں: "رجب کے مہینے میں سیدھے ہاتھ پر ایک پھنسی ہوئی، پھنسی پھوڑا ہو گئی، پھوڑا پھوٹ کر زخم بنا، زخم بگڑ کر غار ہو گیا۔ اب بقدر یک کف دست وہ گوشت مردار ہو گیا۔ انبالے نہ جانے کی بھی یہی وجہ ہوئی" (اردوی: ۱۵۲) بعد ازاں ۳ مئی کو شیو نرائن کو لکھا ہے " . . . اس پھوڑے کا برا ہو! انبالے نہ جا سکا" (ایضاً: ۳۸۴) تفتہ کو ایک غیر مورخہ خط میں اطلاع دی ہے: "... لو صاحب، ہم نے لفٹنٹ گورنر کی ملازمت اور خلعت پر قناعت کر کے انبالے کا جانا موقوف کیا، اور بڑے گورنر کا دربار اور خلعت اور وقت پر موقوف رکھا بیمار ہوں۔ ہاتھ پر ایک زخم، زخم کیا ایک غار ہو گیا ہے۔ دیکھیے انجام کار کیا ہوتا ہے" (ایضاً ۷۸ ۳ لاہور ایڈیشن سنہ ۱۹۲۶ء)

(۲) آموں کی بہنگیاں ۲۹ جون سنہ ۱۸۶۴ء کو یہاں سے روانہ کی گئی تھیں

صفحہ ۲۷

(۱) حبن علی خاں کے لئے دیباچے کی بحث۔ خاندان نسبی' ملاحظہ ہو۔

(۲) میرزا صاحب نے اس لفظ کا املا (بالکل) لکھا ہے۔

(۳) نواب فردوس مکاں اس سال عارضہ سرطان میں مبتلا ہو کر مسلسل چھ ماہ تک علیل رہے

میرزا صاحب سے اُن کے تعلقات شاگردانہ اور کریمانہ تھے۔ جب انھیں علالت کی اطلاع ملی، تو بہت متردد ہوئے اور بذریعہ عریضۂ ہذا حقیقتِ مرض سے آگاہ کرنے کی درخواست کی۔ مثل میں اس عریضے کا جواب موجود نہیں۔ اس سے خیال ہوتا ہے کہ غالباً شدتِ مرض کے سبب جواب میں تاخیر ہوئی، اور اس عرصے میں میرزا صاحب کا آیندہ خط بھی موصول ہوگیا، تو دونوں کے جواب میں مرض کی حقیقت سے انھیں اطلاع دی گئی۔

صفحہ ۲۸

(۱) اصل میں یہ لفظ شہر ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ میرزا صاحب اسے صرف ایک ہی ساکن کے ساتھ بولتے تھے۔

(۲) یا تو عبارت یوں ہونا چاہیے: "اس خط کا جواب آنے کی مدت سے پہلے" اور یا "اس خط کے جواب کے آنے کی مدت سے پہلے"۔ بظاہر یہاں سہوِ قلم نظر آتا ہے۔

(۳) اس عریضے کے جواب میں ۱۹ نومبر کو نواب صاحب نے تحریر فرمایا: "مشفقا! بفضل الٰہی سے پھوڑے کا حقہ میں بہت تخفیف اور قریب الاندمال ہے"۔ عریضہ ۵۳ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ فرمان میرزا صاحب کو ۲۶ نومبر کو موصول ہوا

صفحہ ۲۹

(۱) اشعارِ مذکورہ کے متعلق عریضے کے لفافے پر نوٹ ہے: "حسب الحکم تاریخ نذرِ مولوی امیر احمد صاحب فرستادہ شد یکم دسمبر ۱۸۶۴ء"۔ امیر مینائی مرحوم نے انتخاب یادگار (ص ۲۵۰ جہاں تہنیتِ غسلِ صحت کے نام سے یہ شعر درج ہیں۔

دانم شنیدہ کہ در اقصای ظلمت	سرچشمۂ کہ خضر شد زدی بقا نزیر
جوی بریدہ اند در دل کردہ انتخاب	حمام را بحوض از ان جوی آب گیر
ہنگامِ شب کہ زیرِ زمیں باشد آفتاب	از تابِ مہر گرم شد آں آب ناگزیر
حمام حوض ننگرد گل جاش آسماں	واں را سپید کردہ فروغ سپہر منیر
آمد برای غسل بہ گرما بہ اندروں	مانندِ مہی کہ دہر در دی در ضمیر
اینک فزوغ داختر نیک دجستہ رز	پیدا ست زیں اسم لفظ تاریخ دلپذیر

"سبد چیں" (ص ۱۵، طبع دہلی، سنہ ۱۹۳۸ء) میں ان کی بجائے ۲۶ شعر کا ایک قصیدہ طبع ہوا ہے۔ جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ میرزا صاحب نے ان میں سے سات شعر چن کر نواب فردوس مکاں کے حضور میں پیش کیے تھے۔ نواب صاحب نے اس قطعے کی تعریف میں حسبِ ذیل گرامی نامہ بہ ۱۵ شعبان ۱۲۸۱ھ ۱۳ جنوری سنہ ۱۸۶۵ء کو تحریر فرمایا:

"ہماری صحت کی تہنیت میں قطعہ مبارکباد کا جو آپ نے بھیجا ہے، وہ پہنچا۔ اس کے آنے سے سرورِ صحت دوبالا ہوگیا۔ ایسی نظم، ایسی تاریخیں دوسرے سے کب ہوسکتی ہیں! سچ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بے مثل اور عدیم النظیر پیدا کیا ہے۔ جس کمال کو دیکھیے، اُس میں آپ کی ذات فردِ کامل ہے۔ فی الحقیقت ہم نے اس مرض میں بڑی تکلیف اٹھائی، بہت ایذا پائی۔ اللہ نے بڑا فضل فرمایا۔ دوستوں کی دعا کو قبول کیا۔ شفا حاصل ہوگئی ہے

اندک زخم اندمال ہونے کو باقی ہے۔ غالب ہے کہ دس بارہ دن میں مرہم لگانا موقوف ہو جائے۔ آپ کا ہدیہ مرسلہ اکثر نقل محفل رہتا ہے، جو سنتا ہے جو دیکھتا ہے وارفتہ ہو جاتا ہے۔ سچ ہے ایسے لوگ کہاں پیدا ہوتے ہیں، ہزاروں برس فلک چرخ لگاتا ہے۔ تب کہیں ایک شخص اس کمال کا پیدا ہوتا ہے۔ اللہم، بعصمت و عافیت طول عمر عطا کرے، اور تا دیر گاہ اہل جہاں آپ کی ذات سے مستفید ہو کریں۔ باقی خیریت۔"

صفحہ ۳۰

(۱) یہ انگریزی لفظ "کیمپ" سے بنایا گیا ہے۔ "کیمپ" کے معنی ہیں پڑاؤ۔ بعض پرانے بزرگ کیمو بھی بولتے اور لکھتے تھے۔

(۲) اصل: ہر یک۔ لیکن یہ سہو قلم ہے۔

صفحہ ۳۱

(۱) میرزا صاحب نے "تونگر" لکھا ہے۔

(۲) اس سے یہ شبہہ نہ ہو کہ میرزا صاحب علم نجوم کے عالم تھے۔ انھوں نے خود میر مہدی مجروح کو لکھا ہے: "... تحویل آفتاب بہ حمل کے باب میں نئی بات یہ ہے کہ ۲۲ مارچ کو واقع ہوتی ہے۔ کبھی ۱۰ اور کبھی ۱۱ کبھی آ پڑتی ہے۔ اس سے تجاوز نہیں رہا طالع وقت تحویل درست کرنا بے کتب فن اور بے علم ممکن نہیں۔ میرے پاس یہ دونوں باتیں نہیں۔"
(اردوی لاہور ایڈیشن: ۱۰۲)

(۳) میرزا صاحب نے یہاں ہمزہ لکھا ہے۔

صفحہ ۳۲

(۱) میرزا صاحب نے ہمزہ لکھا ہے۔

(۲) میرزا صاحب نے اس لفظ کو "پولناگ" لکھدیا ہے۔

(۳) قطعہ تاریخ غسل عریضہ (۳۹) کے حاشیہ میں درج کیا جا چکا ہے۔ قصیدہ تہنیت جو منشی سیل چند کے نام کے خط مورخہ ۱۹ جنوری سنہ ۱۸۶۵ء کے مطابق، ۲ شعبان سنہ ۱۲۸۱ھ (۳ جنوری سنہ ۱۸۶۵ء) اور ۲۵ رجب ۱۲۸۱ (۲۵ دسمبر سنہ ۱۸۶۴ء) کے درمیان لکھا گیا تھا، شامل نہیں ہے۔ لیکن اردو دیوان غالب مع شرح نظامی (مطبوعہ نظامی پریس بدایوں، ۱۹۲۲ء) کے صفحات ۲۴۳-۲۴۷ پر ایک قصیدہ پایا جاتا ہے، جو نواب سعید الدین احمد خاں طالب مرحوم جاگیردار ریاست لوہارو سے رسالہ "کمال" دہلی کو حاصل ہوا تھا اور اس کی اشاعت جنوری سنہ ۱۹۰۰ء سے مولانا نظامی نے نقل کیا ہے۔ مولانا کے خیال میں یہ قصیدہ نواب خلد آشیاں کے غسل صحت کی تہنیت میں لکھا گیا تھا میرے نزدیک یہ میرزا غالب کا محولہ بالا قصیدہ ہے اس لئے کہ اس میں جشن کے موقع پر عید، نوروز اور ہولی کا جمع ہونا تحریر کیا گیا ہے۔ اور امیر مینائی کے قطعہ تاریخ (انتخاب یادگار: ۵۰ و مراۃ الغیب: ۲۰۳، مطبع نولکشور، کانپور سنہ ۱۹۰۴ء) سے معلوم ہوتا ہے کہ تینوں کا یہ اجتماع نواب فردوس مکاں کے غسل صحت کے وقت ہوا تھا۔ ان کے قطعے کا آخری مصرع ہے: "ہے مہینا عید کا، نوروز کا دن، روز صحت ہے۔"

میرزا صاحب کا قصیدہ حسب ذیل ہے

مرحبا سال فرخی آئیں	عید شوال و ماہ فروردیں
شب و روز افتخار لیل و نہار	مہ و سال، اشرف شہور و سنیں
گرچہ ہے بعد عید کے نوروز	لیک بیش از سہ ہفتہ بعد نہیں
سو اس اکیس دن میں ہولی کی	جا بجا مجلسیں ہوئیں رنگیں
شہر میں کو بکو عبیر و گلال	باغ میں سو بسو گل و نسریں
شہر گویا نمونۂ گلزار	باغ گویا نگار خانۂ چیں
تین تیوہار اور ایسے خوب	جمع ہرگز ہوئے نہ ہوں گے کہیں
پھر ہوئی ہے اسی مہینے میں	منعقد محفل نشاط قریں
محفل غسل صحت نواب	رونق افزائی مسند تمکیں
بزم گہ میں، امیر شاہ نشاں	رزم گہ میں، حریف شیر کمیں
پیشگاہ حضور، شوکت و جاہ	خیر خواہ جناب، دولت و دیں
جن کی مسند کا آسماں گوشہ	جن کی خاتم کا آفتاب نگیں
جس کی دیوار قصر کے نیچے	آسماں ہے گدائی سایہ نشیں
دہر میں اس طرح کی بزم سرور	نہ ہوئی ہو کبھی بروی زمیں
انجمن چرخ، گوہر آگیں فرش	نور سے، ماہ ساغر سیمیں
راجہ اندر کا جو اکھاڑہ ہے	ہے وہ بالائے سطح چرخ بریں
وہ نظر گاہ اہل وہم و خیال	یہ ضیا بخش چشم اہل یقیں
واں کہاں یہ عطا و بذل و کرم	کہ جہاں گدیہ گر کا نام نہیں
یاں زمیں پر نظر جہاں تک جائے	ژالہ آسا بچھے ہیں در ثمیں
نغمۂ مطربان زہرہ نوا	جلوۂ لولیان ماہ جبیں
اس اکھاڑے میں جو کہ ہے مطلوب	یاں وہ دیکھا بچشم صورت بیں
سرور شہر فر ہوا جو سوار	بہ کمال تجمل و تزئیں
سب نے جانا کہ ہے پری توسن	اور یاں پری کا ہے دامن زیں
نقش سم سمند سے یک سر	بن گیا دشت دامن گل چیں
فوج کی گرد راہ مشک فشاں	رہ رووں کے مشام عطر آگیں
بسکہ بخشی ہے فوج کو عزت	فوج کا ہر پیادہ ہے فرزیں
موکب خاص یوں زمیں پر تھا	جس طرح ہے سپہر پر پرویں
چھوڑ دیتا تھا گور کو بہرام	ران پر داغ تازہ دے کے وہیں
اور داغ آپ کی غلامی کا	خاص بہرام کا ہے زیب سریں
بندہ پرور، ثنا طرازی سے	مدعا عرض فن شعر نہیں
آپ کی مدح، اور میرا منہ!	گر کہوں بھی تو آئے کس کو یقیں
اور پھر اب کہ ضعف پیری سے	ہو گیا ہوں نزار و زار و حزیں

پیری و بیستی خدائی بڑا — دستِ خالی و خاطرِ غمگیں
صرف اظہار ہے ارادت کا — ہے قلم کی جو سجدہ ریزی میں
مدح گستر نہیں، دعا گو ہے — غالبِ عاجزِ نیاز آگیں
ہے دعا بھی یہی کہ دنیا میں — تم رہو زندہ جاوداں آمیں

دیوان غالب اُردو کے طاہر ایڈیشن میں بھی یہ قصیدہ شائع ہو چکا ہے۔

صفحہ ۳۴

(۱) اس نثر کی رسید میں ۵ ذیقعدہ سنہ ۱۲۸۱ھ (۳ اپریل سنہ ۱۸۶۵ء) کو نواب صاحب نے تحریر فرمایا۔ "نثر نثرہ نثار آپ کی آئی۔ جشن صحت کی مسرت بڑھائی۔ زبان خامہ کو مجال صفت نہیں۔ خامہ و زبان کو یارائے مدحت نہیں۔ سچ یہ ہے کہ آپ کی ذات ہر کمال میں فرد کامل ہے ہر فقرے میں قوت سحبانی حاصل ہے۔ انصاف کی تو یہ بات ہے کہ یہ تحریر نہیں کرامات ہے۔ اس جشن میں اگرچہ بظاہر آپ شریک نہیں ہوئے، مگر میرے نزدیک شریک غالب ہے۔ اللہ تعالیٰ صحت و قوت عطا فرمائے۔ مشتاق کو لطف مجالست ہاتھ آئے۔ وست: عالمند ہے۔ نوید صحت کی طبیعت آرزو مند ہے۔ حال اپنا اکثر لکھتے رہیے۔ زیادہ شوق ہے" میرزا صاحب کے خط کے لفافے پر امیر مینائی نے لکھا ہے۔ "بندہ نواز منشی سیلچند صاحب، حسب الامر سرکار مسودہ جواب خط مرزا اسد اللہ صاحب نوشتہ بخدمت میفرستم۔ حسب ضابطہ روانہ یا بدفتر مودہ امیر فقیر"۔ اخبار الصنادید (۲، ۱۲۳) سے معلوم ہوتا ہے کہ حسب تجویز صاحبزادہ سید کاظم علی خاں بہادر عرف چھوٹے صاحب، باغ بے نظیر میں یہ جشن منایا گیا تھا۔

صفحہ ۳۴

(۱) یہ عبارت میرزا صاحب عرائض کے لفافوں پر لکھا کرتے تھے

صفحہ ۳۶

(۱) ۲۴ ذیقعدہ سنہ ۱۲۸۱ھ (۲۱ اپریل سنہ ۱۸۶۵ء) کو جمعے کے دن نصف النہار کے وقت نواب فردوس مکاں نے انتقال کیا۔ ۔ ۔ ۔ اثر دلی پہنچی تو میرزا صاحب نے نواب خلد آشیاں کے نام ۲۷ ماہ اپریل کو ۔ ۔ عریضہ لکھا۔ اصل تحریر مثل میں موجود نہیں، نقل نقعہ کے نام کے مکتوب سے جو ۱۱ مئی سنہ ۱۸۶۵ء کو لکھا گیا تھا، معلوم ہوتا ہے کہ وہ عریضہ تعزیت وفات اور تہنیت جلوس پر مشتمل تھا۔ فرماتے ہیں: رامپور سے اپریل کے مہینے کا روپیہ اور تعزیت و تہنیت کے خط کا جواب آگیا۔ آئندہ جو خدا چاہے (اردوئے معلیٰ: ۲۵۵ لاہور ایڈیشن سنہ ۱۹۲۲ء) نواب خلد آشیاں نے یکم مئی کو اس عریضے کے جواب میں تحریر فرمایا۔ "۔ ۔ صحیفہ عزیزہ مورخہ ۲۷ ماہ گذشتہ اسمی مخلص وصول النظام آورد، بما فیہا مطلع نمود۔ مشفقا! آنچہ منا ہر آں کرم فرما از عہد نواب صاحب قبلہ فردوس مکاں مقرر است ان شاء اللہ تعالیٰ بدستور جاری ماند حسب ضابطہ بنامی تمدید خواہد ماند۔ اس کے بعد سرکار سے ماہ اپریل کی تنخواہ کی ہنڈوی ۔ ۔ ۔ بھیجی۔ میرزا صاحب کا عریضہ اسی فرمان کی رسید ہے۔

(۲۲) یہ رباعی جدا ورق پر لکھ کر میرزا صاحب نے مکتوب ۵ ہم کے ساتھ منسلک کر دی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سال ۲ مئی کو بکر عید تھی ۔

(۲۳) قصیدہ تہنیت مثل میں نہیں پایا جاتا۔ یہاں عود ہندی (ص ۱۷۱)، اور سبد چیں (ص ۱۲) سے نقل کیا جاتا ہے ۔

تجلی کہ ز موسیٰ ربود ہوش بطور	بشکل کلب علی خاں دگر نمود ظہور
خجستہ سرور سلطاں شکوہ ادا نازم	کہ رشک بر کلہش دارد افسر فغفور
ہوای لطف وی، از جاں چریدہ شوش	نگاہ قہر وی، از روی مہ رباید نور
دم نگارش وصف کلام حنبر بیقش	چو خیل مورچہ دود بر ورق حروف سطور
فضای رزم گہش، شاہ راہ قہر و غضب	بساط بزم گہش، کارگاہ سور و سرور
بخوان مشرع بہیں، ہمنوالہ مستعلی	بہ بزم عشق بہیں، ہم پیالہ منصور
زروی رابطۂ حسن، ماہتاب جمال	بحسب ضابطۂ جاہ، آفتاب ظہور
بحکم مرتبہ او حاکم و فلک محکوم	ز راہ قاعدہ، شرع آمر ست و او مامور
چو آب نیل روانی کہ ابستد بمغاک	بود ہمیشہ بہ فنجان وی شراب طہور
زہی وزیر ولی شہریار دانا دل!	تو شاہ کشور حسن و خرد ترا دستور
بنای منظر جاہ ترا، زحل معمار	ثوابت کرہ چرخ ہشتمیں مزدور
ثناگر تو سکندر بہ بارجای جلال	تفاخر تو ارسطو بدرسگاہ شعور
ق برای بزم نشاط تو شمع چوں ریزند	نہ پیہ گاؤ بکار آورند نی کافور
ز فیض نسبت خلق تو، عنبر سارا	بجای موم برآید ز خانہ زنبور
ق بدیں خرام و بدیں قامت و بدیں رفتار	ز بہر فاتحہ آئی اگر بسوی قبور
جہان جانی و جان جہاں، عجب بود	کہ از درود تو ہر مردہ رقص اندر گور
ق بہ پیشگاہ تو، زانو ہمی زند انصاف	کہ ای برحم و کرم در جہانیاں مشہور
در انتقام کشی شیوہ کرم مگزار	برار کام دل بدسگال از ساطور
توئی بعقل فزایندۂ مدح علوم	توئی بعلم کشایندۂ عقود و صدور
صریر خامہ من بین کہ میر باید دل	چنانکہ از لب داؤد استماع زبور
صحیفہ من بین و تابش معنی	عیاں چو شمع فروزندہ در شب دیجور
امیر زندہ دل، آں والی ولایت نظم	بہ کنج خانہ گنجینہ طاسیش گنجور
غروب مہر و طلوع مہ دو ہفتہ بود	رسیدن تو بدیں اوج بعد آں مغفور
چو او بزیر زمیں رفت، آں ولایت یافت	تو باش والی او، ای زہے قرون و دہور
بہ انجمن نرسیدم ز ناتوانائی	ولی بعرض ثنا و دعانیم معذور
بنا کسی پائی تو اگر رسنگاہ داشتی	نبودمی بنعیم دوری ز تو صبور
من آں کسم کہ از فرط ورزش اخلاص	بحیثیت است مرا دعوی دوام حضور
توئی رحیم دل و من سقیم، دوری بہ	مباد، رنجہ شوی از نظارہ رنجور
کنی بدست تہی تر ز کیسہ دلاک	دلی بسینہ بسی تنگ تر ز دیدہ مور

کمی نہ باد کرم از شما، بلا تشبیہ | ز کردگار بود رحمت و ز بندہ قصور
نظر بخستگی و پیری و تہیدستی | قبول کردن تسلیم من خوش است ندور

شعار غالب آزادہ جز دعا نبود | کہ باد سعی دعاگوی در دعا مشکور
بہ دہر تا بود آئین کہ در نوا آرند | رباب و بربط و قانون و نی محفل سور
بہ بزم عیش تو ناہید باد زمزمہ سنج | نسیم عطر فروشش از شمیم طرہ حور
محب ز لطف تو بالندہ، چوں نوا ز ساز! | عدو ز بیم تو نالندہ، چوں خر طنبور

میں نے اس قصیدے کا مقابلہ ایک قلمی ورق سے بھی کیا، جو کلیم رامپوری مرحوم کے پاس تھا۔ ان کا خیال تو یہ تھا کہ یہ وہی پرچہ کاغذ ہے جس کو خود غالب نے میر عوض علی خوشنویس کو بھیجا تھا، تاکہ سرکار میں پیش کرنے کے لئے اس کی خوشخط نقل کر دیں۔ لیکن اس کا خط میرزا صاحب کا نہیں ہے۔ اس بنا پر میں یہ گمان کرتا ہوں کہ کسی نے رامپور بھیجی ہوئی اصل سے نقل کیا ہے۔ چونکہ اس قسم کے نوادرات کلیم مرحوم کو امیر مینائی کے یہاں سے دستیاب ہوئے تھے، کیا عجب ہے کہ یہ نقل بھی انھیں کے لئے تیار کی گئی ہو۔ اس میں جزئی اختلاف بھی پایا جاتا ہے۔ مثلاً مصرع "امیر زندہ دل آں والی ولایت نظم" کو "ناظم نظم و نظم" کے ساتھ لکھا ہے۔ یہ اس کا ثبوت ہے کہ قصیدۂ مذکور میرزا صاحب ہی کے بھیجنے کی نقل ہے، ورنہ دوسرا شخص شعر میں اتنا تغیر کبھی نہ کرتا۔

نواب خلد آشیاں نے ۱۷ محرم الحرام سنہ ۱۲۸۲ھ (۱۲ جون سنہ ۱۸۶۵ء) کو اس قصیدے کے متعلق تحریر فرمایا: "۔۔۔۔ دو قطعہ سامی صحیفہ لطف آگیں، اول مع قصیدۂ تہنیت مسند نشینی، راقم بر ریاست موروثی ملک رامپور و ثانی مع سلام من تصانیف جناب مغفرت مآب نواب صاحب قبلہ فردوس مکان ورود اسعد ارزانی یافتہ، ریزۂ دامن وصول فرحت شمول گشتہ ۔۔۔ حبذا قصیدۂ لآلی مدحت مضامین برجستہ و معانی دل نشستہ اش را برشتۂ ترقیم کشیدن آب دریا بگلیل پیمودن است و شمہ از توصیف فصاحت و بلاغت آں محیط تحریر درآوردن ثوابت آسمان را بہ پنج انگشت شمردن ۔۔۔۔۔ در خیولا بانی نواب مرزا عزم سامی باہلی طرف مسموع گشتہ، موجب کمال مسرتہا ست، چراکہ راقم نیز متمنی ملاقات شریف است۔ اوتعالیٰ شب تاریکی فراق بزودی ہرچہ تمامتر بایام وصال مبدل گرداندی۔"

یہ خط میرزا صاحب کو ۱۷ جون کو موصول ہوا۔ ۱۸ جون کو انھوں نے اس کا جواب تحریر کیا جو نمبر (۴۹) پر درج ہے۔

(۴) میرزا صاحب نے "ساختہ" لکھا ہے۔

(۵) اس شعر کو میرزا صاحب نے اپنے دو شعروں کے ایک ایک مصرع سے بنا لیا ہے۔ وہ دونوں شعر پہلے اور آیندہ عریضوں میں بار بار دہرائے جا چکے ہیں۔

(۶) لفافے پر ۲۷ مئی سنہ ۱۸۶۵ء درج ہے اور اس کی پشت پر لکھا ہے: "دو خط در رسید فیض وسلام مرسلہ نوشتہ شد و المرقوم ۵ محرم سنہ ۱۲۸۲ھ مطابق ۱ ۳ مئی سنہ ۱۸۶۵ء۔"

صفحہ ۳۷

(۱) میرزا صاحب نے "اکھاڑے والے" لکھا ہے۔

(۲) میرزا صاحب نے نواب خلد آشیاں کے جود و کرم کے اس واقعے کا ذکر متعدد خطوں میں کیا ہے۔ حکیم غلام رضا خاں کو لکھتے ہیں: "...... نواب صاحب حال بمقتضائے "الولد سر لابیہ"، حسن اخلاق میں نواب فردوس آرامگاہ کے برابر، بلکہ بعض شیوہ روش میں اُن سے بہتر ہیں۔ بمجرد مسند نشینی کے غلہ کا محصول یک قلم معاف کیا، علی بخش خاں خانساماں کو ۳۰ ہزار روپیہ بابت مطالبہ سرکار بخش دیا...." (اردوئے معلیٰ: ۲۰۵۴)، تفتہ کے نام کے خط میں قدرے تفصیل کی ہے فرماتے ہیں: "..... نواب صاحب از روئے صورت روح مجسم اور باعتبار اخلاق آیت رحمت ہیں۔ خزانہ فیض کے تحویلدار ہیں۔ جو شخص دفتر ازل سے جو کچھ لکھوا لایا ہے اس کے پہنچنے میں دیر نہیں لگتی۔ ایک لاکھ کئی ہزار روپیہ سال غلے کا محصول معاف کر دیا۔ ایک اہلکار پر ساٹھ ہزار کا محاسبہ معاف کیا اور بیس ہزار روپیہ نقد دیا منشی نولکشور صاحب کی عرضی پیش ہوئی، خلاصہ عرضی کا سن لیا۔ واسطے منشی صاحب کے کچھ عطیہ بتقریب شادی صبیہ تجویز ہو رہا ہے۔ مقدار مجھ پر نہیں کھلی" (ایضاً: ۲۹۸)
تخریب قمار خانہ اور بخشش محصول غلہ کا ذکر اخبار الصنادید (۲، ۹۷۱) میں بھی کیا گیا ہے۔

(۳) قافیہ شایگاں ہو گیا ہے۔

(۴) اصل: رواد

(۵) اصل: قصیدہ۔ لیکن اردو کی قواعد یہاں بصیغہ جمع استعمال کرنا ضروری تھا۔ بنا بریں اسے سہو قلم پر محمول کر کے متن میں اصلاح کر دی گئی ہے۔

(۶) یہ رسید عریضہ سابق کے ہمراہ بھیجی گئی تھی، اس لئے لفافے کی عبارت دونوں سے متعلق شمار کی جائے

صفحہ ۳۸

(۱) محولہ بالا فرمان کا اقتباس عریضہ (۴۶) کے حاشیئے میں دیا جا چکا ہے

(۲) یہ قصیدہ عریضہ (۴۷) کے حاشیہ میں درج ہو چکا ہے۔

(۳) کلیات فارسی کے رامپوری نسخے میں اسکا اندراج نہیں ہے، حالانکہ جوابی فرمان، مورخہ ۱۵ جولائی، میں سرکار نے اس کا وعدہ فرما لیا تھا۔

(۴) اصل: بوڈھے مگر اس لفظ کو ۹ جون سنہ ۶۶ء کے عریضے کے ساتھ والی غزل میں "بوڑھا" رے کے ساتھ لکھا ہے جس سے یہ نتیجہ نکالنا بیجا نہ ہوگا کہ آخر میں میرزا صاحب نے تلفظ اور املا دونوں بدل لئے تھے

(۵) سفر کی تفصیل کے لئے دیباچہ ملاحظہ ہو۔ یہاں اس قدر لکھ دینا کافی ہوگا کہ میرزا صاحب ۱۱ اکتوبر سنہ ۱۸۶۵ء کو دلی سے عازم رامپور ہوئے۔ اور ۸ جنوری سنہ ۱۸۶۶ء کو واپس دلی پہنچے (اردوی: ۳۴۳)

(۶) نواب یمین الدولہ: بزالملک محمد علی خاں بہادر صولت جنگ ریاست ٹونک کے نواب

تھے۔ جنوری سنہ ۱۸۶۵ء میں گدی پر بیٹھے۔ ۱۳ دسمبر ۱۸۷۰ء میں لاوا میں سٹھا کردوں کا قتل عام کرانے کے الزام میں حکومت ہند نے انھیں معزول کر دیا۔ سنہ ۱۸۷۰ء میں ریاست پولیٹیکل ڈپارٹمنٹ کے زیر انتظام آگئی، اور حافظ ابراہیم علی خاں بہادر نواب بنا دیے گئے۔ نواب امین الدولہ بنارس چلے گئے، اور ۲۵ سال تک مقیم رہنے کے بعد ۱۲ صفر ۱۳۱۳ھ (۲۰ اگست سنہ ۱۸۹۵ء) کو بنارس میں انتقال کیا۔ آثار رام پور: ۳۴۹، نیز ملاحظہ ہو مکتوب ۱۳۰ کا حاشیہ ۶۔)

(۷) احمد شاہ درانی ضلع ہرات کا باشندہ اور ابدالی نامی قبیلہ کا ایک فرد تھا۔ ابھی بچہ ہی تھا کہ نادر شاہ اس کو ایران لیکر چلا گیا، اور اپنی خدمت گزاری پر مامور کیا۔ اس نے رفتہ رفتہ فوج کے بڑے عہدے تک ترقی کر کے ۱۰ مئی سنہ ۱۷۴۷ء کو نادر شاہ کی وفات پر بغاوت کر دی، اور تھوڑے عرصہ میں افغانستان، سندھ اور لاہور کا بادشاہ بن بیٹھا۔ احمد شاہ نے ہندوستان پر متعدد حملے کیے، لیکن اس کی شاندار ترین جنگ ۱۷۶۱ء میں پانی پت کے میدان میں مرہٹوں کے عظیم الشان لشکر سے واقع ہوئی، جس میں احمد شاہ کامیاب ہوا اور بعد فتح شاہ عالم کو تخت و تاج ہند سونپ کر افغانستان چلا گیا۔ احمد شاہ نے ۲۶ سال حکومت کر کے سنہ ۱۱۸۶ھ (سنہ ۱۷۷۲ء) میں ۵۰ سال کی عمر میں وفات پائی (مفتاح التواریخ: ۷۵)

(۸) جد امجد سے نواب سید غلام محمد خاں بہادر مراد ہیں۔ احمد شاہ کے عطا کردہ خطابات کے سلسلے میں اخبار الصنادید (۶۶، ۸۱) ملاحظہ ہو۔

(۹) میرزا صاحب کے اس خیر خواہانہ عریضے کے جواب میں نواب صاحب نے تحریر فرمایا: "۔۔۔ استعمال الفاظ خطاب دستور این ریاست نبوده است حسب المرقوم قصیده و سلام مذکوره دیوانها مندرج کنانیده خواهد شد۔۔۔۔۔ ۲۴ ربیع سنہ ۱۲۸۲ھ مطابق ۵ جولائی ۱۸۶۵ء" میرزا صاحب نے اس فرمان کے جواب میں حسب ذیل قطعہ لکھ کر ارسال کیا (دستنبو ص ۸۸):

هزار و دو صد و هشتاد و دو شمار کنند | بحسب ضابطه از هجرت رسول اله
چهار شنبه آخر بود ز ماه صفر | که می در آورم این قطعه را بنظم نگاه
سفیدهٔ سحری کا غذ است و من راقم | سواد شعر نمط، ردی بد سگال سیاه
همی نویسم و در وقت نوشتنم باشد | ولی ز بیم لبالب، چو لب بعذر گناه
خدا کند که مشرف شود چو این قرطاس | به پیش مسند عالی زبندهٔ درگاه
امیر کلب علی خاں بہادر از رہ لطف | بسوی غالب خونیں جگر کنند نگاه
که این فلک زده گر عرض کرد مطلقی | بزعم خود ز اخلاص بود، ور نه گناه
خلاف طبع مبارک فتاد آن تقریر | بسی خطا رود از بندگان دولتخواه
تو بادشاه و شهنشاه تاجدار فرنگ | خطاب می طلبد باد شه ز شاهنشاه

چو زائی من بپذیری، ز جرم من بگذر
بحق اشهد ان لا اله الا الله"

صفحہ ۴۰

(۱) اس عریضے کے جواب میں نواب خلد آشیاں نے ۲۳ ربیع الاول سنہ ۱۲۸۲ھ (۱۶ اگست ۱۸۶۵ء) کو تحریر فرمایا ہے: ..... "صحیفۂ لطف آگیں بخلاصہ کی بارش باران رحمت در آں نواح و مسند راک خیریت مزاج راقم مع قطعہ دعائیہ غازہ آرای چہرہ وصول نشاط شمول گردیدہ، بہ نیہا مطلع نمود و تذییل قطعہ مذکورانہ مزید الطاف فرمائیہا تصور رسیدہ۔ مشفقا! سابق ازیں فی الحقیقہ طبیعت راقم بعارضۂ تپ چیزی کسلمند شدہ بود، لیکن حالات بعنایت الٰہی مزاج مخلص خوش و خرم است۔ سنڈ و مبلغ دو صد روپیہ برای آں مشفق، کہ بتقریب صحت ازعارضۂ لاحقہ دیگر صاحبان مستحقین نیز ازیں سرکار عنایت شدہ بود، معطوف رقیمۂ الوداد ہذا بطریق عنایات سمت تبلیغ یافتہ ..... "
میرزا صاحب کا یہ قطعہ دعائیہ "غالب نامہ" کے دوسرے ایڈیشن میں محمد اکرام صاحب نے چھاپ دیا ہے۔

صفحہ ۴۱

(۱) میرزا صاحب نے اس جگہ کے علاوہ مکتوب نمبر ۹۰ میں بھی نون غنہ لکھا ہے۔
(۲) اس سے نامۂ غالب مراد ہے۔ میرزا صاحب نے فارسی لغت کی مشہور کتاب "برہان قاطع" کے بعض اغلاط پر مشتمل ایک رسالہ مسمی بہ "قاطع برہان" اوائل ۱۸۵۹ء میں تصنیف کر کے نواب فردوس مکاں کی امداد سے شائع کیا تھا۔ اس میں رد و قدح کا جو ڈھنگ اختیار کیا گیا تھا، وہ غیر عالمانہ ہی نہیں، کسی قدر سوقیانہ بھی تھا۔ چنانچہ منشی محمد عباس لکھنوی نے بھی جو میرزا صاحب کے حامیوں میں سے تھے، ان کے ایک خط کے جواب میں قاطع برہان نام کی درشتی و لطف ظاہر کرتے ہوئے لکھا تھا: "... معنی صاف ہیں، معترض ناانصاف ہیں۔ لطف یہ ہے کہ خود نام سے نام پیدا ہے، کہ اس نے برہان قاطع کو قطع کیا ہے۔ ان دونوں کا ایک نمط پر ہونا جائے قابل دغدغہ ہے۔ ظاہر، اس کا مطلب اور آپ کا مقصد اور ہے۔ قطع کے معنی کاٹنے کے اور یقین کے بھی آتے ہیں۔ اس نے غالباً معنی ثانی مراد لیے ہیں، اور آپ معنی اول استعمال میں لائے ہیں۔ بہرصورت برہان کی طرف ظاہرہ قاطع کی اضافت ہے، اور اس ترکیب میں سراسر لطافت ہے۔ اس میں کچھ شک و ریب نہیں، کہ ایہام میں حسن ہے، کچھ عیب نہیں۔ لیکن تعقیر معاف ہو

ظرافت نہ کرنی تھی، یہ کیا کیا درشتی نے آفت کو برپا کیا

اضعف الناس، عباس ..." (بیاض قلمی ملوکہ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی صاحب) کچھ ہندوستانی تقلید کے دلدادہ ہیں، اور کچھ اس کا انداز تحریر دل آزار تھا، کتاب کے شائع ہوتے ہی مخالفت کا ایک طوفان برپا ہو گیا۔ برہان کے حامیوں نے اس کی تردید میں متعدد کتابیں لکھیں۔ ان میں سے ایک کا نام "ساطع برہان" تھا، اس کے مصنف کے متعلق میرزا صاحب سیاح کو لکھتے ہیں: "وہ جو ایک اور کتاب کا تم نے ذکر لکھا ہے۔ وہ ایک پڑھے لکھے ملا کا ... دار کا خط ہے ..... رحیم بیگ اس کا نام ہے۔ میرٹھ کا رہنے والا کئی برس سے اندھا ہو گیا ہے۔ باوجود نابینائی کے احمق بھی ہے" (اردوئے معلیٰ، ص ۳۱)

شاگرد کو لکھا ہے: "رحیم بیگ نامی میرٹھ کا رہنے والا ہے۔ دس برس سے اندھا ہوگیا ہے۔ کتاب پڑھ نہیں سکتا۔ سن لیتا ہے عبارت لکھ نہیں سکتا، لکھوا دیتا ہے بلکہ اس کے ہموطن ایسا کہتے ہیں کہ وہ قوت علمی بھی نہیں رکھتا، اوروں سے مدد لیتا ہے۔ اہل دہلی کہتے ہیں کہ مولوی امام بخش صہبائی سے اس کو تلمذ نہیں ہے۔ اپنا اعتبار بڑھانے کو اپنے کو ان کا شاگرد بتاتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ وای اس ہیچ د پوچ پر جس کو صہبائی کا تلمذ موجب عز و وقار ہوا" (عود: ۱۷۱) اس کتاب کے جواب میں میرزا صاحب نے "نامہ غالب" لکھا، اور اس کو ۱۱ اگست سنہ ۱۸۶۵ء سے قبل طبع کراکے نواب خلد آشیاں کی خدمت میں بطریق ارمغان پیش کیا۔ یہ رسالہ عود ہندی (ص ۱۴۱ - ۱۵۵) میں بھی چھپ چکا ہے۔ محولہ جداگانہ مطبوعہ نسخہ کی کوئی جلد کتابخانے میں موجود نہیں اور نہ کہیں بازار میں ملتی ہے۔ جناب مختار الدین احمد آرزو صاحب کے ایک خط سے معلوم ہوا کہ وہ اسے مرتب کرکے شائع کرنے والے ہیں۔

(۳) شاہ عباس ثانی، صفوی خاندان کا آٹھواں بادشاہ تھا، اس نے سنہ ۱۰۵۲ھ (۱۶۴۲ء) سے سنہ ۱۰۷۷ھ (۱۶۶۶ء) تک ایران پر حکومت کی میرزا صاحب کا یہ بیان کہ اس بادشاہ کے عہد حکومت میں ایرانیوں نے داستان امیر حمزہ بنائی، کسی طرح درست نہیں۔ آئین اکبری (۱: ۱۰۹) سے معلوم ہوتا ہے کہ اکبر نے مہابھارت کی طرح رموز حمزہ کا بھی ایک خوشخط اور مصور نسخہ ۱۲ دفتروں میں تیار کرایا تھا۔ آئین کا سال تالیف بیورج کے بیان کے مطابق ۱۰۰۶ھ (۱۵۹۷ء) ہے۔ خان عبد المقتدر مرحوم نے کتاب خانہ بانکی پور (پٹنہ ج ۷: ۹۴) میں لکھا ہے کہ آئین اکبری، اکبر نامہ کی تیسری جلد ہے، اور اکبر نامہ ۱۰۰۴ھ (۱۵۹۶ء) میں تمام ہوا تھا۔ بعد ازاں سنہ ۱۰۱۰ھ (۱۶۰۱ء) تک اس میں اضافے ہوتے رہے۔

شاہ عباس ثانی کی پیدائش کا سنہ ۱۰۴۳ھ (۱۶۳۳ء) ہے مذکورۂ بالا بیان سے واضح ہے کہ شاہ عباس کی پیدائش سے ۳۹ یا ۴۵ برس پہلے رموز حمزہ، اکبر کے کتابخانے میں تیار کی گئی تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ کسی پرانے نسخے ہی کی نقل ہوگی۔ یہ تو رہا شمالی ہندوستان کا معاملہ کتابخانہ بانکی پور میں ایک کتاب بنام زبدۃ الرموز محفوظ ہے۔ اس کا مصنف حاجی قصہ خواں ہمدانی دیباچے میں لکھتا ہے کہ میں ۱۰۲۲ھ (۱۶۱۳ء) میں عراق حیدرآباد پہنچا اور سلطان عبد اللہ قطب شاہ، والی گولکنڈہ (از سنہ ۱۰۲۰ - ۱۰۸۳ھ = ۱۶۱۱ - ۱۶۷۲ء) کے دربار میں داخل ہوا۔ میں اپنے ساتھ رموز حمزہ کے کئی نسخے لایا تھا۔ بادشاہ کے حضور میں انھیں پیش کیا۔ تو حکم ملا کہ ان کا خلاصہ تیار کردو۔ اس حکم کی تعمیل میں یہ کتاب زبدۃ الرموز مرتب کی ہے (فہرست کتابخانہ بانکی پور: ۹۸ (۱۶۹۸)) اس بیان سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ عباس ثانی کی پیدائش سے ۲۰ برس پہلے یہ کتاب عراق سے دکن میں پہنچ چکی تھی اور چونکہ کئی نسخے دکن میں لائے گئے تھے، اس سے یہ نتیجہ نکالنا قرین عقل ہے کہ عرصے سے ایران و عراق میں اس کا رواج تھا۔

صفحہ ۴۲

(۱) اصل میں الزام ہے

(۲) اس قصیدے کے چند اشعار تذکرۂ انتخاب یادگار میں ذیل ذکر غالب اور پورا قصیدہ سبد چین (ص ۷۰) میں شائع ہو چکا ہے۔

(۳) میرزا صاحب نے اس نام کا املا اور تلفظ دونوں غلط لکھے ہیں۔ یہ نام "عمرو" بسکون میم و زیادۂ واؤ بعد راء ہے میں نے از راہ احتیاط اعراب کا اضافہ کر دیا ہے تاکہ "عمر" بضم میم و فتح عین سے التباس دور ہو جائے۔

(۴) "سبد چین" کے دونوں ایڈیشنوں میں "عنطلیہ" ہے۔ اور یہی صحیح ہے۔ اس لئے کہ رموز حمزہ (ج ۲، جزء ۸، طبع ایران ۱۲۰۵ھ) میں بھی جگہ جگہ عنطلیہ ہی پایا جاتا ہے۔

صفحہ ۴۳

(۱) بد اشتعل خوشا۔ بسیار بد۔ (منہ)

(۲) بیچارہ مخفف ہیچ ارہ (منہ)

(۳) آدم ادباری، ادباریدن بمعنی ناخائیدہ فرد بردن ادبار جیفہ امرد در آخر تحتانی، مردم آزاری مثلہ (منہ)

(۴) میرزا صاحب نے یہ لفظ بضم الہار لکھا ہے۔ لیکن صحیح "اسپہبد" بفتح الہار ہے۔

صفحہ ۴۴

(۱) فرد بل بمعنی بگزار۔ ازینجا التزام موقوف است۔ (منہ)

(۲) گزیں بجائے گزیدہ مستعمل اہل زبان۔ تمر بہ تحتانی مکسور و میم مضموم در ترکی فولاد را گویند و اسم شاہی است از اولاد انقوا۔ و اینکہ تیمور نوبسند، طرز املا ست اعراب بالحرف (منہ)

صفحہ ۴۵

(۱) قرضخواہ کی جگہ قرضدار کا استعمال بے پڑھے لکھوں کی زبان پر آج بھی جاری ہے۔ میرزا صاحب جیسے مین میکھ نکالنے والے سے تعجب ہے کہ کس طرح اس کو جائز رکھا۔ چونکہ انھوں نے میر قربان علی بیگ سالک اور تفتہ کے نام کے خطوں میں بھی قرضخواہ کی جگہ قرضدار استعمال کیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں فصحا کی زبان پر بھی کبھی کبھی یہ غلط لفظ آجاتا تھا۔ ملاحظہ ہو، غالب: ۲۰۳، طبع ثانی و خطوط غالب: ۱: ۲۷۱۔

(۲) حکیم بر علی خاں کے متعلق صرف اس قدر پتا چلتا ہے کہ یہ دہلی کے مشہور طبیب تھے ان کے بیٹے حکیم اسد علی خاں کا ذکر سخن شعرا (ص ۴۳۲) میں مضطر تخلص کے تحت کیا گیا ہے اور انہیں میرزا قربان علی بیگ سالک کا شاگرد لکھا ہے۔ اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ تیرہویں صدی ہجری کے اوائل میں حکیم بر علی خاں بقید حیات تھے ایک حکیم بر علی خاں، حکیم کاظم علی خاں کے والد تھے۔ تو امین العلاج (نمبر ۱۴۳ طب فارسی) کے آخری ورق پر ان کا نام ملتا ہے۔ عین ممکن ہے کہ یہ دوسرے شخص ہوں اور نسخۂ مذکورۂ متن انہیں کا مرتبہ ہو۔

صفحہ ۴۶

(١) یہاں کوئی ایک لفظ ساقط معلوم ہوتا ہے۔

(٢) اس عریضے کے جواب میں ٧ ربیع الثانی سنہ ٨٢ھ (٩ اگست سنہ ٦٥ء) کو نواب خلد آشیاں نے تحریر فرمایا: "سہ قطعہ مقاوضۂ لطف آگیں اول مع قصیدۂ نادرہ کہ مضامین عالیش ملو بہزاراں درر غرر معانی بود، و ثانی مشعر رسید ہنڈوی مبلغ دو صد روپیہ و ثالث محتوی بر نسخہ ہای معجون وغیرہ براہ محبت معنوی منواتر باسمیں ریزگریبان وصول فت اطشمول گشتہ ۔ ۔ ۔ حالا مزاج راقم بوجوہ خوش و خرم است۔"

صفحہ ۴۷

(١) سکندر زمانی بیگم، نواب خلد آشیاں کی اہلیہ کی وفات پر یہ خط اور قطعۂ تاریخ لکھا گیا ہے۔ ان بیگم کے والد صاحبزادہ سید امداد اللہ خاں ولد صاحبزادہ سید کفایت اللہ خاں ولد نواب نصر اللہ خاں بہادر، اور والدہ آفتاب بیگم بنت صاحبزادہ سید کریم اللہ خاں خلف نواب سید فیض اللہ خاں بہادر تھیں۔ سنہ ١٢٦٢ ہجری میں ان سے نواب خلد آشیاں کی شادی ہوئی۔ نواب سید مشتاق علی خاں بہادر، عرش آشیاں انھیں کے بطن سے تھے۔ (انتخاب یادگار: ٢٢٥، و اخبار الصنادید: ٢: ٣٠٢)

(٢) یہ قطعۂ تاریخ دوسرے ورق پر لکھ کر اس عریضے کے ساتھ ملفوف کیا گیا تھا۔ اب سبد چین میں بھی چھپ چکا ہے۔

(٣) استاد سے مراد قلندر بخش جرأت دہلوی ہے۔ اس کا مصرع تھا: "جو تم پھر آؤ تو پیارے پھر یہ ہمارے دل" میرزا صاحب نے پیارے کی جگہ حضرت کر دیا۔ یہی وہ تغیر لفظ ہے جس کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔

صفحہ ۴۸

(١) یہ عریضہ میرزا صاحب نے رامپور سے لکھا ہے۔ اس زمانے میں نواب خلد آشیاں دورے پر تشریف لے گئے تھے۔ میرزا صاحب رضوان کو لکھتے ہیں: "آج شنبہ ۴ نومبر کی ہے۔ پرسوں نواب صاحب دورہ کو گئے ہیں۔ فرما گئے ہیں کہ دو ہفتے میں آؤں گا۔ اگر چار روز یہاں رہیں گے۔ پھر نمائش گاہ بریلی کی سیر کو جائیں گے۔" (اردوی: ٢٠٠) حکیم غلام نجف خاں کے مکتوب سے معلوم ہوتا ہے کہ ١٢ نومبر کی صبح تک واپس تشریف نہیں لائے تھے۔ فرماتے ہیں: "نواب صاحب دورے سے یا آج شام کو یا کل آ جائیں گے۔ جشن جشیدی کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔" (ایضاً: ٢٣١)

نواب خلد آشیاں نے ١٠ نومبر کو اس خط کا جو جواب دیا تھا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میرزا صاحب نے خیریت مزاج معلوم کرنے کے لیے دو عریضے لکھے تھے۔ ان میں سے آخری کے جواب میں سرکار نے تحریر فرمایا کہ: "عنقریب اتفاق مراجعت برامپور رو"

(٢) صاحبزادہ ممتاز علی خاں بہادر کے متعلق صاحب انتخاب یادگار (ص ٢٩٠) کہتے ہیں: "نیز، صاحبزادہ محمد ممتاز علی خاں ولد صاحبزادہ محمد اعجاز علی خاں ولد صاحبزادہ نیاز علی خاں"

ولد صاحبزادہ حسن علی خاں ولد جناب مستطاب نواب محمد نعیم اللہ خاں صاحب بہادر، عرش منزل، طالب نژاد ہیں، ستائیس برس کا سن ہے۔ میر احمد علی رسا کے شاگرد ہیں۔ یہ صاحبزادے نہایت اہلبیت شعار ہیں، خوش خلق و خوش اطوار ہیں۔ یہ ان کا کلام ہے:

شوق ہر چند یہ کہتا تھا کہ بوسے لیجے   پر ترا نقش قدم مجھ سے مٹایا نہ گیا

صاحبزادے صاحب کو نواب سعیدالدین احمد خاں فاروقی کی صاحبزادی منسوب تھیں۔ اس تقریب سے مراد آباد میں سکونت پذیر ہو گئے تھے، اور وہیں انتقال کیا۔

(۳) نواب سعیدالدین احمد خاں، نواب محمد الدین احمد خاں کے بیٹے اور نواب مجید الدین احمد خاں عرف نواب مجو خاں مراد آبادی کے چھوٹے بھائی تھے۔ ان کے آبا و اجداد میں سے ایک بزرگ قاضی عصمت اللہ فاروقی، نواب عصمت اللہ خاں بہادر کے لقب سے مفتخر اور عہد عالمگیر میں مختلف صوبوں کے گورنر رہ چکے تھے۔ خود نواب مجو خاں بھی بڑی جاگیر کے وارث تھے۔ غدر سنہ ۱۸۵۷ء میں بجرم بغاوت انھیں پھانسی دیدی گئی اور اسی وقت سے اس خاندان پر زوال آ گیا۔ مراد آباد میں اس خاندان کے اخلاف اب بھی موجود ہیں نواب سعیدالدین احمد خاں کی ایک تصنیف "لب لباب رمل" کتابخانہ ریاست میں محفوظ ہے۔ یہ نسخہ بڑے اہتمام سے لکھا گیا ہے۔ خیال ہوتا ہے کہ خود مصنف نے تیار کرایا ہوگا۔ دیباچے میں مصنف نے اپنے خاندان کی ابتدائی تاریخ اور بعد ازاں سنہ ۱۸۵۷ء میں اس کی بربادی پر ایک مختصر نوٹ لکھا ہے۔ نواب سعیدالدین احمد خاں نے ۱۲ ربیع الاول سنہ ۱۳۰۳ھ، جنوری ۱۸۸۶ء، اور ۲ جمادی الاولیٰ سنہ مذکورہ (۱۳ فروری سنہ مذکورہ) کے درمیان انتقال کیا۔

(۴) لارڈ ولیم بنٹنگ د   نے دیوانی عدالت میں ہندوستانی حاکموں کے واسطے تین درجے مقرر کر رکھے تھے: (۱) صدر الصدور، اس کا مشاہرہ ۵۰۰ سو روپے تھا، اور دیوانی مقدمات میں ججوں کے برابر اختیارات دیے گئے تھے؛ (۲) صدر امین، اس کا مشاہرہ دو سو سے تین سو روپے تک تھا۔ اور ہزار روپے تک مقدمات فیصل کر سکتا تھا، (۳) منصف، اس کا مشاہرہ سو روپے سے ڈیڑھ سو روپے تک تھا۔ اور تین سو روپے تک کے مقدمات فیصل کرنے کا اختیار تھا۔ منصفوں کی ترقی صدر امینی پر اور صدر امینوں کی ترقی صدر الصدوری پر ہوتی تھی۔ منصف کے لیے وکیلوں کے سامنے امتحان دینا پڑتا تھا۔ اس کے بعد ترقی کارگذاری کی عمدگی پر موقوف تھی۔ تاریخ ہندوستان، ذکاء اللہ ج ۳ ج ۲: ۶۹۰،

(۵) مولوی محمد حسن خاں صدر الصدور مراد آباد ولد مفتی ابو الحسن، بانس بریلی کے باشندے تھے، علم و فضل کے ساتھ شعر گوئی کا بھی شوق تھا اور اسیر تخلص کرتے تھے۔ سخن شعراء ص ۱۷ میں ان کا یہ شعر درج ہے۔

اب جس دام کا گلہ کس سے اسیر   زلفوں میں کیوں پھنسا تھا یہ کمبخت نزاری دل

ان کی ایک فارسی تصنیف اصل الاصول کتابخانے میں محفوظ ہے۔ یہ نحو عربی کا ایک رسالہ ہے۔ جسے سنہ ۱۲۵۳ھ میں تصنیف اور مطبع نظامی کانپور میں سنہ ۱۲۸۰ھ میں

طبع کرایا تھا۔ ان کے فرزند مولوی نجم الحسن خاں کے مکتوب مورخہ ۲۶ اپریل ۱۸۷۸ء سے معلوم ہوتا ہے کہ صدر الصدور تاریخ تحریر مکتوب سے ۵ سال قبل، تقریباً سنہ ۱۸۷۳ء میں، انتقال کر گئے تھے۔ ان کے برادر خورد مولوی حامد حسن خاں صاحب صدر الصدور فروری سنہ ۱۸۷۸ء میں فوت ہوئے ہیں۔

(۶) نواب مصطفیٰ خاں بہادر، فرزند عظیم الدولہ سرفراز الملک نواب مرتضیٰ خاں بہادر جہانگیر آباد کے جاگیردار اور بڑے صاحب علم و خوش گفتار شاعر تھے۔ اردو میں شیفتہ اور فارسی میں حسرتی تخلص کرتے تھے۔ (اردوی: ۱۰۱) ابتداءً حکیم مومن خاں سے مشورۂ سخن رہا۔ ان کے انتقال کے بعد میرزا صاحب سے اصلاح لینے لگے۔ انہوں نے اردو شعرا کا ایک قابل استناد تذکرہ "گلشن بیخار" فارسی زبان میں تصنیف کر کے خود شائع کیا تھا۔ آشوب غدر میں شیفتہ کو ۷ سال کی سزا ہوئی لیکن آخر کار رہا ہو گئے۔ میرزا صاحب سے ان کے بہت مخلصانہ روابط تھے جب میرزا صاحب قمار بازی کے الزام میں قید کیے گئے، تو انہوں نے بڑی ہمدردی کا اظہار کیا تھا۔ "حبسیہ" میں میرزا صاحب نے اس خلوص کا اس طرح اعتراف کیا ہے

خود چرا خون خورم از غم کہ بہ غمخواری من — رحمت حق بہ لباس بشر آمد، گوئی
خواجہ ہست درین شہر کہ از پرسش وی — بایہ خویشتنم در نظر آمد گوئی
مصطفیٰ خاں کہ درین واقعہ غمخوار من است — گر بمیرم، چہ غم از مرگ، بہ عزا دو ہست

شیفتہ نے ۶۳ سال کی عمر پا کر سنہ ۱۲۸۶ھ (۱۸۶۹ء) میں وفات پائی۔

(۷) میرزا صاحب کو یہ مصیبت رامپور سے واپسی کے وقت برداشت کرنا پڑی تھی۔ دیباچے میں اس کی تفصیل ملاحظہ ہو۔

صفحہ ۴۹

(۱) دراصل یہ قطعہ سفر کلکتہ کے سلسلے میں لکھا گیا تھا، چنانچہ رای چھجمل کھتری کے نام ایک فارسی خط میں درج آہنگ: ۱۰۰، چھپ بھی چکا ہے۔ لیکن وہاں بجائے "غلیہ تم ہے" "سطوت غم"، اور بجائے مصرع ثالث "گو بند زندہ تا بہ بنارس رسیدہ است" تحریر ہے۔

(۲) لفافے پر ۱۰ جنوری سنہ ۱۸۶۶ء تحریر ہے۔

(۳) نواب خلد آشیاں کو میرزا صاحب کے مصائب سفر کی روداد نواب مصطفیٰ خاں بہادر کی زبانی معلوم ہوئی، تو انھوں نے مراد آباد کے پتے پر میرزا صاحب کو تحریر فرمایا "نواب صاحب مشفق مہربان، کرمفرمای مخلصاں، سلمہ اللہ تعالیٰ! بعد اشتیاق مواصلت موفور المسرت کہ متجاوز التحریر ہے، مشہور رضمیر مودت تخمیر کے ہو۔ زبانی نواب محمد مصطفیٰ خاں بہادر کے دریافت ہوا کہ مراد آباد میں کچھ طبیعت آپ کی علیل ہو گئی ہے۔ باستماع اس امر کے باعث کمال تردد کا ہوا۔ اس واسطے حوالہ خامۂ محبت نگار کے ہوتا ہے کہ حال خیریت مزاج سے مطلع کیجئے۔ اور اگر ہنوز طبیعت مائل باعتدال نہو، اور آپ کا ارادہ قیام مراد آباد کا تا درستی ہو۔ تو آپ رام پور میں تشریف لایئے۔ یہاں معالجہ بخوبی عمل میں آئیگا۔ فقط زیادہ جمعیت اور نشاط ہو۔ المرقوم ۱۷ شعبان سنہ ۱۲۸۲ھ مطابق

۵ جنوری سنہ ۱۸۶۶ء محمد کلب علی خاں ۱؎

نقل میں اصل فرمان موجود اور اس کے لفافے پر تحریر ہے کہ "خط ہٰذا ہرکارہ بر مندہ از مرادآباد بجہت تشریف فرما شدن مرزا نوشہ صاحب بہ دہلی واپس آورد۔ مرقوم ۱۹ شعبان سنہ ۸۲ھ ہوئی"۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میرزا صاحب کو فرمان موصول نہ ہوا۔ مگر اس عرصے میں ان کا عریضہ (۴۰۰) رامپور پہنچ گیا۔ اس کے جواب میں سرکار نے ۵ جنوری کو تحریر فرمایا: "جو کہ وقت اطلاع انحراف طبیعت آپ کے مرکزِ اعتدال سے بمقام مرادآباد رقیمہ، اور وہ اس مضمون سے کہ اگر ارادہ قیام مرادآباد کا واسطے معالجے کے ہو تو رامپور کو معاودت کیجے، یہاں معالجہ بخوبی عمل میں آئیگا۔ بہ دست ہرکارہ کے بھیجا گیا تھا۔ لیکن آپ وہاں سے روانہ دہلی کے ہو گئے تھے، ہرکارہ خط واپس لایا۔ اخباروں سے کمال انتظار وصول مفاوضہ خیریت کا تھا۔ الحمد للہ کہ وصول نمیقہ لطف آگیں باعث اطمینان ہوا۔" میرزا صاحب کا عریضہ (۶۱) اسی فرمان کا جواب ہے۔

صفحہ ۵۰

(۱) غلام نوخرید سے حسین علی خاں مراد ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ میرزا صاحب نے ۱۱ جنوری کے عریضے کے بعد کوئی اور خط بھی لکھا تھا۔ جس میں حسین علی خاں کی تنخواہ کی استدعا کی گئی تھی لیکن یہ خط اور اس کا جوابی فرمان دونوں موجود نہیں ہیں، اس لیے سوال و جواب کی نوعیت کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ بہرحال موجودہ مراسلت میں یہ پہلا عریضہ ہے۔ جس میں حسین علی خاں کی تنخواہ کا ذکر کیا ہے۔

(۲) آل محمد مارہروی نے دیوان تواریخ (۱۶۳) میں ایک قطعہ تاریخ لکھا ہے، جس کا عنوان ہے۔ "تاریخ کر شدن مرزا اسد اللہ خاں، المتخلص بہ غالب و المشہور بہ مرزا نوشہ دہلوی"

خود قطعہ یہ ہے۔

کان بہرے میرزا نوشہ کے آہ — بیٹھے بیٹھے یک بیک کیونکر ہوئے!
دوستو! تاریخ اس کی غیب سے — یوں سنی ہم نے کہ "غالب کر ہوئے"

اس مادہ تاریخ سے اعداد ۱۲۷۴ نکلتے ہیں، جو سال ہجری ہے اور ۲۲ اگست ۱۸۵۷ء تا ۱۱ اگست سنہ ۱۸۵۸ء سے تطابق رکھتا ہے۔ لیکن جیسا کہ آیندہ عرض کروں گا۔ یہ تاریخ ایک غلط فہمی کی بنا پر نکالی گئی ہے۔ دراصل میرزا صاحب اس سے برسوں پہلے بہرے ہو چکے تھے۔ چنانچہ ۱۰ دسمبر ۱۸۵۲ء کو تفتہ کے نام کے خط میں لکھتے ہیں "بوڑھا ہو گیا ہوں، بہرا ہو گیا ہوں" (اردوی: ۳۱۶) یکشنبہ ۱۹ دسمبر سنہ بالا کو منشی نبی بخش کے خط میں، جن کی بینائی میں ضعف آگیا تھا، لکھتے ہیں کہ: "کاروان مارا ہمیں شنیدن و دیدن و گفتن و رفتن متاع است، چرا بتاراج نرود۔ یکی را گوش گران نست، تا ہمنشیں چہ سراید؟ یکی را چشم نگران نست تا کہ می آید" (باغ دو در: ۷۱ الف)۔ یہ بہرے ہونے کی تاریخ سے متعلق ان کے قطعی اور تصریحی بیانات ہیں۔ لیکن ہم اس تاریخ کو اور پیچھے لے جا سکتے ہیں۔ یک نامی خط میں شفق کو تحریر کیا ہے: "اکنوں کہ دندان فرو ریخت، و گوش گراں گشت، موی سپید است و روی پر آژنگ، دست بلرزہ اندر است و پای در رکاب" (پنج آہنگ:

۴۸۴، طبع دوم)۔ اس خط میں جوانِ بخت کے سہرے کا قضیہ دہرایا ہے۔ میرزا صاحب کا سہرا، ذوق کا جواب اور میرزا صاحب کی معذرت، یہ سب دہلی اردو اخبار، مورخہ ۶ جمادی الاولیٰ ۱۲۶۸ھ / ۲۸ مارچ ۱۸۵۲ء) میں شائع ہوئے تھے۔ غالباً اس اخبار کو پڑھ کر شفق نے استفسارِ حال کیا، اور یہ سب کچھ اس واقعے کے فوراً بعد پیش آیا، اس لیے کہ میرزا صاحب نے بیان واقعہ سے پہلے لکھا ہے: "در تا دیدہ ودان از دور بنگرند کہ نامہ نگار را مژہ خوں فشانست و دل دردمند"، ظاہر ہے کہ دل کی دردمندی اور مژہ کی خوں فشانی زیادہ دیر تک باقی نہیں رہ سکتی، اور رہے بھی، تو اتنی تو یقیناً نہ ہوگی کہ اسے ایسے پُردرد انداز سے بیان کیا جائے۔ لہٰذا میرزا صاحب کو سنہ ۱۸۵۲ء کے آخر کی بجائے اب آغاز میں بہرا ہونا چاہیے۔

سرور کے خط میں فرماتے ہیں: "میں پانچ سات برس سے بہرا ہوگیا ہوں" (عودؔ: ۱۱۱) یہ خط اُن کے نام کے خطوں میں دوسرا ہے، اور تیسرا خط پنجشنبہ ۱۸ نومبر ۱۸۵۸ء کو لکھا گیا تھا۔ اسی بنا پر اسے بھی ۱۸۵۸ء ہی کا ہونا چاہیے۔ اگر یہ صحیح ہے، تو پھر میرزا صاحب کے اس تخمینے کے پیشِ نظر انھیں ۱۸۵۱ء میں بھی ثقلِ سماعت کا مریض ہونا چاہیے۔

میرزا صاحب ایک فارسی قصیدے میں، جو واجد علی شاہ کی مدح میں اور کلیات (ص ۳۱۲) میں چھپ چکا ہے۔ فرماتے ہیں:-

فغاں ز پیری و رنجوری و گرانی گوش — کہ کرد ایں ہمہ دشوار کار آساں را

یہ قصیدہ میری رائے میں سنہ ۱۸۴۹ء کے آخر میں لکھا گیا ہے، اس لیے کہ اس میں میرزا صاحب فرماتے ہیں:

کہ گفتہ است در آئین بزم سور و سرور — کہ فرخی نبود روزہای آباں را
من از درازیِ شبہای قوس پندارم — کہ بہر انجمن آرد فلک زمستاں را
خوشا درازیِ شب زانکہ گر بود تاریک — درنگ در نظر افزوں بود چراغاں را
وگر بود شب مہ، نیز بزم عیش آرای — بعرصہ دیر نگہدار ماہِ تاباں را

قطب الدولہ کے نام کے ایک خط مورخہ ۲۰ مئی ۱۸۴۹ء سے معلوم ہوتا ہے کہ میرزا صاحب نے یہ قصیدہ میر احمد حسین میکش کے ہاتھ قطب الدولہ کے پاس بھیجا تھا (باغ دودر: ۱۹۵ الف)، منشی جواہر سنگھ جوہر کے نام کے ایک خط مورخہ ۲۰ فروری ۱۸۴۹ء میں میرزا صاحب نے یہ لکھا ہے کہ "میر احمد حسین کہ ہمنوائی شما ہست و میکش تخلص می کند بہ لکھنؤ رفتہ است۔ در ہر نامہ کہ بمن می فرستد، بشما سلام می نویسد" (ایضاً: ۱۹۶ ب)، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میکش فروری سے خاصا قبل لکھنؤ جا چکے تھے۔ چونکہ مذکورۂ بالا اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ قصیدہ لکھتے وقت ماہِ آباں کی راتیں تھیں، اور آفتاب برج قوس میں تھا۔ اور آبان ایرانی سال کا آٹھواں مہینہ اور نومبر کے مطابق ہوتا ہے۔ اس لیے قصیدے کو نومبر ۱۸۴۸ء میں لکھا جانا اور میرزا صاحب کو اس وقت بہرا ہونا چاہیے۔

میرزا صاحب نے ایک فارسی قصیدہ آزردہ کی مدح میں لکھا ہے۔ اس میں فرماتے ہیں:

نالم از ضعفِ دل، اما چارہ چوں خود ہم کسی   من کہ نتواند بگوشِ من رسد آوای من

اس شعر میں اپنے ضعف کا بمبالغہ بیان مقصود ہے۔ یعنی میرا حال کمزوری سے یہ ہو گیا ہے کہ منھ سے آواز نہیں نکلتی یا نکلتی ہے تو بجید بہت۔ حتیٰ کہ میں خود اسے نہیں سن سکتا، پھر ایسی حالت میں کسی سے کیا اعانت کی امید رکھوں۔ وہ میری کب سن سکے گا۔ جو مدد کو آگے بڑھے۔ مگر میرا خیال ہے کہ میرزا صاحب نے یہ مضمون اپنے بہرے پن کی حالت سے پیدا کیا ہو، تو کچھ بعید نہیں۔ اگر یہ خدشہ درست ہے، تو یقیناً ۱۸۴۵ء (۱۲۶۱ھ) سے قبل بہرا ہونا چاہیے۔ اس لئے کہ یہ قصیدہ سنہ مذکور کے مطبوعہ دیوان میں موجود ہونے کے باعث اس سے پہلے کا لکھا ہوا ہے۔

نتیجہ بحث یہ ہے کہ میرزا صاحب سنہ ۱۸۵۲ء میں بالیقین بہرے تھے سنہ ۱۸۴۹ء میں گمان غالب ہے کہ بہرے ہوں اور سنہ ۱۸۴۵ء میں اُن کے بہرے ہونے کا احتمال ہے۔ آلِ محمد مارہروی کو یوں غلط فہمی ہوئی کہ میرزا صاحب نے شروع ۱۸ نومبر سنہ ۱۸۵۸ء کے خط میں صاحبِ عالم مارہروی کو مخاطب کر کے لکھا تھا: "اگرچہ تریسٹھ برس کی عمر میں بہرا ہو گیا ہوں۔ پر بینائی میں فتور نہیں" (عود: ۱۳) اس سے میرزا صاحب کا مقصد صرف یہ تھا کہ گو بہرا ہوں۔ مگر اس بڑھاپے میں نگاہ تیز ہے۔ آلِ محمد صاحب یہ سمجھے کہ ۶۳ برس کی عمر میں بہرا پن شروع ہوا۔

(۳) میرزا صاحب نے ۱۵ فروری ۱۸۶۶ء کو یہ شکایت، نواب خلد آشیاں کو لکھی ہے۔ ۱۲ مئی سنۂ مذکورہ کو ذکا کے خط میں لکھتے ہیں کہ "رامپور کے سفر کا رہ آورد ہے۔ رعشہ وضعفِ بصر" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آنکھوں کی بینائی میں فرق، رامپور سے دلّی واپس چلتے ہوئے جو تکلیف میرزا صاحب نے اٹھائی تھی، اس کے باعث پیدا ہوا۔ لیکن واقعہ اس کے خلاف ہے۔ میرزا صاحب ہی نے ۱۴ رجب ۱۲۸۱ھ (۱۴ دسمبر ۱۸۶۴ء) کو تفتہ کو لکھا ہے: "سامعہ مر گیا تھا، اب باصرہ بھی ضعیف ہو گیا" (خطوط: ۱؍۹۶) چونکہ ۱۸ نومبر ۱۸۵۸ء کے لکھے ہوئے خط بنام سرور میں صاحبِ عالم کو مخاطب کر کے میرزا صاحب لکھ چکے ہیں کہ "اگرچہ ۶۳ برس کی عمر میں بہرا ہو گیا ہوں پر بینائی میں فتور نہیں۔ عینک سے اعانت چاہنی منظور نہیں" اس لئے انھیں اس تاریخ کے بعد اور تفتہ کے نام کے خط کی تاریخ ۱۴ دسمبر ۱۸۶۴ء کے درمیان کسی وقت اس شکایت میں مبتلا ہونا چاہیئے۔ اور اس صورت میں ۱۲ مارچ ۱۸۶۷ء کو ان کا یہ لکھنا "امراض قدیم بڑھ گئے۔ دورانِ سر، رعشہ اور ضعفِ بصر تین بیماریاں نئی پیدا ہوئی ہیں" اضافی بیان ظاہر کرتا ہے۔

(۴) نیز ملاحظہ ہو عریضہ مورخہ ۱۸ ستمبر ۱۸۶۶ء

صفحہ ۵۱

(۱) میرزا صاحب نے ۱۲ مئی سنہ ۱۸۶۶ء کے ذکا کے نام کے ایک خط میں اس سے ملتے جلتے الفاظ میں اپنی حالت بیان کی ہے۔ فرماتے ہیں: "آگے نا توان تھا، اب نیم جان ہوں۔ آگے بہرا تھا، اب اندھا ہوا چاہتا ہوں۔ رامپور کے سفر کا رہ آورد ہے رعشہ و ضعف بصر جہاں چار سطریں لکھیں، انگلیاں ٹیڑھی ہو گئیں، حرف سوجھنے سے رہ گئے۔" (اردوی: ۳۸)

(۲) یہ غزل عریضے کے دوسرے ورق کی پشت پر تحریر ہے، اور سب چین کے پہلے ایڈیشن میں چھپ چکی ہے۔

(۳) میرزا صاحب نے ازراہ سہو بحر رمل مثمن مخبون کو، ہزج مثمن سالم لکھ دیا ہے۔ میر شمس الدین فقیر دہلوی نے رسالہ وافیہ (ورق ۱۹ الف) میں لکھا ہے: "بحر رمل مثمن مخبون، مثالش سعدی گوید۔

گفته بودم چو بیائی غم دل با تو بگویم	چه بگویم که غم از دل برود چون تو بیائی

والضاً سعدی گفته۔

مردمان منع کنندم که چرا دل بتو دادم	باید اول بتو گفتن که چنین خوب چرائی

تقطیعش بہشت فعلاتن تمام می شود۔ ازاں جملہ رکن صدر فاعلاتن آمدہ باقی ہمہ مخبون در صدر و ابتدای ایں وزن اگر سالم بجائی مخبون آرند یا بالعکس جائز است۔ پوشیدہ نماند کہ ایں وزن مشتبہ می گردد بہ بحر بہ کامل مقطوع، زیرا کہ قطع چوں در متفاعلن درآید، مفاعل بسکون لام می شود۔ و آن را بہ فعلاتن منقول می سازند۔ اما چوں فعلاتن از فاعلاتن مخبون بے نقل حاصل می شود، اعتبار نمودنش از بحر رمل اقرب در صواب است۔"

صفحہ ۵۲

(۱) اس عریضے کے لفافے پر ۱۵ مئی سنہ ۱۸۶۶ء تحریر ہے۔ غالباً دوسرے دن ڈاک میں بھیجا گیا تھا۔

(۲) بادشاہ دہلی سے بہادر شاہ ظفر مراد ہیں۔ میرزا صاحب کی ملازمت کی تفصیل کے لئے تعلقات قلعۂ معلیٰ دیکھیے۔

صفحہ ۵۳

(۱) خدا کرے کو سہواً "کر" لکھ دیا ہے۔

(۲) میرزا صاحب نے "میری" لکھا ہے۔

(۳) یہ غزل عریضے کے دوسرے ورق کی پشت پر تحریر ہے۔ اس کے جواب میں وہ خط ۱۳۰۳ء ۱ ۳۰ جون سنہ ۱۸۶۶ء) کو خلد آشیاں نے تحریر فرمایا: "مفاوضۂ عدیم المعاوضہ مع غزل حسن تصاحبت آپ کے وصول سے شادمانی کا لایا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سبحان اللہ! مضمون اور طرز ہر ایک شعر غزل مذکور کا نیا اور عدیم المثال ہے۔

صفحہ ۵۵

(۱) منشی سیلچند کے لئے ان کے نام کے خطوط سے قبل کا نوٹ ملاحظہ فرمایئے۔

صفحہ ۵۶

(۱) نیز ملاحظہ ہو خط بنام مورخہ ۱۰ ستمبر ۶۶ء

(۲) نواب خلد آشیاں نے ۱۳ ربیع الثانی سنہ ۱۲۸۳ھ (۲۵ اگست سنہ ۶۶ء) کو جواباً تحریر فرمایا "اس صورت میں رسید تاقی ضرور نہیں ہے۔ اور حسب الایما واسطے بھیجے جانے ہنڈوی مشاہرہ آپ کے اس طور پر کہ تاریخ پہلی یا دوسری تک آپ کے پاس پہنچ جایا کرے۔ حکم بنام اہالی سررشتہ کے صادر ہو گیا ہے۔"

صفحہ ۵۷

(۱) بدرالدین محمد چاچی، چاچ (تاشقند) کے رہنے والے تھے۔ سلطان محمد بن تغلق (۷۲۵ھ۔ ۷۵۲ھ) کے عہد میں ہندوستان آئے۔ اور اس کی مدح سرائی میں اپنی عمر کا بڑا حصہ گزارا۔ سلطان محمد بڑا علم دوست بادشاہ تھا۔ اس نے ان کی کافی قدر و منزلت کی اور "فخر الزماں" خطاب دیا۔ بدر نے سنہ ۷۴۵ھ (۱۳۴۶ء) میں انتقال کیا۔ ان کے قصائد شہرت عام کے مالک ہیں۔ اور برسوں درسیات فارسی میں شامل رہے ہیں لیکن تلمیحات و کنایات کی کثرت کے سبب سے بدر کے کلام میں لطف کم ہے۔

(۲) میرزا طاہر خاں وحید تخلص مشہور شاعر اور نثار اور قزوین کا باشندہ ہے۔ سنہ ۱۰۵۵ھ (۱۶۴۵ء) میں شاہ عباس صفوی نے اپنا مجلس نویس مقرر کیا۔ سنہ ۱۱۰۱ھ (۱۶۸۹ء) میں وزیر بنایا گیا اور ۱۰ سال تک اس عہدے پر رہا۔ عماد الدولہ خطاب غالباً اسی عہد کی یادگار ہے۔ تاریخ ایران مشہور بہ تاریخ طاہر وحید کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ طاہر کو نثر نویسی پر بڑی قدرت حاصل تھی۔ لیکن اس کی شہرت صرف عہدہ وزارت کی بدولت ہوئی۔ اس نے مجمع الشعراء کے نام سے ایک تذکرہ شعرا بھی لکھا تھا جس کا ایک نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی کے کرزن کلکشن میں محفوظ ہے۔ ڈاکٹر ریو نے لکھا ہے کہ تقریباً سنہ ۱۱۲۰ھ (۱۷۰۸ء) میں انتقال کیا۔

(۳) میرزا جلالائی طباطبائی اصفہان کا باشندہ ہے۔ سنہ ۱۰۴۲ھ (۱۶۳۲ء) میں ہندوستان آیا، اور شاہ جہاں کے دربار کا مورخ مقرر ہوا۔ ابھی ۵ سال کی تاریخ لکھنے پایا تھا کہ حسّاد نے سازش کی اور کام ہمیشہ کے لئے رک گیا۔ جلالا انشا میں خاص طرز کا مالک ہے یہاں یہ ظاہر کر دینا مناسب ہوگا کہ میرزا صاحب نے طباطبائی کو سہواً "طبائی" لکھ دیا ہے

(۴) اعجازِ خسروی ہند و ستان کے سب سے بڑے فارسی شاعر و نثر حضرت امیر خسرو دہلوی متوفی سنہ ۷۲۵ھ (۱۳۲۵ء) کی تصنیف ہے۔ یہ نثر مرصع کی ممتاز کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔ اور نولکشور پریس لکھنؤ میں طبع ہو چکی ہے

(۵) ابو النصر معین الدین محمد اکبر شاہ، شاہ عالم بادشاہ دہلی کے بیٹے اور دہلی کے آخری بادشاہ ظفر کے باپ تھے، رمضان سنہ ۱۱۷۳ھ (۲۳ اپریل ۱۷۶۰ء) کی تاریخ کو پیدا ہوئے اور ۷ رمضان ۱۲۲۱ھ (۱۹ نومبر سنہ ۱۸۰۶ء) ہی کو ۴۵ سال کی عمر میں تخت پر

بیٹھے۔ اور ۳۱ سال ۹ ماہ ۱۲ دن سلطنت کرکے ۲۰ جمادی الآخرہ سنہ ۱۲۵۳ھ (۱۸ ستمبر ۱۸۳۷ء) کو جمعے کے دن فوت ہوگئے (مفتاح التواریخ: ۳۷۵) اکبر شاہ اپنے والد کی طرح شاعر بھی تھے اور "شعاع" تخلص کرتے تھے۔ شاہ عالم کا مجموعہ کلام فارسی، اردو و ہندی موسوم بہ نادرات شاہی، کتاب خانہ رامپور کی طرف سے طبع ہوچکا ہے۔

(۲) میرزا صاحب کا یہ عریضہ نواب خلد آشیاں کے فرمان مورخہ ۱۵ ربیع الثانی سنہ ۱۲۸۳ھ (۲۷ اگست سنہ ۱۸۶۶ء) کا جواب ہے۔ القاب و آداب کے بعد نواب صاحب نے تحریر فرمایا ہے:

"... . و ربیں ولا تقریظ شرح قصائد بدر چاچی از نوک قلم جلوہ خیز گردیدہ۔ اولاً بر دیباچہ مولوی عبدالرحمٰن وحیدہ مابقی بر طرز جلالائی طباطبائی نگاشتہ ام۔ چوں زیور اصلاح در گنج خانہ عالی طبیعت آں استاد زماں مخزون نیست، بہمیں نظر آں نقش باطل را مرسل ساختہ، مرقوم کہ آنچہ فطرت کمالش پسر شار نہ پسندد، خامہ اعجاز نگار را برہیچہ تانیہ علاوہ ازیں مجموعہ پریشانی بہ تلافیش تکلیف تحریر دہند و باہرع از منہ . دیدہ سفیدان ایں دیار را از سرمہ جواہر آگیں جواب باصواب مسرور و شادماں سازند۔"

شرح قصائد بدر چاچی، جس کا فرمان میں ذکر ہے، مولوی محمد حسن خاں بہادر مدار المہام کی تصنیف ہے۔ خان موصوف نواب خلد آشیاں کی خدمت میں زمانہ ولیعہدی سے آدرفت رکھتے تھے۔ زبان فارسی اور حساب وغیرہ سے بخوبی واقف اور قدرے عربی آشنا تھے۔ جب نواب صاحب تخت نشین ہوئے تو ان کا تقرب اور رسوخ یہاں تک بڑھا کہ ریاست کے مدار المہام بنا دیے گئے۔ مزاج میں قدرے درشتی اور جبر تھا۔ اسی وجہ سے ۱۲ ربیع الاول سنہ ۱۲۹۰ھ (۱۸۷۳ء) کو جامع مسجد کے اندر جلسہ میلاد النبی کا انتظام کرتے ہوئے نادر شاہ خاں نامی ایک پٹھان کے ہاتھ سے چاقو کا زخم کھا کر انتقال کرگئے۔ میاں منصور علی صاحب منصور رامپوری نے "رخصت" مادۂ تاریخ نکالا (اخبار الصنادید ۲: ۵۲-۱۵۶) میں گیارہ تاریخ کو زخمی ہونا اور بارہ کو وفات لکھی ہے۔ ان کے خاندان کی ایک مستورۂ محترمہ کا بیان ہے ... لیکن ہے۔ مگر حقیر عرشی نے بزرگان شہر سے پرسش کی تو بالاتفاق سب نے یہی بتایا کہ ہمیشہ سے ۱۲ ربیع الاول ہی کو جلسۂ میلاد النبی ہوا کرتا ہے، اور یہ واقعہ سب کے نزدیک جامع مسجد کے اندر جلسے میں پیش آیا تھا۔ اس سے ... معلوم ہوتا ہے کہ مولوی نجم الغنی خاں مرحوم کی تحریر انھیں محترمہ کے بیان پر مبنی ہے جو ان کی رشتہ دار تھیں۔

(۳) اس نثر سے مذکورۂ بالا تقریظ شرح قصائد چاچی مراد ہے۔ نقل میں یہ نثر موجود نہیں ہے اس لیے میرزا صاحب کے مواقع اصلاح معلوم نہیں ہوسکے۔

صفحہ ۵۸

(۱) نواب صاحب نے ۲۳ ربیع الثانی سنہ ۱۲۸۳ھ (۴ ستمبر/۲۵ اگست سنہ ۱۸۶۶ء) کے فرمان میں جس کا کچھ حصہ ۱۳ اگست کے عریضے کے حاشیے میں نقل کیا جاچکا ہے، میرزا صاحب کو تحریر فرمایا تھا: "... . مطلب دگر، چونکہ راقم کو ترتیب بیاض اشعار منتخبہ ساتذۂ فارسی

و اردو کی منظور ہے، اس واسطے حوالۂ خامۂ محبت نگار کے ہوتا ہے کہ آپ انتخاب دیوان فارسی و اردو اپنے کا فرما کر مع انتخاب کلام ضیاء الدین خاں صاحب لطف کریں، تا شامل انتخاب کے، جو اس سرکار میں عمل میں آیا ہے، ہو جائے۔" میرزا صاحب نے حسب الحکم اردو دیوان کا انتخاب ۱۸ ستمبر کو اور فارسی کلیات کا انتخاب ۲۴ ستمبر کو ارسال کیا۔ یہ دونوں انتخابات جو حسبِ حکم فرمان مورخہ ۹ جمادی الاولیٰ سنہ ۱۲۸۳ھ/۱۰ ستمبر ۱۸۶۶ء (؟) اس تاریخ سے قبل موصول ہو چکے تھے، کتب خانہ سرکاری میں محفوظ تھے۔ سنہ ۱۹۴۲ء میں ضروری حواشی اور مقدمے کے ساتھ "انتخاب غالب" کے نام سے ان کو یکجا شائع کر دیا گیا ہے۔ نواب صاحب کے پسندیدہ اشعار کی کئی چھوٹی چھوٹی بیاضیں کتاب خانے میں محفوظ ہیں، مگر ان کے متعلق یہ کہنا دشوار ہے کہ وہ منتخب بالکل ایک مذکورۂ بالا بیاض ہے۔

(۲) نواب ضیاء الدین احمد خاں بہادر نواب احمد بخش خاں والیِ فیروز پور جھرکہ و جاگیردار لوہارو کے خلفِ اصغر تھے۔ آپ کی چچا زاد بہن غالب سے منسوب تھیں۔ اس نسبتی رشتے کے علاوہ اہم رابطہ یہ تھا کہ نواب صاحب فنِ شعر میں غالب کے شاگرد تھے۔ یہ فارسی میں نیّر اور اردو میں رخشاں تخلص کرتے تھے۔ (اردوئے معلیٰ: ۱۴) ان کی سمعی و حسنِ طبیعت کے میرزا صاحب اس درجہ معترف تھے کہ انہیں اپنا نمونہ کہتے تھے۔ کلیاتِ فارسی میں ان کی مدح میں ایک قصیدہ ہے۔ اس میں میرزا صاحب فرماتے ہیں:

نکتہ شیوہ، شاگرد و ہم ابن عم ماستا — صنم بصورت خود می تراشد آذر من
اگرچہ اوست ارسطو و من فلاطونم — بود بپایہ ارسطوی من سکندر من

نواب ضیاء الدین احمد خاں بہادر ادب، تاریخ، حکمت، سیاستِ مدن اور جغرافیہ کے بہت بڑے عالم تھے۔ انھوں نے ایلیٹ صاحب کو تاریخ ہند کی ترتیب میں بہت مدد دی تھی۔ ان کے کتب خانے کے متعلق میرزا صاحب لکھتے ہیں: "میرا ایک نسبتی بھائی ہے نواب ضیاء الدین خاں سلمہ اللہ تعالیٰ۔ وہ میری نظم و نثر کو فراہم کرتا رہتا تھا۔ چنانچہ مجمع نثرہا اور کلیاتِ نظمِ فارسی اور کلیاتِ نظمِ اردو سب نسخے اس کے کتب خانہ میں تھے۔ وہ کتب خانہ کہ ڈر کر عرض کرتا ہوں، ۲۰ ہزار روپے کی مالیت کا ہوگا، لٹ گیا، ایک ورق نہیں۔" (اردوئے معلیٰ: ۲۹) نواب ضیاء الدین خاں بہادر نے سنہ ۱۳۰۲ھ ہجری (۱۸۸۳ء) میں وفات پائی۔ مجروح نے مصرع "اب نہ باقی رہی وہ رونقِ شہرِ دہلی" سے ہجری سال نکالا ہے (تاریخ لطیف: ۲۳۱)

(۳) میرزا صاحب نے یہاں "احسن" لکھا ہے، مگر دو پر غزلوں کا ذکر ہے، اس لیے "ان" ہونا چاہیے۔

(۴) نیز ملاحظہ ہو عریضہ مورخہ ۱۵ فروری ۱۸۶۶ء

(۵) میرزا صاحب نے ۱۲ مئی ۶۶ء کو ذکا کے خط میں لکھا ہے کہ: "رامپور کے سفر کا رہ آورد ہے رعشہ و ضعفِ بصر۔" خلد آشیاں کے ۱۰ نومبر سنہ ۶۶ کے خط میں اس بیماری کا ذکر کر کے پھر ۱۲ مارچ ۶۷ء کو لکھا کہ "دوران سر، رعشہ اور ضعفِ بصر، غرض بیماریاں نئی پیدا ہوئی ہیں۔"

لیکن میرزا صاحب کی اس بیماری کا پتا مارچ ۱۸۵۲ء میں بھی چلتا ہے۔ شفق کے نام کے فارسی خط میں جواں بخت کے سہرے کا جھگڑا بیان کر کے لکھا ہے کہ: "اکنوں کہ دندان فرو ریخت، و گوش گراں گشت، موی سپید است و روی پر آژنگ، دست بلرزہ اندر است و پای در رکاب" (پنج آہنگ: ۱۸۱، طبع دوم)۔ اس جملے سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۵۲ء میں جب کہ ان کی عمر ۵۲، ۵۵ برس کی تھی، چند دانت گر چکے تھے۔ کان بہرے ہو گئے تھے، اور ہاتھوں میں رعشہ تھا۔ لہٰذا میرزا صاحب کا رعشے کو نئی بیماری کہنا درست نہیں معلوم ہوتا۔ اور نہ یہ صحیح ہے کہ یہ رامپور کے سفر کی سوغات ہے۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ یہاں سے واپسی میں جو دکھ اٹھایا تھا اس کے نتیجے کے طور پر اس مرض میں زیادتی ہو گئی ہو۔

(۶) نیز ملاحظہ ہو عریضہ مورخہ ۱۳ اگست ۱۸۶۶ء

(۷) یہ فارسی کے محاورے، نشان دادن، بمعنی پتا بتانا کا ترجمہ ہے۔

صفحہ ۵۹

(۱) یہ عریضہ نواب صاحب کی اس تحریر کا جواب تھا: "... نامۂ محبت آمیز مع تعزیت بدرجاچی و مضامین اصلاح آگیں سرمۂ کشش چشم وصول گشتہ روشنی بخش عیون دیدۂ سفیدان انتظار گردید۔ چنانچہ نظر بہمہ الفاظ کہ شاید مجالتاً بامعان نظر ملاحظہ نشدہ مرسل داشتہ ام چشم کہ اگر اقوال این ہمہ اساتذہ قابل اعتبار باشد فبہا۔ والا بعد مشاہدہ از چگونگی آں مطلع سازند۔ المرقوم ۲ جمادی الاولیٰ سنہ ۱۲۸۳ھ مطابق ۱۳ ستمبر سنہ ۱۸۶۶ء"

آشیاں چیدن: عرفی، بیت

آشیان زمن و زاغ بچیدم بر سر سر قدم ساختہ برخار مغیلان رفتم

عذرا از این دوشیزہ، و عذاری بفتح الزاء و کسرہا و عذرا وات جمع۔ از منتہی الارب۔ از فرہنگ جہانگیری: "ارژنگ چہار معنی دارد، اول بمعنی ارتنگ ست کہ مرقوم شد، دوم نام مصوری بودہ مانند مانی، و سوم نام دیوی، چہارم نام پہلوانی از توران۔ ارتنگ نگارنامۂ مانی نقاش، وگاہ ارتنگ بہ مانی اطلاق کنند" آغاز دیباچہ: "کہ کاخ دماغ صدر نشینان محفل سخندانی را بہ نقوش خیالات رنگا رنگ رشک ارژنگ مانی ساخت بس مانی ارژنگ بمعنی مانی نگار خانہ بودہ است۔ و در کلام اہل ولایت نیز ملاحظہ رسید"

(۲) کتاب خانے کے پرانے کاغذات میں ایک ورق دستیاب ہوا تھا جس میں نیر کے فارسی اردو اشعار بڑے قلم سے خط لکھنے کے باریک نیلگوں کاغذ پر درج ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ انھیں اوراق کا پکس ماندہ ہے، جن کے ارسال کرنے کا میرزا صاحب نے ذکر کیا ہے بعد ازاں ایک سہ ورقہ مولوی مہدی علی خاں مرحوم (تحویلدار کتب خانہ) کے کاغذات میں سے دستیاب ہوا جس پر بھی اشعار کمی بیشی کے ساتھ مندرج ہیں۔ یہ اول الذکر کی نقل معلوم ہوتی ہے اور اسی طرح کے کاغذ پر زیادہ خوشخط قلم سے تحریر ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ نقل رامپور میں سرکار کے حضور میں پیش کرنے کے لیے تیار کی گئی ہوگی۔ ان اشعار

کے علاوہ نیر کا ایک فارسی قصیدہ بھی کتابخانے میں محفوظ ہے۔ یہ لارڈ رپن کی تعریف میں لکھا گیا ہے۔ اور نیر کے بہترین کلام میں شمار کیے جانے کے لائق ہے۔ مناسبت مقام کے لحاظ سے اشعار مذکورہ کے بعد اس کا مطالعہ بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ مرسلہ شعر حسب ذیل ہیں:

غزلیات فارسی

گوئی کہ فیض حق رسد و ناگہاں رسد — خوش طالعی کہ جذبۂ شوقی بجاں رسد
لذت شناس بیم بلا، زورقی امید — در چار موجہ افگند، از بر کراں رسد
ہاں نالۂ رسا، سر موجی کہ از سپہر — در گوش خلق زمزمۂ الاماں رسد
حاجی بیای مزدہ بہ دار السلام شد — ساقی بدست رنج بدار الاماں رسد
گریم چو ابر، بو کہ بداں کوی جسم راز — چوں خس، بپای مردی آب رواں رسد
بر رغم محتسب سر باز از در کنشتم — گہ ساغری ز پیر مغاں ارمغاں رسد
نیر بآسماں بنہم باز پای ناز — گر ایں سر نیاز بر آں آستاں رسد

ایضاً

از دیدہ ودل از روش لعل و گہر افتاد — تا آبلہ در سینہ وخون در جگر افتاد
اشکی کہ نہ دریا بد تو از چشم تر افتاد — در دیدۂ صاحب نظران از نظر افتاد
عطار ودم دشنہ و حلاج و سر دار — در موقف تسلیم چہ خونہا ہدر افتاد
گردم سرپا مغز تو، ای ساقی بدست — می در قدم از دگراں بیشتر افتاد
گر خشد نہ زم عیب ز دا ژدی طالع — از ہر چہ عیبم نہ بجائی ہنر افتاد
نیر کشدم نازکی ساعد قاتل — بالجیہ گر امروز نیاز دم دگر افتاد

ایضاً

گر نباشم بدر دوست گدائی کم گیر — در بہیرم بر ہوش، بی سر و پائی کم گیر
نقش امید اگر جلوۂ دلخواہ نداد — از سر لوح ازل حرف گدائی کم گیر
زشت دانستہ اگر دست کشیدی ز جفا — از جفاہای ندانستہ جفائی کم گیر
زخم گر بہ شدنی ہست و نمک پیدا نیست — مرضی بیشتر انگار و دوائی کم گیر
فیر در خلوت دلدار اگر راہ نیافت — از بلاہای شب ہجر بلائی کم گیر
مادر دہر نزاید سپس از سہ مولود — مشت خاکی و گیاہی و ہوائی کم گیر
گر فرو ریزد اساس کہن چار ارکان — اشکی و آہی و سوزی و ہبائی کم گیر
گر فرو بست لب از حرف حقیقت نیر — از چمن بلبل آشفتہ نوائی کم گیر

ایضاً

پیش دو میکدہ سر بجبیدن دہیم — نشۂ اقبال را اوج رسیدن دہیم
ریزش خون از دو چشم زدرون تنگ گشت — با ہمہ تن خون شویم، داد چکیدن دہیم
تا دگر خون خوارہ اش بر نکشیم ای جگر — بلکہ لب زخم را ذوق مکیدن دہیم

ہست از ذوقِ تپش، پاس نزاکت فزوں — در تہ خنجر جہاں تن بہ تپیدن دہیم
حیف کہ از جادہ جسم خش بہ زبونی دہد! — سینۂ خود را چو جیب، عرض دریدن دہیم
گو بسر پا بار رفتہ ز رہ روش — تا بفلک نالہ را سر بکشیدن دہیم
از نمک فتق ماست ہرچہ سود و قیاب — لامسہ را از فسون حس جشیدن دہیم
بیشتر از طرف خویش بہرہ نخواہد ربود — روح قدس را بدل رہ بخزیدن دہیم
وعدہ بعزو است گر، مرحلہ بیش نیست — شوق سبکتاز را گام دویدن دہیم
ز ادہ ستعہ، رنگ رنگ جنس، دل سادہ را — از پی نقش دفا داغ گزیدن دہیم
گوز سر خونچکاں پی بسپر رہ بہ بند — زینت فتراک را سر بہ بریدن دہیم
بوسنفش جسم بری چادر اشکی بس است — بہ نمط عنکبوت تار تنیدن دہیم
سینہ کہ از داغ عشق لاف انا الشرق زد — از افق چاک جیب خور بہ دمیدن دہیم
ہر نفس آید بگوش بانگ درای رحیل — ناقۂ خود را چسرا حکم چریدن دہیم
سال نشید غزل "داد پیغمبری" است — نیز بیان را چو فرس لطف شنیدن دہیم[1]

فی النعت

خاربی ہش چشم را رخصت چیدن دہیم — در دل رضوان، ز رشک، نیش خلیدن دہیم
لب بتکلم کشاد، نغمہ زانفاس زاد — دل بشنیدن نہیم، جان بشمیدن دہیم
بر سر عرش برین طرف کلہ بشکنیم — بہر قدمبوس شاہ، سر بخمیدن دہیم
بندۂ آں خواجہ ایم کز پی جنس بہشت — معصیت خویش را برگ خریدن دہیم
روحی وقلبی فداک: در رہ تو دل راچو خاک — ورق زاد و عصمت جان بدمیدن دہیم
شاہ بہی گر بچشم کحل "ما زاغ" کشیم — صبح "ارنی" گوی را نیر دیدن دہیم
آنکہ بہ نیر خورد با دخوش روضہ را — سرو چمن زار ہند موج دمیدن دہیم

ایضاً

بر روی چو خور نقاب تا کی — دلجوئی ماہتاب تا کی؟
یارب! ز تپ غم امان دہ! — باد آتش و خاک آب تا کی؟
باشیم بدہر تا کجا شاد؟ — ہینیم بخواب خواب تا کی؟
خوہاں با نبید نسیۂ شہد — از نقد شراب ناب تا کی؟
ز امید بد و سوال تا چند؟ — در یاس از دجواب تا کی؟
نشناختہ بلہوس ز جانباز — بے مصرفی عتاب تا کی؟
داغم کہ دل از فسردگی سوخت — بر بابزان این کباب تا کی؟
کی بودہ دگو نشان ایشان؟ — از شاہ و فراسیاب تا کی؟
معمورۂ ہم چو شہر دہلی — ای چرخ کہن خراب تا کی؟
واں مسجد جامع مقدس — بازیگہ طفل و شاب تا کی؟
نیر بجہاں نگر بہ حسرت — یا [illegible] حباب تا کی؟

(۱) مہدی علی خاں کے نسخے میں شعر ۷، ۸، ۹، ۱۰، ۱۱، ساقط ہیں۔ نیز [illegible] "بدن" اور مقطع میں "سالی" [illegible] غزل ہے

اشعار ریختہ

فلک گر نہ تھا بار اٹھانے کے قابل
تو کیا تھے ہمیں آزمانے کے قابل

زہے: سربلندی شہیدِ وفا کی!
گر اس در پہ ہو سر چڑھانے کے قابل

جہاں میں ہوئی صبحِ محشر نمایاں
کہ ہے شمعِ ہستی بجھانے کے قابل

مجھے رشکِ وحشت میں ہے نخلِ بار پر
نہیں خاک سے جو اٹھانے کے قابل

لیے سر پہ پھرتے ہیں وہ بارِ عصیاں
زمیں میں نہیں جو سمانے کے قابل

وہ لب کے ہلانے میں کیوں صرفہ کرتے
مگر تھے نہ ہم ہی جلانے کے قابل

مرا سینہ اے غیر کیا دیکھتا ہے
ترا منہ ہے اس زخم کھانے کے قابل

نفس ہی کے ہمراہ شاید بر آوے
جو حسرت کوئی ہو بر آنے کے قابل

کوئی ان کو لے آئے خلوت سے یاں تک
کہ ہے شمعِ محفل جلانے کے قابل

نہ ہو تو ذرا بھی کہ گویا نہیں ہے
زباں کام میں کچھ بھی لانے کے قابل

یہ آنکھیں جو پتھرا گئیں تھیں، نہ دیکھیں
ترِ پای قاتل بچھانے کے قابل

جو آئندہ کہتے ہیں سچ ہے وہ رخشاں
کہ دنیا نہیں دل لگانے کے قابل

ایضاً

بوالہوس اور بھی مرنے کی کرینگے خواہش
شمع و گل قبر پہ رخشاں کی نہ لایا کیجے (۱)

خاک کا پتلا ملائک کا بحق مسجود ہے!
سجدۂ حق میں بشر کا جبہ خاک آلود ہے

واں پہنچنا کیا ہو مشکل، آئے یوں جس جا سہل
جادۂ دشتِ عدم اپنا قدم فرسود ہے

یہ سرِ نخوت کہیں اب تو جھکے بہرِ خدا
مورچہ یا سبزۂ خط، لشکرِ نمرود ہے (۲)

زلفِ مشکیں کی سیاہی بس گئی ہے آنکھ میں
رشتۂ تارِ نگاہ و دیدہ مشک اندود ہے (۳)

بہ حصارِ آبگینہ شیشۂ ساعت کی شکل
گاہ زیر و گہ زبر یہ باد و خاک آلود ہے

دل دخود آبلہ سے سینے میں کیونکر سمائے!
دل کے پر خوں ہونے سے ضیقِ محل افزود ہے

نغمۂ عشق آہنیں دل کو بھی کر دیتا ہے موم
لحنِ داؤدی میں اعجازِ کفِ داؤد ہے

آفتابِ حشر سے دل سوختہ کو کیا ہراس!
دودِ آہِ دل سے سر پہ سایۂ ممدود ہے

دل فزا لطفِ سخن، جاں کاہ غصے کی نگاہ
نقدِ جان و جنسِ دل رہنِ زیان و سود ہے

سنگِ اسود پر لگی ہے آہنی بت کی ہے ساخت
مومن و کافر کو، تیغِ دلستاں مسجود ہے

نفیِ نفی اثبات کہلاتی ہے، رخشاں اس لیے
ہم نہیں کہتے کہ یہ کون و مکاں نابود ہے

ایضاً

(۴) مے کے گرنے کا ہے خیال ہمیں!
ساقیا، لیجو سنبھال ہمیں

کل نہ آئے جو اپنے وعدے پر
گزرے کیا کیا نہ احتمال ہمیں

---

(۱) مذکورہ نسخے میں یہ شعر بھی نہیں ہے (۲) شعر ۲، ۴، ۵، ۶ مذکورہ نسخے میں نہیں۔

(۳) نسخۂ مذکورہ میں مشک آلود ہے (۴) یہاں سے آخر اشعار اردو تک مہدی علی خاں کے نسخے سے ساقط ہے۔

تیرے غمزے نے ایک دم میں کیا — مردۂ صد ہزار سال ہمیں
نقص سے رنج کچھ نہیں رخشاں — حق نے بخشا ہے یہ کمال ہمیں

ایضاً

سنا بہ بہار آئی کہ جو بیچئے جنوں — پھر کر رہا ہے جامۂ دستار تار تار
سر پیٹئے، سینہ کوٹئے، کہ افسوس ہو ملے؟ — عاشق کو ہاتھ چاہئیں ناچار چار چار
رخشاں یہ غصے، قیس کے ملنے سے کیوں ہوئے؟ — ملتے ہی ہیں ہم، بہت عیار، یار یار

ایضاً

چاک یکسر مرا گریباں ہے — دل کا محضر مرا گریباں ہے
لاغری میں بریدہ ناخن سے — مختصر تر مرا گریباں ہے
راست بینے سے سینہ کس کا رہا! — کہ معطر مرا گریباں ہے
چاک کرنا جگر کا سکھلایا — میرا رہبر مرا گریباں ہے
سر آوارگان وحشت پر — سایہ گستر مرا گریباں ہے
پھر بہار آئی، اب جنوں کا ہاتھ — اور بہتر، مرا گریباں ہے

ایضاً

کیا پہنچے تو، فرشتے کا جس جا گزر نہ ہو — بیت المقدس ہے، شیخ خدا کا یہ گھر نہ ہو
رخشاں جو آتے آتے ابھی رک گئے ہیں اشک — آنکھوں میں آ گیا کوئی لخت جگر نہ ہو

ھو

سحر کہ باد بحر در دمیدہ جیبان در تن — بنورِ صبح، نمودم وہ دیدگان روشن
بہ تیغ؟ صبح دل افروز روزگار بہار — چہ بار؟ باد روان بخش نو بہار چمن
سحر کشیدہ برخ غازہ از نمود شفق — صبا دمیدہ بہ تن روح از نسیم سمن
قبرد رخ صبح بدیدہ کشیدہ سرمۂ نور — کہ خواندہ گشت خط سر نوشتہا لعلن
نسیم باغ بتی کشادہ طبلۂ عطر — کہ تودہ تودہ سمن ریختہ است و گل خرمن
زبان نہ سوی تو بخم لبسان باغ ارم — جہاں زجوش شمارم بہار داشت ممکن
بو ہزدہ بوندہ دل خلد عدن سواد — کہ گشتہ ذرۂ خاکش ہم اللہ در عدن
چہ دلی؟ آن کوہ فرط تنگی زمیں — زروز خندہ گل، نہفتہ بود چمن
چہ دلی؟ آنکہ بہ وقت بودہ دلکشا — زرو زبیح مغل تا زمان جرجو دعن
چہ دلی؟ آنکہ دیا لی تخت ہندستان — چنانکہ مملکت، و تکیند را السدن
چہ دلی؟ بادشاہان تموری مدارس بود — علوم مشرقی و مجالستہم را معدن
چہ دلی؟ آن کہ دو ہوندہ صناعت بود — مدار جملہ ہنرہا و مرکز ہنر فن
زنقش فنون دایان و مجلس سالی — ستارہ زار مشتری من موقع درش
ز بو و طیب باغ شورہ مہیب ارایان — شدی بسنگ، و درش شہید عقیق یمن
سیاہ جیکد گر یافتہ ہمسایہ ظلمت — زخیر مقدم گیہان خند یولارڈ رقن

ا یہ داعی پاخود خانہ و تالم من منصف بمعنی بار دادن۔ لیکن مستعمل فارسی زبان مدح سرا نمک ہندا ست

بدان مشابه که روز جلوس قبلا خان[۱] ۔ شده مزین و باز یب بلدهٔ پیکن[۲]
بدان نمونه که بر تون گشته است آئین بند ۔ دم ورود مظفر شهنشه جرمن
بگونه گونه نمایش گرفته آرایش ۔ چه باره و در شهر و چه کوچه و برزن
خلائق از پی دید شکوه استقبال ۔ شتافته خیز و دوان سوی ریل اسٹیشن
چه موج باد همه ره بسپرده چه خاص و عام! ۔ چو سیل آب همه قطره زن، چه مرد و چه زن!
بقطع راه یکی بر دگر تقدم جوی ۔ فشرده خار و خس راه را اطلس وادکن
بمانده هم بسر خلق تا بسپل مخلد ۔ دراز و هام گرانداخته کسی سوزن
بوز فرط خوشی یا که از کشاکش خلق ۔ که پاره پاره بر اندام گشته پیراهن
چو روز عید کسان از همه و آمد و رفت ۔ بهیکدگر شده گرم معانقه همه تن
معانقه شده یکسمت منبع انواج ۔ زبسکه بوده بتخمین شهر دست زن[۳]
غریو فستگی توپ مژده جنبش قدوم ۔ فگنده غلغله در گنبد سپهر کهن
پیادگان و سواران ستاده هر دو طرف ۔ همه نهنگ شکار و همه پلنگ اوژن
گروه ساز نوازان بیکطرف نواده نعت ۔ طرب فی و بحبت اندر جلاجل و ارغن
بدو برادر و دوران همه اکابر شهر ۔ فراهم آمده ز افسران گروه گروه خرمن
محززان یورپ جمع با اهالی هند ۔ چنانکه سبزه و گل بود هر بیک گلشن
ز سر گرفته کلاه نغش سران ز ایسر ۔ نهاده دست بسر بندی افسران زمین
نموده پشت و خم و سر فرو پئی تسلیم ۔ گرپا بوسی و سر بازی است از ان روشن
گزید شیوهٔ دیرین ادای تهنیت است ۔ بر الیدین ممالک ز اهل ملک و وطن
دلی بخاطر راقم لطیفه گزرد ۔ امید آنکه قبولش کنند اہل فطن
کہ دلپذیرائی علامت گرای ملک آرای ۔ خود از زبان در افشاں بلهجه این
بشریان بدیده مژده مبارک باد ۔ ز عہد دولت خود عہد نشر عدل و منن
نوید راحت و آسودگی و آزادی ۔ امید رنج علاهای قحط و رنج و ملتن
خدا بگاما و قتیکه در میان سفر ۔ بیا رسالی از امروز دور تا صدون[۵]
ہم از تبدل آب و ہوای ملک و فصول ۔ ہم از مشقت راہ و دراز بسپردن
رسید و بود بہم رنج صعب و ضعف قوی ۔ بدان شریف عناصر بدان لطیف بدن
عموم مردم ہند خصوص دلو یان ۔ شدند مضطرب و مبتلای درد و حزن
ورا ز ساختہ دست دعا بدرگہ حق ۔ ہمہ ای صحت فرما ندہ زمین و زمن
دعای صبحگی و نیاز نیم شبی ۔ ہزار شکر کہ پذرفت ایزد ذوالمن
بمژدہ ترقی عافیت ابروان آمد ۔ ہم از حصوف علالت ہم از جان و جن
نگاہبان تو چشمان روشنان سپہر ۔ کہ ہست بر قدرت از فضل چشم شاد دیگر
بیادگار قدوم مسرت آثارت ۔ ز شہر گشتہ فراموش شیوہ شیون

(۱) قبلہ چنگیز خاں (۲) پائی تخت چین (۳) پائی تخت پروشیا، (۴) چیرز دیہ انگریزی لفظ ہے اور اس کے معنی تالیاں ہیں یعنی (۵) در ترکی دہ ہزار سال کو ہندو

بروزگار ورود حجستگی یار است
بدشت لاف ہمائی زده است بوم و دمن

زسر گرفته کله چرخ و مه پی تعظیم
اگر گذشته بر ایوان تو ز نیه پیرامن

سزد ز شہپر کرد بیان بر کلہت
که گشته طرف کلاهت بچرخ سایه فگن

ز اختلاف صلاحت، امور سہل محال
ز اتفاق رضایت، محال ہا آسان

گورنری بتو نازد نه تو بدان که فروغ
بود ز شمع لگن را نه شمع را ز لگن

توان شمرد نظیرت چگونه آفتکس؟
که فتح یافته بر یک ضعیفه قبطی زن (۱)

توان نوشت عدیلت چگونه اسکندر
که فوج خود نتوانست برد تا بجمن

ز اتحاد تو، بیجدل همه پروتسنت (۲)
ز اعتقاد تو، خوشنود کیتھلک رومن (۳)

از آنکه ملت پیشینه مسیحی را
مصدقی بخلوص یقین و خوبی ظن

فزون تری ز دگر علیو به حکم و بہان
برحم و شفقت قلبی و مهر و خلق حسن

ز خلق دوستی و حق پرستی تو بہر
نبود هیچ کسی دشمنت جز اہرمن

بزیر حکم تو، از روی طول صد کشور
ز رود قبار برہم پتر (۴) تا بقطع دمن

مطیع امر تو، از راه عرض یک عالم
ز کوهسار ہمالہ (۶)، الی بلاد و کن

اگر بعهد تو بودی، بیادی قاصر
ز شرح دانش و داد تو توش بیان ملتن (۷)

ز مدح خوانی تو ہومر آمدی ابکم
ز وصف گوئی تو درجل آمدی الکن

اگر چگونه دامان تو رسد دستش
دراز دست از آن آفریده شد اہمن

مراد از آن دل ترکی (۸) بود محاسبۂ
سنین عمر تو هرگه کند شمار از دن (۹)

خوشا مبارکی عهد معدلت عهدت!
که اعتدال ربیعی است در روی او بهمن

بسی چی اسپ سواره گرا کتاب هوا
شود هوای بہاری ابهیت توسن

شکار شیر ازان رو بجد پسندیده
جناب ارل گری؛ نوجوان شیر اوژن

که بخیل زد و دان مشتغل شوند بدشت
هزار جان بزراعت درودن و کشتن

ز فرط پیل کشتی و پلنگ افگنیش
شد از روانی خون، دشت رود شانن (۱۰)

توئی که باز سپردی امارت کابل
بعبدرحمن خان آن جلا شده ز وطن

نه صرف قطعۂ ملکی بدو ببخشیدی
که دادی اسلحه و سیم و زر چهل مخزن

بدان قدر که هم از سیم می توان ساخت
برای توپ مگو که گران تر از آهن

بجود و بذل که بنددی همان زر بودی
امیر فتح و ظفر یافته است بر دشمن

ولی با این همه بذل توجه و الطاف
اعانت وعدو بخشش و عطا و منن

امید خیر سگالی از و نباید داشت
دنی کجاست بجز بنده مرد عهد شکن!

شعار اوست رضاجوئی و ہمسایه
ز دن دو چنگ پی آغوز زر بود و امن

و میکه گشت معین یک انگلش افسر
پی سفیری آن ملک وی بود مسکن

(۱) کلوپطرا مصری (۲) عقیدۂ دیگر حاکمان انگلش (۳) عقیدۂ ولیسرائی (۴) دریای شرقی ہندوستان و فضای بنگاله (۵) مواضع سرحد بلوچستان و افغانستان و قطع کے تئے مراد: مغربی (۶) جبال شمالی ہندو (۷) ملتن و ہومر و درجل هر سه شاعران نامی یوروپ بوده اند (۸) دو هزار سال (۹) یک عدد انگریزی (۱۰) نام یک دریای ایرلینڈ.

بغور بندہ ز نارسائی این تدبیر | نمودہ عرض برادر زبیل الحیرق⁽¹⁾
کز آبیاری فرمان روای پنجاب | بود شگفتہ و شاداب تر ز صد گلشن
ولی و نبیعۂ دیر بنہ خیرخواہانست | خصوص مدح طرازان سالخوردہ چو من
ادا نمودن اندرز در مطاوی مدح | نگار کردن مطلب بضمن شعر و سخن
دریں چگامہ کہ باجملہ تہنیت نامہ است | در آسمان شدہ بر نظم وی نثار پرن
یکی نگارش مدح است، بو کہ باد قبول | دگر گزارش رائی کہ بود⁽²⁾ مستحسن
بیان بندہ نہ فخریہ بلکہ شکریہ است | کہ از میانِ ایں عہد و مین این مأمن
نہادہ اند بطبعم لطیفی از ہر علم | سپردہ اند بدل حصہ ز ہر یک فن
ز نظم و نثر ز جغرافیہ ہم از تاریخ | ز حکمت عملی وز انتظام مدن
کلام پارسی پیری خیال آمیز | کہ فاش شد زمن ایں تازہ طرز تو فاش⁽³⁾
ز بندہ بیتر زخشاں کند قبول این نذر | کہ برتر است ز سلک گہر بار و دوش
درم دعاست کہ ہم بر دعا سخن سنجان | گرفتہ اند مبارک لقبِ ختم سخن
مدام تا شود آوردہ ذکر رستم بیدم⁽⁴⁾ | مدام تا کہ شود بردہ نام نل بہ دمن⁽⁵⁾
ہمیشہ تا کہ بلاحق بود بدجلہ فرات | ہمیشہ تا کہ معانق بود بگنگ جمن
ہم بہ مارکوئیس خوش نہاد مارکسنس⁽⁶⁾ | چہ در ممالک ہند و چہ در دیار رین⁽⁷⁾
بفرق ہر دو گراں مایہ و سہ دیگر اول⁽⁹⁾ | تقدس سہ اقالیم⁽⁸⁾ باد سایہ فگن!

(۳) ضیاء الدین خاں بہادر کے کتب خانے کے غدر میں لٹ جانے کے متعلق میرزا صاحب نے صاحب عالم کو لکھا ہے: "میرا ایک سبی بھائی۔ نواب ضیاء الدین خاں سلمہ اللہ تعالیٰ وہ میری نظم و نثر کو فراہم کرتا رہتا تھا۔ چنانچہ مجموعہ نثر اور کلیات نظم فارسی و اردو سب نسخے اس کے کتب خانے میں تھے۔ وہ کتب خانہ کہ ذکر عرض کرتا ہوں بیس ہزار روپے کی مالیت کا ہوگا۔ لٹ گیا، ایک ورق باقی نہیں رہا۔" (اردوی: ۱۵۰ لاہور ایڈیشن)؛ یوسف علی خاں عزیز کو تحریر کیا ہے: "بھائی تم کیا فرماتے ہو! جان بوجھ کر انجان بنے جاتے ہو۔ واقعی غدر میں میرا گھر نہیں لٹا۔ مگر میرا کلام میرے پاس کب تھا کہ نہ لٹتا۔ بھائی ضیاء الدین خاں صاحب اور ناظر حسین مرزا صاحب ہندی فارسی نظم و نثر کے مسودات مجھ سے لے کر اپنے پاس جمع کر لیا کرتے تھے۔ سو ان دونوں کے گھروں پر جھاڑو پھر گئی۔ نہ کتاب رہی نہ اسباب رہا۔ پھر اب میں اپنا کلام کہاں سے لاؤں؟" (ایضاً: ۱۵۲)

(۴) میرزا صاحب نے سہواً "غزلین" لکھ دیا ہے۔ صحیح "[illegible]" ہے۔

صفحہ ۶۰

(۱) میرزا صاحب کے ۱۹ ستمبر کے عریضے کے جواب میں نواب خلد آشیاں نے جو فرمان لکھا

---

(۱) نواب لفٹننٹ گورنر بہادر پنجاب (۲) یعنی طرز و روش لغت الحرجی (۳) رفت سیلن و یہ عادت راجہ دڑانی امیدوا (۴) راجہ درانی اوجین (۵) بیگم مارکوئیس چانگ پرنشپ (۶) ڈچیس بیگمان پرنس و ڈیوک (۷) وطن دمیرنی (۸) بعالی گرے مذکورہ فرزند کلاں دمیرنی (۹) جمع اقوام اصول سرگانہ سنگیناں کہ مراد از آب و ابی دو دم است۔

متھا اُس کا یہ فقرہ میرزا صاحب نے نقل کیا ہے۔ نواب صاحب فرماتے ہیں :"...

... فیضانِ خامہ کہ در تحریر معانیٔ شعر عرفی وہم تحقیق لفظ ارتنگ وارژنگ گوہر بار گردیدہ بر خاطر خلاص فروش ہر آئینہ مخفی و محتجب مباد کہ اکثر مالک رقاب ان علم لغت ارتنگ وارژنگ را بمعنیٔ واحد پندا شتہ اند۔ و عامۂ معتبران کلام شیرازی مشار "آشیاں چیدن" را مرادفِ آشیاں بستن انگاشتہ۔ چنانچہ نظیرہر یکی ملفوف عنبرین نامہ ہذا ست لمطالعہ خواہد رسید۔ معہذا اگر طبع آں استادِ زماں بہ ترقیم الفاظ بالائی اجمل نفوری داشتہ، ہمچناں حوالۂ قلم نمایند کہ بحوث عذرا از تقریظ اصلاح شدہ جو نغمانیت خود محو سازم، زیرا کہ مرا از اں مشغلہ واسطۂ تلمذ بودہ است، نہ از عرفی و دیگراں۔ اما نظیری کہ بنظر گزشتہ است صرف برائے اطلاع بہ ضمیمۂ ہذا مندرج گردید..... المرقوم ۱۲ جمادی الاول سنہ ۱۲۸۳ھ مطابق ۱۰ اکتوبر سنہ ۱۸۶۶ء"

ملا عبد الصمد کی شاگردی کا اظہار سب سے پہلی بار قاطعِ برہان کی وساطت سے ہوا ہے۔ اس سے قبل میرزا صاحب ہمیشہ یہی ظاہر کرتے رہے ہیں کہ فارسی دانی کا ملکہ قدرت کی طرف سے انھیں ودیعت ہوا ہے۔ کلکتے کے سفر میں جو ادبی جھگڑا کلکتے والوں سے پیش آیا تھا اس میں بھی میرزا صاحب نے عبد الصمد کے اقوال اور اس کی تعلیم کو ثبوت میں پیش نہیں کیا۔ حالانکہ وہ موقع عبد الصمد کے ... ذکر کے لیے زیادہ مناسب تھا۔ اسی وجہ سے مجھے اس میں شک ہے کہ عبد الصمد کوئی نو مسلم پارسی اکبر آباد آیا اور میرزا صاحب اس کے شاگرد ہوئے۔ اور وہ دو برس میں انھیں فارسی گھٹا کر چلا گیا۔ واقعہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ مخالفوں کو خوش کرنے کے لیے میرزا صاحب نے یہ نام دل سے گھڑ لیا تھا جیسا کہ خواجہ حالی مرحوم نے خود میرزا صاحب ہی کی زبانی یادگارِ غالب (ص ۱۳) میں اس کا ذکر کیا ہے۔

صفحہ ۱۶

(۱) انجو کا نام جمال الدین حسین بن شاہ حسن انجوی شیرازی اور لقب عضد الدولہ ہے۔ ان کے آبا و اجداد فارس کے شہرۂ آفاق شہر شیراز کے باشندے تھے۔ یہ وہیں پیدا ہوئے بعد ازاں تلاشِ روزگار ہندوستان آئے۔ اور بقول محمد عارف بدخشی، سنہ ۱۰۳۵ھ (۱۶۲۶ء) میں آگرے میں انتقال کیا۔ فرہنگِ جہانگیری اکبر کے عہد میں شروع ہو کر نورالدین جہانگیر کی حکومت میں انجام کو پہنچی۔ اس لیے اس کے نام معنون کی گئی۔ انجو کو از راہِ تحقیر میاں لکھا ہے۔ جیسے ایک جگہ فیضی کو لکھتے ہیں "اہلِ ہند میں سوا خسرو دہلوی کے کوئی مسلم الثبوت نہیں۔ میاں فیضی کی بھی کہیں کہیں ٹھیک نکل جاتی ہے۔" (اردوی: ۷۰، خط ۳۰)

(۲) رشید کا نام عبد الرشید حسنی ہے۔ ان کے آبا و اجداد مدینۂ منورہ کے رہنے والے تھے یہ خود شہر ٹھٹہ میں پیدا ہوئے۔ منتخب اللغتہ اور فرہنگ رشیدی اُن کی مصنفہ ہیں۔ شاعر بھی تھے اور رشیدی تخلص کرتے تھے۔ انھوں نے تحفۂ رشیدی کے نام سے شعرائے فارسی کا ایک تذکرہ بھی لکھا ہے۔ اس کا ایک نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے کرزن کلکشن میں محفوظ ہے۔ میرزا امیر بیگ بنارسی کے تذکرہ حدائق الشعرا کا یہ ملخص ہے۔ خزانۂ عامرہ (ص ۲۲، نولکشور پریس) میں اُن کا سالِ وفات ۱۰۷۷ ہجری (۱۶۶۶ء) لکھا ہے۔ غالب نے انھیں حقارت کی راہ سے شیخ لکھا ہے، ورنہ وہ جانتے تھے کہ عبد الرشید حسنی

لبید میں ایک اور جگہ بھی فرماتے ہیں در عبدالرشید میں کیا غنی اور میاں انجو
جیں کیا پیری ہے" (دیوان: ۱۳۰)

(۳) لالہ ٹیکچند بہار تخلص، خان آرزو، متوفی سنہ ۱۱۶۹ ہجری (۱۷۵۵ء) کے شاگرد اور اردو فارسی کے شاعر تھے۔ بہار عجم کے علاوہ ایک کتاب جواہر الحروف بھی ان کی تصنیف ہے۔ سال وفات کسی تذکرے سے معلوم نہ ہو سکا۔

(۴) سیالکوٹی مل وارستہ تخلص، مصطلحات شعرا کے مصنف ہیں۔ یہ میر محمد علی رائج سیالکوٹی، متوفی سنہ ۱۱۴۹ھ (۱۷۳۶ء) کے شاگرد تھے اور ۱۱۸۰ھ (۱۷۶۶-۶۷ء) میں فوت ہوئے ہیں۔ مصطلحات شعرا کو عام طور پر سنہ ۱۱۸۰ھ کی تصنیف بتایا جاتا ہے۔ لیکن در اصل اس کا نام "مصطلحات شعرا" تاریخی ہے۔ جس سے سنہ ۱۱۴۹ھ برآمد ہوتے ہیں۔ مصطلحات الشعرا مشہور ہو جانے کے باعث اس کے عدد زیادہ جوڑ لیے جاتے ہیں۔

(۵) میرزا صاحب نے سہواً اس کے لکھ دیا ہے۔

(۶) یہاں لفظ "کے" ساقط ہو گیا ہے۔ آئندہ عریضے کو پڑھتے ہوئے میرزا صاحب نے یہ لفظ لکھا تھا۔ اس لیے میں نے بریکٹ میں بڑھا دیا۔

(۷) اصل خط میں سہواً ۱۰ تاریخ درج ہو گئی ہے، صحیح ۱۱ ہے، اس لیے کہ اولاً خود میرزا صاحب نے اس خط کے لفافے پر ۱۱ اکتوبر تاریخ لکھی ہے، جس کے یہ معنی ہیں کہ تاریخ کتابت کے دوسرے دن یہ خط پوست کیا گیا تھا، ثانیاً نواب خلد آشیان نے اس خط کا جواب جو آگے آتا ہے، ۱۳ اکتوبر کو دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جس خط کا جواب ۱۳ کو لکھا جائے وہ خود ۱۳ کا مکتوب نہیں ہو سکتا۔ میرزا صاحب کے عریضے کے بعض کنایات سے ناخوش ہو کر نواب صاحب نے جواباً تحریر فرمایا: "... مکتوب حیرت اسلوب مشعر اختراع معنی غلط نسبت بہ ہندی نژادان پیشین و دیگر اعتراضات، چون کہ راقم را طریقۂ بحث یاد نیست، موصول مطالعہ گشتہ باعث استعجاب عظیم گردید۔ از آنجا کہ تا حال در دو سہ تحقیق و تنقیح امور علمیہ کہ معاذ اللہ از مناظرہ و مناقشہ بچشم حق بین ابا بعید می نماید، امری دیگر بظہور نیامدہ و آنچہ حالی خاطرم بود بی ریب در نتیجہ حوائے ظلم، تا فی تنقیح گردیدہ۔ لیکن می نازم بر ذہن موشگاف آن فرید زمان کہ نوشتہ ام را بر بحث و جدال محمول نمودہ، امثال این کنایہ ہای ثقیل نسبت ان دل بجانب راقم داغ بحث کردہ و مخالف واقع و موجب رنج و حیرت نگاشتند۔ اب اگر آن مشفق را ہمچنین منظور باشد، اشارتی سازد کہ واسطۂ تبدیل وصلت از فیما بین ہمہ داشتہ شود، ورنہ بنان خامہ را باسور خارج المبحث تکلیف ندادہ باشند کہ نتیجہ اش بسوا صداع الراس امری بخیال نمی رسد، ورقم پایۂ اعتبار محققیان اکثر صاحب تصانیف مقبول نام بودہ از خود زیادہ دانستہ کوالہ کلام شان بردختہ۔ اگر نزد آن صمیم جاوید آنہا قابل قبول نبود، بایستی کہ ہم برآن نمط تحریر میفرمودند، مصلحت این قدر اطناب سخن از فہم ہیچمدان بیرون، زیادہ از حد نوشتن حکمت عنان آموختن ابست۔ المرقوم ۳ جمادی الثانی سنہ ۱۲۰۳ھ مطابق ۱۳ اکتوبر سنہ ۱۸۰۰ء" چونکہ نواب صاحب کے اس فرمان سے اظہار ناخوشی و ناراضگی ہوتا تھا میرزا صاحب نے

فوراً معذرت نامۂ مورخہ ۱۶ ماہ اکتوبر لکھ کر طلب عفو کی۔ نواب صاحب نے معذرت قبول کرتے ہوئے تحریر فرمایا: .... مشفقا! سابق ازیں بملاحظہ

مضمونِ معاوضۂ سابقہ امری کہ متخیل شدہ بود، بے شائبۂ تکلف حوالۂ خامہ کردیدہ حالا کہ آں مہربان تمادیٔ بیش بہ ساختند و از آں دقیقۂ شکوک لاحقہ نگردید۔ خاطر لطف مظاہر مقرون جمعیت باشد۔ المرقوم ۱۲ جمادی الثانی ۱۲۸۳ھ مطابق ۲۱ اکتوبر سنہ ۱۸۶۶ء''

اس کے بعد نواب صاحب نے پھر کوئی نثر اصلاح کے لئے نہیں بھیجی جس کے یہ معنی ہیں کہ ان کی طبیعت کا تکدر کلیۃً دور نہیں ہوا۔

صفحہ ۶۲

(۱) یہاں بیت کی جگہ مصرع کا مخفف "ع" ہونا چاہیے۔

(۲) صاحبزادہ میر مہدی علی خاں بہادر، نواب سید غلام محمد خاں بہادر کے پوتے، صاحبزادے حفیظ اللہ خاں بہادر کے بیٹے اور نواب خلد آشیاں کے چچا تھے۔ شعر و سخن کا شوق تھا۔ اور نحیف تخلص کرتے تھے۔ ابتدا میں نواب فردوس مکاں سے تلمذ تھا۔ آخر میں میر احمد علی رسا کے شاگرد ہوئے۔ ۴۸ برس کی عمر پائی۔ ستائیسویں ماہ رمضان سنہ ۱۲۸۹ھ (۱۸۷۲ء) کو رحلت فرمائی۔" انتخاب یادگار: ۴۰۳، وتاریخ لطیف: ۲۲۹۔

(۳) تاریخ سلطنت انگلشیہ ہند طبع مراد آباد سنہ ۱۸۸۷ء ص ۳۰۹ میں لکھا ہے۔

"ماہ نومبر سنہ ۱۸۶۶ء میں جناب نواب گورنر جنرل بہادر نے بمقام آگرہ دربار عام کو زیب و زینت بخشی۔ دربار میں والیان ریاست و رئیسانِ نامی و گرامی، علاوہ اُن رئیسان کے کہ جن کو تمغہ "ستارۂ ہند" عطا ہوئے القدر ۸۹ کس کے تھے۔ علی قدر مراتب اپنی اپنی جگہ کرسی نشین ہوئے۔ نواب گورنر جنرل بہادر نائٹ گرانڈ ماسٹر اسٹار آف انڈیا، بڑے تزک اور احتشام سے معہ دس بارہ صاحبان انگریز جلیل القدر کے پوشاک و خلاع شاہی پہنے ہوئے رونق افروز ہوئے۔

اول صاحب سکریٹری بہادر اسٹار آف انڈیا نے استادہ ہو کر فرمان ملکۂ معظمہ بابت عطائے تمغہ ہائے اسٹار آف انڈیا کے پڑھنے فرمایا۔ بعدہ بترتیب درجہ ہا، تمغۂ اسٹار آف انڈیا یعنی ستارۂ ہند عطا ہوئے"

اس کے بعد حاضرین دربار کی فہرست دی ہے۔ اس میں بسلسلہ والیان ریاست نمبر ۱۰ پر درج ہے: "آنریبل نواب رامپور تشریف نہیں لائے" اس بیان سے واضح ہو جاتا ہے کہ نواب خلد آشیاں نے یہ سفر تمغۂ ستارۂ ہند پانے کے لیے کرنا چاہا تھا چنانچہ اکبر آباد تک سفر کا انتظام درست ہو چکا تھا۔ سرکار سنبھل تک تشریف بھی لے گئے تھے۔ مگر مزاج ناساز ہو جانے کی وجہ سے راستہ ہی سے مراجعت فرمائی۔

(۴) نواب خلد آشیاں کے اس سفر کے متعلق صاحب اخبار الصنادید (ج ۲، ص ۱۰۴) لکھتے ہیں: "مسٹر جان انگلش جو کمشنر و ایجنٹ ریاست کے نواب سید کلب علی خاں سے ہونہاری و بلند اقبالی کے آثار دیکھ کر بہت جلد آنریبل ایڈمنڈ ڈرمنڈ صاحب لفٹنٹ گورنر کو خوشنودیاں متواتر کے متعلق رپورٹ کی، اور انہوں نے لارڈ لارنس صاحب

گورنر جنرل کی خدمت میں نواب سید کلب علی خاں بہادر کی لیاقت خداداد کی اطلاع کی۔ گورنر جنرل نے باظہار مسرت مثل نواب سید یوسف علی خاں کے نواب سید کلب علیخاں کو بھی لیجسلیٹیو کونسل میں ممبر تجویز کیا۔ نواب صاحب نے ہنگامِ استمزاج باوجودِ ناچاقیٔ طبیعت و ضعف باقتضائے عزم بلند ممبری قبول کی۔ ۲۰ شعبان سنہ ۱۲۸۳ھ (۲۸ دسمبر ۱۸۶۶ء) کو رامپور سے علیگڑھ تک گاڑی کی ڈاک میں اور علیگڑھ سے کلکتے تک تخمیناً پانسو ہمراہیوں کے ساتھ ریل کے ذریعے سے گئے۔ اثنائے راہ میں کانپور، الہ آباد، اور بنارس وغیرہ ہر مقام پر حکام نے استقبال کیا اور سلامی سر ہوئی۔ مہاراجہ السیری پرشاد نارائن سنگھ صاحب جی، سی، ایس، آئی، والیٔ کاشی نریس نے بنارس میں بنظرِ اتحادِ قدیم دھوم سے دعوت کی۔ کلکتے میں گورنر جنرل کی طرف سے بطرزِ مرغوب استقبال ہوا۔ سلامی سر ہوئی۔ آب و ہوائے کلکتہ نے ان کے مزاج سے بھی مخالفت کی، اور طبیعت جادۂ اعتدال سے منحرف رہی۔ پھر بھی کونسل میں کئی اجلاس کیے۔ جب ناسازی زیادہ بڑھی، تو حسب اصرار گورنر جنرل ڈاکٹر بیلی سے علاج شروع ہوا۔ ڈاکٹر کی رائے ہوئی کہ آب و ہوا یہاں کی ان کے مخالف ہے، بلکہ قیام کلکتہ سے امراضِ شدید لاحق ہونے کا اندیشہ ہے، مگر نواب صاحب نے اسے قبول نہ کیا۔ جب گورنر جنرل کو اس کا علم آیا، تو بمقتضائے محبت خاص بکمال اصرار واپس کیا۔ ۲۲ رمضان سنہ ۱۲۸۳ھ (۳۱ جنوری سنہ ۱۸۶۷ء) کو کلکتے سے رامپور واپس ہوئے۔

میرزا صاحب کے ۶ لیفے (۸۱) کے لفافے سے معلوم ہوتا ہے کہ نواب صاحب محلۂ کاشی پور کے مکان نمبر ۵۷ میں قیام فرما ہوئے تھے۔ میرزا صاحب کا قطعۂ تاریخ حسب الحکم حضور اخبار دبدبۂ سکندری میں طبع ہوا اور ۳ نومبر کو اس کی اطلاع ان الفاظ میں میرزا صاحب کو دیگئی: "قطعۂ تاریخ مذکورہ کہ بطرزِ نو عدیم المثال ست در اخبار دبدبۂ سکندری طبع گردیدہ شد۔"

صفحہ ۶۳

(۱) خط میں کاتب کا نام اور تاریخ درج نہیں تھی۔ میں نے قوسین میں لفافے کی تاریخ اضافہ کردی ہے۔

(۲) میرزا صاحب نے "مات" لکھا ہے۔

(۳) دہلی سے مراد آباد کو جو ریلوے لائن آتی ہے، اُس پر دہلی جنکشن کے بعد شاہدرہ اور پھر غازی آباد کا اسٹیشن آتا ہے۔ یہ بستی پہلے نواب غازی الدین خاں بہادر عماد الملک وزیر شاہ عالمگیر ثانی و شاہ عالم ثانی نے سنہ ھ (۱۷۴۰ء) میں بسائی تھی۔ پہلے اُن کے نام پر غازی الدین نگر کہلاتی تھی۔ جب ریل کے محکمے نے اسے جنکشن بنایا، تو بول چال کی سہولت کی خاطر غازی آباد نام رکھدیا۔ اسی نام سے اب مشہور ہے۔ غلّے کی منڈی ہو جانے سے آبادی اور دولت دونوں میں خاطر خواہ اضافہ ہو گیا ہے، اور یہ قصبے سے ترقی کر کے شہر کے درجے پر پہنچ گیا ہے (امپیریل گزیٹر: ۵/۶۱ –)

(۴) اس خط کے جواب کا مسودہ منقول عنہ میں نہیں ہے۔

صفحہ ۴۶

(۱) میرزا صاحب نے اس خط میں تین جگہ اس لفظ کو اسی طرح لکھا ہے۔

(۲) آثار الصنادید، یادگارِ دہلی، سید احمد ولی اللہی اور واقعاتِ دار الحکومت دہلی بشیر احمد دہلوی میں اس کوٹھی کا ذکر نہیں ملتا۔

(۳) یہاں لفظ (سے) زیادہ معلوم ہوتا ہے۔

(۴) بیگم سے مراد جہاں آرا بیگم ہیں، جو شاہ جہاں بادشاہ کی چہیتی بیٹی تھیں۔ یہ ممتاز محل کے بطن سے ۲۱ صفر ۱۰۲۳ھ (۱۶۱۴ء) کو بدھ کے دن پیدا ہوئیں۔ ماں کو شہزادی سے اتنی محبت تھی کہ اُس نے مرتے وقت شاہ جہاں کو وصیت کی کہ میرے متروکے کا آدھا حصہ جہاں آرا کو دے باقی آدھا بیٹوں میں تقسیم کرنا۔ خود شاہ جہاں اتنا چاہتا تھا کہ بیٹی کی صحت کی خاطر ہندوستان میں انگریزوں کا بیج بو لیا، جو آکاس بیل کی طرح آخر میں مغل سلطنت کے درخت کی شاخوں پر چھا کر خود درخت ہی کو کھا گیا۔ صورت یہ پیش آئی کہ سنہ ۱۰۵۴ھ (۱۶۴۴ء) میں جہاں آرا کی سالگرہ کا جشن منایا گیا۔ سوءِ اتفاق کہ عین سالگرہ کے دن شمع کی لو سے شہزادی کا دامن جل اٹھا شہزادی اُس وقت دربارِ شاہی کے پاس کھڑی تھی۔ پاسِ حیا سے زنانے کی طرف بھاگی ہوا لگنے سے سب کپڑوں نے آگ لے لی، اور جہاں آرا کا گلاب سا بدن جل کر کوئلہ ہو گیا۔ باپ کو اس کی زندگی کی طرف سے مایوسی ہو گئی۔ مگر فرطِ محبت میں دوا اور دعا کا کوئی جتن نہ چھوڑا۔ ہزار ہا روپیہ خیرات کیا گیا، اور ملک بھر کے حاذق اطبا اکٹھے کر لیے گئے۔ قسمت دیکھیے کہ ان میں سے کوئی کامیاب نہ ہوا۔ اُس زمانے میں ایک انگریز ڈاکٹر بندر سورت میں آیا ہوا تھا۔ بادشاہ نے اُس کی شہرت سُن کر طلب کیا۔ اُس کے پانچ مہینے کے علاج سے شہزادی تندرست ہو گئی۔ بادشاہ نے جشنِ صحت میں لاکھوں روپیہ ایثار کیا۔ قدسی کو قصیدۂ تہنیت پر، جس کی رباعی کا یہ شعر لاجواب ہے۔

تا سر زدہ از شمع چنین بی ادبی — پروانہ زعشق شمع را سوختہ است

۵ ہزار روپے کا صلہ عطا ہوا۔ ڈاکٹر کو چاندی میں تلوا دیا، اور اُس قوم پرور کی استدعا پر ایسٹ انڈیا کمپنی کو بنگال میں آزاد تجارت کا فرمان عطا ہوا۔

جہاں آرا کو قدرت نے ذہنِ رسا اور روشن دماغ عطا کیا تھا۔ اعلیٰ تعلیم و تربیت نے اس جوہر کو نکھار دیا۔ اردو، عربی، فارسی اور ترکی میں صاحبِ دستگاہ ہو گئی۔ اپنی اعلیٰ دماغی خوبیوں کی بدولت باپ کے مزاج میں بیحد دخیل تھی۔ بھائیوں کی جنگ میں دارا شکوہ کی حامی رہی، اور عالمگیر کے بادشاہ ہو جانے پر آگرے کے قلعے میں باپ کی خدمت کی خاطر جا پڑی تھی۔

تصوف کی دلدادہ اور خاندانِ چشت کی شیدا اور مرید تھی۔ صاحبِ تصنیف و تالیف بھی ہے۔ خواجہ معین الدین چشتی کی سیرت پر مونس الارواح نام کی کتاب اس کی تصنیف ہے شعر بھی کہتی تھی۔ بنگرم۔ کتاب خانۂ رامپور میں رسالۂ خواجہ عبداللہ انصاری کا ایک خوشخط نسخہ ایران کے مشہور خطاط میر علی الکاتب کے قلم کا محفوظ ہے، جس پر جہانگیر اور شاہ جہاں کی دو تحریریں ثبت ہیں۔ اُس کے آخر میں جہاں آرا نے اپنے قلم سے ایک عبارت لکھی ہے۔

مزاج میں انکسار، فیاضی، مہماں نوازی، بردباری اور ثقاہت بہت تھی۔ سادہ معاشرت کو پسند کرتی، اور تزکِ احتشام سے متنفر تھی۔ اس نے ۳ رمضان ۱۰۹۲ھ (۵ ستمبر ۱۶۸۱ء) کو انتقال کیا اور شاہ نظام الدین میں سنگِ مرمر کے خود تعمیر کردہ مجرہ میں دفن ہوئی۔ (واقعاتِ دارالحکومت دہلی: ۲، ۲۲۹، ح ا)

جہاں آرا نے ۱۰۶۰ھ (۱۶۵۰ء) میں چاندنی چوک کی جانب شمال مکانات دلکشا اور ایک باغ بنایا تھا، جو پہلے صاحب آباد کہلاتا تھا، بعد ازاں بیگم کا باغ مشہور ہوا۔ اور اب ملکہ کی مورت نصب ہو جانے کے بعد ملکہ کا باغ کہلاتا ہے۔ یہ ۹۷۰ گز لمبا اور ۲۴۰ گز کا چوڑا تھا۔ اس میں عجیب عجیب بارہ دریاں اور مکانات تھے۔ اس میں نہر جاری تھی۔ اور جگہ جگہ فوارے اور حوض بنائے گئے تھے۔ مرورِ ایام سے اس باغ کی وضع قطع بالکل بدل گئی۔ چار دیواری، جس میں جا بجا برج بنے ہوئے تھے، غدر میں ٹوٹ پھوٹ گئی۔ اب صرف چار برج رہ گئے ہیں دو تو باغ کے احاطے کے شمال رُخ پر موجود ہیں، تیسرا انبل کے کٹرے کے پاس اور چوتھا اس مقام پر ہے، جہاں عجائب خانے کے شیر وغیرہ رکھے جاتے تھے۔ پرانے درخت کاٹ کر نئے چمن لگائے گئے ہیں۔ جگہ جگہ پختہ سڑکیں پڑی ہیں۔ بیچ میں ایک خوبصورت گول چبوترہ بنا کر آس پاس گھاس کے تختے بو کر پھولوں کے گملے دھرے ہیں۔ پہلے اس چبوترے پر بینڈ بجتا تھا، پھر موقوف ہو گیا۔ یہیں ایک سنگِ مرمر کا حوض تھا، جو اب قلعے میں ہے۔ اس میں فوارہ لگا ہوا تھا، اور بیچ میں سے نہر رواں تھی۔ چند سال ہوئے باغ اور اشٹیشن کے بیچ کی سڑک چوڑی کی گئی۔ تو کچھ حصہ باغ کا اُس میں شامل ہو گیا۔ (آثار الصنادید: ۲، ۵۵، طبع دہلی ۱۲۶۳ھ = ۱۸۴۷ء، واقعاتِ دارالحکومت دہلی: ۲، ۲۳۱)

(۵) سنہ ۱۸۵۷ء میں الیسٹ انڈیا ریلوے کلکتے سے رانی گنج تک جو ۱۲۰ میل کا فاصلہ ہے، جاری تھی۔ تعمیر کا کام برابر دلی تک جاری رہا۔ پہلے آگرے سے جمنا کے غربی کنارے کے ساتھ ساتھ داغ بیل ڈالی گئی۔ غدر کے بعد اس کی جگہ ٹونڈلا جنکشن سے علی گڑھ ہوتی ہوئی جمنا کے مشرقی کنارے پر لائن کا حصہ سنہ ۱۸۶۴ء میں کھولا گیا۔ اس وقت جمنا کا پل بن رہا تھا۔ سنہ ۱۸۶۶ء کے آخر میں یہ پل، جو ۲۶۶۰ فٹ لمبا ہے، ۶۶۰۳۵۵ روپے کی لاگت سے بن کر تیار ہوا، اور یکم جنوری سنہ ۱۸۶۷ء کو پہلی بار اس پر سے ریل گزری۔ اور این، ڈبلیو آر نے، جو اُس زمانے میں سندھ پنجاب دلی ریلوے کہلاتی تھی، غازی آباد کو ریل کے ذریعے دلی سے ملا دیا۔ اس ریل کا اشٹیشن پہلے ہملٹن روڈ پر بنا تھا، جسے میرزا صاحب نے دلی محمد سوداگر کی کوٹھی کے پاس بتایا ہے۔ اب اُس جگہ این ڈبلیو کا مال گودام ہے۔ موجودہ ریلوے اشٹیشن دراصل ای، آئی، آر، کا ہے۔ راجپوتانہ مالوہ ریلوے کا اشٹیشن موری دروازے تھا، این ڈبلیو آر کا ہملٹن روڈ پر، ای، آئی، آر سے جداگانہ۔ مسافروں کو تکلیف ہوتی تھی۔ ان سب کو ملا کر یہ ایک اشٹیشن بنا دیا گیا۔ (یادگارِ دہلی: ۱۳۵، واقعاتِ دارالحکومت دہلی: ۱، ۳۴۷، ۲، ۲۲۳)

نواب خلد آشیاں غالباً دلی سے اس بنا پر سوار نہ ہوئے کہ دسمبر کے آخر تک انھیں اس پل کے کھلنے کی صحیح تاریخ کا علم نہ تھا۔

(۶) میرزا صاحب نے اس جملے اور آیندہ جملے کے درمیان، نقطے دیے ہیں۔
اس عریضے کے جواب میں ۲۲ دسمبر سنہ ۱۸۶۶ء کو نواب خلد آشیاں نے تحریر فرمایا:
"... چون راقم عنقریب روانۂ کلکتہ می شود. چنانچہ برای انتظام گاڑیہای ریل رفعت دوالی مرتبت محمد اصغر علی خان رسالدار رارداۂ آنجا نمودہ شدہ و ہنوز تاریخ رسیدن بمقام اسٹیشن ریل دہلی مقرر نگشتہ، لہذا حوالۂ خامۂ مودت نگاری شود کہ حال تقرر تاریخ رسیدن آنجا از خان معزی الیہ دریافت نمودہ شود۔" رسالدار صاحب کے خاندان میں تلاش کرنے پر بھی میرزا صاحب کا کوئی خط نہ ملا، جس سے پتا چلتا کہ اُن سے میرزا صاحب نے استفسار کیا یا نہیں۔ لیکن یہ امر اخبار الصنادید کے محولۂ بالا اقتباس سے معلوم ہوا کہ سرکار علی گڈھ تک گھوڑوں کی ڈاک میں اور وہاں سے بذریعہ ریل کلکتے گئے تھے، اس لیے یقین ہے کہ میرزا صاحب سعادتِ ملاقات حاصل نہ کر سکے۔

(۷) میرزا صاحب کا یہ ارشاد سہو پر مبنی ہے، کیونکہ اُن کی پنشن، دربار اور خلعت یہ تینوں اعزاز غدر کے بعد بند ہو گئے تھے۔ تفصیل دیباچے کی بحث تعلقات انگریزی میں ملاحظہ ہو۔

(۸) سر ڈانل میکلوڈ صاحب مراد ہیں۔ یہ لفٹنٹ جنرل ڈنکن میکلوڈ کے یہاں فورٹ ولیم، کلکتہ، میں ۶ جون سنہ ۱۸۱۰ء کو پیدا ہوئے۔ ولایت جا کر تعلیم پائی۔ سنہ ۱۸۲۸ء میں ہندوستان واپس ہوئے، اور صوبۂ بنگال میں ملازمت اختیار کی۔ سنہ ۱۸۳۱ء سے ۱۸۴۹ء تک اضلاع ساگر و نربدا، اور بنارس میں رہے۔ سنہ ۱۸۵۰ء میں پنجاب کے جوڈیشل کمشنر ہوئے۔ غدر سنہ ۵۷ء میں لاہور میں تھے۔ ۱۸۶۵ء سے ۱۸۷۰ء تک پنجاب کے لفٹنٹ گورنر رہے اور ۲۸ نومبر سنہ ۱۸۷۲ء کو لندن کی زمین دوز ریل کے ایک حادثے سے انتقال کر گئے۔ یہ مشرقی علوم و فنون کے بڑے حامی تھے، اور چاہتے تھے کہ دیسی زبانوں میں مغربی علوم کی تعلیم دی جائے۔ پنجاب یونیورسٹی انھیں نے قائم کی تھی۔

(۹) سبد چین (ص ۹۷) میں یہ رُباعی میکلوڈ کی مدح کی چھپی ہے:

ای پایہ بلند ساز دانا جاہی ۔۔۔ از بہر تو باد ہر چہ از حق خواہی
مدکو کہ میکلوڈ کہ در صورت تست ۔۔۔ چون مہر عیان معنی روح الٰہی

بعید نہیں، اسی کو خوشخط لکھا کر پیش کیا ہو۔ لیکن اسی کتاب میں ایک قطعہ بھی درج ہے جس کی ۱۲ بیتیں ہیں، اور پہلا شعر یہ ہے:

بزم تو اے بجم حشم میکلوڈ ۔۔۔ بوستانی است پُر ز نعمت و ناز

اس میں میرزا صاحب لکھتے ہیں:

آمدم تا بہ پیش وی نالم ۔۔۔ از جفای زمانۂ ناساز
از ادب دم نمی توانم زد ۔۔۔ با چنین داغہای سینہ گداز
چون رسد وقت کار سر تا سر ۔۔۔ گویم اما بہ شیوۂ ایجاز
مدح بانوی انگلستان است ۔۔۔ بر زبانِ من از زمانِ دراز
اندرین پایہ با من مسکین ۔۔۔ نیست در ہند ہیچ کس انباز
غالبم اسم شہرۂ نامم نست ۔۔۔ اسد اللہ خانِ مدح طراز

(سبد چین: ۳۷)

میرزا صاحب کا ایک اور ۷ اشعر کا قطعہ، کسی گورنر کی مدح میں ہے۔ اُس کا پہلا شعر حسب ذیل ہے:

پس از ادای سپاسِ خدای عزّ و جل ثنای حضرتِ نواب می کنم انشا

اس میں میرزا صاحب لکھتے ہیں:

زہی عطای گرانمایۂ گرامی قدر که سود تارک من از شرف باوجِ سما
قوان نگند بہ گیتی بنای ہشت بہشت زہفت پارچہ کان ہر یکی است بیش بہا
حائلِ گہر و جیغہ و دگر سر پیچ بروشنان فلک با فروغ داد ضیا
چو بی طلب بمن اینہا رسیدہ است بود زبہر مطلبِ خویشم توقع امضا
توقع آنکہ یکی سارتی فکٹ یابم زپیشگاہِ عنایاتِ داورِ والا

(سبد چین: ۵۵)

خیال یہ ہے کہ قطعہ اوّل دربار میں تعارف کے طور پر رُباعی کے ساتھ پیش کیا ہوگا، اور دوسرا قطعہ خلعت پانے کے بعد اظہارِ تشکر اور طلبِ سارٹیفکٹ کے لیے لکھا ہوگا۔ اس قطعے سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ باوجود منٹگمری صاحب سے خلعت پانے کے میرزا صاحب کو یہ یقین نہ تھا کہ اُن کا خلعت و دربار جاری ہے۔ اُنھیں دربار میں مدعو نہ کیے جانے سے بھی اس خیال کی تائید ہوتی ہے۔

صفحہ ۶۵

(۱) میرزا صاحب کے اس بیان سے کہ نہ تو کمشنر کو علم تھا کہ اسداللہ خاں کو خلعت ملے گا، اور نہ مجھے اس کا خیال گزرتا تھا، معلوم ہوتا ہے کہ اب تک خلعت بحال نہیں ہوا تھا، صرف شرکتِ دربار کی اجازت ملی تھی، ورنہ گورنر خلعت دیتے وقت کیوں کہتا کہ یہ ہم نے آپ کے واسطے رکھا تھا۔ اس کے شکریے میں میرزا صاحب نے جو قطعہ لکھا ہے، اُس کا یہ شعر ابھی گزر چکا ہے:

چو بے طلب بمن اینہا رسیدہ است، بود زبہرِ مطلبِ خویشم توقع امضا

اُس سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے کہ میرزا صاحب خلعت سے مایوس تھے، ورنہ بے طلب کی قید کیوں لگاتے۔ لیکن وہ خود بیان کرتے ہیں کہ سنہ ۱۸۶۳ء میں منٹگمری صاحب نے بلا کر خلعت دیا، تو کہا کہ "ہم تمھیں مژدہ دیتے ہیں کہ نواب گورنر جنرل بہادر نے اپنے دفتر میں تمھارے دربار اور خلعت کے بدستور بحال رہنے کا حکم لکھوا دیا" اس صورت میں یہ بھی فیصلہ کرنا پڑے گا کہ اُنھوں نے کسی مصلحت سے اُس وقت یہ بات مشہور کر دی تھی۔ (مکاتیب: ۱۴۲)

(۲) میرزا صاحب نے اسی طرح لکھا ہے۔ لیکن فرہنگِ آصفیہ اور نوراللغات میں قنادیز لکھا ہے یہ ایک قسم کا نہایت چمکدار موٹا ریشمی کپڑا ہے جو پہلے بخارا سے آتا تھا، اب یورپ سے آتا ہے اور گرنٹ کی قسم میں شمار ہوتا ہے۔

(۳) میرزا صاحب نے اس لفظ کو "بوجہ" لکھا ہے۔

(۴) یہ عریضہ میرزا صاحب نے کلکتے کے پتے سے لکھا تھا چنانچہ لفافے پر تحریر ہے: کلکتہ، محلہ کاشی پور، خانہ نمبر ۷ اور نمبر ۵۔

صفحہ ۶۶

(۱) لارڈ لارنس مراد ہیں۔ یہ الیگزنڈر لارنس کے چھٹے بیٹے تھے۔ ۴ مارچ ۱۸۱۱ء کو پیدا ہوئے فروری ۱۸۳۰ء میں کلکتے آکر سول سروس میں نام لکھایا۔ ۸ برس تک دہلی اور اُس کے اطراف میں اسسٹنٹ اور ڈسٹرکٹ افسر کی حیثیت سے کام کیا۔ پھر ۱۸۴۳ء سے ۱۸۴۵ء تک دوبارہ اسی علاقے میں خدمات انجام دیں۔ ۱۸۴۶ء میں ستلج جالندھر کے دوآبے کے کمشنر مقرر ہوئے۔ لاہور میں رزیڈنٹ بھی رہے۔ کانگڑے کی بغاوت فرو کی۔ ۱۸۴۹ء میں پنجاب کے الحاق کے بعد انتظامی بورڈ کے ممبر مقرر ہوئے۔ لارڈ ڈلہوزی نے ۱۸۵۳ء میں بورڈ توڑ کر انھیں پنجاب کا چیف کمشنر بنا دیا۔ اپنے بھائی سر ہنری لارنس سے جمہوری معاملات میں انھیں معقول اور سنجیدہ اختلاف تھا۔ غدر میں پنجاب کو محفوظ رکھا اور فوجی مدد بھیج کر دہلی کے محاصرے میں اہم اعانت کی۔ یکم جنوری ۱۸۶۴ء کو ہندوستان کے گورنر جنرل اور وٹیسرائے مقرر ہوئے، اور ۱۲ جنوری ۱۸۶۹ء تک اس عہدے پر فائز رہے۔ یہ بہت طاقتور، مستعد، جفاکش اور کٹر مذہبی آدمی تھے۔ ملازمت سے سبکدوشی پر "بیرون لارنس آف دی پنجاب اینڈ گریٹلی" کے اعزاز سے مفتخر ہوئے۔ ۲۷ جنوری ۱۸۷۹ء کو لندن میں انتقال کیا اور ویسٹ منسٹر ایبی میں دفن ہوئے۔

(۲) اس سلسلے میں نواب خلد آشیاں نے ۲۱ جنوری سنہ ۱۸۶۷ء کو تحریر فرمایا: "مشفقا! بعنایت ایزدی مخلص بخیریت تمام بتاریخ ۶ جنوری سنہ حال فائزِ مقام کلکتہ گردید۔ و ملاقات جنابِ مستطابِ معلیٰ القاب نواب گورنر جنرل بہادر دام شوکتہم، و دیگر صاحبانِ عالی شان دنیز اجلاس کونسل بعنوان شایستہ وطرز بایستہ بپایۂ حصول رسید۔"

(۳) دونوں لڑکوں سے باقر علی خاں اور حسین علی خاں مراد ہیں۔ دیباچے میں ان کا حال تفصیل سے لکھ دیا گیا ہے۔ یہاں یہ بات ظاہر کر دینا مناسب ہے کہ میرزا صاحب کی استدعا منظور نہیں ہوئی، اور اُن کی زندگی میں کسی لڑکے کی تنخواہ مقرر نہ کی گئی۔

(۴) نواب خلد آشیاں نے ۲۷ رمضان ۱۲۸۳ھ (۳ فروری ۱۸۶۷ء) کو لکھا تھا: "بتاریخ سی ویکم ماہ جنوری سنہ حال راقم بعنایت آلٰہی مع الخیر بعد شمول چند اجلاس کونسل از مقام کلکتہ داخل رامپور گردید۔" تعجب ہے کہ یہ فرمان میرزا صاحب کو ۱۴ فروری تک موصول نہیں ہوا۔

(۵) اصل خط میں سہواً "مد جاؤں" تحریر ہو گیا ہے۔

صفحہ ۶۷

(۱) لفافے پر ۱۵ فروری درج ہے۔ غالباً دوسرے دن ڈاک میں ڈالا گیا تھا۔

(۲) صحیح لفظ "طمانینت" ہے، مگر اردو زبان کے عام و خاص سب طمانیت ہی بولتے ہیں۔

صفحہ ۶۸

(۱) بریکٹ کی عبارت میرزا صاحب سے سہواً چھوٹ گئی تھی۔ میں نے دیگر عرائض سے ایزاد

کردی ہے تاکہ کلام تمام ہو جائے۔

(۲) اصل میں "بات" ہے۔

صفحہ ۶۹

(۱) لفافے کی پشت پر تحریر ہے: "پیش نمودہ شد۔ قطعہ نوشتہ نزد مہتمم اخبار برای طبع ... فرستادہ شود ..... مطابق ۱۰ اپریل سنہ ۱۸۶۷ء۔"

(۲) انتخاب یادگار (ص ۹۰) اور اخبار الصنادید (ج ۲، ص ۱۳۹) سے معلوم ہوتا ہے کہ نواب خلد آشیاں نے ذیقعدہ سنہ ۱۲۸۳ھ (مارچ سنہ ۱۸۶۷ء) میں جو جلوس کا پہلا سال تھا، باغ بینظیر کے میلے کا آغاز کیا۔ یہ میلہ آٹھ روز بڑی رونق سے رہتا تھا۔ باغ میں ہر قسم کے مال کی دکانیں ہوتی تھیں، جن میں سے یہاں ذکر کے قابل مطبع نظامی کانپور کے مالک عبدالرحمٰن خاں بن حاجی محمد روشن خاں کی کتابوں کی دکان ہے۔ روہیلکھنڈ کے اکثر معزز رؤسا بھی اس میلے میں شریک اور نواب خلد آشیاں کے مہمان ہوتے تھے۔ نواب صاحب خود بھی آٹھ روز برابر وہیں مقیم رہتے تھے، اور اکثر اوقات دوکانوں پر تشریف لے جا کر اسباب خریدتے۔ قسم قسم کے جلسے، مشاعرے اور تماشے بھی ہوا کرتے تھے۔ سنہ ۱۲۸۹ھ میں میلے کی ترقی کے لیے ایک عمارت تیار کرا کے اس میں قدم شریف رکھوایا، ہر میلے میں دلّی والوں کی طرح اس پر پنکھا چڑھایا جاتا تھا۔ بائیس میلے نواب صاحب نے کیے، تیئیسواں میلہ قریب تھا کہ رحلت کی۔

(۳) نقلوں میں اس خط کا جواب شامل نہیں، اس لیے نہیں کہا جا سکتا کہ سرکار نے کن لفظوں میں اس قطعے کی داد دی۔

صفحہ ۷۰

(۱) سبد چین (ص ۵۱) میں اس قطعے کے یہ ۶ شعر درج ہیں:

نمائشگہی در خور شان خویش ‌ برآراست نواب عالی جناب

بشب زہرہ دہ قنادیل سقف ‌ بود پیشکارش بہ روز آفتاب

ز غالب چو پرسیدہ شد سال آن ‌ چنین گفت آن رندِ خانہ خراب

ازان روکہ بزم عیش و نشاط ‌ ز بخشش جہانی شود کامیاب

چو بینی طرب را نہایت نماند ‌ بود سالِ آن "بخشش بیحساب"

خدایا! بپسند خداوندگار ‌ کہ از طبع غالب رود پیچ و تاب

(۲) خط میں تاریخ درج نہیں تھی۔ میں نے لفافے سے اضافہ کی ہے۔

(۳) میرزا صاحب نے سونچنا لکھا ہے۔ اسی طرح خط نمبر ۵۳ میں بھی سونچ لکھ دیا ہے۔

(۴) صاحبزادہ محمد حسن خاں بہادر، نواب سید غلام محمد خاں بہادر کے پرپوتے اور نواب خلد آشیاں کی صاحبزادی حیات النساء بیگم ملقب بہ عالیہ سلطان بیگم، کے شوہر تھے۔ (اخبار الصنادید ۲: ۲۳۰) انھوں نے عین عالم جوانی میں انتقال کیا۔ نواب خلد آشیاں کے لیے یہ واقعہ بہت روح فرسا تھا، اسی لیے میرزا صاحب نے اس قدر پُر اثر تعزیت نامہ ارسال کیا ہے۔

(۵) یہ مصرع میرزا صاحب کے ایک فارسی نوحے کا دوسرا مصرع ہے۔ پہلا مصرع یہ ہے۔ "شد غرقہ بخون پیکر شاہ شہدا ہاے"۔ ملاحظہ ہو کلیات نظم فارسی۔ ۶ ستمبر ۱۸۶۲ء کے ایک خط موسومۂ نواب میر غلام بابا خاں رئیسِ سورت میں بھی، نواب میر جعفر علی خاں کے بعمر ۶۴ سال فوت ہو جانے پر افسوس کرتے ہوے میرزا صاحب نے یہی مصرع دہرایا ہے۔ ملاحظہ ہو اردوی معلیٰ: ۶، طبع لاہور۔

صفحہ ۱۷

(۱) علی بخش خاں خانساماں کے سلسلے میں چھبیسویں عریضے کا حاشیہ ملاحظہ ہو۔
(۲) میرزا صاحب نے سو ۱۰۰ روپیے لکھ دیا ہے۔

صفحہ ۲۷

(۱) صاحب عالم میرزا رحیم الدین بہادر حیاؔ ابن میرزا کریم الدین رساؔ دلّی کے شاہزادے اور شاہ نصیرؔ کے شاگرد تھے۔ سنہ ۱۲۱۲ھ میں پیدا ہوے۔ رجب سنہ ۱۲۷۲ھ (۱۸۵۵ء) میں نواب فردوس مکاں کی طلب پر رامپور تشریف لائے، اور یہیں سنہ ۱۳۰۳ھ میں نواب خلد آشیاں کی وفات کے ۸ دن بعد ۹۱ سال کی عمر میں فوت ہوے۔ انھیں شطرنج کا بہت شوق تھا۔ میرزا صاحب نے ان کے دیوان کا دیباچہ بھی لکھا ہے۔ تفصیل کے لیے گلستانِ سخن (۲۰۷) اور خمخانہ (۲، ۵۱۰) ملاحظہ ہو۔
(۲) میرزا رحیم الدین بہادر حیاؔ کے پوتے رامپور میں بقیدِ حیات ہیں۔ انھوں نے بھی فاضل شطرنج باز کے حالات سے لاعلمی کا اظہار کیا۔
(۳) ان صاحبزادی کا نام اور ان کے والد کا نام اگلے خط میں خود میرزا صاحب نے لکھ دیا ہے یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ نواب احمد بخش خاں کے بھائی کا نام نبی بخش خاں تھا، اور یہ کہ ان صاحبزادی کے نانا جنرل آکٹر لونی، جو مسلمانوں میں اخترلونی مشہور تھے اور نانی ایک مسلمان بی بی مبارک بیگم نامی تھیں۔ مبارک بیگم نے بازار سری والان (قاضی حوض، دہلی) میں سنگِ سرخ کی ایک مسجد بھی بنوائی تھی، جو سنہ ۱۲۳۸ھ (۱۸۲۲ء) میں بن کر تیار ہوئی اور آج تک "لال مسجد" کے نام سے مشہور ہے (ذکرِ غالب: ۳۰، بحوالۂ واقعات دار الحکومت دہلی: ۲، ۳۳۹)
(۴) اصل "بات"

صفحہ ۳۷

(۱) اس عریضے کے لفافے پر ۲۹ اگست درج ہے، لیکن یہ سہوِ قلم معلوم دیتا ہے، کیوں کہ ڈاک خانے کی مہر میں بھی ۱۹ ہی درج ہے۔ نواب خلد آشیاں نے ۲۶ ربیع الثانی سنہ ۱۲۸۴ھ (۲۸ اگست سنہ ۱۸۶۷ء) کو جواباً تحریر فرمایا: "... چونکہ مفاوضۂ بہجت طراز سے مدعای خاص آپ کا بخوبی منکشف نہ ہوا، اس واسطے حوالۂ خامۂ محبت نگار کے ہوتا ہے کہ آپ خلاصۂ مکنونِ خاطرِ محبت مظاہر سے مطلع کیجیے، کہ بمقتضای انضباطِ روابطِ موانستِ قدیمہ جو بات کہ ممکن ہوگی، وہ ظہور میں آئے گی۔ خاطر جمع رکھیے"۔
(۲) ذکرِ غالب (ص ۳۰) میں ان کا نام خورشید بیگم لکھا ہے۔ اگر یہ اطلاع درست ہے، تو

غالباً خورشید بیگم عرف ہوگا۔

(۴) اس عریضے کے جواب میں نواب خلد آشیاں نے تحریر فرمایا: "۔۔۔۔ چون کہ آن مشفق تعدادِ مصارفِ شادیٔ مجوزۂ خود تحریر نہ نمودہ اند، لہذا حوالۂ خامۂ محبت نگار میشود کہ اول از تعدادِ مصارفِ شادیٔ مطلع نمایند کہ بعدِ دریافتِ آن درین خصوص تجویز مناسب بعمل خواہد آمد، چراکہ بمقتضای موانست و اتحادِ قدیمہ راقم را خوشنودیٔ آن مہربان در امورِ مناسبہ مدِ نظر است ۔۔۔۔۔ المرقوم ۱۸ جمادی الاولیٰ سنہ ۱۲۸۴ھ مطابق ۱۸ ستمبر سنہ ۱۸۶۷ء۔

صفحہ ۴۰۷

(۱) سلطان سنجر بن ملک شاہِ سلجوقی سنہ ۵۱۱ھ (۱۱۱۷ء) میں تختِ سلطنت پر بیٹھا۔ یہ بڑا اولوالعزم اور صاحب جود و کرم بادشاہ تھا۔ اس کا ابتدائی عہدِ حکومت، فتوحات کی وسعت کی بدولت، تاریخ کا روشن باب ہے۔ علم و ہنر اور شعر و سخن کا بھی بڑا قدر دان اور مربی تھا۔ رشید وطواط اور انوری وغیرہ، اس کے درباری شعرا میں شمار ہوتے ہیں۔ اس نے کاشانۂ انوری کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے دوبار شرف بخشا۔ آخر میں ترکمانوں کے ہاتھ میں گرفتار ہوگیا تھا۔ وہاں سے بدقت آزاد ہوا، تو ۱۱ ربیع الثانی سنہ ۵۵۲ھ (۱۱۵۷ء) کو دستِ قضا نے پکڑ لیا۔

(۲) شاہجہان ہندوستان کے مغل سلاطین کا پانچواں حکمران تھا۔ ۲۹ ربیع الاول سنہ ۱۰۰۲ھ (۱۵۹۳ء) میں رانی بالمتی، دختر راجہ اودے سنگھ والیٔ جودھپور کے بطن سے پیدا ہوا۔ ۲۵ سال کی عمر میں سنہ ۱۰۳۷ھ (۱۶۲۷ء) میں مسندِ حکومت پر قدم رکھا۔ اور سنہ ۱۰۶۸ھ (۱۶۵۷ء) میں عالمگیر اورنگ زیب کے حق میں تاج و تختِ ہند سے دست بردار ہوکر آگرے کے قلعے میں جا بسا۔ موجودہ دلّی اسی کی آبادی ہوئی ہے۔ بڑا ہی دانا اور شہرۂ آفاق قدر دانِ علم و ہنر بادشاہ گزرا ہے۔ دلّی کی مسجد جامع اور لال قلعہ، اور آگرے کے عدیم النظیر روضۂ تاج محل کا بانی ہے۔ اس کی قدر دانی اور قدر افزائی کا یہ عالم تھا کہ محمد جانِ قدسی اور کلیم ہمدانی کو قصیدوں کے صلے میں روپیوں سے تُلوا دیا۔ حسنِ اتفاق کہ دونوں ساڑھے پانچ ہزار روپے بھر نکلے۔ قدسی کو دوبار خلعت اور دو ہزار روپے عطا ہوئے۔ کلیم کو جشنِ وزنِ شمسی کی تقریب میں ۱۰ ہزار روپے کا صلہ عطا کیا۔ بعض شاعروں کے منھ ہیرے اور موتیوں سے بھر دیے۔ اس نے آگرے میں سنہ ۱۰۷۶ھ (۱۶۶۵ء) میں وفات پائی اور تاج محل میں اپنی بیوی کے برابر مدفون ہوا۔

(۳) باقر علی خاں کے لیے دیباچہ، بحث خاندان سبھی ملاحظہ ہو۔

(۴) میرزا صاحب نے "کرتا ہے" لکھا ہے۔ لیکن یا تو "کرتا ہوں" ہونا چاہیے اور یا "کرتی ہے" چونکہ میرزا صاحب تمام دلّی والوں کی طرح مرکب مصادر میں جزو اول کی تانیث کی صورت میں علامت مصدر "نا" کو "نی" سے بدل دیتے ہیں اسلئے میرے نزدیک "ہوں" کی جگہ "ہے" سہواً لکھ گیا ہے۔

(۵) اس عریضے کی تاریخوں میں میرزا صاحب سے سہو ہوا ہے۔ انھیں سنہ ۱۲۸۴ھ اور ۱۸۶۷ء لکھنا چاہیے تھا، مگر ۱۲۳۸ء اور ۱۸۷۶ء لکھ گئے ہیں۔ اسی طرح انگریزی مہینے کا نام بھی رہ گیا ہے۔ البتہ لفافے کی تاریخ میں ماہ و سنہ انگریزی یوں لکھا ہے: ۲۳ ستمبر سنہ ۱۸۶۷ء۔ لفافے کی پشت پر میر منشی صاحب کا نوٹ ہے: "پیش نمودہ شد۔ ہنوز حکمِ تحریرِ جواب صادر نشدہ۔ ۲۸ ستمبر سنہ ۱۸۶۷ء"

صفحہ ۷۵

(۱) اس عریضے کے جواب میں لکھا گیا تھا: "مشفقا! فی الحقیقت مزاجِ راقم از مرکزِ اعتدال منحرف شدہ بود، حالاہم طبیعت خوب صاف نیست، تجویزِ استعمالِ مسہلات درپیش۔ ۲۹ اکتوبر سنہ ۶۷ء"

(۲) نواب صاحب نے ۱۸ نومبر سنہ مذکور کو قطعے کی رسید میں تحریر فرمایا: "..... معاوضۂ عدیم المعاوضہ مع یک قطعہ بمضامینِ نو و طرزِ تازہ در رنگ افروزِ چہرۂ وصول گردید، و از ملاحظۂ مضامینِ نوشش انشراحِ دل بحصول، الحامید۔"

(۳) عریضے کے لفافے پر ۳ نومبر ۱۸۶۷ء تاریخ درج ہے۔

صفحہ ۷۶

(۱) میرزا صاحب نے "گمعامیں" لکھا ہے۔

صفحہ ۷۷

(۱) مثل میں محمد حسن خاں مالک اخبار دبدبۂ سکندری کی رسید شامل ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ تیرہ اخبار کی قیمت کے میرزا صاحب کی اکتوبر کی تنخواہ میں سے مجرا کر کے انھیں دیے گئے تھے۔ اس حساب سے سو رُپے میں سے چودہ رُپے بارہ آنے بچتے ہیں۔ شاید پانچ رُوپے بارہ آنے کے فرق کی وجہ میرزا صاحب کا ضعفِ حافظہ ہے۔

(۲) لفافے پر تحریر ہے: "پیش نمودہ شد، ہنوز حکمی صادر نگردید۔ ۲۰ نومبر سنہ ۱۸۶۷ء"

(۳) یہاں میرزا صاحب نے الفاظ کی قدیم ترتیب کو بدل دیا ہے۔

صفحہ ۷۸

(۱) سرکار کا یہ زبانی ارشاد غالباً کسی درباری کے توسط سے میرزا صاحب تک پہنچا ہوگا، کسی فرمان میں اس کا ذکر نہیں ہے۔

(۲) اس عریضے کے لفافے پر میرزا صاحب نے یکشنبہ دوم رمضان و ۲۹ دسمبر لکھا ہے۔ نواب خلد آشیاں نے جواباً ۱۰ رمضان ۱۲۸۴ھ (۶ جنوری سنہ ۱۸۶۸ء) کو جو فرمان تحریر فرمایا ہے، اُس میں میرزا صاحب کے اصل مدعا کا کوئی تذکرہ نہیں۔

صفحہ ۷۹

(۱) میرزا صاحب نے اس لفظ کو "توجہ" لکھا ہے۔

(۲) اس رباعی کے ساتھ مثل میں کوئی عریضہ منسلک نہیں، صرف لفافہ شامل ہے، جس پر انگریزی تاریخ ۲۴ جنوری سنہ ۱۸۶۸ء تحریر ہے۔ رباعی کی رسید میں نواب خلد آشیاں نے ۱۰ شوال سنہ ۱۲۸۴ھ (۵ فروری سنہ ۱۸۶۸ء) کو تحریر فرمایا: "قطعۂ مبارکباد عید الفطر بطرزِ نغز و مضامینِ شرف افزا وصول گشتہ سازو برگِ فرحت و انبساط افزود۔" اس فرمان میں

رباعی کو قطعۂ مبارکباد لکھنا کتابت کا سہو ہے۔

صفحہ ۸۰

(۱) عریضے کے لفافے پر "دوشنبہ نہم مارچ سنہ ۱۸۶۸ء" درج ہے۔

(۲) کاغذ سے ہنڈوی مراد ہے۔

(۳) عریضے میں کاتب کا نام اور تاریخ کتابت دونوں درج نہیں۔ لفافے پر میرزا صاحب نے دوشنبہ ۱۱ اپریل سنہ ۱۸۶۸ء تحریر کیا ہے، جو درست نہیں ہے۔ اولاً اس لیے کہ ڈاک خانے کی انگریزی مہر میں "۱۱ مئی" درج ہے، ثانیاً اس لیے کہ عریضے میں تنخواہِ اپریل کی اطلاع دی ہے اور یہ مسلّم ہے کہ اپریل کی تنخواہ اپریل میں نہیں ملتی، مئی میں ملتی ہے۔ اس لیے اس کو ۱۱ مئی سنہ ۱۸۶۸ء کا ہونا چاہیے۔

(۴) میرزا صاحب نے سہواً ۱۸۶۷ لکھ دیا ہے۔ صحیح تاریخ ۲۷ مئی سنہ ۱۸۶۸ء ہے: اس لیے کہ اولاً تو جون سنہ ۱۸۶۸ء کے نوشتہ عریضے میں اس کی رسید طلب کی ہے، اور اس میں اس خط کو "سابق کا عریضہ" لکھا ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دونوں عریضوں کے درمیان کسی تیسرے عریضے کا فصل نہیں تھا، ثانیاً اسی عریضے کے لفافے کی پشت پر میر منشی صاحب کا حسب ذیل نوٹ ہے: "تصویر بعد ملاحظہ سپردِ سید مجادر علی صاحب شد۔ ۲ جون سنہ ۱۸۶۸ء" اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ واقعہ سنہ ۱۸۶۸ء کا ہے۔ اگر سنہ ۱۸۶۷ء کا ہوتا تو اسی سال میرزا صاحب تقاضا ہی رسید کرتے، اور اسی وقت سرکار یہ تصویر ملاحظہ فرما کر سید مجادر علی صاحب کو دیتے۔

صفحہ ۸۱

(۱) نواب صاحب نے جوابی فرمان مورخہ ۷ جولائی سنہ ۱۸۶۸ء میں تحریر فرمایا ہے: "شبیہ آں مشفق وصولِ شادمانی آوردہ از فرطِ محبتہا منظور شد۔" اس تصویر کے علاوہ میرزا صاحب نے جہاں جہاں اپنی تصویریں بھیجی تھیں، اُن کے لیے اردوی معلی (ص ۲۰، ۲۳، ۴۳، ۱۲۶، ۲۲۷، ۲۴۷) ملاحظہ ہو۔

(۲) اس عریضے میں صرف (طالب غالب) میرزا صاحب کے قلم کا لکھا ہوا ہے۔ نیز کاتب نے بجائے دلمجی کے دلجی لکھا ہے اسپر غالباً میرزا صاحب کی نظر نہیں پڑی۔

(۳) یہاں لفظ "میں" ساقط معلوم ہوتا ہے۔

(۴) مظفر حسین خاں بہادر ابن مسیح الدولہ حکیم علی حسن خاں بہادر جاوید جنگ ابن حکیم الملوک میرزا علی خاں بہادر لکھنوی نواب خلد آشیاں کے مصاحب تھے۔ ان کے والد مسیح الدولہ شاہِ اودھ کے طبیبِ خاص تھے۔ سلطنتِ اودھ کی بساط اُلٹ جانے کے بعد یہ خاندان بھی ترکِ وطن پر مجبور ہوا۔ رامپور اُس زمانے میں صاحبانِ علم و ہنر کا ملجا و ماوی تھا۔ مظفر حسین خاں اور اُن کے بھائی احسان حسین خاں نے بھی سنہ ۱۸۶۷ء میں اسی دربار دُربار کا قصد کیا۔ نواب خلد آشیاں نے ان دونوں کی کما حقہٗ قدر و منزلت کی۔ مسیح الدولہ صاحب علم اور ایک نہایت عمدہ ذخیرہ مخطوطات و مطبوعات کے مالک تھے جو اُن کے انتقال کے بعد اُن کے دونوں بیٹوں کو وراثت میں ملا۔ نواب صدر یار جنگ بہادر کی

ایک تحریر سے معلوم ہوا کہ مولانا شبلی نے یہ کتاب خانہ دیکھا تھا اور وہ اس کی جامعیت اور ندرت کے بےحد معترف تھے۔ مظفر حسین خاں سے نواب صاحب نے اس ذخیرے کا ایک معقول حصہ خرید کر سرکاری خزانۂ کتب میں شامل فرما لیا تھا۔ ان کتابوں پر مظفر حسین خاں کے دستخط ثبت ہیں، اور متعدد نسخوں پر جا بجا حواشی بھی پائے جاتے ہیں۔ خود ان کے اپنے مصنفہ متعدد رسالے بھی کتب خانے میں موجود ہیں۔ یہ عربی زبان میں فلسفہ و حکمت پر لکھے گئے ہیں۔ میرزا صاحب سے ان کے روابط تھے۔ جب رامپور آئے، تو میرزا صاحب نے منشی سیل چند سے ان کی درباری قدر و منزلت کے متعلق استفسار کیا تھا۔۔۔ ملاحظہ ہو مکتوب نمبر ۱۲۷۔

احسان حسین خاں نے ۵ رجب سنہ ۱۲۹۰ھ (۱۸۷۳ء) کو کربلائے معلیٰ میں انتقال کیا (کلیات منیر: ۵۳۵) اور مظفر حسین خاں سنہ ۱۲۹۲ھ (۱۸۷۵ء) میں فوت ہوئے (ایضاً: ۵۴۷)

صفحہ ۸۲

(۱) اس خط میں خلافِ دستور میرزا صاحب نے دعائیہ شعر نام اور تاریخ کے بعد لکھا ہے۔

صفحہ ۸۳

(۱) یہ بچت انگریزی تنخواہ کو آمدنی میں شامل کر لینے کے بعد معلوم ہوتی ہے۔ اس لیے کہ سہ ماہی سود کے علاوہ بھی صرف ۲۵ روپے شاگرد پیشہ ہی کے رامپور کے سو روپے میں سے منہا کر دیے جائیں، تو ۷۳ روپے بچتے ہیں۔

(۲) شاگرد پیشے کی تنخواہ کا ذکر عریضہ ۱۰۱ میں بھی گزر چکا ہے۔

(۳) اصل میں سود کی دال ساقط ہے۔ اسی سہ ماہی سود کی مقدار کے متعلق سرور کو لکھا ہے:
"تین برس کا چڑھا ہوا روپیہ مل گیا۔ بعد ادائے قرض ۹/۱۰ بچے۔ اب ماہ بماہ روپیہ ملتا ہے۔ مگر یہی تین مہینے ستمبر، اکتوبر، نومبر ملیں گے۔ دسمبر سنہ ۱۸۶۰ء میں تنخواہ ششماہی ہو جائے گی۔ اس سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ چار روپیہ سیکڑہ سالانہ عموماً وضع ہوا کرے گا اس حساب سے میرے حصے میں ڈھائی روپیہ مہینا آیا۔ ۹/۱۰ کے ساڑھے رہیں گے۔
کچھ رامپور سے ماہ بماہ آتا ہے۔ یہ دونوں آمدنیں مل کر خوش و ناخوش گزارا ہو جاتا ہے۔" (اردوی: ۱۰۳، لاہور ایڈیشن)

(۴) لفافے کی پشت پر لکھا ہے: "پیش نمودہ شد۔ ہنوز حکمے صادر نگردید ۲۳ اکتوبر ۱۸۶۸ء"

صفحہ ۸۴

(۱) اس عریضے کے لفافے پر ۱۵ دسمبر سنہ ۱۸۶۸ء درج ہے، حالانکہ ڈاک خانے کی مہر کے اندر بھی ۷ تاریخ ہی مندرج ہے اس سے یقین ہوتا ہے کہ سہواً لفافے پر ۱۵ دسمبر لکھا گیا ہے۔ لفافے کی پشت پر نوٹ ہے: "پیش نمودہ شد حکم صادر نشد۔ ۲۰ دسمبر سنہ ۱۸۶۸ء"

(۲) اس لفظ کو تمدد حواس اور رعشے کی بنا پر "قرضخواہا ہوں" لکھا ہے۔

(۳) اصل میں ۱۲۵۸ لکھا ہے۔ اور لفافے پر دہم جنوری سنہ ۱۸۶۹ء تحریر ہے۔ یہ میرزا صاحب کی آخری تحریر ہے۔ حسین علی خاں کے عریضے سے معلوم ہوتا ہے کہ جنوری کی تنخواہ

۱۵ فروری کو میرزا صاحب کے انتقال سے ایک گھنٹہ قبل پہنچی تھی، اس لیے اُس کی رسید اپنے قلم سے نہ لکھ سکے۔ سویم کے روز حسین علی خاں نے سرکار کو میرزا صاحب کے انتقال کی اطلاع دیتے ہوئے لکھا: "بتاریخ ۱۵ فروری سنہ حال، مطابق ۲ ذیقعدہ، روزِ دوشنبہ دقتِ ظہر، جناب داداجان صاحب قبلہ نواب اسد اللہ خاں غالب عرف میرزا نوشہ صاحب نے اس جہانِ فانی سے رحلت کی۔ فدوی کچھ عرض نہیں کر سکتا کہ کس قدر رنج والم اس سانحہ جانگزا و جگر خراش سے لاحق ہوا ہے۔ اور نیز جناب دادی صاحب معظمہ کا حال اس رنج سے عالمِ پیری میں ایسا ہو گیا ہے کہ گزارش نہیں کیا جا سکتا ہے۔ حضور کا نوازش نامہ مع ہنڈوی یک صد روپیہ بابت تنخواہِ جنوری سنہ ۶۹ء کے ۱۵ فروری کو ایک گھنٹہ پہلے انتقال داداجان صاحب سے شرفِ صدور لایا تھا۔ رسید ہنڈوی واسطے اطلاعِ حضور کے عرض کی گئی۔"

فروری کے چودہ دن کی تنخواہ کی رسید حسین علی خاں نے ۱۱ مئی سنہ ۶۹ کو اپنی مہر لگا کر دہلی سے روانہ کی تھی، جو اُن کے خطوط کے فائل میں منسلک ہے۔ مگر اُن کے مکتوب بنام سیکریٹری سے معلوم ہوتا ہے کہ ۲۶ ماہِ مذکور تک تنخواہ کی ہنڈوی انھیں نہیں ملی تھی۔ ۱۴ صفر ۱۲۸۶ھ کے ایک نوٹ سے پتا چلتا ہے کہ اُس تاریخ سے قبل رقم یہاں سے بھیجدی گئی تھی۔ یہ تاریخ ۲ جون سنہ ۱۸۶۹ء کے مطابق ہے جسین علی خاں نے اپنے ۱۲ جون کے عریضے میں اس کے وصول کا ذکر کیا ہے۔

صفحہ ۸۵

(۱) یہ عبارت میرزا صاحب نے لفافے پر لکھی تھی۔

صفحہ ۸۶

(۱) چیف کمشنر سے لارڈ لارنس مراد ہیں، جو ۱۸۵۳ء سے ۱۸۶۴ء تک پنجاب کے چیف کمشنر اور بعد ازاں وٓیسرائے بنا دیے گئے تھے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو حاشیہ ۱ صفحہ ۶۶

(۲) کمشنر دہلی سے چارلس سانڈرس مراد ہیں۔ ان کا حال معلوم نہ ہو سکا۔

(۳) اس زمانے میں دہلی کے کلکٹر فلپ ہنری اجرٹن، آئی، سی، ایس تھے۔ یہ ۹ اگست سنہ ۱۸۲۴ء میں پیدا ہوے۔ سنہ ۱۸۴۲ء میں ہندوستان آئے۔ شمال مغربی صوبے میں سنہ ۱۸۵۰ء تک خدمات انجام دیں۔ سنہ ۱۸۵۵ء سے سنہ ۱۸۵۹ء تک دہلی کے مجسٹریٹ اور کلکٹر رہے لیکن سنہ ۵۷ کے محاصرۂ دہلی میں رخصت پر تھے۔ اکتوبر سنہ مذکور میں واپس آکر بڑی مضبوطی سے شہر اور ضلع میں امن وامان کو بحال کیا۔ سنہ ۱۸۵۹ء میں امرتسر کے کمشنر مقرر ہوے۔ سنہ ۱۸۶۸ء میں راولپنڈی تبادلہ ہوا۔ ۱۷ جنوری سنہ ۱۸۹۳ء کو تاریخ انتقال ہے۔

(۴) اس لفظ کو میرزا صاحب نے اسی طرح لکھا ہے۔ لیکن صحیح "ریونیو بورڈ" ہے۔

(۵) اس سلسلہ میں جمعہ ۱۲ مارچ سنہ ۱۸۵۸ء کو تفتہ کو لکھا ہے: "عرضی میری سرجان لارنس چیف کمشنر بہادر کو گزری۔ اُس پر دستخط ہوے کہ یہ عرضی مع کاغذ ضمیمۂ سائل کے پاس بھیجدی جائے اور یہ لکھا جائے کہ معرفت صاحب کمشنر دہلی کے پیش کرو۔ اب سررشتہ دار کو لازم تھا کہ میرے نام موافق دستور کے خط لکھتا۔ یہ نہ ہوا۔ وہ عرضی حکم چڑھی ہوئی

میرے پاس آگئی۔ میں نے خط صاحب کمشنر دہلی چارس سانڈرس کو لکھا اور وہ عرضی حکم چڑھی ہوئی اُس میں ملفوف کرکے بھیج دی۔ صاحب کمشنر نے صاحب کلکٹر کے پاس یہ حکم چڑھا کر بھیجی کہ سائل کے پنسن کی کیفیت لکھو۔

اب وہ مقدمہ صاحب کلکٹر کے یہاں گیا ہے۔ ابھی صاحب کلکٹر نے تعمیل اُس حکم کی نہیں کی۔ پرسوں تو اُن کے ہاں یہ روبکاری آئی ہے۔ دیکھیے مجھ سے پوچھتے ہیں یا اپنے دفتر سے لکھ بھیجتے ہیں۔ دفتر کہاں رہا ہے، جو اُس کو دیکھیں گے۔

بہرحال یہ خدا کا شکر ہے کہ بادشاہی دفتر میں سے میرا کچھ شمول فساد میں پایا نہیں گیا، اور میں حکام کے نزدیک یہاں تک پاک ہوں کہ پنسن کی کیفیت طلب ہوئی ہے۔ اور میری کیفیت کا ذکر نہیں ہے۔ یعنی سب جانتے ہیں کہ اس کو لگاؤ نہ تھا۔

بھائی، ہدایت تو اچھی ہے، نہایت بھی خدا اچھی کرے۔ وہ عزت اور وہ ربط و ضبط جو ہم رئیس زادوں کا تھا، اب کہاں! روٹی کا ٹکڑا ہی مل جائے تو غنیمت ہے۔ گورنری کلکتہ اور گورنری آگرہ اور ایجنٹی و کمشنری و دیوانی و فوجداری و کلکٹری دہلی سے جو حکم میرے خط اور عرضی پر ہوا ہے، مشتمل اُس حکم پر خط میرے نام آیا ہے حاکم نے اب بھی یہی حکم دیا تھا کہ لکھا جاوے کہ یوں کرو۔ عملہ نے خط لکھا، مگر وہ عرضی حکم چڑھی ہوئی بھیج دی۔" (اردوی: ۸۵، لاہور ایڈیشن؛ خطوط: ۱، ۳۱)

صفحہ ۸۷

(۱) لفافے سے معلوم ہوتا ہے کہ میرزا صاحب نے اسے لکھ تو ۲۵ تاریخ ہی کو لیا تھا، مگر ارادہ تھا کہ ۲۵ کو پوسٹ کرائیں گے، اس لیے ۲۵ مارچ تاریخ لکھ دی تھی۔ لیکن بعد ازاں از راہِ عجلت ۲۴ ہی کو ڈاک میں ڈلوا دیا۔ اصل عبارت یہ ہے: "در شہر رامپور موصول و بخدمت نواب صاحب مشفق و مکرم، مظہر لطف و کرم، نواب زین العابدین خاں صاحب عرف کلن میاں سلمہ اللہ تعالیٰ مقبول باد، از غالب بکر نگ، بیرنگ۔ مرسلہ ۲۵ مارچ ۱۸۵۸ء۔ ضروری۔ جواب طلب و شتاب طلب ۱۲ چون عجلت در ارسالِ مکتوب می بایست، ہم بروزِ چہارشنبہ آخرِ روز ۲۴ مارچ فرستادہ شد۔"

(۲) یہ خط میرزا صاحب نے زین العابدین خاں کے اصل خط کے حاشیے پر نقل کرکے منشی سیل چند صاحب کو بھیج دیا تھا۔ زین العابدین خاں کے خط کی عبارت یہ ہے: "نواب صاحب مشفقِ مہربان، کرمفرمای دوستان، مجموعۂ خوبیہای بیکران، سلمہ اللہ تعالیٰ۔ بعدِ سلام مسنون و اشتیاقِ ملاقاتِ مسابحت مشحون، یہ چند خزف ریزے بھیجکر تکلیف دیتا ہوں کہ نگاہِ گوہر سنج سے ملاحظہ کرکے اغلاطِ محاورات، و تراکیب، و سستیٔ بندش و تعقیداتِ صوری و معنوی، و تنافرِ الفاظ، و ابتذالِ مضامین، جس جگہ واقع ہو مطلع فرمائیے۔ فقط۔ امرِ مستفسرۂ سابق میں صدورِ مہربانی نامۂ نامی نے خلجان رفع کیا، جواب اس کا بھی اگر جلد عنایت ہو، بعید ارتباطِ دیرینہ سے نہ ہوگا۔ زیادہ شوق و بس۔ فقط نگاشتہ دہم مارچ سنہ ۱۸۶۵ء مقام جے پور۔

صفحہ ۸۸

(۱) یہ خط دیوانِ بیتاب قلمی کے ورق ۸۴ الف کے حاشیے پر میرزا صاحب نے لکھا ہے آخر میں تاریخ نہیں ہے۔ لیکن دوسرے خط کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ نومبر سنہ ۱۸۶۶ء سے قبل لکھا گیا تھا۔

صفحہ ۸۹

(۱) دیوانِ مطبوعہ میں اس اصلاح کا اتباع نہیں کیا گیا ہے۔

صفحہ ۹۰

(۱) دیوانِ مطبوعہ میں "میں بھی" ہے۔

صفحہ ۹۱

(۱) یہ کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے۔
(۲) مطبوعہ میں دوسرا مصرع یوں چھپا ہے: "میں تم پہ مبتلا ہوں، وہ ہے مبتلای شمع"۔
(۳) مطبوعہ: "ہیں زخم اور آبلہ"۔
(۴) مطبوعہ: "جب قابلِ بیاں ہی نہ اپنا رہا قلق"۔

صفحہ ۹۲

(۱) مطبوعہ: "پھوڑا ہوا ہے پک کے"۔
(۲) یہ کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے۔ دیوانِ مطبوعہ اور اُس قلمی نسخے میں جو میرزا صاحب کے اصلاحی نسخے سے منقول ہے، یہ غزل نہیں ہے۔
(۳) دیوانِ مطبوعہ میں اس اصلاح کا اتباع نہیں کیا گیا ہے۔
(۴) یہ کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے۔
(۵) مطبوعہ: "لکھیں نہ نامے میں"۔ دراصل قلمی بیضے میں یہ اصلاح غالباً خود بیتاب نے کی ہے۔

صفحہ ۹۳

(۱) مطبوعہ: "قتل کا اپنے خوش آیا ہے یہ ایہام کو"۔ یہ بعد کی ترمیم معلوم ہوتی ہے۔
(۲) مطبوعہ: "جوشِ وحشت میں ہوں کیوں ننگ میں عریانی کا"۔ یہ بھی بعد کی ترمیم ہے۔
(۳) میرزا صاحب کی یہ اصلاح درست نہیں ہے؛ اس لیے کہ "مقتضی" مصدر اقتضا کا اسم مفعول ہے، اور جمع اس کی "مقتضیات" بفتح یا بغیر تشدید ہوگی، نہ کہ "مقتضیات" جیسا کہ میرزا صاحب نے لکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مطبوعہ میں مصرع اس طرح درج کیا گیا ہے: "مقتضای بشری سے تو نہ مقاصر مگر"۔
(۴) مطبوعہ: "لگا"۔
(۵) مطبوعہ میں یہ غزل ردیف نون میں درج کی گئی ہے۔ مگر مطلع کی حسب ذیل صورت ہے
عبث ہیں خونفشاں یہ دیدہ و مژگان تر دونوں   فغان و نالہ ہیں تو ہوں مگر ہیں بے اثر دونوں

صفحہ ۹۴

(۱) مطبوعہ: "رکھے منہ کیوں کر وہ میرے سینۂ پُر داغ پر"۔
(۲) مطبوعہ: "توڑ کر"۔

(۳) مطبوعہ: "حشر کے دن ہوگی اُس سے ایک صحبت اور بھی"۔
(۴) مطبوعہ: "خم ہے یہاں گردن"۔
(۵) مطبوعہ میں یہ شعر اسی طرح باقی رکھا گیا ہے۔

صفحہ ۹۵

(۱) یہ خط دیوان کے آخری سادہ صفحہ پر لکھا گیا ہے۔

صفحہ ۹۶

(۱) مطبوعہ میں یہ شعر نہیں ہے۔
(۲) مطبوعہ میں اس مطلع کو اس طرح چھاپا گیا ہے: "قسمت سے کہاں پر اپنی تو ذکر اُس کا لاتا ہے
یہی چرچا کیے ہے، مجھ کو، ای نامہ نو کن آتا ہے" ہے
(۳) مطبوعہ: "وہم ہے آفت"۔
(۴) مطبوعہ: "ہو گیا"۔

صفحہ ۹۷

(۱) مطبوعہ: "ناصحو، تم رہے عقبیٰ میں کلام آنے دیے"
(۲) مطبوعہ: "ملا کر خاک میں بس جلد یے دہ"
(۳) مطبوعہ: "عشاق"۔

صفحہ ۹۸

(۱) بیتاب کا اس زمین میں دو غزلہ ہے، مگر یہ قافیہ یا اس مضمون کا شعر اُنھوں نے نہیں لکھا تھا۔ میرزا صاحب نے اپنی عادت کے خلاف پورا شعر خود کہہ کر لکھ دیا ہے۔
(۲) مطبوعہ میں یہ شعر اس طرح درج ہے:
مارڈالا بیقراری نے، کوئی اللہ سے مانگ لائے اک ذرا سا صبر میرے نام سے
(۳) دراصل میرزا صاحب کی سمجھ میں حرف لفظ "یونہی" نہیں آیا تھا جسے کاتب نے "یوں ہی" لکھ دیا تھا، ورنہ مصرع کے اور تمام لفظ صاف صاف تحریر ہوئے ہیں۔
(۴) مطبوعہ: "تھا بہت شوقِ طپش، لیکن ادب مانع ہوا"۔

صفحہ ۹۹

(۱) مطبوعہ: "عاشق ہیں، بآسانی اگر قتل کرے گا"۔

صفحہ ۱۰۰

(۱) بیتاب نے بھی غلط نہیں لکھا ہے۔ اصلاح کا منشا صرف حسن کلام بڑھانا ہے۔
(۲) مطبوعہ: "بغیر اُس کے پیوں خون دل، یہ مے ساقی"۔

صفحہ ۱۰۱

(۱) اصل میں یہ مصرع اس طرح لکھا ہے: "نیکوں کی تہ جھکی زمین سر کچھ تو دیر کی"۔

صفحہ ۱۰۲

اصل میں مصرع کا پہلا لفظ "زمش ہے" اور لفظ "آج" کاتب سے رہ گیا ہے۔
(۲) مطبوعہ: "طمانچے"۔

(۳) مطبوعہ میں یہ قصیدہ نہیں ہے۔

صفحہ ۱۰۴

(۱) میرزا صاحب نے آراستگی پر اسی طرح اعراب لگائے ہیں۔ مگر مطبوعہ میں اس اصلاح کا اتباع نہیں کیا گیا ہے۔

(۲) مطبوعہ: "پہنچتی ہے"

(۳) یہ کتابت کی غلطی ہے۔

(۴) مطبوعہ میں اس اصلاح کا اتباع نہیں کیا گیا ہے۔

صفحہ ۱۰۵

(۱) مطبوعہ میں اس اصلاح کا اتباع نہیں کیا گیا ہے۔

(۲) مطبوعہ: آگاہ تو ہے"

(۳) یہ کتابت کی غلطی ہے۔

صفحہ ۱۰۶

(۱) مطبوعہ میں یہ شعر نہیں ہے۔

صفحہ ۱۰۷

(۱) مطبوعہ: "عدو کے پر بتانے کی تہیں ہے"

(۲) مطبوعہ: "تو اُن کو کرے پیار"

(۳) مطبوعہ میں یہ رباعی نہیں ہے۔

(۴) یہ کتابت کی غلطی ہے۔

(۵) اصل: "مظلوین" یہ کتابت کی غلطی تھی۔ در اصل اُسے مظلومی لکھنا چاہیے تھا، جس سے مظلوم ہونا مراد ہے۔ میرزا صاحب مظلوم کی جمع مظلوین سمجھے۔ چونکہ یہ لفظ غیر موزوں سا تھا، انھوں نے "مقتولوں" سے بدل دیا۔ حالانکہ زیادہ موزوں وہی "مظلومی" ہے۔

صفحہ ۱۰۸

(۱) یہ غزل میرزا صاحب کی اُس غزل کی ہم طرح ہے جس کا مقطع ہے: اب ہے دِلّی کی طرف کوچ ہمارا غالب ۔ آج ہم حضرتِ نواب سے بھی مل آئے۔ پوری غزل کے لیے غالب نامہ ۔۴۲ طبع دوم ملاحظہ ہو۔

صفحہ ۱۰۹

(۱) یہ عبارت میرزا صاحب نے مکتوب مورخہ ۲۵ دسمبر سنہ ۱۸۶۴ء کے لفافے پر لکھی تھی۔

صفحہ ۱۱۰

(۱) یہ خط نواب فردوس مکاں کے غسلِ صحت کی تاریخ کے متعلق لکھا گیا تھا۔ سرکار کے مرض اور افاقے کے متعلق عرائض ۳۹ تا ۴۴ اور اُن کے حواشی ملاحظہ ہوں۔

(۲) منشی صاحب نے میرزا غالب کے مکتوب مورخہ ۲۵ دسمبر سنہ ۶۴ء کے جواب میں جو خط تحریر کیا تھا، اُس میں ذکرِ ماہِ جشن کے بعد درخواست کی تھی کہ "ایک مادہ تاریخ کا فدوی نے نکالا ہے، سو عرض کرتا ہوں۔ اُمیدوار ہوں کہ اُس کے دو شعر موزوں

فرما کر عنایت نامہ موسومہ فدوی کے ہی عنایت فرمائیے :

کاش کر میرا عدا عرض کرتو، اے منشی — بندگانِ عالی کا آج غسلِ صحت ہے

اس شعر کا مصرعِ ثانی مادۂ تاریخ ہے۔ چونکہ اس کے اعداد ۱۸۶۶ ہوتے ہیں، اس لیے ایک عدد کا تخرجہ کیا گیا ہے۔ فقرہ (کاش کر میرا عدا) بتاتا ہے کہ اگر میرا عدا یعنی حرفِ الف کے عدد کو، جو ایک ہے، مادۂ تاریخ میں سے کم کر دیا جائے، تو اعدادِ مطلوبہ ۱۸۶۵ حاصل ہو جائیں گے۔ چونکہ یہ امر قاعدۂ تاریخ گوئی کے عینِ مطابق ہے، اس لیے میرزا صاحب نے اس پر جو اعتراض کیا ہے، وہ درست نہیں۔

(۳) قصیدۂ تہنیت عریضۂ نمبر ۴۴ کے حاشیے میں درج ہے۔

(۴) شاہ کبیر الدین صاحب سہسرام کے ایک بزرگ تھے۔ مزید حالات کا پتا نہیں۔

(۵) میرزا صاحب نے سہواً ماہِ آیندہ کو رجب لکھ دیا ہے ورنہ فی الواقع اگلا مہینا رمضان کا تھا اس لیے کہ عریضہ ۴۸ سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس سال ۱۳ دسمبر کو رجب کی بھی ۱۴ تاریخ تھی۔ لہٰذا ۱۹ جنوری کو، ۱۹، یا ۲۰ شعبان ہو گی، اور شعبان کے بعد رمضان آتا ہے، رجب نہیں آتا۔

صفحہ ۱۱۱

(۱) زین العابدین خاں کا خط میرزا صاحب کے مکتوب (۱۲۰) کے حاشیے میں نقل ہو چکا ہے

(۲) عریضۂ نمبر ۴۴ مراد ہے

(۳) مقرر : ضرور۔

(۴) یہ عریضہ کلیاتِ نثرِ فارسی میں شامل نہیں ہے، اس سے گمان ہوتا ہے کہ رامپور سے نقل روانا نہیں کی گئی۔

(۵) اس کے آخر میں میرزا صاحب نے اپنا نام اور تاریخِ کتابت کچھ نہیں لکھا ہے۔ پشتِ ورق پر کسی اہلکارِ دارالانشا نے حسبِ ذیل یادداشت لکھی ہے : "قصیدہ ہای شاعران مرسلۂ مرزا نوشہ صاحب ۲۹ رجب سنہ ۱۲۸۲ھ مطابق ۱۹ دسمبر سنہ ۱۸۶۵ء"۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دسمبر سنہ ۱۸۶۵ء کی ۱۵ یا ۱۶ کو میرزا صاحب نے یہ خط لکھا ہو گا۔ خط کا لفافہ ضائع نہ ہو جاتا، تو تاریخ کا واقعی علم ممکن تھا۔

صفحہ ۱۱۲

(۱) سید فرزند احمد صفیر بلگرامی، سید عبدالحی عرف میر سید احمد احمد تخلص کے بیٹے اور حکیم حاجی مولوی سید غلام یحییٰ کے پوتے ہیں۔ نسب میں حسینی سید اور بلگرام کے باشندے ہیں۔ اپنے نانا کے گھر مارہرے میں پیدا ہوئے: "شمس الضحیٰ" سے سالِ ولادت ۱۲۴۹ھ نکلتا ہے۔ رشحاتِ صفیر (صد ۱۹، مطبع نور الانوار، آرہ، ۱۲۹۴ھ) میں خود اپنا حال اس طرح لکھا ہے :

" خالقِ بے ہمتا نے قصبۂ مارہرہ ضلع کول میں مجھے خلعتِ میلاد دیا، جو میرے نانا حضرت شاہ عالم صاحب علیہ الرحمہ، سجادہ نشینِ مارہرہ کا مسکن ہے، جن کو حضرت غالب دہلوی نے پنج آہنگ اور اردوی معلی وغیرہ میں پیر و مرشد کر کے یاد کیا ہے، اور قصبۂ بلگرام کو

میرا وطن گیا، جو صوبۂ اودھ میں نام بہ آوردہ اور معدنِ علم وفن ہوتا آیا ہے، اور شیخ امان علی سحرؔ اور میرزا سلامت علی دبیرؔ لکھنوی اور مرزا نوشہ اسداللہ خاں غالبؔ دہلوی کا شاگرد اور شیخ امداد علی بحرؔ لکھنوی کا مقلد اور میر مظفر علی اسیرؔ لکھنوی کا معتقد ہے مگر آب ودانہ پانچ برس کی عمر میں مجھے قصبۂ آرہ ضلعِ شاہ آباد، قریب عظیم آباد پٹنہ کے لایا۔ اور شوقِ علم نے ہمیشہ اس زاویہ نشینِ نادانی کو اکثر بلاد وامصار میں صورتِ پرکار پھرایا۔ بارہا لکھنؤ کی سیر کی، دہلی گیا۔ اساتذۂ سابق سے سابقہ رہا۔"

استادِ من بشیوۂ اردو زبان سحرؔ | کز ناسخ است یافتہ تمغای شاعری
درمرثیہ دبیرؔ بود اوستادِ من | مقبولِ کبریا شدہ اندمدحِ حیدری
غالبؔ بود بہنر وبہ شعرم بیاوری | کو ہست در زمانہ علم باہنر دری

(ایضاً: ۱۴)

میرزا صاحب نے رشحاتِ صفیرؔ کی تقریظ میں ان کی بڑی تعریف کی ہے۔ فرماتے ہیں:
"سیدی و سندی، نورِ بصر، لختِ جگر، قرۃ العینِ اسد، مولوی سید فرزند احمد کے طولِ عمر ودوامِ دولت وبقای اقبال کی دعا مانگتا ہوں، جن کو مبدءِ فیاض سے اس رسالے کے لکھنے کی توفیق عطا ہوئی ہے۔ سبحان اللہ! تفرقۂ تذکیر اور تانیث کی تقریر کہ وہ اور مطالب کی توضیح پر بھی مشتمل ہے، کس لطف سے ادا ہوئی ہے۔ ہر چند اس راہ سے کہ سید صاحب دانا اور دقیقہ رس اور منصف ہیں، قواعد تذکیر وتانیث کے منضبط ہونے کے خود معترف ہیں، لیکن قوتِ علم اور حسنِ فہم اور لطفِ طبع سے وہ مضبوط ضوابط بہم پہنچائے ہیں کہ مجھے دل سے پسند آتے ہیں۔ دعا یہ ہے اور یقین بھی یہی ہے کہ یہ رسالہ صفحۂ دہر پر یادگار اور ہمیشہ منظورِ انظارِ اولوالابصار رہے گا۔ جو صاحب اس کو مطالعہ فرمائیں گے نفع بھی پائیں گے، اور لطف بھی اٹھائیں گے۔ مؤلف صاحب جو کامیاب اپنے ذہن رسا سے ہیں، رئیس جلیل القدر آرہ اور حضرت فلک رفعت مولوی صاحب عالم صاحب مارہروی کے نواسے ہیں، سید واسطی بلگرامی ہیں، جہاں کے سادات علم وفضل میں نامی اور قدر ومنزلت میں گرامی ہیں۔ ان حضرات کا مادح گویا اپنا ثنا خواں ہے، جیسا کہ مولوی معنوی رومی علیہ الرحمہ کا بیان ہے۔

مادحِ خورشید مداحِ خودست | کہ مرادو چشم سرنامرد است

[illegible] ۱۲۳۸ھ

داد کا طالب غالب

صفیر نے ۱۳۰۷ھ (۱۸۸۹ء) میں انتقال کیا (خمخانہ: ۵، ۳۳۹؛ تاریخِ لطیف ۱۶۳)

اس قصیدے کے ہر شعر کا پہلا حرف ملایا جائے تو "نوابِ مستطاب معلیٰ القاب جناب نواب کلب علی خاں صاحب بہادر دام اقبالہٗ والیِ رام پور" نکلتا ہے۔ اسی کا نام صنعتِ توشیح ہے۔ حاشیے کا حلِ لغات خود صفیر کا نوشتہ ہے۔

قصیدہ بہ صنعتِ توشیح در مدحِ نوابِ مستطابِ معلی القاب جناب نواب کلبِ علی خاں بہادر دام اقبالہٗ والیِ رامپور

نویدِ ساقیِ رنداں کہ ہے طرب کا ظہور — لنڈھا دے شیشۂ صہبا، پلا دے جامِ سرور
وہ اٹھا ابر وہ بادل چلے برسنے کو — وہ بیٹھا خانۂ رنج و الم بفضلِ غفور
اڑی نقاہتِ نرگس، بڑھی وجاہتِ گل — کھلی صباحتِ نسریں، کھلی ملاحتِ سورا[1]
بہارِ عیش میں ہیں بھونروں کے یہ رنگ ہے آج — ہزار عیش میں ہیں، وصلِ گل ہے کل کل دور؟
مرا بھی خانۂ دل نقشہائے رنگیں سے — کیا ہے صنعتِ معمارِ طبع نے معمور
سبب نہ پوچھ کہ دل کیوں ہے خانۂ بلغِ طرب — جہت نہ ڈھونڈ کہ ہے ششجہت میں پیرور
تجھے ہو آج مبارک یہ دور دورِ شراب — تجھے ہو آج سزاوار عیش کا مذکور
طرب طرب نہ کہے کھل کے کس لیے غنچہ — کہ آج مسندِ دولت ہے نور سے معمور
المدت آج ہے نازاں کہ زیبِ مسند ہیں — جنابِ کلبِ علی خاں غیور ابنِ غیور
بنایا دورِ فلک نے زمین کو رشکِ ارم — کہ رامپور ہوا ہے تمام دارِ سرور
میں اس خوشی میں پڑھوں ایک مطلعِ رنگیں — کہ جس کے لکھنے کو آئے بیاضِ دیدۂ حور

مطلع

عنایت اُس کی نہ چاہے اگر نظامِ امور — تو میلِ دیدۂ سلطاں[3] ہو خانۂ دستور

ق

لیاقتِ ازلی سے ہے مطلقِ عالم — جلالتِ ابدی سے ہیں منتشر جمہور
یہ اس لیے ہے کہ ایذا نہ دے کسی کو کوئی — وہ اس لیے ہے کہ ہے ظلم اُن کی حد سے دور
اسیرِ دامِ خطِ دست میں ہے دزدِ حنا — جو چورِ شمع کا گلگیر نے کیا محصور
ہوائی عدل ہوا سایہ افگنِ سرِ خلق — ہما کے سایے کے خواہاں نہیں ہیں اب جمہور
قلوبِ خلق ہیں یوں اُس کے حکم سے خورسند — کہ جیسے رشح کو ہو انتعاشِ طلعتِ حور
اس انتظام کو دیکھو، یہ عدل ہے نایاب — زمیں پر ایک جگہ ہے مقامِ سایہ و نور
بری ہیں درد و غم و رنج سے تمام قلوب — ہوئے ہیں فرطِ بشاشت سے دل برائے سرور
جمال و ظلم سے اُمید میں غنی و فقیر — جلال و رعب سے دہشت میں نخیر و نخور
نہیبِ عدل اگر روکے ظلمِ حادثہ کو — بری ہو نامِ مینی سے گوہرِ منشور
اشارہ ہو جو ذرا عدلِ دہرِ اقدس کا — کلف ہو ماہ سے زائل تو آفتاب سے نور

ق

بلند عدل کا پایہ ہوا یہ اُن کے سبب — کہ اب ہے فکرتِ کسریٰ پہنچنے سے معذور
نیابت اُن کی کرے آ کے ہاں اگر کسریٰ — یقین اتنا تو ہے بعدِ انقضائی دہور
وہ پہنچے زینۂ اول پہ عدل کے لیکن — جو اور قصد یہ ہو گام سنج، کیا مقدور
اٹھائے چوبِ ادب سر پہ اُس کے شحنۂ حب — بٹھائے مہرِ جلالت کے سایے میں گو سے عور
ہدایت اُس کو برابر کی دے بدم محفوظ — رعایت اُس کو رہا کی رات دن منظور
کسی کا رنگ بگاڑے نہ کوئی باہم دگر — نہ ہے سیاہی فلاں سفید کا [illegible]

(۱) سور معنی رنگ سرخ ۱۲ غیاث (۲) گل گل یعنی کاوکاو ۱۲ برہان (۳) میلِ رزبیدن یعنی کور کردن ۱۲ برہان - (۴) یعنی وزیر ۱۲

لب شکایت و فریاد کیوں نہ بند رہیں ۔۔۔ مقام امن میں ہیں رات دن وحوش و طیور
بندھے ہیں ایک ہی رسّی میں ظلم و فتنہ و شر ۔۔۔ کہ روز شحنۂ انصاف اُس پہ ہے مامور
علو جاہ و مراتب میں گرد ہے دارا ۔۔۔ سمو شان و جلالت میں ہیچ ہے فغفور
لکھوں وہ مطلعِ رنگیں میں اب سراپا میں ۔۔۔ کہ آب آب سراپا ہو جس سے ابرِ دجور

مطلع

یہ خال و رخ ہے کہ ہے اتصالِ ظلمت و نور ۔۔۔ کہ جس طرح ہے بہم ربطِ ملفسل دکافور
خدا نے حُسن دیا، حُسن پر ریاست دی ۔۔۔ وہ آفتاب کا جلوہ، یہ ماہتاب کا نور
اسی طرح کا ہے، بلبل ترے گلوں میں لگ ۔۔۔ یونہی ہے سرو میں، قمری تجالِ قد کا ظہور!
نمودِ خط نے کیا حُسنِ خط کو روز افزوں ۔۔۔ جہاں میں دیکھی سواد و بیاض دیدہ محور
صباحتِ رُخ دکیفیتِ ملاحتِ خال ۔۔۔ بہم ہوئیں، تو بڑھا ذوقِ دیدۂ جمہور
الف ہے جبینِ روشن مگر امارت کا ۔۔۔ یہی الف سرِ اقبال کا ہے تاجِ سرور
حسین، رشکِ قمر، نوجوان، جواں دولت ۔۔۔ شجاع، باذلِ دوراں، بلند قدر، غیور
بہائی آب گہر آب و تابِ دنداں سے ۔۔۔ صدف کا گھر ہوا تاراجِ سیلِ قلزمِ نور
بھلا ہو لعل کہاں لب کے رنگ پر سرسبز ۔۔۔ تری نظر کا ہے، اے جوہری مریخ قصور
ہوا ہے مطلعِ تازہ کا پھر مجھے سودا ۔۔۔ مخاطب اُن سے ہوں باطن میں، ظاہراً ہو دور

مطلع

اگر حضور کو ہو پرورش ذرا منظور ۔۔۔ دُرِ یتیم کو ہرگز نہ کوئی دیکھے عور
دکھائیں یائی طلب سے جگا کے روزِ نشاط ۔۔۔ اگرچہ طالعِ خفتہ ہو خواب سے مجبور
رہے خیالِ کرم میں حضور کے جو کوئی ۔۔۔ تو اُس کے مطلبِ خاطر، ماغیب سے ہو ظہور
دیا ہے آپ کو حق نے وہ دل کہ مورثِ ابر ۔۔۔ قریب اُس سے ہے سیراب فیضیاب ہے دور
اگرچہ دور ہوں میں آستانِ دولت سے ۔۔۔ مگر حضور کے الطاف کا اگر ہو صدور
مجھے ہو دور قریب اور قرب عزت ہو ۔۔۔ رہوں ہمیشہ میں انعام و لطف سے مشکور
اگرچہ مجھ کو ہے مشکل یہ منزلت پانی ۔۔۔ کہ مدح خواہاں ہوں زمانے میں آپ کا مشہور
قلم کو میرے نہیں آج تک یہ راہ ملی ۔۔۔ سخن نے میرے نہیں پایا مدح کا دستور(۱)
بندھے ہیں لب مرے، گویا ہے مہرِ خاموشی ۔۔۔ ہزار گنج سخن اور طبع ہے گنجور(۲)
اشارہ چاہتی ہے طبعِ مدح سنج مری ۔۔۔ کہ تا بجشر ہو جس کا جہان میں مذکور
لکھوں وہ مدح کہ جو یادگارِ عالم ہو ۔۔۔ پڑھوں قصیدہ وہ جس سے حضور ہوں مسرور
ہوا ہے کیا تجھے کلکِ صغیر مدح سرا ۔۔۔ نہیں ہے مدح سراؤں کا یہ کہیں دستور(۳)
وہ آفتاب ہے، تو ذرّہ کیا ہے مدح تری ۔۔۔ ہزار تجھ سے ہیں مدحت سرا قریب حضور
اگر کرم ہو انھیں کا تو ہاں لکھوں میں بھی ۔۔۔ کہ تجھ کو بخت پہ اپنے ہے کبر و ناز ضرور
لے اب دعا کا محل ہے اٹھا دے دستِ دعا ۔۔۔ کہ طبع ہوتی ہے آمین کہنے پر مامور
یہ آفتاب ہے جب تک فلک پہ جلوہ فروز ۔۔۔ یہ ماہتاب ہے جب تک زمین پہ قاسمِ نور

(۱) بمعنی اجازت ۔ (۲) خزانہ دار ۱۲ (۳) بمعنی قاعدہ و طریقہ ۱۲

رہے حضور کے اقبال کو ترقی روز ... بڑھے حضور کی عمر اور جاہ و سور و سرور
الٰہی میری دعا یہ قبول کر لینا ... بحقِ احمد و آلِ رسولِ پاک و طہور (۱)
مری ہو مدح پسندِ طبیعتِ عالی ... لکھوں انھیں کی ثنائیں جواب لکھوں میں سطور
پڑھوں مدام قصائد لکھوں دوام ثنا ... یہیں سے مدح سرا ہوں بابتہاج و سرور
وہ شہر شہر میں مشہور ہوں مرے ممدوح ... میں شہر شہر میں مداح اُن کا ہوں مشہور
رہیں وہ مسندِ دولت پہ جلوہ گر دائم ... رہوں میں مدح سرائی پہ رات دن مامور

(۳) خواجہ حالی مرحوم، خواجہ ایزد بخش کے بیٹے اور پانی پت کے رہنے والے تھے۔ سونی پت کے نہیں۔ جو میرزا صاحب نے سہواً لکھ دیا ہے۔ سنہ ۱۸۳۷ء کے قریب پیدا ہوئے عربی و فارسی کی تحصیل کے ساتھ شعر و سخن کا بھی مشغلہ جاری رکھا۔ میرزا غالب کے قابل فخر شاگردوں میں شمار کیے جاتے ہیں، اور نئی طرزِ شاعری کے موجد ہیں۔ یادگارِ غالب حیاتِ جاوید، مسدس حالی وغیرہ اُن کی تصنیفات ہیں۔ سنہ ۱۹۱۴ء میں انتقال کیا۔ یہ عرضی اور قصیدہ ان کے کلیات میں موجود نہیں ہے:

حاشیہ بوسانِ بساطِ فیض مناط، حضرت نواب کیوان جناب جہان مطاع، جہانیاں مآب دام اقبالہٗ

بموقعِ عرض ... میرساند

بعدِ گذارشِ مراتبِ عجز و انکسار و تقدیم آداب و تحیت و ثنا و صوتی چند خارج از آہنگ بر می کشد۔ ہر چند سامعہ خراش است، اما شنیدنی دارد۔ دوش در عالم سرخوشی خیال بیخ چیدِ تازی زبان در مدح بندگانِ حضور ترتیب میداد۔ ناگاہ دلِ سودا زدہ بمنازعت برخاست و گفت: "چیست کہ از چار سو ردی در ہم کشیدہ سر نیاز برایں آستانہ فرود آوردہٗ؟ مگر با ملازمانِ درگاہ سابقہ معرفتی داشتہ باشی"؟ گفتم: "درمیانۂ شاہ و گدا معرفت چگونہ تواند گنجید؟" گفت: "پس حلقہ کوبی در دولت بچہ نسبت راست آید؟ نشنیدہٗ کہ گفتہ اند سہ در میر و وزیر و سلطان را بی وسیلت مگرد پیرامن"۔ گفتم: "آنجا کہ کرم عمیم است، بیگانہ حکم آشنا دارد"۔ گفت: "یاد دارم کہ پیش از مسند آرائی بندگانِ حضور قصیدۂ متضمنِ مدحِ حضرتِ فردوس مکان بوساطتِ بعضی از اعیانِ حسن پور گذارش کردہ و از انجا نویدِ قبولی ہم ہنوز رسیدہ تا بصلہ و انعام چہ رسد، اکنون بکدام توقع این ہمہ شادمان بودہٗ؟" گفتم: "شرمت بادا! مگر آگاہ نہٗ از قولِ عرب سہ گفتہ اند: الاَوّل للآخِر"۔ گفت: "نہ ترا فضلی مشہور، نہ ذکری سائر، سخن چون تو گمنامی بہ التفات چہ ارزد؟" گفتم: "در مذہبِ من حرام است ستایش کسی کہ از شہرتِ متکلم بحسنِ کلام دار رسد، و از حسن مقال بہ مقال پی بردہ" گفت: "آخر عوض این مدیحہ سرائی چہ خواہی؟" گفتم: "خواہم آنچہ خواہم"۔ گفت: "از طلبِ مجہول مطلق چہ خیزد؟" گفتم: "کار با روشن ضمیری است کہ گفتہ و ناگفتہ پیشش یکی است"۔ گفت: "نعم، اما از اظہارِ مدعا چہ خلل زاید"؟ گفتم: "سائل را زبان دارد"۔ گفت: "چگونہ؟" گفتم: "ہمتِ ممدوح بلند تر از ان است کہ آرزوی

(۱) مبنی پاک ۱۲ ضیاث

مسائل بدان تواند رسید۔" گفت: "اگر ہمچنین است، بچہ نوع از بارِ منتِ ممدوح سبکدوش خواہی شد؟" گفتم: "حجت این دو مصرع ے شکر بجا آر کہ مہمانِ تو روزیِ خود میخورد از خوانِ تو۔" گفت: "چو در فارسی و اردو ہم قدرتِ نظم و نثر باندازۂ بایست داشتہ ترا چہ افتاد کہ صعب را بر ذلول اختیار نمودی، و خود را کاوش و دیگران را کاوش بر کاوش افزودی؟" گفتم: "ملاحظہ نفضل و شرفِ ذاتِ ممدوح نگذاشت کہ مکارمِ اخلاقش جز بہ اشرفِ لغات و افضلِ السنہ وصف کردہ شود و فضلِ عربی بر سائرِ السنہ، چنانکہ دانی، محتاجِ بیان نیست۔" القصہ چون سخن بہ اینجا کشید دل را محلِ گفتگو باقی نماند۔ گفت: "این ہمہ کہ گفتی عینِ صواب است۔ اما اگر دعا باندازۂ ہمتِ ممدوح خواہند، چہ جواب خواہی داد؟" گفتم: "بیک بیتِ خود ازین عہدہ بیرون آیم ے

بقدرِ ہمتش نتوان دعا کرد
الٰہی، ہر چہ طبعش خواہد آن باد!

عرضی دعاگو، صفرالیدین، الطاف حسین، مقیم دہلی متصل حوض قاضی
مکان حکیم احسن اللہ خاں

فَاذَا الزَّمَانُ بِمَالِہٖ — مِنْ حَزْلِہٖ وَذِبَالِہٖ
سَاغَ التَّفَاخُرُ بِالْعُلٰی — لِشَرِیْفِہٖ وَ دُ ذَ الِہٖ
لَزِمَ التَّعَفُّفَ قَانِعًا — مَنْ کَانَ مِنْ سُؤَالِہٖ
نَالَ ابْنُ یُوْسُفَ نَوْلَہٗ — بِالْخَلْقِ دُوْنَ سُوَالِہٖ
مِطْوَاعُ شَرْعِ الْمُصْطَفٰی — بَحْرًا کَرَمِہٖ وَحَلَالِہٖ
لَامَیْلَ فِیْ اَحْکَامِہٖ — لَا مَیْلَ فِیْ اَقْوَالِہٖ
لَاحَجْرَ فِیْ اِنْفَاقِہٖ — لَاحَصْرَ فِیْ اَمْوَالِہٖ
اَلْحُسْنُ مِنْ اَخْلَاقِہٖ — وَالْخَیْرُ مِنْ اَفْعَالِہٖ
اَلْفَتْحُ تَحْتَ لِوَائِہٖ — وَالنَّصْرُ خَلْفَ قِتَالِہٖ
اَلْحَقُّ اِسْمُ قَضَائِہٖ — کَالصِّدْقِ فِیْ عَیْنِ مَقَالِہٖ
اِنْ شِئْتَ تَعْرِفُ مَا النُّہٰی — فَانْظُرْ اِلٰی اَعْمَالِہٖ
اِنْ رُمْتَ تَکُنْ دِیْنَ التُّقٰی — فَارْقَبْ مُجَادِ مُحَالِہٖ
یَشْرِی الْمُنٰی مُتَتَابِعًا — بِعَطَائِہٖ وَنَوَالِہٖ
یَرْقَی الْعُلٰی مُتَنَاہِیًا — فِیْ فَضْلِہٖ وَکَمَالِہٖ
یُحْیِی الْوَرٰی وَیُمِیْتُہٗ — بِجَمَالِہٖ وَجَلَالِہٖ
یُرْوِی الْغَلِیْلَ بِلَفْظَۃٍ — نِعْمَ الرَّوِیُّ فِیْ قَالِہٖ
یَشْفِی الْعَلِیْلَ بِلَحْظَۃٍ — طُوْبٰی لِصَبٍّ وَّالِہٖ
بِالْحَدْسِ فَاقَ اُولِی النُّہٰی — فَامْتَازَ عَنْ اَمْثَالِہٖ
مَا مِنْ مُحَالٍ مُمْکِنٍ — اِلَّا عَلَی اسْتِدْلَالِہٖ

لا كلَّ قصدٍ واقعًا　　إلّا الّذي في بالهٖ
يعزُّ ونصرٌ قرّبنا　　بيمينهٖ وشمالهٖ
يفني العداة كأنّه　　لا عوذ من مرسالهٖ
وكأنّما اخلنت الورى　　من فوق من إرعالهٖ
كم طلعة تجلو الأسى　　منها بريق جمالهٖ
كم لهجة تشفي الجوى　　منها هدى يرمقالهٖ
إذ ما يبادر للوغى　　فالنّفر من عمّالهٖ
ومتى يفيض على الورى　　فالله باقي مالهٖ
كم سائل يسطو به　　ثقةً بحسن فعالهٖ
لولا الظنون مع الحجى　　لا بكيت كون مثالهٖ
لزم العناء حسوده　　لا مرحبًا بعضالهٖ
من لا اراد بقاءه　　قد جنّ في ابسالهٖ
يا من كفى أهل المنى　　متضاعفًا في نالهٖ
قل دلّهكين فاقة　　رفقًا بحال الدّالهٖ
لا زلت تخدم الورى　　بمحمّدٍ وبآلهٖ

(۳) حکیم فصیح الدین رنج میرٹھ کے باشندے اور قوم کے بنی اسرائیل تھے، عربی کی تحصیل کے بعد طب پڑھی اور اسی کو پیشہ بنا لیا۔ شعر و شاعری کا شوق اور میرزا صاحب سے تلمذ تھا۔ شعرائے اردو کا ایک تذکرہ، بہارستانِ ناز، ان کی تصنیف ہے۔ آقا حسن عرف میرزا صاحب نے توقیعاتِ کسریٰ کا اردو میں ترجمہ کیا اور مہاراجہ سر دگبجے سنگھ والیِ بلرام پور کی فرمائش پر مطبع جنگ بہادری بلرام پور میں اس کی طباعت ہوئی، تو رنج نے حسبِ ذیل قطعۂ تاریخ لکھا تھا:

مسرت نے مژدہ سنایا مجھے　　کہ احکامِ نوشیروانی چھپا
ہوا سن کے مسرور و اور شاداں　　دلِ غنچہ ساں، گل صفت کھل گیا
لکھوں اس کے چھپنے کی تاریخ میں　　اسی فکر میں تھا میں بیٹھا ہوا
یکایک سنا لب سے ہاتف کے یوں　　"یہ نسخہ ہے نوشیرِوانی نما"

(خمخانہ: ۳، ۵۰۷، ۵۰۵، ۲۴۱؛ احکام نوشیروانی: ۱۱۰)

قصیدہ در تہنیت جشنِ سکندر حشمت، دارا شوکت، فیض رسان، فیاضِ زمان، حاتمِ دوران، نواب کلبِ علی، بہادر دام اقبالہ

آج کل چلتی ہے عالم میں خوشی کی وہ ہوا　　آشیاں میں ناچتا ہے طائرِ قبلہ نما
دھوم ہے شادی کی اس غل ہی مبارکباد کا　　زیرِ گردوں جا بجا بالائے گردوں جا بجا
مے بہ جوش ہے عروسانہ لباسِ سرخ سے　　شورِ قلقل ہے لبِ مینا سے مے پہ قہقہا

لوٹی جاتی ہے ہنسی کے مارے بجلی چرخ پر
ہے بلند آہنگ کوسِ شادمانی رعد سا

ہے شگفتہ چھیڑنے سے ناخنِ گلگیر کے
شکر کے رستے ہیں سازِ تارِ مطرب کی صدا

پھولی پھرتی ہے شفق پہنے ہوئے رنگیں لباس
شادمانی سے جدا گردوں بھی ہے ناچتا

دیکھیے جس کو وہ ہے مصروفِ سامانِ نشاط
فرشِ سبزہ باغ میں بچھواتی ہے بادِ صبا

جامِ نرگس ہے کہیں رکھا ہوا گل کے حضور
دخترِ رز ہے لیے شیشہ مئے انگور کا

سرو ہے مصروفِ سامانِ طرب باجے کو کر
عطردان کھولے ہوئے بیٹھا کہیں ہے موتیا

شانۂ مرجاں سے سلجھاتی ہے سنبل اپنے بال
یاسمن نے بھی ملا ہے اپنے منہ پہ غازہ

ابر چھایا مور بولا مور کا سن کر خروش
نشۂ مے میں ہے نخلِ بید مجنوں جھومتا

بھر کے پچکاری کہیں فوارہ چھڑکے ہے گلاب
محفلِ گل میں کہیں پنکھا ہلاتی ہے ہوا

نغمہ پیرا لب بلبل داؤد الحان ہے کہیں
ہے کسی تختے میں طاؤس نگار رقص ناچتا

حرز ولے نواب عالی جاہ تیری بزم میں
آج ہے ہر بلبلِ تصویر بھی نغمہ سرا

باغ کو دی ہے خبر جا کر جو تیرے جشن کی
سلے ہے انعام زرِ گل ڈھیریوں بادِ صبا

دیکھ کر جلوہ تری بزمِ طرب کا رات کو
خندہ زن ہیں بزمِ گردوں پر شرارِ سہا

آج وہ دن ہے کہ گردوں کشتیِ مہتاب میں
گوہرِ انجم کو بھر بھر کرکے تجھ پر فدا

آئے زہرہ تیری محفل میں دف ہاتھ لیے
گائے اک تما کھڑے ہو کر مبارکباد کا

کیوں نہ ہو خورشید کا چرخِ چہارم پر دماغ
آفتابہ ہر سحر لے منہ دھلاتا ہے ترا

مہر تمکین تیری خواہش سے ہو تمکین پائیں
سنگ موتی دے تجھے اور سیب لعلِ بے بہا

دین کو اللہ اکبر کیا دیا تو نے رواج!
نکلے ہے ناقوس سے اللہ اکبر کی صدا

زلفِ محبوباں کو بھی کافر نہیں لکھتا کوئی
کفریاں تک رعبِ دینداری نے تیری کھو دیا

مہ جبینوں کو عرق تیری جبیں کا عطر ہے
سرمۂ چشمِ اولی الابصار تیری خاکِ پا

مہر فرشِ رنگیں آفتاب و ماہتاب
چرخ رنگیں فرشِ رنگیں ہے ترے دربار کا

عدل گستر تو یہاں تک ہے کہ تیرے دور میں
غیر ممکن ہے کہ پانی آگ کو دیوے بجھا

خوف سے تیرے غضب کے یاں تلک ہے انتظام
گھاس کے تنکوں کو بھی آتش نہیں سکتی جلا

گر یہی ہے عدل فرمائی تو تیرے دور میں
دانے کو بے جرم پیسے گی نہ ہرگز آسیا

یاں تلک آرام تیرے ظل سے ہر اک کو ہے
پاؤں پھیلائے ہوئے فتنہ بھی سوتا ہے پڑا

بیاں کیسے تری دریا دلی، بحرِ کرم
موتیوں سے دامنِ امید دریا بھر دیا

خستگانِ غم کو ہے تیری نگہ حرزِ اماں
دل شکستہ کو ترا دستِ کرم ہے مومیا

سلطنت سے بھی ہے افزوں ورکی دریادلی ہے
سایۂ دامن ہے تیرا سایۂ بالِ ہما

ہے خوشی ذرہ سے تا خورشید تیرے جشن کی
ہے نشاط اندوز عالم میں ہر اک چھوٹا بڑا

جاہ و منصب عمر و دولت روز افزوں ہو نصیب
جشنِ جمشیدی ہے ہر دن جشن ہو تیرا سوا

تجھ سے گر چاہوں نہ دادِ شعر تو اے قدرداں
قدرداں تیرے سوا اب کون باقی رہ گیا

رنج کے ہاتھوں سے دل کا رنج کے یہ حال ہے
جس طرح ہو دانۂ انگور مرجھایا ہوا

جشنِ شاہانہ مبارک تجھ کو با اقبال و عمر
عمر بھی وہ ہو کہ جس کی کچھ نہ ہووے انتہا

مدح طراز عقیدت آگیں خاکسار راہ آل محمد فصیح الدین بنی اسرائیل متخلص بہ رنج
متوطن شہر میرٹھ

(۴) اس خط کے دوسرے پیرے کے الفاظ "اور ان کے بھائی مظفر حسین خاں" اور اس خط کے جواب کا طالب غالب۔" تک میرزا صاحب کے قلم کے نوشتہ ہیں، اسی لیے اس خط کے بقیہ حصہ میں متعدد املائی غلطیاں پائی جاتی ہیں۔ چنانچہ "پہنچے" کو کاتب نے دونوں جگہ "پونچے" لکھا تھا۔ میرزا صاحب نے اس متن میں یہی حالہ باقی رکھ کر پائیں خط میں اپنے قلم سے "پہنچے" بنا دیا ہے۔ "جواس" کا املا کاتب نے "پائی ہوئی" سے لکھا تھا۔ میرزا صاحب نے اس کو قلمزد کر کے حاشیے سے لکھا ہے۔

(۵) میرزا صاحب کے خط میں یہ لفظ موجود نہیں ہے، لیکن سیاق چاہتا تھا اس لیے میں نے اس کو سہو کاتب و مکتوب نگار خیال کر کے اضافہ کر دیا ہے۔

(۶) احسان حسین خاں اور مظفر حسین خاں کے لیے "عریضہ" ۱۱ کا حاشیہ ملاحظہ ہو۔

(۷) اصل خط میں "ہے"، بصیغۂ مفرد تحریر ہے۔ لیکن اصول زبان کی رو سے "ہیں" بصیغۂ جمع ہونا چاہیے۔ میں نے یہ خیال کر کے کہ اس پر میرزا صاحب کی نظر نہیں پڑی، متن میں "ہیں" لکھ دیا ہے۔

(۸) خط کے لفافے پر میر منشی صاحب کی حسب ذیل تحریر ہے: "خط در جواب نوشتہ ۲۴ صفر سنہ ۱۲۸۴ھ مطابق ۳۰ جون سنہ ۱۸۶۷ء موصولہ" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میرزا صاحب کے خط کی یہی تاریخ ۱۱ جون سنہ ۱۸۶۷ء ہے۔ یہاں تصحیح کر دینا ضروری ہے کہ خط کشیدہ الفاظ میرزا صاحب کے قلم کے لکھے ہوئے ہیں۔

(۹) یہ لفظ اصل میں ساقط تھا میں نے اس لیے بڑھا دیا ہے کہ جملہ درست ہو جائے۔

صفحہ ۱۱۳

(۱) یہ عریضہ بھی میرزا صاحب کے اپنے قلم کا نوشتہ نہیں ہے۔ البتہ خط کشیدہ عبارتیں انھوں نے اپنے قلم سے بڑھائی ہیں۔

(۲) اس خط کے لفافے پر ۱۰ ستمبر سنہ ۱۸۶۸ء تاریخ درج ہے۔

صفحہ ۱۱۵

(۱) میرزا صاحب کا یہ خط مولوی عبد الحکیم خاں صاحب مدرس فارسی مدرسہ عالیہ رامپور سے مبلغ ۵۰ روپے میں خریدا گیا تھا۔ خیال تھا کہ سبین فارسی کی کیفیت پر مشتمل دو ورقے بھی موصوف الذکر بزرگ کے پاس ہوں گے، لیکن باوجود تلاش دستیاب نہ ہو سکا۔

(۲) عرفی کے لیے عریضہ ۱۱ کا حاشیہ ملاحظہ ہو۔

(۳) جلال الدین اکبر ابن نصیر الدین ہمایوں، ابن ظہیر الدین بابر، سلطنت مغلیہ کا تیسرا اور عظیم ترین فرمانروا تھا۔ امر کوٹ، سندھ، میں سنہ ۹۴۹ھ (۲۳ نومبر ۱۵۴۲ء) کو پیدا ہوا۔ ابھی تیرہ سال نو مہینے کی عمر تھی کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ بیرم خاں خانخاناں نے اسے بادشاہ بنا کر مختار کل کی حیثیت سے کام شروع کر دیا۔ لیکن اپنی خداداد قابلیت سے اکبر نے بہت جلد انتظام سلطنت کا بار اپنے کاندھوں پر اٹھا لیا، اور سلطنت مغلیہ کی حدود کو گجرات، بنگال، کشمیر اور سندھ تک وسیع کر دیا۔ فتح پور سیکری اسی نے آباد کیا تھا۔ یہ بہت لکھا پڑھا نہ تھا، لیکن ایک دانشمند بادشاہ کی طرح دربار کو اس وقت کے ممتاز اہل علم سے مزین رکھتا، اور ان کے

علمی مباحثوں میں شریک ہوتا رہتا تھا جس سے اس کی معلومات اور قابلیت میں غیر معمولی وسعت پیدا ہو گئی تھی۔ اس کے دربار کے نورتن ابتک مشہور ہیں۔ اس کا سب سے اہم کارنامہ دینِ الٰہی کی ترویج ہے جو خالص اسلامی نقطۂ نگاہ سے بیحد مضر، مگر خود اس کی سیاست ملکی میں بہت معاون ثابت ہوا۔ چنانچہ ہندوستان کی پرشور فضا اسی مذہب کی بدولت جنت نشان بنی تھی۔ اکبر نے جمادی الآخرہ سنہ ۱۰۱۴ھ (۱۶۰۵ء) کو ۶۳ سال کی عمر میں اس دارِ فانی کو خیرباد کہا۔

(۴) ابوالفضل، شیخ مبارک کا بیٹا اور فیضی کا بھائی ہے۔ یہ سنہ ۹۵۸ھ (۱۵۵۱ء) میں پیدا ہوا۔ سنہ ۹۸۱ھ اکبر شاہی میں ملازمت کا شرف حاصل کیا، اور بہت تھوڑے عرصہ میں وزارت کے درجے تک جا پہنچا۔ اس کو ربیع الاول سنہ ۱۰۱۱ھ (۱۶۰۲ء) میں شاہزادہ سلیم کے ایما سے ۵۲ سال ۲ ماہ کی عمر میں شہید کر دیا گیا۔ یہ بڑا مدبر اور زبردست ادیب تھا۔ آئینِ اکبری، اکبرنامہ اور مکاتباتِ علامی تصنیفات ہیں۔ شعر بھی کہتا اور علامی تخلص کرتا تھا۔ یہ اکبری دربار کے نورتن میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس کے قتل کی اطلاع سے اکبر کو اس قدر صدمہ ہوا تھا کہ اس نے کئی وقت کھانا نہ کھایا۔ اور بار بار کہتا کہ اگر شیخو بابا مجھے قتل کرا دیتا تو اس سے بہتر تھا۔

(۵) فیضی، شیخ مبارک کا بڑا بیٹا، اور اکبری دربار کا ملک الشعرا تھا۔ حکمت، فلسفہ، ریاضیات، تاریخ اور سنسکرت کا عالم تھا۔ سواطع الالہام، اور موارد الکلم، عربی میں، اور کلیات، نلدمن اور خمسہ، اور ترجمۂ لیلاوتی فارسی میں اس کی مشہور تصنیفات ہیں۔ یہ ۱۰ صفر سنہ ۱۰۰۴ھ (۱۵۹۵ء) کو ۵۰ سال کی عمر میں فوت ہوا۔

(۶) اصل میں نون ساقط ہے چونکہ میرزا صاحب نے ہمیشہ اس لفظ کو نون کے ساتھ لکھا ہے، اس لیے متن کے اندر نون کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔

(۷) حکیم ابوالفتح مسیح الدین ابن حکیم عبدالرزاق گیلانی اکبر کا طبیب خاص اور اس عہد کا بڑا فاضل تھا۔ یہ اپنی علمی وجاہت و عظمت کے سبب سے بادشاہ کے دربار میں ممتاز درجے کا مالک اور نورتن میں شامل تھا۔ اس نے سنہ ۹۹۷ھ (۱۵۸۹ء) میں وفات پائی۔

صفحہ ۱۴۱

(۱) میرزا صاحب نے تیا اس طرح لکھا ہے: "رامپور آزاد خاں کا بنگلہ، جدید سکندری کا مطبع، محمد حسین خان مالک مطبع"، لیکن حقیقت یہ ہے کہ مطبع کا نام "حسنی" اور مالک مولوی محمد حسن خاں تھے۔

(۲) مطبع حسنی مراد ہے۔ مولوی محمد حسن خاں صاحب نے سنہ ۱۸۵۶ء میں اسے جاری کیا تھا۔

(۳) ڈگ بجے سنگھ، بلرامپور کے زمیندار تھے۔ غدر کے پر آشوب ایام میں انگریزوں کی خدمات جانبازی سے انجام دیں، جن کے صلے میں تلسی پور کا سابق پرگنہ جو ضبطی میں آ چکا تھا، گورنمنٹ نے عطا کر دیا، اور ضلع بہرائچ میں بھی ایک بڑا علاقہ مرحمت کیا۔ اس کے علاوہ جملہ موروثی علاقے میں دس فی صدی جمع سرکاری معاف اور مرفوع القلم کر دی گئی۔ ڈگ بجے سنگھ عدالت ہائی دیوانی کی حاضری سے مستثنیٰ ہوئے، اور آن کے باڈی گارڈ ہمراہی ایکٹ اسلحہ کے اثر سے بری قرار پائے۔ نیز انہیں مہاراجہ بہادر اور کے سی ایس آئی کا خطاب بھی ملا، اور ۹ ضرب توپ کی سلامی کا اعزاز حاصل ہوا۔ کچھ عرصے کے لیے ویسرائی کی مجلس واضع قوانین کے رکن بھی رہے۔

ان کا نام چار دوسرے تعلقداران اودھ کے ساتھ لارڈ کیننگ کے اعلان میں باعتراف خیرخواہی مذکور ہوا ہے۔

دگ بجے سنگھ کو شعر کہنے کا بھی شوق تھا۔ راجہ تخلص کرتے تھے۔ سید آغا حسن عرف میرن صاحب نامی تخلص سے مشورۂ سخن رہتا تھا۔ دیوان "مخزن فصاحت" کے نام سے ۲۵ دسمبر سنہ ۱۸۶۸ء (۱۰ رمضان سنہ ۱۲۸۵ھ) کو بلرامپور کے مطبع جنگ بہادر خاں میں چھپا تھا۔ ان کی فرمائش پر میرن صاحب نے توقیعات کسریٰ کا اردو میں ترجمہ کیا تھا، جو مطبع مذکور میں دسمبر سنہ ۱۸۶۸ء کی کسی تاریخ کو چھپ کر احکام نوشیروانی کے نام سے شائع ہوا تھا۔ سنہ ۱۸۸۲ء میں انھوں نے انتقال کیا ہے۔ ۲۰ مارچ ۱۸۷۳ء کو بے نظیر کے میلے کی سیر کے لیے رامپور بھی آئے تھے۔ نواب خلد آشیاں نے رنگ محل میں ٹھیرایا اور بڑی مدارات کے بعد ۳۱ مارچ کو رخصت کیا۔ (صحیفۂ زریں: ۱، خمخانہ ۳، ۲۹، ۳۰، اخبار الصنادید: ۲، ۱۵۶)

(۴) یہ لفظ اصل میں ساقط تھا۔ سیاق کلام کے حسب اقتضا بڑھا دیا گیا ہے۔

(۵) اصل میں "عملداری" کی بجائے "معلداری" ہے چونکہ یہ خط میرزا صاحب کے قلم کا نہیں ہے اس لیے سہو کاتب پر محمول کرکے متن میں تصحیح کی گئی ہے۔

(۶) نواب محمد علی خاں والیٔ ٹونک کے لیے صفحہ ۳۳ کا حاشیہ ۵ ملاحظہ ہو۔ نواب محمد علی خاں کے حاشیے سے میرزا صاحب کا مطلب یہ ہے کہ نواب صاحب پر لاوا کے ٹھاکر دل سو کو قتل کرانے کا جو الزام ہے، اس سے متعلق بار بار اظہار رنج و افسوس کرتے ہو۔ یہ بھی معلوم رہنا چاہیے کہ ٹونک کے اس اہم واقعے سے میرزا صاحب کا اتنی بے تعلقی ظاہر کرنا مدیر دبدبۂ سکندری سے ناراضگی کے باعث تھا۔ ورنہ وہ اس خاندان کے پرانے نیازمند تھے۔ نواب وزیر الدولہ وزیر محمد خاں بہادر کی مدح میں اُن کے دو فارسی قصیدے موجود ہیں۔ ان میں سے پہلا: ای ذات تو جامع صفتِ عدل و کرم را (سنہ ۱۲۶۱ھ/۱۸۴۵ء) سے پہلے اور جولائی سنہ ۱۸۳۸ء (جمادی الآخرہ ۱۲۵۴ھ) کے بعد لکھا گیا تھا، اس لیے کہ یہ موخر الذکر سنہ کے نوشتہ دیوان میں شامل نہیں، اور پہلی تاریخ کے چھپے ہوئے نسخے میں موجود ہے۔ دوسرا قصیدہ "عید اضحیٰ بسر آغاز زمستان آمد" کسی ایسے سال میں لکھا گیا ہے جس میں بکرید شروع جاڑوں میں آئی تھی، اور یہ یا برس [illegible] ۱۲۶۵، ۶۶ اور ۶۷ میں سے ایک ہو سکتا ہے، اس لیے کہ ان برسوں میں اکتوبر کی ۱۸، ۱۰ اور ۸، اور ستمبر کی ۲۷ کو ذی الحجہ کی پہلی ہوئی تھی، جو موسم سرما کے آغاز کا زمانہ ہے۔

سنہ ۱۲۸۱ھ (۱۸۶۴ء) میں جب نواب محمد علی خاں گدی پر بیٹھے، تو میرزا صاحب نے ایک تاریخی مثنوی لکھ کر بھیجی تھی۔ اس میں فرماتے ہیں:

زغالب کہ از روزگاری دراز   بر آن عتبہ سای جبین نیاز

یہ میرزا صاحب کی طرف سے کھلا ہوا اقرار ہے اپنی قدیم نیازمندی کا۔ میرزا صاحب نے ۱۸ نومبر سنہ ۱۸۵۸ء سے کچھ پہلے ایک خط سرور مارہروی کو لکھا تھا، اس میں فرماتے ہیں: "میں نے کسی زمانے میں اسی زمین میں ایک قصیدہ لکھ کر وزیر الدولہ والیٔ ٹونک کو